تاریخ ادب اُردو

(1838 تا 1858)

جلد دہم

محمد انصار اللہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

تاریخ ادب اردو

(1838 تا 1858)

جلد دوم

محمد انصار اللہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت	:	2012
تعداد	:	550
قیمت	:	-/132 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1587

Tareekh-e-Adab-e-Urdu Vol-X
By : Mohd. Ansarullah

ISBN :978-81-7587-771-9

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

اردو دنیا کی ان مقبول ترین زبانوں میں سے ہے جس کے بولنے، لکھنے، پڑھنے اور سمجھنے والے دنیا کے مختلف ممالک میں آباد ہیں اور اب اس زبان کی عمر تقریباً ہزار سال کے قریب ہوگئی ہے۔ گذشتہ ڈھائی سو سال میں اس نہایت شیریں، وقیع اور دل پذیر زبان کی چھوٹی بڑی متعدد تاریخیں اور بہ کثرت تذکرے لکھے اور شائع کیے جاچکے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہے، اردو زبان و ادب کے فروغ، ترویج اور توسیع پر نہایت عمدہ اور مثبت مقاصد کے ساتھ وجود میں آئی ہے۔ کونسل کی کوشش رہی ہے کہ عوام و خواص میں یکساں اس ہر دل عزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تذکرے اور تاریخ کی معیاری کتابوں کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔ تذکرہ نویسی میں جامع التذکرہ کے نام سے تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

تاریخ میں پہلی کوشش پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر سیدہ جعفر کا سترھویں صدی کی نظم و نثر سے متعلق ہے، پانچ جلدوں پر مشتمل مکرر اشاعت کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ جبکہ

دوسرا کام پروفیسر ظفر احمد صدیقی کا اٹھارھویں صدی عیسوی کی نظم سے متعلق ہے، جو ایک ضخیم جلد کی صورت میں جلد منظر عام پر آنے والی ہے۔ تیسرا کام پروفیسر محمد انصار اللہ کا انیسویں صدی عیسوی کی زبان وادب کی نظم ونثر کے ارتقا سے متعلق ہے جو تین جلدوں اور ہر جلد تین حصوں پر مبنی ہے۔

اس طرح تاریخ ادب اردو کا یہ پروجیکٹ 17 جلدوں پر مشتمل ہوگا جن میں پہلے کی پانچ جلدیں جیسا کہ ذکر کیا گیا منظر عام پر آچکی ہیں۔ زیر نظر کتاب تاریخ ادب اردو کی 10 ویں جلد ہے جو پروفیسر انصار اللہ کی تصنیف ہے۔

ہماری کوشش ہے کہ بقیہ جلدیں بھی جلد از جلد اور بہتر انداز سے سامنے لاسکیں، اس کے لیے قارئین کرام اور ارباب علم وبصیرت کی طرف سے حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ نیز اہل علم سے گزارش ہے کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہے وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

ڈائرکٹر

عرض مؤلف

شاہ عالم بادشاہ اپنے زمانہ شاہزادگی میں ممالکِ مشرقی کی تسخیر کے ارادے سے نکلے تھے۔ وہیں اپنے والد ماجد عزیز الدین عالمگیر ثانی کی شہادت کی خبر سنی۔ کمپنی کے ارباب اقتدار نے ضروری انتظامات کیے اور وہیں یعنی عظیم آباد پٹنہ میں شاہ عالم کی تاج پوشی کی رسم ادا کی گئی۔ بادشاہ نے بہار، بنگال اور اڑیسہ کی دیوانی کمپنی کو عطا کر دی اور خود بدولت امرا کے ساتھ دارالخلافہ دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ حضرت جان کو سلامت لے کر وطن میں پہنچ تو گئے لیکن وہاں خود اپنے پروردہ غلام قادر خاں روہیلہ کے ہاتھوں اپنی آنکھیں گنوا بیٹھے۔ نابینا بادشاہ بیکسی سے مدد اور حمایت کے لیے ایک ایک کا منہ تکتے رہے۔ ان کے یہ دو شعر خصوصیت سے توجہ طلب ہیں۔

مادھو جی سیندھیا فرزند جگر بند من است ہست مصرف تلافی ستم گاری ما
آصف الدولہ و انگریز کہ دستورِ من اند چہ عجب گر بہ نمایند مدد گاری ما

اس مقام پر واقعہ لائق توجہ ہے کہ اس سے چند سال پیشتر روہیلوں کی الگ الگ پانچ ریاستوں کی تنظیم عمل میں آ چکی تھی اور اس کے بعد نواب شجاع الدولہ سے 1188ھ/1774 میں جنگ ہوئی جس کے نتیجہ میں " حافظ رحمت خاں کا سر کاٹا گیا۔" اس کے بعد بھی نواب آصف الدولہ روہیلوں کے معاملات میں اپنی مصلحتوں کے مطابق موقع بہ موقع دخل دیتے رہے۔

شاہ عالم بادشاہ بصارت سے محروی کے ساتھ کئی برس تک بادشاہت کرتے رہے اور 1221ھ/1806 میں رحلت کر گئے۔ ان کے بعد ان کے ولی عہد محمد اکبر شاہ ثانی تخت نشین

ہوئے۔ اپنے پدر والاقدر سے ان کو جو دوست، دشمن ملے تھے ان میں سے دو یعنی

(الف) روہیلے اور (ب) نوابین لکھنؤ

کو خصوصیت حاصل رہی تھی۔ تاریخ ادب اردو کی اس جلد میں ان دونوں کے علم و دانش سے متعلق معاملات اور کارکردگی کا بیان مطلوب ہے۔ اسی صورت حال کے پیش نظر اس جلد میں جن علمی مراکز کی نظم و نثر کا احوال قلم بند کیا گیا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

(الف) روہیل کھنڈ- اس کے تحت بریلی، مرادآباد، بدایوں، رامپور، شاہجہانپور اور فرخ آباد کی ریاست کا مذکور ہے اور

(ب) لکھنؤ کے سرمایۂ علمی کا مجمل تعارف کیا گیا ہے:

شاہ عالم بادشاہ نے کبت، ہولی اور پھاگ وغیرہ ہندوستانی اصناف شعری سے دلچسپی لی تھی۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں بھی اس قبیل کی بیشتر اصناف میں کم و بیش طبع آزمائی کی تھی۔

سرکار کمپنی بہادر کی حمایت سے مختلف مراکز پر تعلیمی ادارے (اسکول) قائم کیے گئے تھے جن کے نتیجہ میں علمی اور ادبی کاموں کے لیے نئے نئے راستے نکل آئے تھے مثلاً خطوط اور مضمون نویسی، ترجمہ وغیرہ۔

اس زمانے کا سب سے اہم بلکہ انقلاب آفریں ایجاد چھاپے خانہ (پریس) تھا۔ پریس کے قیام کے بعد نظم و نثر اور روزانہ معاملات سے متعلق تحریروں کی ترویج و اشاعت کا کام بہت تیزی سے ہونے لگا تھا۔

چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے قیام سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اہل قلم کو جگہ جگہ سرپرستی کرنے والے ملنے لگے تھے لیکن بڑا نقصان یہ ہوا کہ آپس کے معرکوں کا زور ہوا اور اکثر موقعوں پر ہجویات لکھی گئیں جن میں فحش اور مبتذل مضامین بھی در آتے تھے۔

اس تاریخ میں کوشش کی گئی ہے کہ صحیح واقعات اور حقائق کو پیش کیا جائے۔ سہو و خطا سے کوئی خالی نہیں ہے۔ صاحبان علم و بصیرت سے توقع ہے کہ وہ اس کام کو بہتر بنانے میں مدد کریں گے۔ انشاءاللہ۔

محمد انصاراللہ

4/1172 سرسید نگر، علی گڑھ (یوپی)

فہرست

(الف)

(1) بریلی	1
(2) مرادآباد	27
(3) بدایوں	60
(4) رامپور	75
(5) شاہ جہان پور	162
(6) فرخ آباد	173
(7) لکھنؤ	225

1۔ بریلی

الف۔غزل	1
1 معظم۔محمد معظم عباسی	2
2 وحشت۔میرزا باقر علی خاں	2
3 نالاں۔میرزا محمد جان	5
4 جذب۔میر عزت اللہ	6
5 شائق۔محمد نذیرالدین حسن	7
6 نیاز۔شاہ نیاز احمد	8
7 عشرت۔غلام علی	10
(ب) نعت	13
1 لطف۔لطف علی خاں	13
2 شاہ نیاز احمد	14
(ج) ہولی و پھاگ	17
نیاز۔شاہ نیاز احمد	17

(د) نثر	21
1 قصہ سحرالبیان	21
2 اخبار حسن	23
3 مصدر فیوض	25

(الف) غزل

اودھ کے حکمرانوں اور روہیلوں کے مابین شروع زمانے سے ہی رقابت کا سلسلہ چلا آتا تھا۔ نواب علی محمد خان بہادر کی وفات کے بعد دشمنوں نے ان کی اولاد میں ایسی پھوٹ ڈالی کہ بالآخر ملک کی تقسیم ہو کر رہی۔ اس طرح:

(الف) ''بریلی پر مع مضافات حافظ رحمت خاں نے دخل پایا۔

(ب) آنولہ، بدایوں اور اسہیت وغیرہ کے کارفرما فتح خاں خانساماں ہوئے۔

(ج) مرادآباد مع متعلقات دوندے خاں کے قبضے میں آیا۔

(د) کوٹ، اہرات اور سنبھیا وغیرہ کے مختار بخشی سر۱. خاں ہوئے۔ اور

(ہ) صرف رامپور وشاہ آباد وغیرہ محالات نواب محمد فیض اللہ خاں سے متعلق رہ گئے۔

اس تقسیم کے باوجود اچھی بات یہ ہوئی کہ بقول امیر مینائی:

> ''یہ امر معمول یہ رہا کہ جب کوئی معرکۂ جنگ وجدل پیش آتا سرداران لشکر نواب محمد فیض اللہ خاں اور نواب محمد سعد اللہ خاں کو سردار وسرور ومختار بنا کر اس معرکے کو سر کیا کرتے تھے''۔1

لیکن یہ صورت حال بھی زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکی۔ 1158ھ (1771) میں

احمد خاں بنگش نے وفات پائی۔ مظفر جنگ نے اس کی جگہ لی لیکن وہ ریاست ۔کے معاملات کو بخوبی سنبھال نہ سکے۔ شجاع الدولہ سے اعانت چاہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست پر اسی کا قبضہ ہوگیا۔ مظفر جنگ اور اس کی اولاد کو مختصر سی جاگیر اور نوابی کے خطاب پر قانع ہونا پڑا۔ اسی زمانے میں مرہٹوں نے ضابطہ خاں کو تباہ کیا۔ غرض روہیلوں کا زور بہت کچھ ٹوٹ گیا۔ شجاع الدولہ نے موقع پاکر بریلی پر حملہ کر دیا اور 1188ھ (1774) میں حافظ رحمت خاں شہید کر دیے گئے اور اس واقعہ کے بعد رامپور چھوڑ کر روہیلوں کا تقریباً سارا علاقہ اودھ کے ماتحت ہوگیا۔

آصف الدولہ کے انتقال کے بعد نواب سعادت علی خاں اودھ کے حکمراں ہوئے تو انھیں اپنا آدھا ملک انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا2۔ اس میں ایک طرف الہ آباد، گورکھپور اور اعظم گڑھ کا علاقہ تھا، تو دوسری طرف فرخ آباد، بریلی اور باندہ تھا، حافظ رحمت خاں، احمد خاں بنگش اور ناصر جنگ وغیرہ کی اولاد کے اخراجات انگریزوں کے ذمہ رہے۔

1- معظم

مذکورہ انقلابات کے باوجود تیرھویں صدی ہجری کے اوائل (اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر) میں بریلی میں شعر وسخن کے سلسلے جاری تھے۔ قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکرے میں محمد معظم نامی ایک شاعر کے حال میں لکھا ہے:

> "محمد معظم عباسی، متوطن بریلی...در گفتن تاریخ و چیستاں وتبع وغیرہ صناعات مہارتے دارد"۔3

اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس جوار میں شاعری کی تقریباً سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی جارہی تھی۔ اسی معظم شاعر نے رامپور کی جنگ دوجوڑہ کے واقعات کو ایک مثنوی کی صورت میں تفصیل سے نظم کیا ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ آصف الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے روہیلوں کو شکست دے کر صغر سن نواب احمد علی خاں کو رامپور کی مسند پر بیٹھا دیا تھا۔

2- وحشت

تیرھویں صدی ہجری کے عشرۂ سوم (انیسویں صدی عیسوی کے اوائل) میں بریلی میں مہدی علی خاں صوبے دار تھے۔ اس زمانے میں ان کے اخلاف واقربا وہاں کے علمی اور شعری

ماحول میں موثر حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک کے بارے میں شیخ مصحفی نے لکھا ہے:

''وحشت تخلص، میرزا باقر علی خاں، قوم مغل، اہل ایران از میرزایان باختر، والد بزرگوارش میرزا حسین علی خاں برادر مہدی علی خاں صوبہ دار بانس بریلی، از اُمرائے قدیم بسیار موقر و ممتاز بودہ، مقدمات ریاست ورتق پروری واخراجات ... بار انفس نفیس ایشاں ہمیشہ سردار، شجاعت وسخاوت این خاندان علیا ضرب المثل دانایان روزگار، خودش جوان صلاحیت شعار ونرم گفتار، از عہد عنفوان شباب طبع موزونش سرے بہ صاحب کمالان نظم داشت و بہ قدر مرتبہ وحال ہر کس بہ سلوک ہم پیش می آید، چوں بہ سن تمیز رسیدہ، در کلام خود بہ عرصۂ قلیل از فیض خدمت استادان فصاحتے وبلاغتے پیدا کردہ عمرش قریب بہ چہل رسیدہ باشد''4۔

محسن موسوی نے ان کے حالات میں کچھ اضافہ کیا ہے۔ اس طرح:

''وحشت مرزا باقر علی خاں مرحوم، خلف حسین علی خاں نائب ومختار مہدی علی خاں صوبیدار بریلی، باشندۂ فتح آباد، مقیم لکھنؤ، صاحب دیوان مع قصائد، شاگرد میر تقی میر۔''5

اور سعادت خاں ناصر نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''صاحب جاہ وثروت مرزا باقر علی خاں ابن حسین علی خاں، صوبیدار بانس بریلی تخلص وحشت، شاگرد محمد تقی میر، آخر آخر مرتبہ ان کا بہ سبب قرابت نصیر الدین حیدر شاہ سے بیش از بیش ہوا''۔6

ناصر نے مرزا باقر علی کو ''صاحب جاہ وثروت'' کہا ہے اور اس کا سبب ان کی بادشاہ لکھنؤ سے قرابت کو بتایا ہے۔ ان کے والد حسین علی خاں خود صوبہ دار تھے، بلکہ اپنے بھائی مہدی علی خاں صوبیدار کے نائب اور مختار تھے۔ بہرصورت ان کے موقر اور موثر ہونے میں شبہ نہیں۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

دزدِ معنی ہے فلک دیکھ لے مصراعِ ہلال　　صاف مضموں ہے بندھا اس میں ترے ابرو کا

یاد کر اس کو یہ رویا ہوں چمن میں وحشت
کہ ہر اک تار کفن تار ہوا آنسو کا

ہوا ہے خط سے جوہر دار آئینہ ترے رو کا صفائی کے سبب ظاہر ہوا عکس گیسو کا
نگہ آفت، بلا قامت، کمر ہیچ و دہن معدوم جو دیکھو غور سے تو وہ صنم پتلا ہے جادو کا

ہوا برگشتہ بختی سے ہمارے حق میں سم وحشت
خطِ پشتِ لب جاناں تھا نسخہ نو شدارو کا

ہم کو ایذا دے نہ تو اے سنگدل پچھتائیگا توڑ کر آئینۂ دل منہ بھی پھر دکھلائیگا
شوخ ہے ایسا اگر اک دم رہا پر تو فگن عکس اس کا خانۂ آئینہ میں گھبرائیگا
لاغری کہتی ہے پوشیدہ نگاہوں سے مجھے استخواں میرے ہما کے بدلے عنقا کھائیگا

دست و پا تصویر کے زنجیر سے مانی تو باندھ
ورنہ اس میں میرا نقشہ بھی پچھاڑیں کھائیگا

تیغ سے، خنجر سے نہ ڈر جائیں گے چین جبیں دیکھیں تو مر جائیں گے
خوف اسیری میں رہائی کا ہے ضعف یہی ہے تو کدھر جائیں گے
کاٹتی ہیں گور کی اندھیاریاں کیا شب دیجور سے ڈر جائیں گے

کتنوں کی جاں بخشی کرینگے وہ لب
کتنے ہی اس بات پر مر جائینگے

ٹھہرا نہ کوئی بھی میرا آزار دیکھ کر آنکھیں تلک تو پھر گئیں بیمار دیکھ کر

غزلوں کے سوا کسی اور صنف میں باقر علی وحشت کا کلام فی الوقت دستیاب نہیں ہے جو کلام پیش نظر ہے اس سے شاعر کی قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ مشکل ردیف اور قافیوں میں کامیابی کے ساتھ غزلیں کہہ لینے پر قادر ہے۔ اپنی قوت مشقی کے اظہار کے لیے کبھی کبھی اس نے دوغزلے بھی کہے ہیں۔

وحشت کے کلام میں بعض ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جو لکھنؤ اور مضافات میں رائج تھے

مثلاً اندھیاری وغیرہ۔ دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ وحشت نے کبھی کبھی غیر مردّف غزلیں بھی کہی ہیں۔

3- نالاں

محمد جان نالاں شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگردوں میں سے تھے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے:

"میرزا محمد جان، نالاں تخلص، خلف مہدی علی خاں صوبیدار بانس بریلی وغیرہ،
جوان صلاحیت شعار است، از ابتدائے عمر سرے بہ موزونی شعر داشت، پیش ازیں
بہ لالا موجی رام موجی تخلص کہ او ہم شاگرد فقیر است چندے مشورہ کردہ، دو سال
مشاعرہ ہم نمودہ حالا بہ فقیر رجوع تمام وارد، عمرش بست وسہ سالہ خواہد بود"۔ 7

صوبیدار کا بیٹا ہونے کی وجہ سے علاقے میں ان کی ذات والا صفات خاصی معزز اور موثر رہی ہوگی۔ اس پر مزید یہ ہوا کہ انھوں نے مشاعروں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ جہاں شاعروں اور شعر پسندوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے در دولت کو ایک ایسے مرکز کا بھی درجہ حاصل ہوگیا جہاں بریلی کے شعری اور ادبی مزاج کی ترتیب اور تشکیل ہو رہی تھی۔ مشاعروں میں معمولاً غزلیں پڑھی جاتی تھیں چنانچہ اس خطے میں اسی صنف شاعری کو رواج حاصل ہوا۔ خود نالاں کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

وصل کی شب مجھے کیا یار نے سونے نہ دیا   دیدۂ مایل دیدار نے سونے نہ دیا
شدت درد سے کرتا جو رہا نالہ وآہ   قبر میں بھی دل بیمار نے سونے نہ دیا
چھیڑنے کو مرے، تصویر خیالی بھیجی   خواب میں بھی مجھے دلدار نے سونے نہ دیا
گرچہ افسانے سے نیند آتی ہے مجھ کو لیکن   قصۂ عشق دل زار نے سونے نہ دیا
یاد روز سیہ ہجر دلا کر مجھ کو   وصل میں بھی تو شب تار نے سونے نہ دیا
گرچہ ہوں ساکن گلزار و لے نرگس وار   ایک شب آرزوئے یار نے سونے نہ دیا
جیتے جی تیرگی گور کا دکھلا کے سماں   یار بن مجھ کو شب تار نے سونے نہ دیا
بخت خفتہ اسے کہتے ہیں، شب وصل بھی آہ   اپنے پہلو میں مجھے یار نے سونے نہ دیا

وہ تو اس بات پہ راضی تھا مگر اے نالاں

پاس میرے اسے اغیار نے سونے نہ دیا

کیا ناز کی سے رکھے وہ صمصام دوش پر ہو بار جس کو زلفِ سیہ فام دوش پر

پھرتے ہیں تیرے عشق میں اے برہمن پسر زنار رکھکے صاحب اسلام دوش پر

عاشق مزاج کہتے ہیں طفلی سے مجھ کو لوگ

آتا نہ تھا کبھی مجھے آرام دوش پر

یہ نالاں کی ابتدائی مشق کا کلام ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی مشاقی کا ثبوت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ طویل اور مشکل ردیفوں میں غزلیں کہی ہیں اور فکر و تخیل سے کلام میں تنوع پیدا کرنا چاہا ہے۔

حافظ رحمت خاں شہید اور ان کے بعض اخلاف کی وجہ سے بریلی میں اس زمانے میں بھی مذہب کا اثر زیادہ معلوم ہوتا ہے چنانچہ شاعروں میں بھی زیادہ لوگ ایسے ہی تھے۔ بعض کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

4- جذب

جذب تخلص اور عزت اللہ نام تھا۔ ان کی طبیعت کا میلان تخلص سے ظاہر ہے۔ شیفتہ نے ان کے تعارف میں لکھا ہے کہ:

''عزت اللہ خاں المعروف بہ میر بھکاری۔ از اعزۂ بریلی است۔ شخص موذب و حلیم۔ صاحب فطرت سلیم۔ از علوم رسمیہ آگاہ۔ دستش در ہر فن دراز و عمرش کوتاہ۔ اکثر بالا درا بہ گام سیاحت پیمودہ و قریب بخارا ہوس ہیچ سفر آخرت نمود۔'' 8

لالا سری رام نے ان کے حالات میں یہ وضاحت کی ہے کہ:

''سرکار کمپنی کی طرف سے عہدۂ جاسوسی پر مقرر تھے اور اسی ذریعہ سے سیر و سیاحت میں مصروف رہتے تھے وسط ایشیا کے نواح میں بخارا کے قریب مارے گئے''۔ 9

ان کی ایک غزل کے دو شعر یہ ہیں۔

دھاں صفائی وخود نمائی ہے یہاں مری جان کی صفائی ہے
جو کہ حلقہ بگوش نتھ کے ہیں ناک میں ان کی جان آئی ہے

لفظوں کے تلفظ میں قدامت کا اثر ہے۔ محاورہ بندی سے شاعر کو دلچسپی زیادہ ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض لفظوں اور محاوروں کو نظم کرنے کے لیے ہی شعر کہے گئے ہیں، زبان سادہ اور طرز بیان میں سلامت نمایاں ہے۔

5-شائق

شائق تخلص اور ان کا نام محمد نذیر الدین حسن تھا۔ بعض تذکروں میں ''نظیر'' (غلطی سے) لکھا ہے۔ جو صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔ شیفتہ نے ان کے حال میں تحریر کیا ہے:

''شائق تخلص محمد نذیر الدین حسن ابن شاہ غلام محی الدین رومی، سرہندی، از شیخ زادگان بریلی است''۔10

اور قدرت اللہ شوق کے تذکرے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے والد غلام محی الدین اویسی تخلص کرتے تھے اور انھوں نے قرآن شریف کی منظوم تفسیر لکھی تھی۔ خود شائق کے بارے میں شوق کا کہنا ہے کہ:

''جوان سعادتمند طبع موزوں دارد''۔11

اور میر محمد خاں سرور نے لکھا ہے کہ:

''ساکن سرکار بریلی اصلش از پیرزادہ ہائے صوبہ سرہند کلامش مطبوع است''۔12

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ہجراں میں تری لاکھ ہوے جان کے ٹکڑے دیدار دکھا اب تو مری جان کے ٹکڑے
گلشن میں اگر ناز سے ہووے وہ خراماں غنچے بھی کریں اپنے گریبان کے ٹکڑے

اگر اس طرح سے ہمیشہ کو مری چشم غم سے تری رہے
تو مزارعوں کو یہ مژدہ دو کہ تمھاری کھیتی ہری رہے

یہ دل ہے بے سر وسامان تجھ بن پہنچ اولٹ پٹی دستار والے
نہ ہو اس حسن پر مغرور اے گل یہ سن لے، ہر کمالے را زوالے

لگے بطرح دل پر داغ ہجراں پڑے ہیں مجھ کو اب جینے کے لالے
کبھی تو وصل کا وعدہ وفا ہو کہاں تک دو گے جاناں ٹالے بالے
اگر شائق تو چاہے لذتِ عشق
بتوں سے بھاگ اور راہِ خدا لے

باری مرے طالع کی تو اب دیکھ بخوی کس چاند میں مہ رو سے ملونگا تو بتا رے
آرے بھی چلے غم کے ترے عشق میں سر پر جان آئی بہ لب اب تو مرے پاس تو آ رے

پہلی غزل سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو مشکل ردیفوں میں شعر کہنے کی قدرت ہے لیکن اس کی طبیعت کا میلان اس طرف نہیں ہے۔ چنانچہ آخری دونوں غزلوں کو غیر مردّف کہا جا سکتا ہے۔ شائق کی ان غزلوں میں مکالمے کا انداز پایا جاتا ہے اور اس کی محاورہ بندی سے دلچسپی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

6-نیاز

شاہ نیاز احمد بریلی کے نہایت معروف صاحب حال بزرگوں میں سے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مصحفی نے ان کے حال میں لکھا ہے کہ:

''مولوی نیاز احمد، نیاز تخلص کہ بندہ در ایام طالبعلمی شان عالمِ وجاہتِ ایشاں را دیدہ بلکہ چند روز میزبان ہم از ایشاں در شاہجہاں آباد خواندہ بود، زبانی صادر دارد، چوں طنطنۂ فصاحتِ من از لکھنؤ بہ گوش مبارک ایشاں رسیدہ غزلے کہ بعد تحصیل فنون فضایل خود گفتہ بودند از بریلی بہ فقیر نوشتند، چوں بر پشت تخت مشائخی در بریلی تمکن دارند، و در وجد و حال نام برآوردہ، از مضامین آں معنی ہمہ اوست می تراود''۔13

شاہ نیاز دہلی گئے تھے، وہاں قیام کیا تھا اور وہاں کے مذہبی اور علمی حلقوں میں غیر معروف نہیں رہ گئے تھے۔ اس کے باوجود شیفتہ نے ان کے بارے میں بس اتنا لکھا ہے:

''صوفی مشرب است۔ صافی طینت۔ در بریلی سکونت دارد''۔14

البتہ قطب الدین باطن نے یہ اطلاعات فراہم کی ہیں کہ:

''مرید حضرت میر ضیاء الدین بے پوری، صاحب کیف، اہل باطن،... عرصۂ
قلیل ہوا کہ شہر خوشاں آباد کیا''۔15

اور عبدالغفور خاں نساخ نے اپنے تذکرے میں تحریر کیا ہے کہ:

''شاہ نیاز احمد سرہندی ولد حکیم شاہ رحمت اللہ، باشندۂ بریلی، کسب باطن مولانا
فخر الدین دہلوی و شاہ عبدالعزیز بغدادی سے کیا تھا۔ دہلی میں تربیت پائی تھی۔
1250 ھ میں ماہ جمادی الثانی (اکتوبر 1832) میں ستتر برس کی عمر میں
وفات پائی۔ دیوان فارسی و اردو ان کا نظر سے گذرا''۔16

بریلی میں شاہ صاحب کا مزار ہے اور وہاں ہر سال عرس ہوتا ہے، ان کے کلام کا انتخاب
یہ ہے:

ملکِ خدا میں یارو، آباد ہیں تو ہم ہیں — تعمیر دو جہاں کی بنیاد ہیں تو ہم ہیں
اپنا ہی دیکھتے ہو تم بند و بست یارو — گرداد ہیں تو ہم ہیں فریاد ہیں تو ہم ہیں
دیکھا پرکھ پرکھ کر آخر نظر پڑا یہ — گر نقد ہیں تو ہم ہیں، نقاد ہیں تو ہم ہیں
پھیلا کے دامِ الفت گھرتے گھراتے ہم ہیں — گر صید ہیں تو ہم ہیں، صیاد ہیں تو ہم ہیں
شادی و غم یہ دونوں اپنی، ہی حالتیں ہیں — دلگیر ہیں تو ہم ہیں، اور شاد ہیں تو ہم ہیں
کاریگری کی اپنی یہ سب مصوّری ہے — تصویر ہیں تو ہم ہیں، بہزاد ہیں تو ہم ہیں
ہستی کے کاغذوں پر اپنی ہی دستخط ہیں — گر فرد ہیں تو ہم ہیں، اور صاد ہیں تو ہم ہیں
جو کچھ کہ یہ گڑھت ہے، سو ہے ہتوتی اپنی — فولاد ہیں تو ہم ہیں، حدّاد ہیں تو ہم ہیں
روئے زمیں کے اوپر، یا تند گرد بادی — گر خاک ہیں تو ہم ہیں اور باد ہیں تو ہم ہیں

تعلیم اور تعلم سب ہے نیاز اپنا
شاگرد ہیں تو ہم ہیں، استاد ہیں تو ہم ہیں

مجھے چین خواب عدم میں تھا، نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال — یہ جگا کہ شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا
وہ جو نقش پا کی طرح رہی تھی نمود اپنے وجود کی — سو کشش سے دامن ناز کی، اسے بھی زمیں سے مٹا دیا

شاہ نیاز پرانے مشاق شاعر تھے۔ عالمِ کیف و جذب میں جو اشعار زبان سے نکلتے تھے

دلوں پر اثر کرتے تھے۔ مشکل زمینوں میں بھی عجیب بیساختہ غزلیں کہی ہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ بریلی کے ان شاعروں نے اپنے کلام کو عموماً فارسی کی نامانوس اور پیچیدہ ترکیبوں سے آراستہ کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

7-عشرت

عشرت تخلص، غلام علی نام تھا۔ بریلی کے پرانے شاعروں میں سے تھے۔ ملک محمد جائسی کی پدماوت کے ترجمے کا کام جو ضیاء الدین عبرت ناتمام چھوڑ کر رحلت کر گئے تھے۔ اسے انھوں نے پورا کیا۔ شیخ مصحفی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''کثیر الکلام است، دیوان ہا و مثنوی ہائے معتد دوارد۔ عمرش تخمیناً قریب چہل سالہ خواہد بود''۔18

مولوی عبدالملک ممتاز نے ان کی وفات کی تاریخ کہی تھی اس طرح

ع ہائے میر عشرت

1236ھ (1821)

عشرت کی ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

شب فراق میں دل پر قلق ابھی سے ہے — سحر ہے دور، مرا رنگ فق ابھی سے ہے
ابھی لکھا بھی نہیں حال دل اے قاصد — ہوائے شوق میں اُڑتا ورق ابھی سے ہے
ہنوز دفن ہوا بھی نہیں ترا بسمل — کہ زلزلے میں زمیں کا طبق ابھی سے ہے
کسی نے شام کے آنے کو کیا کہا عشرت — کہ منہ پر آپ کے پھولی شفق ابھی سے ہے

اس غزل میں ردیف پر توجہ کی ضرورت ہے کہ اس کی وجہ سے مطلع سے مقطع تک تمام شعروں میں خاص قسم کی مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ غزل کسی داستان کے کسی مخصوص موقع کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہ صورتِ حال غزل کے مزاج کی ایک خاص انداز کی تبدیلی کی غماز معلوم ہوتی ہے۔

عشرت اپنے وقت کے مسلّم الثبوت استادوں میں سے تھے۔ بریلی میں ان کے کئی شاگرد تھے۔ ایک کا ذکر شیفتہ کے تذکرے سے نقل کیا جاتا ہے:

''آزاد تخلص، شیخ امیر الدین نام، تلمیذ غلام علی عشرت بریلوی بودہ''۔18

ان کا ایک شعر یہ ہے۔

بن ترے سیر چمن کو نہ گئے ہم ورنہ　　　خندۂ گل نے ہمیں خوب رُلایا ہوتا

ان کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

بدنام نہ ہوں کیونکر آزاد یہ فرماؤ　　　نامہ کا وہ پنچالا تُکّل میں لگاتا ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر الدین آزاد کبھی کبھی ظریفانہ شعر بھی کہہ لیتے تھے۔

(ب) نعت

معمولاً اردو کے شاعر خواہ وہ ہندو، سکھ یا عیسائی ہی کیوں نہ ہوں۔ اپنے دیوان وغیرہ کو حمد اور نعت سے شروع کرتے آئے ہیں۔ اس معمول کا فائدہ یہ ہوا کہ اردو میں اس صنف میں قطرہ قطرہ کر کے بہت بڑا سرمایہ جمع ہوگیا ہے۔ بریلی تو پھر صاحب دل مذہبی بزرگوں کا مسکن تھا اور وہاں نعت ومنقبت کے لیے ماحول زیادہ سازگار تھا۔ وہاں ایسے شاعر بھی ہوئے ہیں جنھوں نے اس میدان میں خصوصیت حاصل کرلی ہے۔

1 - لطف

مولوی لطف علی خاں لطف تخلص، بریلی کے رہنے والے ایک شاعر تھے۔ انھوں نے نعتیہ کلام پر مشتمل اپنا ایک دیوان مرتب کرلیا تھا۔ اس دیوان کا قلمی نسخہ جو چوالیس صفحوں پر محیط ہے اور ہر صفحہ پر پچیس سطریں ہیں، حیدرآباد کی آصفیہ لائبریری میں محفوظ ہے، اس دیوان کی ترتیب 1250ھ (1834) کے بعد میں عمل میں آئی تھی۔ دیوان اس شعر سے شروع ہوتا ہے[1]۔

ازل میں جوش پر آیا جو دریا حق کی رحمت کا ‌ ‌ ‌ سر احمدؐ پہ رکھا تاج عالم کی شفاعت کا

دیوان کو شاعر نے اس شعر پر ختم کیا ہے۔

مجھے امید قوی ہے یقین واثق ہے ‌ ‌ ‌ عجب نہیں اگر اے لطف بخش دے غفار

ظاہراً یہ مخطوطہ دیوان کے ابتدائی حصہ پر مشتمل ہے۔اس کے ترقیمے کی عبارت اس طرح ہے:

''ہزار شکر جناب کبریا کہ دیوان لطف تصنیف مولوی لطف علی خاں ساکن بریلی

کہ مشتمل بر نعت جناب رسول مقبول صلعم.....شانزدہم ماہ ربیع الثانی 1281ھ

میں تحریر ہوا......ے عشق محبوب سے سرشار کر

وَنُصلی عَلٰی محمد و آله وَأصحابه وَاهل بیته اَجمَعین''۔

عبدالغفور خاں نساخ نے لطف کے بارے میں تحریر کیا ہے:

''لطف تخلص لطف علی خاں باشندۂ بریلی۔ ان کا دیوان حضرت سرور اَنبیا

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں (نظر سے) گذرا''۔2

ان کی نعت کا نمونہ یہ ہے ؎

اچھا نہ ہو یارب کبھی بیمار محمدؐ — کم ہو نہ کبھی خواہش دیدار محمدؐ
مومن ہوا جس نے کیا اقرار محمدؐ — کافر ہوا جس نے کیا انکار محمدؐ
ہے سر میں ازل سے مرے سودائے محمدؐ — ہے دل میں خیال رخ زیبائے محمدؐ
ہے شوق فزائے دل وجاں روئے محمدؐ — روئے دل وجاں کیوں نہ رہے سوئے محمدؐ

2-نیاز

شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی کا ذکر گذشتہ اوراق میں کیا جاچکا ہے۔ وہ صاحب دل صوفی بزرگ تھے۔انھوں نے اپنی شاعری میں عموماً ہمہ اوست کے مضمون کو پیش کیا ہے اور کچھ نعتیں بھی کہی ہیں۔ان کی نعتیں دل سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، اور نہایت پُر اثر ہیں۔عرس کے موقع پر قوال ان کو بڑے ذوق وشوق سے گاتے ہیں۔ یہاں نمونہ کے طور پر چند شعر نقل کیے جاتے ہیں ؎

معمور ہورہا ہے عالم میں نور تیرا — از ماہ تابہ ماہی سب ہے ظہور تیرا
وحدت کے ہیں یہ جلوے نقش ونگار کثرت — گر برّ معرفت کو پاوے شعور تیرا
اگرچہ میں سیر بُتاں دیکھتا ہوں — ولے جلوۂ حق عیاں دیکھتا ہوں
ازل سے ابد تک جو کثرت ہے پیدا — سو وحدت کا دریا عیاں دیکھتا ہوں

نیاز کے دیوان میں کچھ کلام منقبت میں بھی موجود ہے مثلاً۔

خواجہ معین الدین کے گھر کو آج دھاتی ہے بسنت کیا بن بنا اور تج سجا مجرے کو آتی ہے بسنت
چھتیاں امنگ سے بھر رہیں، نیناں سے نیناں لڑ رہیں کس طرز معشوقہ سے اب جلوہ دکھاتی ہے بسنت

ناز وادا سے جھومنا، خواجہ کی چوکھٹ چومنا
دیکھو نیاز اس رنگ میں کیسی کہاتی ہے بسنت

(ج) ہولی و پھاگ

زبان اردو کا اصل اور قدیمی نام جیسا کہ معلوم ہے ہندی، ہندی یا ہندیہ وغیرہ ہے۔ اس زبان میں جو قدیم ترین شعری نمونے ملتے ہیں وہ سب ہندوستانی اوزان میں اور اسی سرزمین کی شعری اصناف کی صورت میں ہیں۔ صوفیائے کرام نے اس روایت کو آخر تک باقی اور جاری رکھنے کی مستحسن کوشش کی تھی۔

1 - نیاز

بریلی کے صوفی شاعروں میں شاہ نیاز احمد کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ حکیم قطب الدین باطن کے قول کے مطابق وہ:

> "صاحب کیف، اہل باطن، رموز دان حقائق ایزدی، پیر مغان میخانۂ جذب وسلوک، صوفی باصفائے سرمدی"۔1

تھے۔ شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں صاحب دیوان تھے اور اردو کی شعری روایات سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے اپنے اردو دیوان کے آخر میں "آغاز ہولی وغیرہ" کے عنوان سے ہندوستانی اصناف میں اپنی منظومات بھی شامل کی ہیں ان کی چند ہولیاں یہاں نقل کی جاتی ہیں ۔

مَن موہن جب چھب دکھلائی سرسوں پھولی آنکھوں میں
پیم کی زردی مکھ پر چھائی سرسوں پھولی آنکھوں میں
نیاز کہاتے مورے بھائی، ہوش گیا بیہوشی آئی
خودی گئی جب، ملی خدائی سرسوں پھولی آنکھوں میں

منہٗ

شیام سندر کی جب سدھ آئی سرسوں پھولی آنکھوں میں
کچھ کا کچھ ہے دیت دکھائی، سرسوں پھولی آنکھوں میں
ہر ہر بُند سمندر پچھا نوں ہر ذرۂ خورشید
واہ گرو جی خوب سُجھائی سرسوں پھولی آنکھوں میں
بندے کو اللہ بکھانوں قیدی کو بے قید
اُن کہنی منہ سے کہلائی سرسوں پھولی آنکھوں میں
اونچ نیچ میں فرق نہ جانوں دوئی ہوے پابند
وحدت میں پر ایسی چھائی سرسوں پھولی آنکھوں میں
نیاز آپ کو نہ جانوں، کجا عُمر، کِت زید
نگل گئی پربت کو رائی سرسوں پھولی آنکھوں میں

منہٗ

ہوری ہوے رہی احمدؐ جو کے دوار	نبی علی کو رنگ بنو ہے حَسن حُسین کھلار
ایسو انو کھو چتر کھلا ری رنگ بنو سنسار	نیاز پیارا بھر بھر جھڑ کے ایک ہی رنگ پچکار

منہٗ

صُمٌ بکمٌ عمی، ہو کے حق سے دھیان لگاؤ جی	بیرنگی کے سُرت جما کے اپنا آپ گماؤ جی
پاک منزہ پوری ہو سبحانی گُن گاؤ جی	نیاز گیا جب اللہ کو کون رہا فرماؤ جی

ان چند ہولیوں کے ساتھ شاہ نیاز کا ایک پھاگ بھی نقل کیا جاتا ہے۔

مَن لاگوات کیسے چھوٹے، لگ کسی پیم کی ڈوری

برہا آگن سلگت ہے تن میں، جل بھل جسم بھیوری
مدن مرار پھاگ کھیلت وہاں ہم سلگت جیسے ہوری
نیاز تہاری لین ہیں بلئیاں کر کیو موری

قاضی محمد سعید مرحوم نے ایک قلمی نسخے کے حوالے سے شاہ نیاز بریلوی کی ایک ٹھمری کا بھی پتا دیا ہے جس کا پہلا مصرع اس طرح ہے ع

من موہن نے چھب دکھلائی، سرسوں پھولی آنکھوں میں کے

حقیقت یہ ہے کہ یہ شاہ نیاز کی ایک ہولی کا پہلا مصرع ہے اور وہ ہولی شروع میں درج کی جا چکی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی ہولیاں مقبول رہی ہیں۔

ان مثالوں سے اتنی بات تو بخوبی ظاہر ہے کہ زبان اردو کے لیے نہ ہندوستانی اصل کی یہ شعری اصناف اجنبی ہیں۔ نہ ان کے اوزان و بحور غیر ہیں اور نہ ان کے الفاظ نامانوس ہیں۔ جن لوگوں نے اردو کی قدیم تصانیف کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اردو میں دوہے، چوپائی، کبت، کتھا وغیرہ کا چلن اس حد تک رہا ہے کہ بعض وقت ان کے لیے اسے مطعون بھی کیا گیا ہے۔ ہندوستانی اصل کی شعری اصناف میں طبع آزمائی کی اردو میں مسلسل غیر منقطع اور نہایت پایدار روایت موجود ہے، صوفی شاعروں نے نہایت ذہانت اور سلیقہ سے ان سبھی اصناف میں اپنے مسلک کے موافق مضامین اور خیالات نظم کیے ہیں۔ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے مقامی اصطلاحات کو اپنے معتقدات کے مطابق معنویت بھی عطا کردی ہے۔ ان کے اس کارنامے کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

(د) نثر

بریلی کے علاقے میں اردو نثر سے بھی قابل توجہ حد تک دلچسپی لی گئی تھی، چنانچہ وہاں مختلف قسم کی نثری کتابیں مل جاتی ہیں۔ یہاں ان میں سے صرف بعض کا مجملاً تعارف کرایا جاتا ہے۔

1- قصہ سحر البیان۔

غلام علی عشرت پدماوت کے قصے کو اردو میں نظم کر چکے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے ریاض الحسین کے نام سے ایک مذہبی مثنوی تصنیف کی تھی۔ آخر عمر میں انھوں نے اپنے انتقال سے کوئی چھ برس پیشتر اردو نثر میں شہزادہ یوسف شاہ اور شہزادی حُسن آرا کے عشق کا قصہ لکھا تھا۔ اس کے شروع میں تحریر کیا ہے:

> ''اے یاران سخن طراز و سخن دانان نکتہ پرداز، ہرچند یہ قصہ کہ مسمّٰی بہ داستان سحر البیان ہے، بے بود و بے نمود، بے شہود وجود، فی الحقیقت شد و بود کی نہ رکھتا تھا لیکن یہ خیال طبع آرائی و زبان دانی آرای، فصاحت لسانی و بلاغت بیانی بہ عبارت پوچ و بے معانی لاشے لایعنی، بپاسِ خاطر عاطر و تفریح مزاج دوستان جانی و جمیع سخن رسان و اہل معانی کے ساختہ و بے ساختہ تحریر و تقریر کیا اور چہرۂ دروغ حقیقت کو گلگونہ فروغ و فصاحت لفظی و نقش و نگار بلاغت معنوی سے ایسا

آراستہ و پیراستہ کر کے جلوہ نمایش کا دیا کہ دل و دیدۂ نظر و نگاہ خاص و عام جمہور
انام کو حُسن با کمال بے زوال منظور ہوا''۔1

عشرت کے اس قصے کا سال تالیف ''فرح بخش دلہا'' اور ''فصیح بلیغ'' سے برآمد ہوتا ہے،
یعنی 1815 میں مکمل ہوا۔ 1230 1230

قصہ کے نام سے قطع نظر عشرت نے میر حسن کی مشہور مثنوی کے بہت سے اشعار بھی جابجا اور حسب موقع نقل کیے ہیں۔ اس نے الف لیلہ سے بھی بخوبی استفادہ کیا ہے۔ اقتباس بالا میں ہم قافیہ فقرے اور مرکب ترکیبیں بہ کثرت لائی گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے عبارت نہایت مصنوعی اور پُر تکلف ہوگئی ہے۔ اصل قصہ کی زبان میں خطیبانہ انداز اختیار کیا گیا ہے اور وہاں عبارت کسی قدر صاف ہے البتہ محاورہ بندی اور ضلع جگت وغیرہ کا اہتمام معلوم ہوتا ہے، ڈاکٹر سہیل بخاری نے اس قصہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''عشرت (قصہ سحر البیان میں) فنون و اشیا کے ناموں کے علاوہ واقعات حرکات اور صفات وغیرہ کے لوازمات میں پے در پے بیان کرتے چلے جاتے ہیں..... منظر نگاری میں بھی عشرت نے کمال دکھایا ہے۔ وہ جس منظر کو بیان کرتے ہیں اس کی ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں،..... موقع موقع سے اردو فارسی کے اپنے پرائے اشعار بہ کثرت پیش کیے ہیں جن میں قطعات، غزلیات، مثنویات اور ابیات سبھی کچھ ہیں۔ ان کی بدولت قصے میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ میر حسن کی طرح آتیاں جاتیاں جیسے الفاظ بھی بے تکلف استعمال کیے ہیں''۔1

اس داستان کا قصہ اس طرح ہے کہ دریائے نیل کے کنارے مُلک مصر میں ایک نہایت دلکش اور آباد شہر حُسن آباد تھا جس کا فرماں روا یعقوب شاہ تھا۔ دُرویشوں اور خدا پرستوں کی دعاؤں سے اس کے یہاں ایک بیٹا یوسف شاہ پیدا ہوا۔ جب وہ بارہ تیرہ برس کا ہوا تو بہرہ مند وزیر کے ساتھ شکار کے لیے گیا۔ اس نے ایک ہرن کا پیچھا کیا اور بھٹک کر شہزادی حُسن آرا کے قلعۂ طلسمات میں جا پہنچا۔ شہزادی پہلی نظر میں یوسف شاہ پر عاشق ہوگئی۔ اس موقع پر مصنف نے لکھا ہے کہ:

''جس وقت یوسف شہزادہ پیچھے اس غزال نونہال رعنا کے گھوڑا مارے دبائے

سَر پٹ ٹیک جھپٹ جھپٹکے ہوئے چلا گیا، تمام فوج لشکر کے سوار و پیادہ امیر و وزیر،
صغیر و کبیر، چھوٹے بڑے، ادنا اعلا جا بجا حیران و پریشان، سرگرداں، نالاں،
گریاں ہو کے ڈھونڈنے لگتے ہیں اور درد و غم اندوہ الم میں غلطاں پیچاں، پیچاں
غلطاں سرگرم تلاش متلاشی دو چار گھڑی دن سے تمام رات پھرے کہ اس بیابان
میدان کوہستان کا بارہ بارہ چوبیس کوس تک ادھر ادھر دائیں بائیں...کوچہ تکیہ
باغ سرائے چھان مارا لیکن نام و نشان اُتا پتا اس گم ہوئے یوسف لاثانی کا پتا نہ
پانا تھا نہ پایا اور نہ ملنا تھا نہ ملا''۔

اس اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرادف الفاظ کو جمع کر کے مصنف نے زبان پر اپنی قدرت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

رامپور کی رضا لائبریری میں اس قصہ سحر البیان کے دو نسخے موجود ہیں لیکن ان کا سالِ کتابت معلوم نہیں ہو سکا ہے۔

2-اخبارِ حسن

حافظ محمود خاں شیرانی کے اردو مخطوطات کے ذخیرے میں ایک مخطوطے کے بارے میں اندراج اس طرح ہے:

''اندراج نمبر 4444، اخبارِ حسن در حالات رووساء ملک ....از محمد حسن رضا
خاں خلف محمد کامگار خاں ولد محمد اللہ یار خاں ولد حافظ رحمت خاں نوشتہ
1250ھ (1834)''۔2

اس کتاب کے مصنف جیسا کہ مذکورہ اندراج سے ظاہر ہے حافظ رحمت خاں کے اخلاف میں سے تھے۔ انھوں نے اردو نثر میں کئی کتابیں لکھی تھیں، پہلی کتاب یہی اخبارِ حسن ہے۔3 اس کی تالیف کا سال مؤلف نے اس طرح نظم کیا ہے۔

بہر اخبارِ حسن ڈھونڈا جو سال   غیب سے آئی ندا تاریخِ حال

1250ھ (=1834)

مؤلف نے کتاب کو دو چمنوں میں اور پھر ہر چمن کو چار چار روشوں میں تقسیم کیا ہے، تفصیل

اس کی اس طرح ہے:

چمن اول مشتمل چار روش پر

روش اول: حسب ونسب قوم افغان اور ذکر داؤد خان میں،

روش دوم: ذکر حالات والا صفات نواب علی محمد خان بہادر میں،

روش سوم: ذکر نواب حافظ الملک بہادر میں،

روش چہارم: ذکر نواب دوندے خان بہادر اور بخشی محمد سردار خان اور فتح خاں خانساماں میں

چمن دوم بھی چار روش پر

روش اول: ذکر نواب فیض اللہ خان بہادر میں،

روش دوم: ذکر نواب محمد علی خان بہادر اور نواب احمد علی خان بہادر میں،

روش سوم: ذکر نواب نجیب الدولہ بہادر میں،

روش چہارم: ذکر رئیسانِ فرخ آباد میں۔

کتاب کا آغاز اس عبارت سے ہوا ہے:

''حمد بیحد اور ثنائے بے عد ذات پاک قدسی صفات کی اور ستایش بے غایت اور نیایش بے نہایت ایزد بے مثال کی، ایسی نہیں کہ زبان انسان سے سلک تقریر اور تحریر میں آئے''۔

اور خاتمہ ان جملوں پر کیا گیا ہے:

''اور تا ایں وقت نواب حشمت جنگ مسند ریاست اور نواب احمد یار خاں عہدۂ نیابت پر ممتاز ہیں، فقط تمام شد''۔

کتاب کے آخر میں خاتمے کی عبارت اس طرح ہے:

''ایں نسخہ داستان ہائے طلسم، بیان سفیران دشت عدم اور رحیلان میدان قدم کا واسطہ حسرت عمر گذشتہ اور عزت ایام آیندہ، ارباب بینش کہ آیۂ کریمہ: ﴿فاعتبروا یا اُولی الابصار﴾ سے مستفید اور بہرہ مند رہیں اور بہ جہت یادگار بندۂ گنہگار

نحیف العباد محمد حسن رضا خاں حسب الارشاد فجستہ نژاد صاحب والا مناقب عالی

مراتب مسٹر تھیوفلس بارلو صاحب بہادر کے اہتمام و انصرام پذیر ہوا"۔

کتاب کی عبارت اس زمانے کے رواج کے مطابق تشبیہ اور استعارہ سے پُر ہے اور عربی فارسی کے الفاظ سے گراں بار ہے چنانچہ ذیل کے اقتباس میں ہے:

"فتح خاں خانِ ساماں سابق میں قوم برہمن تھے، عہد داود خاں میں بہ عہد خورد سالی بہ حلیۂ اسلام آراستہ اور بہ زیور دیں پیراستہ ہوے، اور ہمیشہ شفقت اور محبت داود خاں کی فتح خاں پر بہ درجۂ کمال مصروف اور مبذول رہی، جب کہ نواب عالی جناب علی محمد خان بہادر زیب افزا اور رونق پیرا مسند امارت و ریاست پر ہوے، فتح محمد خاں کو بہ نظر لیاقت و قابلیت، بہ تصور اعتماد و اعتبار کے عہدۂ جلیل القدر خان سامانی خاص پر مقرر اور منصوب فرمایا۔ تا حیات والا صفات نواب غفراں مآب خان ممدوح نے اس طور کا بہ دیانت اور امانت اور بہ جزم اور ہوشیاری انصرام اور انجام کیا کہ مورد تفقدات بیکراں اور مصدر تفضلات بے پایاں کے ہوے، شہرہ نیکنامی و خوش طینتی خان سامان ممدوح کا ہر ملک و دیار اطراف و اکناف میں پہنچا"۔

دیکھا جائے تو اس میں ستائشی کلمات کا استعمال زیادہ کیا گیا ہے اور ان میں عموماً ہم قافیہ الفاظ و تراکیب لانے کی شعوری کوشش کی گئی ہے بایں ہمہ عبارت میں سلاست کا وصف معلوم ہوتا ہے۔

اخبار حسن کا جو نسخہ رضا لائبریری میں ہے وہ مولوی مہدی علی خاں کے ہاتھ کا چھپا سی اوراق پر لکھا ہوا ہے۔ سال کتابت معلوم نہیں۔

3- مصدر فیوض

نذیر الدین شائق نے جن کا حال اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اردو نثر میں ایک رسالہ "مصدر فیوض" کے نام سے لکھا تھا، 1261ھ (1845) میں عصمت اللہ نامی ایک شخص نے اس رسالے کی ایک سے زائد نقلیں تیار کی تھیں، علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں ان میں سے دو محفوظ

ہیں۔ پہلے نسخہ کے بیچ کے کچھ صفحے غائب ہیں اور اب اس میں کل سینتالیس ورق ہیں۔ اس کی ابتد ان کلمات سے ہوئی ہے:

"......اسمیہ کے اور ہندی جملہ اسمیہ کے ساتھ جدول سے معلوم کرو گے"۔

اور اس رسالے کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا ہے:

"پڑھیں جو فاتحہ شائق پہ وہ بھی پاویں مراد"۔5

دوسرا نسخہ مصدر فیوض کا ناقص الاول ہے اور اب اس میں چالیس ورق ہیں۔ ابتدا تو اس کی وہی ہے البتہ خاتمہ اس عبارت پر ہوا ہے:

"...... چند قاعدہ ضروری اس مختصر میں درج کیے جو ان کو ضبط کریگا باقی قاعدے اور کتابوں سے آپ نکال لیگا اس واسطے زیادہ طول نہیں دیا"۔6

ایک تیسرا نسخہ اور بھی ہے جو ناقص الآخر ہے اس لیے کاتب کا نام معلوم نہیں۔ اب اس میں 62 ورق ہیں۔ اس کی ابتدا اس شعر سے ہوئی ہے۔

کروں پہلے اسم خدا وردِ جاں ۔۔۔ کیے فعل اور حرف جس نے عیاں 7

(2)مرادآباد

(الف)غزل ومخمس 29

1-حیرت میر مراد علی 30

2-خاکسار غلام محی الدین خاں 31

3-رغبت جلال الدین 31

4-حسرت ذوقی رام 32

5-صنعت کریم الدین 33

6-ظریف لالا بنی پرشاد 37

7-حریف لالا چنی پرشاد 39

8-ذوقی ذوقی رام 39

2

1-زماں سید محمد زماں 41

2-عارف میر عارف علی 41

3-کلیم شیخ کلیم اللہ 42

4-مروت میر صغیر علی 43

(ب)مثنوی وقصیدہ	47
1-صنعت شیخ کریم علی	47
2-بیخود ہت لعل	49
3-علی نواب علی محمد خاں	49
4- سکھ فوجی	50
(ج)مذہبی نثر	51
.1-علی محمد خاں	51
(د)قصہ وکہانی	55
1-مروت میر صغیر علی	55
2-غلام علی نجیب	57

(1)

غزل و مخمس

روہیل کھنڈ کی تقسیم کے وقت مراد آباد کا علاقہ مع متعلقات دوندے خاں کے حصے میں آیا تھا۔خلیفہ معظم نے ان کی اور ان کے بیٹے عظیم اللہ خاں کی بہادری کا ذکر کیا ہے۔

تھا وہاں خان دوندے کا کنبہ کھڑا　　تھا مضبوط لڑنے پہ چھوٹا بڑا
اور۔۔۔

عظیم اللہ خاں، خان دوندے کا پور　　کیا اس نے پلٹن کے اوپر فتور

ان جانباز دلاوروں کا وقت علاقے کے استحکام میں بسر ہوا۔علم وشعر کی کوئی مستحکم روایت قائم کرنا ان کے لیے غالباً ممکن نہیں ہو سکا تھا۔

نواب سعادت علی خاں کے آخری وقت میں مراد آباد میں نواب عظمت اللہ خاں فاروقی کے بیٹے، پوتے معزز، موقر اور موثر حیثیت سے رہ رہے تھے۔ان کے زیر اثر وہاں علم ودانش کی ترویج کے سلسلے شروع ہوئے۔قدرت اللہ شوق کے تذکرے میں جن کا تعلق مراد آباد کے خطے سے تھا وہاں کے جن شاعروں کا مذکور ہے ان میں سے کچھ یہ ہیں:

> ''خنداں علی محمد خاں، برادر خورد محمد میاں کہ از نبایر نواب عظمت اللہ خاں مراد آبادی است، غلامے است در قالب انسانی طبع رسا فکر بجادارد''۔1

"شوریدہ، محمد شجاع الدین خاں خلف وجیہ الدین خان نبیرہ نواب عظمت اللہ
خاں طبع مناسب وذہن صایب دارد"۔ 2

"صوفی محمد اعظم از قربائے نواب عظمت اللہ خاں، فکر صایب دارد"۔ 3

"عبرت احمد الدین خاں خلف رستم ہند قطب الدین خاں نبیرہ عظمت اللہ خاں،
بسیار قابل، دیوان ضخیم دارد"۔ 4

یہ سب رواج زمانہ کے مطابق شاعر بھی تھے، غزلیں کہتے تھے اور اپنے وقت کے باکمالوں میں گنے جاتے تھے۔ ان کے اثر سے اس جوار میں غزل گوئی کو فروغ حاصل ہوا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بعد کے زمانے میں لکھے جانے والے شعرائے اردو کے بیشتر تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے ہی نئی نسل کو اپنے معیار و مذاق کے مطابق تعلیم اور تربیت دی تھی اور انھیں کی سرپرستی اور کفالت میں رہ کر اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ یہی اپنے وقت اور علاقے کے میر و مرزا تھے اور انھیں بزرگوں کے شوق اور ان کی محنتوں کے پروردوں میں سے جنھوں نے نام کما لیا تھا، بعض کے حالات یہاں مجملاً لکھے جاتے ہیں۔

1- حیرت

ان کا نام میر مراد علی اور تخلص حیرت تھا۔ مراد آباد کے باشندے تھے، شیفتہ کا کہنا ہے کہ:

"پے تجارت کوہستان رفتہ بود، ہم در آنجا درگذشت"۔ 5

اور سعادت خاں ناصر نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"خوش فکر، پاکیزہ طبیعت، میر مراد علی شاہ تخلص حیرت، ساکن مراد آباد،
شاگرد شوق"۔ 6

یہ بات قابل توجہ ہے کہ رامپور کی طرح مراد آباد میں بھی قدرت اللہ شوق ہی کے تلامذہ نے اس علاقے میں بھی شعر گوئی کی محفلیں آراستہ کی تھیں اور انھیں کے طرز فکر و بیان کو اس علاقے میں بھی رواج حاصل ہوا تھا۔ حیرت کے چند شعر یہ ہیں۔

سمجھ کے دیکھا تو بیجا تھا سب گلہ دل کا
یہ چشم تر نے ڈبویا معاملہ دل کا

کہاں ہے شیشۂ ے محتسب خدا سے تو ڈر
مری بغل میں جھلکتا ہے آبلہ دل کا

سرشک وآہ ہے، سوز جنوں ہے، وحشت ہے — عجب جلوس سے جاتا ہے قافلہ دل کا
نظر آیا یہ جہاں نقش بر آب آخر کار — تاج سر پر سے گرا مثل حباب آخر کار
سادہ رویوں کی دلا مہر ومحبت پہ نہ جا — منہ پہ دیویںگے تجھے صاف جواب آخر کار
ہم اس بزم سے یوں پُر ارمان نکلے — جوانی میں جس طرح سے جان نکلے

حیرت لفظی اور معنوی صنعتوں کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں۔ مشکل ردیفوں اور تنگ قافیوں میں بھی غزلیں کہہ کر اپنی قدرت کلام کا اظہار کرتے تھے۔ ساتھ ہی زبان کے لطف کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

2- خاکسار

یہ بھی مرادآباد کے رہنے والے اور قدرت اللہ شوق کے شاگرد تھے۔ محسن نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''خاکسار، زبان آور دوزبان، غلام محی الدین خاں مرحوم، خاکسار مرادآبادی، شاگرد قدرت اللہ شوق''۔3

خاکسار کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

تکیۂ مخمل ہے گرچہ منعماں کے زیرِ سر — ہاتھ اپنا بس ہے یاں، مجھ ناتواں کے زیرِ سر

زبان میں قدامت کا اثر نمایاں ہے چنانچہ پہلے مصرع میں منعماں اور دوسرے میں ''بس ہے یاں'' سے ظاہر ہے شاعر کو معنی آفرینی کا بھی شوق معلوم ہوتا ہے۔

3- رغبت

یہ بھی بہ گمانِ غالب نواب عظمت اللہ خاں فاروقی کے اقربا میں سے تھے۔ شیخ مصحفی نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

> ''جلال الدین خاں خلف شجاع الدین خاں، رغبت تخلص، ساکن مرادآباد، از تلامذۂ ذوقی رام حسرت مخلص مُسِن و نابینا است، شوق شعر ونثر نویسی ہر دو بہ شدت دارد، عمرش شصت سال رسیدہ''۔8

افسوس ہے کہ رغبت کی نثر نویسی کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہوسکی ہے۔ البتہ ان

کے یہ دو شعر مصحفی نے نقل کیے ہیں۔

نقطۂ صفر ہے اس ماہ کا خالِ گردن　　جس نے دو چند کیا حُسن و جمالِ گردن

ہموا یان چمن تم تو کرو سیرِ بہار　　ہم پھر آئیں گے قفس سے جو رہائی ہوئی

پہلا شعر معنی آفرینی کی اچھی مثال ہے اور دوسرے شعر میں ضرب المثل بن جانے کی سب خوبیاں موجود ہیں۔ زبان کی لطافت اور بیان کی خوبی و بیساختگی داد طلب ہے۔ رغبت کے کلام کی شہرت تو دہلی تک پہنچ گئی تھی لیکن خود رغبت کے نام سے دہلی اور آگرے والے ناواقف تھے۔ شیفتہ کے تذکرے میں ہے:

''رغبت تخلص شخصے ست از اہل مراد آباد، از نامش اطلاع دست بہم ندارد۔

ایں بیت از دست 9

جس کو اپنی نہیں پروائے جگر سوزی کچھ　　اس کی ہر بات پہ کیوں جی کو جلاتے پھریئے''

یہ شعر بھی بے ساختہ اور بہت خوب ہے لیکن خود شاعر کے نام کی طرف سے تذکرہ نویس کی بے خبری توجہ طلب ہے۔ باطن نے بھی اس کے بارے میں لکھا ہے:

''لا اعلم مراد آبادی'' ۔10

رغبت صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کے دیوان کا قلمی نسخہ رامپور میں محفوظ ہے۔

4-حسرت

روہیل کھنڈ (رامپور، بریلی، مراد آباد وغیرہ) کے شاعروں کے ذکر سے عموماً دتی والوں کے تذکرے یا تو خالی ہیں یا پھر ان سے دتی کے تذکرہ نویسوں کو کماحقہٗ واقفیت حاصل نہ ہونے کا اعتراف ہے۔ ظاہراً اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اس علاقے کا دہلی سے براہ راست رابطہ قائم نہیں ہوا تھا۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ یہاں کی نظم و نثر دہلی کی زبان و بیان سے ایک حد تک غیر متاثر رہ گئی تھیں، البتہ بعض استثنائی صورتیں بھی رہی ہیں۔ مثال کے طور پر رغبت کے استاذ ذوتی رام حسرت کا تعلق دہلی سے تھا چنانچہ لالہ سری رام نے بھی لکھا ہے:

''منشی ذوتی رام حسرت، اگروال ویش، قدیم رئیس شاہجہاں آباد، زیادہ تر فارسی میں شعر کہتے تھے، اور صاحب دیوان تھے'' ۔11

اور قدرت اللہ شوق کے تذکرے میں ہے:

''ذوقی رام حسرت، قوم بقال، متوطن شاہجہاں آباد، از مدتے بہ سبب افراط وتفریط روزگار در بلدۂ مراد آباد سکونت دارد، جوانِ قابل، دردمند، خوش سلیقہ است، فاماً گردش فلکی با او مساعد نیست، اکثر اشعار فارسی خوب می گوید، از چندے بہ سبب تحریک بعضے صاحبان در شعر ریختہ ہم چند غزل موزوں نمودہ، ذہن رسا و فکر بجا دارد''۔12

مراد آباد کے زمانۂ قیام کے اس شخص کے کچھ شعر یہ ہیں۔

محبت کے نشہ والوں کو میخانے سے کیا نسبت — پئیں جو خون دل ہی، ان کو پیانے سے کیا نسبت

نہ حسرت کی نصیحت میں کرو اوقات کو ضایع — تمھیں اے غافلو ہے ایسے دیوانے سے کیا نسبت

قبا پہنے اگر وہ سیمبر سبز — نہ ہو سرو دمن زنہار سر سبز

ترا رخ خط سے دونا خوشنما ہے — کھلے ہے خوب رنگ سرخ پر سبز

عیب معشوق کا کب اہل وفا کہتے ہیں — خوب نہیں کرتے جو خوبوں کو بُرا کہتے ہیں

وقت پا کر کبھی تجھ سے کہیں اپنا احوال — تو سُنے یا نہ سُنے ہم تجھے کیا کہتے ہیں

نصیب ایسے تو ناکارہ کم کسی کے ہوے — کیا کسی کو نہ اپنا، نہ ہم کسی کے ہوے

شاعر نے محنت سے یہ شعر کہے ہیں اور اچھے مضامین تلاش کیے ہیں۔ تنافر صوتی وغیرہ کی صورت بھی پیدا ہوگئی ہے، مثلاً ''معشوق کا کب'' وغیرہ میں ہے۔ مراد آباد میں دہلی کے طرز شعر گوئی کا تھوڑا بہت جو اثر معلوم ہوتا ہے اس میں ذوقی رام حسرت کی شاعری کو خاصی حد تک دخل رہا ہے۔

5-صنعت

مراد آباد کے اس زمانے کے شاید سب سے زیادہ معروف شاعر یہی تھے، مصحفی نے اپنے تذکرے میں ان کی ایک غزل ان تعارفی کلمات کے ساتھ لکھی ہے:

''کریم الدین صنعت تخلص، ساکن مراد آباد، شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق، عمرش قریب چہل و پنج سال خواہد بود، از دست''13

نہ مونس نہ ہمدم، نہ ہم یار ٹھہرے — فقط غم ہی کھانے کے غمخوار ٹھہرے
یہ مانا کہ ہیں آپ دلبر ولیکن — ہمارا ہی دل لے کے دلدار ٹھہرے
کہیں کیا نصیبوں کی خوبی، ہمیں کو — طرح دیکھے اب تم طرحدار ٹھہرے
یہی چاہیے مرحبا تم ہماری — مٹا کر نمود، اب نمودار ٹھہرے
پئیں خون دل ہم غم اس کے میں ہردم — وہ دمساز دم دیکھے خونخوار ٹھہرے
سُنا جبکہ حاضر ہے صنعت تو بولے — کہ کہہ دو اُسے زیر دیوار ٹھہرے

ہر شعر میں قافیہ کی رعایت سے کوئی لفظ نیا لا کر مضمون پیدا کیا ہے اور اپنے تخلص کی مناسبت سے شاعری کو واقعی صناعی بنا دیا ہے۔ شیفتہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''در صنائع زرگری استاد، از دانہ منزید، اوقات عزیز بہ عبادت می گزراند، بارہا بہ دہلی آمدہ، اما فقیرش نہ دیدہ ام''۔14

حکیم باطن نے ان کا نام ''میاں کریم اللہ'' لکھ دیا ہے جو غلط ہے۔15 انھوں نے صنعت کا یہ مطلع نقل کیا ہے۔

قتل ناحق کیا تو نے جسے تلوار گھسیٹ — لاش کو اس کی نہ ظالم سر بازار گھسیٹ

سعادت خاں ناصر نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''صاحب جاہ و ثروت، شیخ کریم الدین صنعت، مسکن اس کا رامپور، شاگرد شوق''۔16

اس میں نام، تخلص اور تلمذ کے سوا جو کچھ ہے غیر صحیح ہے۔ امیر مینائی نے البتہ ان کے بارے میں مفید اطلاعات قلمبند کی ہیں:

''صنعت شیخ کریم الدین ولد شیخ مخو، صنایع زرگری میں کامل تھے اور ساتھ ان مشاغل کے عابد و زاہد ذاکر و شاغل تھے، شاعر رنگین طبیعت و صاحب طبیعت و صاحب ذوق تھے، شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق کے تھے، پچھتر برس کی عمر تھی کہ تیسری محرم کو 1265ھ (نومبر 1848) میں انتقال کیا''۔17

لالا سری رام نے ان کے حال میں بعض باتیں مختلف لکھی ہیں:

''شاگرد قدرت اللہ شوق و جرأت، علاوہ دیوان مخمسات و غزلیات وغیرہ ایک رسالہ ان کا علم سیاق میں بھی ہے، ستر برس کی عمر میں 1263ھ میں مرے، انوار حسین تسلیم نے کہا

ع کہا، استاد خمسہ کا موا ہاے

زبان شستہ اور فصیح تھی''۔18

اس مادۂ تاریخ میں ''کہا'' شامل نہیں ہے، اور موجودہ صورت میں اس سے 1255 کے عدد برآمد ہوتے ہیں۔ البتہ اگر یہ اس طرح ہو:

استاد خمسے کا موا ہے

1265

تو صحیح سال کے عدد برآمد ہو جائیں گے اور یہی سال امیر مینائی نے بھی لکھا ہے۔ 1263ھ کو صنعت کا سال وفات کہنا غالباً صحیح نہیں ہے۔

صنعت کا کلیات مطبع منشی نولکشور لکھنؤ میں 1294ھ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ صنعت کے دیوان کے دو قلمی نسخے رامپور میں ہیں۔ ان میں سے ایک خود صنعت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ اور کانپور وغیرہ مقاموں پر خمسہ گوئی کا خاصا چلن ہو گیا تھا۔ آگرہ میں بھی نظیر اور ان کے شاگردوں کی بدولت اس صنف کو رواج حاصل ہو چکا تھا۔ ایسے میں اگر صنعت نے بھی اپنا دیوانِ مخمسات مرتب کر لیا ہو تو تعجب کی کوئی وجہ نہیں۔ اسی دیوان مخمسات کی وجہ سے تسلیم نے ان کو ''استاد خمسہ کا'' کہا ہے۔ علم سیاق میں صنعت کے تالیف کردہ رسالے کے بارے میں البتہ کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی ہے۔

امیر مینائی نے صنعت کے ایک خمسہ کا بند اس طرح نقل کیا ہے۔

ہر جگہ تم نے مچل کر، دل ہیں، جس تس کے لیے　　کیا اجاران کا پڑے گا، لیتے ہو کس کے لیے

بن دلا سا میں نہیں دینے کا، تم جس کے لیے　　کہتے ہو گھر کو نہیں جانے کا ان اس کے لیے

اور بھی للچائے تم کچھ مفت کا دل دیکھ کر

صنعت شعر کے شوقین اور قدر شناس تھے۔ انھوں نے لمبی عمر پائی تھی، اور بہادر شاہ ثانی کا

دور بھی دیکھا تھا۔ اُس وقت بنگالہ سے دہلی تک قاضی محمد صادق خاں اختر کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ صنعت نے ان کے ایک دلچسپ قطعہ کی تخمیس کی تھی۔ وہ درج ذیل ہے۔

کاندھے پہ شال، ہاتھ میں سبحہ، رومال تھا　　مندیل سر پہ گول تھی، پکڑے ہوئے عصا
پاؤں تلک تھے پہنے ہوئے جبہ ریا　　کل شیخ بن کے مجتہدِ عصر ساقیا
دکھلا کے سبز باغ عذاب وثواب کا

دیکھا مجھے تو کتنے کنایہ کیے بہ طنز　　پھر آپ کو بھی پردہ میں- کچھ کہہ اُٹھے بہ طنز
سمجھا میں یعنی کہتے ہیں عاصی مجھے بہ طنز　　کہنے لگے ز راہ تبختر دلے بہ طنز
معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا

سُن کر یہ بات شیخ کی میخوار جو کہ تھے　　نام سے ہو کے دل میں وہ حیران رہ گئے
کچھ بن نہ آئی بات تو خاموش سب ہوئے　　میں نے کہا کہ ہم بھی ہیں یہ خوب جانتے
پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

ہر آن کام ہوتا ہے اس عمر میں زبوں　　اس واسطے کو ان دنوں شیطاں کے بس میں ہوں
افعالِ بد سے اپنے ہوں ہر چند سرنگوں　　گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
لیکن نہ کیجیے مجھے مورد عتاب کا

نوے برس میں فہم تمہارا ہوا درست　　کہنا زباں سے آپ کا ہے سب بجا درست
پر اب بھی جانیں آپ کو ہم پارسا درست　　تقوا ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست
اور تب یقین آپ کے ہو اجتناب کا

بارش ہو اور ابر بھی چھایا ہو چار سو　　پھولا تمام باغ ہو، جاری ہو آب جو
کرتا ہو اختلاط کی وہ تم سے گفتگو　　مے اور کنج باغ ہو، ساقی ہو ماہ رو
اور کوئی دھاں مخل نہ ہو باعث حجاب کا

اس وقت اس نے جام صراحی سے ہو بھرا　　پینے سے اس کے آنکھوں میں آیا ہو جب نشا
مستانہ اختلاط کرے تم سے برملا　　گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوق بے حیا
یہ ریش، جس پہ جلوہ ہے رنگِ خضاب کا

کھا کر گزک وہ، اور سنگھا کر کے اپنا منھ ‏ ‏ ‏ چتون بدل کے، ناز دکھا کر کے اپنا منھ
مستانہ شوخ وشنگ بنا کر کے اپنا منھ ‏ ‏ ‏ کھینچ اس کو اور منہ سے ملا کر کے اپنا منھ
دے ذایقہ زباں سے دہن کے لعاب کا
اور یہ کہے کہ میں ترا تابع ہوں بن دیئے ‏ ‏ ‏ بخشش پہ اس کی ہم نے ہیں لاکھوں گنہ کیے
اب چھوٹنے کا تو نہیں بے جام پیے ‏ ‏ ‏ منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیے
گر پی نہ جاے جلد یہ پیالہ شراب کا
ممکن نہیں کہ آپ کو عقبا کا دھیان ہو ‏ ‏ ‏ اس وقت خاطر اس کی سے جو کچھ کہے کرو
بس یہ کہے بن آے کہ حاضر ہیں جو کہو ‏ ‏ ‏ اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو
گر خوف آپ کیجیے روزِ حساب کا
اسباب عیش جس کو میسر ہوں یہ تمام ‏ ‏ ‏ ایسی جگہ میں باز رہے جو کہ نیک نام
تاثیر ہم پہ کرتا ہے اس شخص کا کلام ‏ ‏ ‏ اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ وشاب کا

خمسہ کہنے کے لیے مشق ومزاولت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے شاعر کی قدرت کلام اور قوت فکر کا بھی پتا چلتا ہے۔ صنعت خمسہ کے استاد تھے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مراد آباد میں اس زمانے میں کچھ اور شاعر بھی اس صنف سے دلچسپی لے رہے تھے۔

6-ظریف

شیخ مصحفی نے امروہہ کے اپنے ایک شاگرد کے تعارف میں لکھا ہے:

"لالہ بنی پرشاد ظریف برادر خورد لالہ چنی لال حریف، از عمر دوازدہ سالگی موزوں طبع افتاد ...شعر بہ متانت وفصاحت می گوید، ومسدس ومخمس عاشقانہ وآبدار ....میگوید، عمرش تا الی الیوم بست ویک سالہ خواہد بود ہر چہ گفتہ دمی گوید بہ فقیر نمودہ ومی نماید"۔19

اس مقام پر یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لالہ سری رام کا تذکرہ وہ ہے جس کے بارے میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ:

"ہندو بھائیوں کو جو ابھی تک گوشۂ گمنامی میں پڑے تھے ڈھونڈ نکالا اور ان پر نہایت درجہ کا احسان کیا ہے، (کہ اس تذکرہ میں ان کو جگہ دی ہے)"۔20

اور مسلمانوں کے لکھے ہوئے تذکروں خصوصاً آب حیات کو یہ کہہ کر مطعون کیا گیا ہے کہ:

"بیچارے ہندو شاعروں کو کہیں کہیں فٹ نوٹوں یا حواشی پر جگہ دی گئی ہے"۔21

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان مصنفین کے تذکروں میں اس دور کے روہیل کھنڈ کے جن شاعروں کے حالات درج تھے لالہ سری رام نے تقریباً ان سب کو نظر انداز کر کے گوشۂ گمنامی میں پہنچا دیا ہے۔ ظریف اور حریف پر ہی منحصر نہیں ہے۔ شاید ہی اس خطہ کا کوئی خوش قسمت ہندو شاعر ہوگا جسے خمخانۂ جاوید جیسے ضخیم تذکرے میں چند سطریں میسر آ گئی ہوں۔ لالہ صاحب کے اس عمل نے مؤرخ کے لیے بڑی مشکلیں پیدا کر دی ہیں۔

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے تذکرے سے پتا چلتا ہے کہ لالا بنی پرشاد ظریف کے اسلاف لکھنؤ کے رہنے والے تھے لیکن ان کے ماں باپ نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ پھر یہ لوگ امروہہ میں جا کر رہنے لگے تھے۔ وہیں انھوں نے مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ پھر ظریف وغیرہ کے توسط سے امروہہ کے کچھ اور نومشق مصحفی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے تھے۔ مصحفی نے ریاض الفصحاء میں ظریف کی فارسی اور اردو کی کئی کئی غزلیں درج کی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں ظریف کا کلام خاصا مقبول تھا۔ سعادت خاں ناصر کا کہنا ہے کہ:

"کلام اس کا پاک اور لطیف"۔22

اور ناصر نے بھی ان کے کئی شعر نقل کیے ہیں۔ محسن نے ان کے بارے میں کئی مفید اطلاعات قلمبند کی ہیں اس طرح:

"لالا بنی پرشاد آنجہانی ظریف ولد روشن لال برادر خورد چنی لال حریف باشندۂ لکھنؤ، صاحب دیوان شاگرد مصحفی"۔23

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ۔

ترے عشق میں اے بتِ ماہ لقا گئی مفت میں ساری مشقت دل
رہا مورد رنج والم ہی سدا ہوئی شاد کبھی نہ طبیعت دل

ہے ظریف کو تجھ سے ہی چشم وفا کوئی اور بھی ہے اس کا تیرے سوا
مری جان جو تو نہ سُنے تو بھلا کہے جائے وہ کس سے مصیبت دل

کس کی طاقت سدّ رہ ہو وقت رفتن آپ کا آپ شعلہ اور رشک برق تو سن آپ کا
اے جنوں نالہ وفریاد کروں یا نہ کروں خانۂ شوق کو آباد کروں یا نہ کروں

ظریف کے اردو کلام پر فارسی کا اثر نمایاں ہے۔ ان کا مشکل سے کوئی مصرع ہوگا جس میں فارسی کے قاعدے کے مطابق کوئی ترکیب نظم نہ ہوئی ہو۔

7-حریف

شیخ مصحفی نے حریف کا تعارف اس طرح قلمبند کیا ہے:

''لالہ چنی لال ولد روشن لال حریف تخلص، قوم کاستھ، مولدش از قدیم لکھنؤ است، اما جد و مادرش متوطن شاہجہاں آباد بودہ است، از عرصۂ شش سالگی بعضے کتب درسی را از فقیر یاد گرفتہ، بہ مقتضائے موزونی طبع شوق نظم فارسی و ہندی در سر دارد.... عمرش قریب بست و ہفت سالہ''۔24۔

سعادت خاں ناصر نے ان کو ''خندہ رو اور ظریف'' بتایا ہے۔25 ان کے کلام میں بھی اس کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے چند شعر یہ ہیں۔

نہیں ہے مجھ کو دم نزع آب کی حاجت غم فراق سے میرا جگر کباب ہوا
تجھ کو منظور اگر زلف کا سلجھانا تھا کام یہ مجھ سے پریشاں کو فرمانا تھا
منہ سے نقاب دے جو مرا مہ جبیں الٹ حور و پری کا جائے دام اے ہمنشیں الٹ
موسم گل میں بھی بلبل اگر آزاد نہ ہو پھر وہ کس طرح بھلا شاکی صیاد نہ ہو

8-ذوقی

مرادآباد کے ہندو شاعروں میں یہ بھی قابل ذکر تھے۔ شیفتہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''ذوقی رام تخلص ذوقی، از مرادآباد است، نسبت شاگردی بہ زکی مہدی علی دارد، بسر بُرداو قاتش بہ عطر فروختن است، گویند در موسم ہولی کہ زمان عشرت ہندیاں است، بہ تقلید فرقۂ بینوایان در کوچہ و بازار اشعاری خواند، اور است۔

ملنے سے تصور میں کچھ کم نہ مزا دیکھا گرووہ نہ ہوا، اس کی تصویر ہے اور میں ہوں"[26]

ہمارے زمانے میں کہ جب عوامی طبقے کے معاملات پر بھی توجہ کی جارہی ہے "فرقہ بینوایان" کے کلام کی بھی مطالعے کی ضرورت ہے کہ اس سے اہل کوچہ وبازار کے طور طریقوں اور رسم ورواج کا صحیح علم حاصل ہوگا۔

(2)

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے امروہہ میں بھی شعروسخن کی محفلیں آراستہ ہوتی رہی ہیں، وہاں کے شاگردوں میں سے بعض یہ ہیں:

1-زماں

ان کے بارے میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بس اتنا لکھا ہے:

''زماں سید محمد زماں، شخصے بود در امروہہ'' ۔27

عبدالغفور خاں نساخ نے البتہ ان کے بارے میں اطلاع دی ہے کہ ''تعلقات دنیوی کو چھوڑ کر فقیری اختیار کی تھی'' ۔28

زماں کے کلام کا نمونہ یہ ایک شعر ہے ۔

خوبرویوں کے تو ملنے سے نہ باز آئیں گے　　　　یہ تو بدخو نہیں جائیں گے مگر جان کے ساتھ

2-عارف

عارف شیخ مصحفی کے شاگرد تھے اور انھوں نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''میر عارف علی عارف تخلص متوطن قصبہ امروہہ، جوان غریب وضع، ومسکین مزاج، دیدمش، معرفت بنی پر شاد ظریف بہ حلقہ شاگردی فقیر در آمدہ، عرائس

افکار خود را بہ زیور اصلاح مجلّی ساخت، و در عرصۂ قلیل ہم سلک تلامذۂ عالی طبیعت ایں خاکسار گردید، ذوالفقار زباں را بہ جوہر نظم ہندی و فارسی بیاراست۔ عمرش تخمیناً سی و پنج سالہ خواہد بود"۔29

نواب شیفتہ نے ان کے حالات میں کچھ اضافہ کیا ہے۔ لکھا ہے:

"سید یست از امروہہ، از چندے بہ مرادآباد جا گزیدہ، و مردیست با فہم و فراست، عروض و قافیہ نیکو می داند، دعوائے شاگردی مصحفی می کند، اکنوں ترک شاعری گفتہ، حرف از پند و وعظ می زند، خلق را بہ راہ خدا می آرد"۔30

عارف کے کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔

رات ساری مجھے دونوں کی تسلی میں کٹی ہاتھ دل پر سے اُٹھایا تو جگر پر رکھا
ہاتوں کو چاک جیب تلک دسترس نہیں میں کس کے بس میں ہوں کہ مرا کچھ بھی بس نہیں

وہ ہوا گرد سے جب وقت شکار آلودہ
تیر خاکی ہے مژگان غبار آلودہ

کوئی تو ہے گل چہرۂ کوئی سرو رواں ہے دیکھا تو یہاں ایک نہ ایک آفت جاں ہے

رہ گیا آئینہ جوں دیدۂ عاشق حیراں
ہنس پڑا دیکھ جو وہ غنچہ دہن آئینے میں

زبان کی صفائی اور محاورہ بندی پر زیادہ زور معلوم ہوتا ہے۔ بعض شعروں میں اس دور کے تفریحی مشاغل وغیرہ کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے اور تلک بجائے تک، دیکھ کر کے موقعہ پر دیکھ وغیرہ زبان کی قدامت کا رنگ دکھاتے ہیں۔

3۔کلیم

اس زمانے میں مرادآباد کے مضافات میں بھی اردو شاعری کا رواج ہو گیا تھا۔ چنانچہ شیفتہ نے ایک شاعر کا حال اس طرح لکھا ہے:

"کلیم تخلص، شیخ کلیم اللہ ساکن سرکوٹ کہ از متعلقات نگینہ من مضافات مرادآباد است"۔31

جلوۂ طور، رخِ یار سے پیدا ہووے　　　　خجل اعجازِ تکلم سے مسیحا ہووے

4-مروّت

یہ شاعر ابن شاعر تھے اور اپنے زمانے میں معزز اور نام برآوردہ ہوئے۔ شیخ مصحفی نے ان کا ذکر تفصیل سے کیا ہے:

''صغیر علی مروت تخلص کہ بہ پسر مصری شہرت دارد، ولد کبیر علی عرف کبیر سنبھلی، شیخ انصاری کہ ذکرش گذشت، جوان قابل و دانا است، تحصیل کتب طب وغیرہ از والد خود در رامپور کردہ.....او را بہ صحبت نجو خاں پسر مستقیم خاں کہ جوانِ شاعر دوست گذشتہ، سیر دواوین اساتذۂ سلف و حالِ خاطر خواہ میسر آمد و لہذا اگاہ گاہے کہ فکر شعر میکند در راہ تلاشِ معنی ہائے تازہ منظوری دارد، اکثر غزلش قصیدہ طور است و یک دو قصیدہ کہ گفتہ خیال بندی را در و بطور سلیم وسعت دادہ، دریں کار روبۂ مرزا رفیع پیشِ نہاد خاطر است، در ہماں ایام کہ بہ رام پور بود یک دو داستاں بہ ردیۂ مثنوی میر حسن در سلک نظم کشیدہ با خود داشت و میخواست کہ آنہارا بہ نظر موی الیہ بہ گزارند، چوں در ہماں ایام میر موصوف را سفر ناگزیر در پیش آمدہ بسیار تأسف خوردہ رفتہ رفتہ ہماں چند قطرہ اش دریا گردیدند یعنی در عرصۂ پنج شش سال کہ از سفر بنارس در شہر باز آمد، جواب مثنوی بہ معنی ہائے تازہ مہیا گردانیدہ، بعد اتمام قصہ بہ عرصۂ قلیل بہ ہمسائگی فقیر اور انو بیسانیدہ، وصاف نمودہ در معرض شہرت افگندہ، اکثر دوستاں نقل گرفتند نازش شاعری او بر ہمیں مثنوی است، در آغاز شباب اول چندے بہ ترغیب میر حسن فکر شعر کردہ و از نظرِ ایشاں گزرانیدہ و بعد ازاں در روز ہائے کہ در رستم نگر اقامت داشت بہ سبب قرب و جوار بہ میاں قلندر بخش جرأت رجوع آوردہ، اقرار شاگردیش بہ یک کس نیست لہذا ای گوید۔

زہر خرمنے خوشہ یافتم　　　　تمتع زہر گوشہ یافتم

بہ سبب ہمسائگی اتفاق ملاقات می شود''۔32

یہ افسوس کی بات ہے کہ جس مثنوی کو شاعر کے لیے ''نازشِ شاعری'' کی بنیاد قرار دیا ہے شیخ مصحفی نے اس کا ایک شعر بھی نقل نہیں کیا ہے۔ نواب شیفتہ نے البتہ اس عنوان سے مروت کا یہ ایک شعر نقل کیا ہے

''ایں بیت از وخوش کردہ شد۔

غیروں پہ دیکھ دیکھ کرم اس نگار کا　　چیں بر جبیں ہے نقش ہمارے مزار کا

بعد کے تذکرہ نویسوں نے مروت کے حالات میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا ہے۔ ان کے کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔

کیوں تو نے وا کیا تھا بندِ قبا چمن میں　　اُڑتی پھرے ہے گل سے بلبل خفا چمن میں
ہر سمت اب صبا جو پھرتی ہے خاک اڑاتی　　بلبل کے پر پڑے ہیں کیا جا بجا چمن میں
نرگس کی آنکھ تجھ پر پڑتی ہے بے طرح سے　　مت وقت شام جانا بہر خدا چمن میں
جوں لالہ داغ دل یہاں، پھر جل اٹھا ہے شاید　　جاتا ہے سیر کرنے وہ بے وفا چمن میں

جیب اپنا گل نے پھاڑا بلبل موئی مروت
کیوں اپنے غم کا قصہ تو نے کہا چمن میں

حُسن چشم آہ یہ کس گُل کا مجھے بھاتا ہے　　خواب میں تختۂ نرگس ہی نظر آتا ہے
تحفۂ لختِ جگر اشک مرا اے ہمدم　　دمبدم گوشۂ دامن کو لیے جاتا ہے

قطعہ

مہررو پر ترے گیسوئے سیہ کے نیچے　　خال مشکیں مجھے اس شکل نظر آتا ہے
جس طرح وقت سحر موسم سرما میں غزال
شاخ سنبل کے تلے دھوپ کھڑا کھاتا ہے

نہ چمن ہے، نہ گل ہے، نہ بو ہے　　جلوہ گر یہاں تو ہر طرف تو ہے
دیکھنا ہنس کے اس کا آنکھ ملا　　کیا کہوں سحر ہے کہ جادو ہے

کیا صدف ہوں میں، رکھوں جو ہر گھڑی گوہر بدست
جوہر شمشیر ہوں رہتا ہوں، نت خنجر بدست

عشق کا قصہ مروّت سے سنو اے بلبلو
مثل گل اس بات کا رکھتا ہے وہ دفتر بدست

مروت کے کلام کو اگر بہ غور دیکھیں تو اس پر رام پور کی شاعری کا اثر نمایاں ہے۔ بعض شعروں میں اس زمانے کے مشاغل اور مناظر کا عکس بھی صاف نظر آتا ہے۔ مروت کو محاورہ بندی کے علاوہ بعض صنعتوں مثلاً تجنیس وغیرہ سے بھی دلچسپی ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ کہیں کہیں اس نے فارسی کی ترکیبوں کے ساتھ ہندوستانی اصل کے الفاظ بھی صرف کیے ہیں۔ مثلاً 'بت خنجر بدست' ایک شعر میں آنکھ ملانا کے موقع پر غالباً ضرورت شعری سے صرف ''آنکھ ملا'' بھی نظم کیا ہے۔

(ب) مثنوی و قصیدہ

مراد آباد کے علاقے میں مثنوی کی صنف سے بھی خاصی حد تک دلچسپی لی گئی تھی۔ چنانچہ گذشتہ صفحات میں ضمناً بعض تخلیقات کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ اس علاقے کی مثنویوں کی طرف کما حقہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔

1۔ صنعت

غزل گو کی حیثیت سے شیخ کریم الدین صنعت کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس شخص کا یہ کارنامہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس نے مثنوی کی صنف کو علمی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی راہ نکالی۔ اس نے علم ریاضی اور اس کے متعلقات پر مشتمل ایک منظوم رسالہ 1238 ہجری میں تالیف کیا تھا۔ اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے، اس کی ضخامت 97 صفحات کی ہے اور ہر صفحہ پر تیرہ سطریں ہیں۔ رسالے کے ابتدائی اشعار یہ ہیں۔

کریم کریماں وہ عالی جناب ۔۔۔ کہ جس کے کرم کا نہیں ہے حساب
اسی نے کیا ہے زمیں کو بسیط ۔۔۔ وہ تحقیق ہے کُل شئی محیط
لکھا ہو جو قسمت میں انسان کی ۔۔۔ کسی علم سے وہ نہ بدلی گئی

حساب کے اس رسالہ کا اختتام جوڑ کے ایک دلچسپ گر کے بیان پر ہوا ہے۔ جو اس طرح ہے۔

اسی طرح دونے کو دونا کیا غرض جبکہ دونے ہوے آٹھ جا
جو کچھ ~~آخوین~~ جا عدد ہوں شمار بتاؤ وہیں گن کے اس کو تو یار۔
یہی ان حسابوں کا ہے کلیہ جو میں نے دیا صاف تجھ کو بتا

گر کے اس بیان کے بعد ایک مثال اس جوڑ کی اس طرح درج کی ہے:

510=256+128+64+32+16+8+4+2

اس نسخے کے آخر میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ البتہ ''پٹہ قبولیت اور تمسک وغیرہ'' کے چند نمونے لکھے ہوئے ہیں۔ اس رسالے میں شاعر نے ذیل کے شعر میں اپنا تخلص نظم کیا ہے۔

کہ کم مایہ اور خوشہ چیں آپ کا یہ صنعت تو ہے مخلص بے ریا

اور سال تصنیف کا اظہار اس نے اس شعر میں کیا ہے۔

جو ملہم سے پوچھا میں سال کتیب کہا مخزن کلیات حسیب

1238

اس سے پتا چلتا ہے کہ حساب کا یہ منظوم رسالہ 1238ھ (23-1822) میں مکمل ہوا تھا۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں بھی موجود ہے۔ فہرست نگار نے غلطی سے ''مخزن کلیات حسیب'' کو کتاب کا نام سمجھ لیا ہے۔ یہ نسخہ ناقص الآخر ہے اور بہ صورت موجودہ اس میں کل 27 ورق ہیں۔ ہر صفحہ پر چودہ سطریں ہیں، اس میں آخری شعر یہ ہے۔

پھر اسے بھی تکنا کیا تیسرا اور اسے بھی تکنا وہ چوتھا کیا

بتایا گیا ہے کہ صنعت کا یہ رسالہ اس جوار میں مدت تک نصاب میں داخل رہا ہے لیکن تعجب ہے کہ اس کے کسی مطبوعہ نسخے کا حال معلوم نہیں ہو سکا ہے۔

رامپور کی رضا لائبریری میں بھی شیخ کریم الدین صنعت مرادآبادی کی ایک مثنوی ہے جس کا عنوان مثنوی صنعت'' بتایا گیا ہے۔ سال تصنیف اس کا 1237ھ (1822) ہے۔ علی محمد نامی کسی شخص نے 1276ھ (60-1859) میں ستر ورق پر اس کی نقل تیار کی ہے۔ فی الوقت اس کے

بارے میں ہمیں مزید تفصیلات معلوم نہیں ہو سکی ہیں۔

2۔ بیخود

علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں ایک گمنام شاعر بہت لعل بیخود سنبھلی کی مثنویوں اور قصیدوں کا ایک مجموعہ موجود ہے جو بہ گمان غالب بخط مصنف ہے۔ اس مجموعہ میں اس شاعر کا 1245ھ سے 1248ھ (1829 تا 1833) تک کا کلام درج ہے، ضخامت ستاون اوراق ہے۔ اس کا آغاز ذیل کے مطلع سے ہوتا ہے۔

عشق ہے یا کہ جان کا جنجال　　ایک عالم ہے اس سبب پامال

یہ شعر کسی مثنوی کا معلوم ہوتا ہے

یہ قلمی نسخہ بہت لعل بیخود کے کسی قصیدے کے اس شعر پر تمام ہوا ہے۔

اور...... تو رہے جب تک　　جب تلک آسمان ہے دوّار

ظاہراً اس شاعر کی زبان قدیمانہ ہے اور اس نے ایسے الفاظ کا خاصا استعمال کیا ہے جو بعد کے زمانے میں متروک ہو گئے تھے۔ اس کے کلام کا معیار بھی کچھ بلند نہیں معلوم ہوتا ہے۔

فہرست نگار نے اس مجموعہ کا نام اس طرح تحریر کیا ہے۔

''مثنویاتِ بیخود مع قصاید بیخود''

3۔ علی

نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ نے علی کے حال میں لکھا ہے کہ:

''علی تخلص، علی محمد خاں، اعظم الدولہ گوید کہ شخصے است از قوم افاغنہ، باشندۂ مرادآباد، اوراست 4

دھیان میں لاتے ہیں جب ابھرے کسی کے گات ہم　　مارتے ہیں تب وہیں چھاتی پہ دونوں ہاتھ ہم

اعظم الدولہ کا جو تذکرہ دہلی سے چھپ کر شائع ہوا ہے اس میں اس علی کا نام بھی نہیں آیا ہے۔ مولوی کریم الدین نے البتہ شیفتہ کی عبارت کو اپنے تذکرے میں اس طرح سے نقل کیا ہے:

''علی تخلص، علی محمد خاں کا ہے، جو مرادآباد کا رہنے والا ایک پٹھان ہے جو اعظم الدولہ کہلاتا ہے، یہ شعر اس کا ہے (وہی ایک شعر)''۔5

ظاہر ہے کہ کریم الدین نے شیفتہ کی عبارت کو سمجھنے میں بڑی غلطی کی ہے۔

نواب علی محمد خاں علی تخلص رسا شعر کہہ لیتے تھے۔ انھوں نے بعض مرثیے اور نعتیہ قصید ے بھی کہے ہیں چنانچہ ان کی نثری کتابوں میں ان کے نمونے مل جاتے ہیں مثلاً

(الف) ان کا ایک نعتیہ قصیدہ جو پینتیس شعروں پر مشتمل ہے ان کی کتاب مولود شریف کے شروع میں درج ہے۔

(ب) نواب علی محمد کی دوسری کتاب غمکدہ میں ان کے مرثیوں کے کچھ شعر نقل ہوئے ہیں۔

بایں ہمہ نواب علی محمد خاں نے شاعر کی حیثیت سے نام نہیں پایا۔ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا یا نہیں۔

(ج) سکھ بوجی

کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں چھتیس صفحوں کا ایک قلمی رسالہ محفوظ ہے جس کا عنوان ''رسالہ سکھ بوجی'' لکھا ہے۔ 6 اس کے ابتدائی دو شعر اس طرح ہیں۔

پرسوتم پرماتما پوران لیوا نیس — آدھرس اب جلت ہے نوہ نواوں سیس
نمو نمو سکھ بوجی پرتم گرو سنت — تم پرساد سریہ کی خیر انداسی پرست

اور اس رسالہ کا آخری شعر یہ ہے۔

جوگ جوگ ہر تھکت کر میرمہ گیان دود کر گیو — اتم بت بچار کر اچیا من من سن رہیو

اس رسالے کا ترقیمہ اس طرح ہے:

''..... بوقت چار گھڑی شب گذشتہ جمعہ بتاریخ چہاردہم شہر..... 1251 ھ (1835) در قصبہ مراد آباد بخط خام حافظ بدر الدین احمد.....''۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مراد آباد اور اس کے جوار میں ہندوستانی اصل کی بعض شعری اصناف بھی مسلمانوں میں مروج اور مقبول رہی ہیں۔

(ج) مذہبی نثر

مرادآباد کے نواب عظمت اللہ خاں فاروقی کا گھرانا کئی اعتبار سے ممتاز حیثیت کا مالک رہا ہے۔ مولوی حاجی رفیع الدین جیسے عالم، نواب شبیر علی خاں تنہا جیسے شاعر اور نواب مجدالدین عُرف مجو خاں جیسے مردانِ کار اس خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ شعر گوئی کی طرح نثر نویسی کے فروغ میں بھی نواب عظمت اللہ خاں فاروقی کے بعض اخلاف کی دلچسپیاں اور کارکردگی اس خطے میں راہنما ثابت ہوئی تھی۔

علی

نواب علی محمد خاں کا شاعر کی حیثیت سے ذکر کیا جاچکا ہے۔ اپنے نام کی مناسبت سے علی تخلص کرتے تھے۔ مرادآباد کے معزز اور موقر رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

مولوی نواب علی محمد خاں علی تخلص ابن نواب رحیم الدین خاں

ابن نواب فصیح الدین خاں ابن نواب عظمت اللہ خاں بہادر فاروقی مرادآبادی

یہ علی محمد خاں محض رسماً شاعر تھے البتہ ان کی دلچسپیوں کا مرکز مذہب تھا اور ان کی اردو نثر میں دو کتابیں دستیاب ہیں۔

مولود شریف اور غمکدہ

دونوں کتابوں کے قلمی نسخے رام پور کی رضا لائبریری میں محفوظ ہیں۔ دونوں کی یہ نقلیں فضل امام مراد آبادی نامی شخص نے ایک ہی سال یعنی 1244ھ (29-1828) میں تیار کی تھیں، خود علی نے 13 محرم 1263ھ (جنوری 1847) میں وفات پائی تھی۔

نواب علی محمد خاں کے استاد مولانا حاجی رفیع الدین خاں بھی شاعر تھے۔ چنانچہ اعظم الدولہ سرور کے تذکرے میں ہے:

''رفیع تخلص، رفیع الدین خاں مراد آبادی، قوم افغان، از زیارت مکۂ معظمہ مشرف گشتہ۔ معاودت نمودہ، از اقربائے نجیب الدولہ مرحوم، از دست ؎

ناتوانوں کے ستانے سے حذر کر ظالم عرش بھی آہ سے مظلوم کی ہل جاتا ہے''۔

انھوں نے فارسی زبان میں ''مولود شریف'' لکھی تھی۔ شاگرد نے استاد کی اتباع میں اردو میں یہی کام کیا۔ علی کی مولود شریف کا مخطوطہ اکیاون اوراق (ورق اب تا 52 الف) پر محیط ہے، اس کا آغاز پینتیس شعر کے ایک نعتیہ قصیدے سے ہوا ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

ہو سکے بندے سے کیونکر نعت اس شہ کی بیاں جس کی ذات پاک ہو ممدوح خلاقِ جہاں

اس مطلع کے بعد نثری عبارت اس طرح شروع ہوتی ہے:

''نفحات عنبر شمیم، صلوات و نسیمات عبہر نسیم، تحیات نثار مرقد منور و مشہد معطر سید عالم، خلاصہ اولادِ آدم، خواجہ کائنات، سر دفتر موجودات، صدر بزرگوار ثقلین، بدر نامدار خافقین، مصلی قبلتین، خلاصہ کاف و نون کونین ...... سردار اور مولا ہمارے نبی قوم قریش میں ہاشمی، متوطن ملک عرب، باشندۂ کعبہ، مہاجر مدینہ، محمدؐ بن عبداللہ .....معد بن عدنان، اتفاق علماء ہے کہ آں سرور علیہ الصلاۃ والسلام اپنے نسب مبارک کو عدنان سے زیادہ بیان نہ فرماتے''۔

امتیاز علی خاں عرشی نے اس کتاب کے ذکر میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''مؤلف نے خاتمے میں اپنے آپ کو مترجم بتایا ہے۔ میری دانست میں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے کسی کتاب سے ترجمہ کیا ہے۔ بلکہ ان مطالب کو عربی کی کتابوں سے ترجمہ کر کے مرتب کیا ہے''۔

کتاب کی زبان پر عربی اور فارسی کا اثر غالب ہے، جس کے سبب سے اکثر جگہ عبارت مشکل اور دقیق ہوگئی ہے۔

نواب علی محمد خاں علی تخلص کی دوسری کتاب ''غمکدہ'' پہلی کے مقابلے میں ضخیم تر ہے اور اکیاسی اوراق اور ایک صفحہ (53ب تا 134ب) پر مکمل ہوئی ہے۔ اس کے مخطوطے کا ترقیمہ اس طرح ہے:

''الحمد للہ والمنۃ کہ ایں رسالۂ شریف مسمّٰی بہ ''غمکدہ'' بتاریخ دوم شہر ربیع الثانی سنہ 1244 ہجری نبوی (اکتوبر 1828) بروز یکشنبہ وقت پنج گھڑی روز برآمدہ در چکلہ مرادآباد بہ خط خام اضعف العباد محمد فضل امام زینت انجام وزیب اتمام یافت''۔

اس کتاب میں مؤلف نے خود اپنے اشعار خاصی تعداد میں شامل کر دیے ہیں چنانچہ اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔

اہل بیتِ شہ پہ کل روز مصیبت آئے گا　　صبح کو ابن علی لب تشنہ مارا جائے گا

.....اے یاراں آج کی شب وہ شب غم افزا ہے کہ اس شب کو اہل بیت رسالت میں شور العطش اور ہر ایک خورد و بزرگ ذکور و اُناث سے پیاسا مرتا تھا''۔

اور اس غمکدہ کے خاتمہ کی عبارت یہ ہے:

''اے خدا مغفرت کر مومنین و مومنات و مسلمین و مسلمات کی خصوصاً بندۂ گنہ گار علی محمد مولف اس رسالہ کی کہ مسمّٰی بہ غمکدہ ہے اور جمیع حاضرین مجلس کی اور عفو کر معاصی کو بہ حق سید الأبرار و آلہ الأطہار وَصحبہ الأخیار یا غافر المذنبین برحمتک یا أرحم الراحمین''۔

اس کتاب میں جیسا کہ اقتباسات بالا سے ظاہر ہے حضرت حُسینؓ کی شہادت کا بیان کیا گیا ہے۔ اس کی عبارت پہلی کتاب کے مقابلے میں کسی قدر صاف اور رواں ہے۔

یہ امر لائق توجہ ہے کہ رام پور اور مضافات میں بھی سُنّی علما نے عموماً ایسے عنوانات کا انتخاب کیا ہے جو شیعہ اور سُنّی دونوں فرقوں کے درمیان مشترک تھے۔ اور اس طرح باہمی اتفاق و اتحاد کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس قسم کی نثری تصانیف سے بطور مجموعی شیعیت کو تقویت بھی حاصل ہو رہی تھی۔

(د) قصے کہانی

رامپور کے ماحول کے اثر سے اہل مراد آباد کو بھی قصے کہانی سے دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ اس علاقے میں بھی مثنویاں اور داستانیں لکھی گئی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں کی نظم ونثر زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکیں اور تذکرہ نویسوں کو بھی ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہوئی۔

1-مروّت

مروت تخلص، صغیر علی نام تھا۔ شاعر کی حیثیت سے ان کا احوال لکھا جا چکا ہے۔ سعادت خاں ناصر نے ان کے بارے میں جو لکھا ہے اس کا اختصار یہ ہے:

''پیشہ اس کا طبابت، میر صغیر علی تخلص مروت، تحصیل علم طب اپنے والد سے اس نے کیا، اور شاعری میں اکثر شعرا کا تتبع رہا، اخیر اخیر میاں جرأت کی شاعری پر قناعت کی''۔1

اپنے زمانے کے چلن کے مطابق مروت نے بھی ایک کہانی 1244ھ (29-1828) میں لکھی تھی اس کے سبب تالیف میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ:

''ایک دن راقم حروف صحبت میں دوستوں کی بیٹھا تھا، میر حسین (تسکین) صاحب کہ ساتھ اس بے بضاعت کے محبت دلی رکھتے تھے، کہنے لگے کہ

حکیم صاحب ایک کہانی زبان اردو میں ترتیب دے دیجیے تا جریدۂ عالم پر ثبت

رہے کہ زندگی کو اعتبار نہیں ہے۔

رستم ہے اس زمانے میں، نے سام رہ گیا   مَردوں کا آسمان تلے نام رہ گیا

از بسکہ مجھ کو خاطر مشارٌ الیہ کی بہت سی عزیز تھی۔ اس باعث گو ہر سخن بطور کہانی کے

ترتیب دیئے'' ۔1

مرزا قادر بخش صابر نے میر حسین تسکین کے حال میں یہ اطلاع قلمبند کی ہے کہ:

''رئیس رامپور کی قدر شناسی سے سلسلہ (ان کی) نوکری کا بہ قدر رفاہ حال

منتظم ہوگیا''۔

مروّت نے انھیں کی فرمائش سے یہ کہانی لکھی تھی اس لیے تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ کہانی رامپور میں لکھی گئی تھی، مروّت نے اس کو نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ کے نام معنون کر کے ان کی خدمت میں رسائی حاصل کرنی چاہی تھی۔ لیکن کسی وجہ سے انھیں اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔

اس مقام پر یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مروّت کو اپنے مسکن سے باہر جانے کے مواقع بھی ملے تھے۔ چنانچہ انھوں نے زبان کے لیے لفظ اردو کا استعمال کیا ہے اور اپنی تالیف کو انھوں نے ''کہانی'' کہا ہے۔ ہمارے زمانے کے ناقدین اس کو داستان کہتے ہیں۔

مروت کی اس کہانی کا قصہ اس طرح ہے کہ شہزادہ مہ جبیں ملکہ حور لقا کی تصویر دیکھ کر اس پر عاشق ہوگیا اور سفر کی صعوبات برداشت کرتا ہوا اس کے ملک میں جا پہنچا۔ ملکہ کو اطلاع ہوئی تو:

''ملکہ نے شہزادے کو اندر طلب کیا اور سامنے چلونیں ڈال کر کرسی پر ان کو بٹھایا لیکن دیکھتی رہی شکل ان کی تیر عشق کا کھایا کہ جگر کے پار ہوگیا بادشاہزادے نے پوچھا کہ:

''صاحب کیا شرط تھی آپ کی؟''

ملکہ نے کہا کہ:

''شرط ان کے واسطے تھی کہ جن سے دل کو راہ نہ تھی۔ کس واسطے کہ ہم پہلو اس

کے ہوجیسے کہ جس سے دل کو نسبت ہو۔ مجھے تم سے کچھ شرط نہیں ہے۔''

لیکن شہزادہ شرط معلوم کرتا ہے کہ جو یہ تھی کہ جو کوئی ملکہ عجائب پری کا حال دریافت کر کے

بتائے گا اسی سے ملکہ حور لقا کی شادی ہوگی۔ شہزادہ اس شرط کو پورا کرتا ہے۔ لیکن قصہ کے ختم تک اس کی چار شادیاں ہوگئی تھیں۔

حکیم صغیر علی مروت کی اس کہانی کا مخطوطہ رامپور میں ہے۔ جس کی کتابت 1265 ھ (1849) میں ہوئی تھی، ضخامت اس کی 262 ورق کی ہے۔ قصہ کا نام ''گلدستۂ عجائب رنگ'' ہے، اس قصہ کی عبارت سلیس اور رواں ہے اور مکالموں میں بے ساختگی کے ساتھ فطری انداز بھی پایا جاتا ہے۔

مروت کو قصہ گوئی سے بہت دلچسپی تھی چنانچہ انھوں نے ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔

2- غلام علی

ان کے بارے میں اسی قدر معلوم ہے کہ امروہہ کے رہنے والے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ پایا تھا اور اردو نثر میں چھوٹے چھوٹے سبق آموز قصے لکھتے تھے، جن قصوں کا حال معلوم ہو سکا ہے یہ ہیں:

(الف) قصہ بلی اور چوہا- اس کا ایک قلمی نسخہ جس کی کتابت یعقوب علی خاں نے 1246 ھ (31-1830) میں کی تھی۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس میں کل آٹھ ورق ہیں۔ ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:

> ''ایک روز کا مذکور ہے کہ یاران لطیف اور جورستان ظریف ساتھ بیان لطائف اور ظرائف کے با یک دگر طوطی وار شکر فشاں تھے......''

قصہ کو مصنف نے ان کلمات پر ختم کیا ہے:

> ''یہ اشارہ کل اُمورات کے واسطے خالی فائدہ سے نہیں، اَلعاقلُ تکفیۃُ الإشارۃ''۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مصنف کو محض تفریح طبع مقصود نہیں ہے۔ بلکہ وہ ان قصوں سے زندگی کے لیے کچھ مفید سبق پڑھنے اور سُننے والے کو دینا چاہتا ہے۔

اس قصے کا ایک اور نسخہ اسی کتب خانہ میں ہے جس کا عنوان ''قصہ گربہ مسکین'' ہے۔ فہرست کے مرتب نے مصنف کا نام غلطی سے غلام علی آزاد لکھ دیا ہے۔ اس کا سال کتابت معلوم نہیں البتہ اس کا کاتب کنھیا لال نامی کوئی شخص ہے۔ یہ نسخہ دس اوراق پر محیط ہے اور ہر صفحہ پر چودہ

سطریں ہیں۔اس کا متن وہی ہے جو پہلے نسخے کا ہے۔اختلاف صرف سہو قلم کی حد تک ہے۔مثال کے طور پر آخر کے کلمات اس میں بھی یہ ہیں:

''اور جو کام آغاز کیجیے اس کے انجام کو سوچ لیجیے۔ یہ اشارہ کل امورات کے واسطے خالی فائدہ سے نہیں''۔

(ب) قصہ گربہ۔ یہ قصہ بھی اسی مصنف یعنی غلام علی کا لکھا ہوا ہے۔دہلی کی ہارڈنگ پبلک لائبریری میں اس کا جو قلمی نسخہ محفوظ ہے بخط مصنف ہے اور اس کا ترقیمہ اس طرح ہے:

''تمام شد قصہ گربہ، بتاریخ بست و ششم رجب سنہ 2 ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ دام ملکہٗ وسلطنتہٗ 1255 ہجری موافق 6 اکتوبر 1839 عیسوی روز شنبہ بوقت چہار گھڑی روز باقی ماندہ صورت انجام گرفت''۔2

یہ ایک مختصری کہانی بلی اور مرغی کی ہے، انداز بیان تمثیلی ہے، موئف کہنا یہ چاہتا ہے کہ آدمی کو اپنے دشمن پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے، اس مخطوطہ میں قصہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

''کوئی قصہ دلچسپ بہ طرز نو طرز مرصع کے اگر سلک تقریر میں منسلک کرے تو یہ سلسلہ بندگی واسطے سررشتہ یادگاری کے...''۔

یعنی مصنف نے میاں تحسین کی نو طرز مرصع کو نمونہ کے طور پر اپنے پیش نظر رکھا تھا اور اسی کی اتباع کرنے کی کوشش کی تھی، قصہ کے خاتمے کی عبارت یہ ہے:

''پس اب تقریر اور حاصل مطلب ظاہر تو یہی ہے کہ اپنے دشمن کو دشمن جانیے اور جس کام کا آغاز کیجیے اس کے انجام کو سوچ لیجیے''۔

ختم قصہ کے آخری کلمات پہلے اور اس قصے میں مشترک ہیں اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید پہلے قصے کے کاتبوں نے تصرّف کر کے دوسرا قصہ بنا لیا ہو۔

زبان دونوں قصوں کی صاف سلیس اور رواں ہے۔صرف کہیں کہیں لفظوں کی ترتیب روزمرّہ کے خلاف ہو گئی ہے۔

(ج) قصہ قضیہ قاضی۔ یہ غلام علی امروہوی کا لکھا ہوا تیسرا قصہ ہے اس کی ضخامت سات ورق کی ہے۔مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے اس قصہ کے مخطوطہ کی کتابت بھی یعقوب علی نے

ہی 1246 ہجری میں کی ہے۔ اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

''راویان اخبار اور حاکیان آثار سے روایت ہے کہ............''

اور قصہ ان جملوں پر ختم ہوتا ہے:

''وہ چور کہ حقیقت میں چور نہیں تھا بلکہ شاہ تھا... عرصۂ روزگار میں یادگار ہو گیا''۔

زبان اس قصہ کی بھی صاف اور آسان ہے اور مقصد اس کا بھی ظاہر ہے۔

تذکروں میں مراد آباد کے بعض ایسے شاعروں کا بھی ذکر ملتا ہے جو اردو نثر بھی لکھتے تھے۔ چنانچہ جلال الدین خاں رغبت کے حال میں یہ ذکر کیا جا چکا ہے۔

ان کے علاوہ امیر مینائی کے تذکرے میں بھی شاکر تخلص کے ایک شاعر کے بارے میں لکھا ہے:

> ''شاکر میاں نجیب شاہ خلف سید عطاء الٰہی ساکن قصبہ شاہ آباد، شاگرد مولوی غلام محی الدین ہوش برادر مولوی کریم الدین آرزو، نظم و نثر اردو اور فارسی دونوں میں بصیرت رکھتے تھے۔ 1241ھ (1825) میں قضا کی''۔

ہوش اور آرزو دونوں بھائی مراد آباد کے استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ اس لیے ان کے شاگرد کا بھی ذکر اسی جگہ کر دیا گیا ہے۔ شاکر کی اردو نثر کا حال معلوم نہیں ہو سکا ہے۔

(3) بدایوں

(الف) پس منظر 61

1-حشر رسول بخش 62

2-نوا ظہوراللہ خاں 63

(ب) غزل 65

1-عدل شیخ فضل رحمان 65

2-کامل شیخ جمال الدین 66

3-وحید حکیم محمد وحیداللہ 67

(ج) نثر 69

1-مولوی عبدالمجید 69

2-حکیم علی حسین 73

(الف) پس منظر

بدایوں کا علاقہ بھی روہیلوں کی عملداری میں شامل تھا۔ سردار داود خاں ابن شاہ عالم خاں ان روہیلوں کے خاندان کے بانی تھے۔ ان کے حالات میں مذکور ہے:

> ''حسب اتفاق جب کہ شاہ عالم خاں قریب شہر بداوں کے پہنچے، دزدان روسیاہ اور قطاع الطریقان گمراہ نے اس طرح مال و منال شب جمعہ نہم ذی الحجہ شاہ عالم خاں کو مع دو کس دیگر ہمراہ رکاب فیض انتساب کے تھے، شہید کیا، داود خاں بہ دریافت اس خبر تکدر اثر کے بہ سرعت سریعہ و عجلت عجیلہ روانہ بداوں کے ہوے، اول لاش اس شہید سعید کو بجائے قتل مدفون کیا''۔

یہ واقعہ 1187ھ (1773) کا ہے۔

زمانہ مابعد میں جب روہیلوں کے علاقوں کی تقسیم عمل میں آئی تو بدایوں، آنولہ وغیرہ فتح خاں خانساماں کے حصہ میں آیا۔ فتح خاں اپنی ذات سے بڑی خوبیوں کا مالک تھا اور اپنے زمانے کے نیک نام امرا میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن برہمن نژاد ہونے کی وجہ سے غالباً وہ شعر و سخن کی قدر شناسی کی قابل توجہ روایت قائم نہیں کر سکا۔ البتہ اس کا شہر بدایوں بعد کے زمانے میں بھی اولیا کا شہر سمجھا جاتا رہا ہے۔

فتح خاں کے کئی بیٹے تھے اور اپنی خوبیوں کی وجہ سے وہ بھی ممتاز تھے۔خلیفہ محمد معظم عباسی نے اپنے جنگ نامے میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

جو تھا فتح خاں خانساماں کلاں — سخاوت کا تی اور شجاعت کی جاں
خلف بعد اس کے رہے تھے کئی — تو اس وقت موجود ہیں تین جی
ہیں بیٹے و پوتے پڑوتے کلاں — بہت خوش خصال اور شیریں زباں

میں سب ان کے کنبے کا استاد تھا
بہت خوش تھا بے غم تھا آزاد تھا

خلف بہرہ ور ان کا حافظ عظیم — پسر ان کا دانا محمد نعیم
بہ دانش بزرگ و بہ ہمت بلند — بہ بازو دلیر و بدل ہوشمند

ان خوبیوں کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ فتح خاں کے بعد بدایوں کی علم و شعر کے مرکز کے طور پر اہمیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ یہ تو نہیں ہے کہ یہاں باصلاحیت افراد ناپید ہو گئے تھے۔لیکن ان کی سرپرستی کرنے والا کوئی موجود نہیں تھا۔ یہاں کے صاحبان علم و ادب کو دوسرے شہروں میں جا کر جدو جہد کرنی پڑتی تھی۔ جو اپنے شہر سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔عموماً گمنامی میں جی کر چلے جاتے تھے،احمد حسین سحر نے ایک شاعر کے بارے میں لکھا ہے:

1-حشر

''حشر تخلص، رسول بخش نام، باشندۂ خاص بدایوں است، در بدایوں از ہنگامۂ شاعری خود قیامت بپا کردہ، تلاش مضمون شاں نسبت بندش شعر خوش است''۔3

اس شاعر کے دو شعر یہ ہیں۔

زخمی ہوا ہوں ابروے پُر خم کو دیکھ کر — رکھنا ہمارے زخم پہ مرہم کو دیکھ کر
یاد آ گیا وہ کان کا موتی کسی کا حشر — برگ سمن پہ قطرۂ شبنم کو دیکھ کر

اس مطلع میں شاعر نے کئی صنعتوں کا صَرف کیا ہے۔ زخمی، زخم اور خم اور ابرو (اب+رو) وغیرہ کا صَرف داد طلب ہے۔ مقطع میں موتی کے ساتھ کان اور پھر سمن اور قطرۂ شبنم کا لانا بھی بہت خوب ہے۔ یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ شاعر نے حُسن یا حُسین کے بجائے سبب حُسن (زیور) پر

نظر کی ہے۔

ان دو شعروں سے قطع نظر دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ جس شاعر نے بقول احمد حسین سحر اپنے شہر میں شاعری کی دھوم سے گویا قیامت بپا کر دی تھی۔ دہلی کے معاصر تذکرہ نویس مصحفی و شیفتہ وغیرہ نے اس کا نام بھی نہیں لیا۔ شہر میں قیامت برپا کرنے سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس وقت وہاں شعر و سخن کا چرچا تھا اور سخن گویوں کے ساتھ ساتھ وہاں سخن فہموں کا بھی جمگھٹ تھا۔

2- نوا

حشر کے برخلاف نوا اپنے شہر کو چھوڑ کر باہر نکلے تھے، ان کو شہرت ملی تھی، ان کے بارے میں احمد حسین سحر نے لکھا ہے:

"نوا تخلص، ظہور اللہ خاں بدایونی، شاگرد بقاء اللہ خاں بودہ است، از حضور مرزا جہاندار شاہ، خوش فکر خاں، لقب یافتہ، در شہر لکھنؤ گذرانیدہ، کمال علوِ مزاجی داشت، از عمایدِ مردم آں جا اعزاز حاصل کردہ نظر بہ اکتساب زبان فارسی بہ ایران رفت، اعزاز ہا یافتہ، باز بہ لکھنو رسیدہ، قصاید گفتہ و بہ حکم نصیر الدین حیدر بادشاہ ایں جا بہ نظم شاہنامہ فکرے کردہ بود، چوں عمرش دفانہ کردہ فکرش ناتمام ماند، در فارسی کلامش مطبوع جملہ شعر است، بہ زبان ریختہ نسبت فارسی کمتر تقریر پرداختہ"۔4

شاہزادہ مرزا جہاندار شاہ کے زمانے میں نوا نو عمر تھے۔ اس کے باوجود انھیں خطاب "خوش فکر خاں" سے شرف حاصل ہوا۔ ان کے شوقِ علمی کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جانا چاہیے کہ وہ فارسی سیکھنے کے لیے ایران بھی گئے تھے۔ لکھنؤ میں ان کی شہرت کا حال یہ تھا کہ خود بادشاہ نے انھیں شاہنامہ لکھنے پر مأمور کیا تھا، ان واقعات سے ظاہر ہے کہ نوا غزل کے علاوہ قصیدہ اور مثنوی وغیرہ لکھنے کے لیے بھی لکھنؤ میں شہرت رکھتے تھے۔

نوا کی کامیابیوں نے ان کو محسود بنا دیا تھا اور وہ اپنے استاد بقا کے تعلق سے وہاں کے شعری ہنگاموں میں مبتلا ہو گئے تھے، سعادت خاں ناصر کے تذکرے میں لکھا ہے:

"سخنورِ بے مثل، شاعر یکتا، ظہور اللہ خاں، تخلص نوا، قوم شیخ، قصبہ بدایوں اس کا

وطن، پیشگاہ سرکار شہزادہ مرزا جواں بخت کی سے بہ خطاب خانی ممتاز ہوا اور
(بقاء اللہ) بقا سے حاصل فن سخن اس نے کیا تھا، قلندر بخش جرأت سے بر سبیل
شاعری اس سے مکابرہ ہوا، آخر نوبت ہجو اور مذمت پر پہنچی، دو ایک بند اس مخمس
کے کہ جرأت نے اس کی ہجو میں کہے ہیں بہ طریق مذکور لکھے جاتے ہیں 5

اب ان کو دے شفق چرخ شال نارنجی ۔ بنا جو کرتے تھے لیل ونہار شطرنجی
یہ دیکھ کیونکہ نہ الجھے بہ خانۂ تن جی ظہور حشر نہ ہو کیوں جو کلبخڑی کنجی
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

نگر گداوں کو دے چرخ منصب شاہی جو گھس گھدے ہوں وہ اوڑھیں دوشالہ کاہی
ستم ہے پاے جو دھیونر مراتب ماہی غضب ہے چقدر کی مادہ بھی ہو کے جب واہی
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

یہ مخمس ترجیع بند ہے اور اس میں شاعر نے اپنے حریف کے حالات کی مناسبت سے کئی رعایتیں نظم کی ہیں۔ یہ سب رعایتیں معلومات افزا ہیں اور بڑے سلیقے سے انھیں صرف کیا گیا ہے۔

ظہور اللہ خاں جو اس کے جواب میں نوا سنج ہوا ہے اس کا بھی ایک بند لکھا جاتا ہے۔

ایک دن کہنے لگا جورو کے منہ پر ہاتھ پھیر قدرت حق سے لگی ہے ہاتھ اندھے کے بٹیر
وہ لگی کہنے کہ ایسا ہے یہ بکڑوا نیم سیر بدگماں بھائی سے اپنے ہو گئے گر مجھ کو دیر
کور، بے ایماں، حرامی، سخت قرم ساق ہے

نوا نے بھی حریف سے متعلق مختلف رعایتیں صرف کی ہیں لیکن وہ زیادہ کھل گئے ہیں۔ انھوں نے بھی مختلف صنعتوں سے کلام میں لطف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً پہلے مصرعہ میں (جو) رو کے ساتھ منہ نظم کیا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں ایک ضرب المثل تضمین کر کے اپنی خوش فکری اور خوش بیانی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ آخری مصرعہ میں چار صفتیں یکجا کر دی گئی ہیں۔ یہ سب ہے لیکن نوا جرأت کے مقابلے میں چھوٹے تھے چنانچہ دونوں کے کلام کا فرق بھی ظاہر ہے۔

(ب) غزل

ظہور اللہ خاں نوا اور ان کے بعض معاصر بھی اردو شاعری کی تقریباً سبھی اصناف میں کامیابی کے ساتھ شعر کہتے تھے۔ ان کا کلام اور ان کے واقعات کم و بیش سب بدایوں اور اہل بدایوں تک پہنچتے تھے اور وہاں کی نئی نسل کو کسی نہ کسی طور پر متاثر کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس شہر میں غزل کے علاوہ دوسری معروف اصناف شعری کو بھی کم و بیش رواج رہا ہے۔

آنولہ اور بدایوں میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی وغیرہ کے بعض تلامذہ بھی موجود تھے اور ان کے واسطے سے وہاں شعرائے قدیم کی روایتیں کم و بیش زندہ تھیں۔ خود مصحفی نے اپنے ایک شاگرد کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''1- عدل

شیخ فضل رحمان عدل تخلص، ساکن بداؤں جوان غریب و طالب علم بود، کلام خود را بہ نظر حقیری گزرانید، در روز ہائے کہ فقیر بر مکان میاں غلام اشرف مشاعرہ می نمود و غزل طرح می کرد، شریک مجلس می شد، از مدتے مفقود الاحوال است، شعرے

از دورِ غزل طرح بیاد ماندہ ولست۔ 1

دل میں آتا ہے کہ اب محتسب وقاضی کو   جمعہ کے روز لڑا دیجیے پانی بھیے"۔

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے دن بدایوں میں چھٹی رہتی ہوگی اور فرصت پا کر لوگ اس دن مرغ اور بٹیر وغیرہ لڑاتے ہوں گے، یہ شعر شاعر کی خوش طبعی پر بھی دلالت کرتا ہے۔ شیفتہ وغیرہ کے تذکروں میں عدل کا بھی ذکر موجود نہیں ہے۔ سعادت خاں ناصر نے البتہ اس کے بارے میں بس اتنا لکھا ہے:

''شاعر خوش زباں، شیخ فضل رحماں، عدل تخلص، شاگرد میاں مصحفی''۔ 2

اور وہی ایک شعر اپنے تذکرے میں نقل کر دیا ہے۔

2- کامل

روہیلوں کی ابتدائی عملداری میں قصبہ آنولہ کو عملاً مرکزی حیثیت حاصل رہی تھی۔ سعادت خاں ناصر نے اس قصبہ کے ایک شاعر کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''مرد خردمند، شخص عاقل، شیخ جمال الدین تخلص کامل، شاگرد میاں مصحفی''۔ 3

متفرق اشعار کے علاوہ ناصر نے اس شاعر کی ایک غزل مطلع سے مقطع تک بھی درج کی ہے اور وہ یہ ہے۔

تجھ سے وحشی صنم کو رام کیا   جذبۂ دل نے کیا ہی کام کیا
مژدہ اے چشم انتظار نصیب   جلوۂ حُسن اس نے عام کیا
دل دیا تجھ سے بے مروّت کو   ہم نے یہ کیا خیال خام کیا
اس نے منہ کو چھپا کے زلفوں سے   روز روشن ہمارا شام کیا
تو نے کھا کھا کے ساتھ غیروں کے   آب و دانہ برا حرام کیا
کوچ کرتے ہی آپ کے، ہم نے   منزل گور میں مقام کیا
کیا ہی کامل کے کشورِ دل میں
اے شہِ حُسن انتظام کیا

معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ مابعد میں کامل کے کلام کو زیادہ شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ چنانچہ محسن

نے ان کا احوال اس طرح قلمبند کیا ہے:

''شیخ جمال الدین کامل، باشندۂ آنولہ، لکھنؤ میں واسطے تحصیل علم کے آئے تھے،
شاگرد غلام ہمدانی مصحفی''۔ 4

محسن نے ان کی ایک سے زائد غزلوں کو مفید مطلب پا کر اپنے تذکرے میں ان کو جگہ دی ہے۔ یہاں ان کے صرف دو دو شعر لکھے جاتے ہیں۔

طایر دل کو جو رہتا ہے خیال کاکل　　　کب ہوئی پھر ہوس دانۂ خال کاکل
فصل سودے کی پھر آئی ہے خدا خیر کرے
دیکھیے پڑتا ہے کس کس پہ وبال کاکل

آغاز میں عیاں ہیں یہ انجام کار دل　　　دو چار دن ہے زندگی مستعار دل
فوج غم والم میں پھنسا شہر یار دل　　　ہو کون بیکسی کے سوا غمگسار دل

شیخ کامل معنی آفرینی اور تلاش مضمون تازہ کے دلدادہ تھے۔ ان کے کلام میں بعض ترکیبیں بھی نئی ملتی ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ بطور مجموعی یہ اپنے وقت کے قابل ذکر شاعروں میں سے تھے۔ لیکن شیفتہ وغیرہ دہلوی تذکرہ نویسوں کی نگاہوں سے دور دور رہ گئے۔

3-وحید

یہ بھی بدایوں کے قابل ذکر شاعروں میں سے تھے۔ سعادت خاں ناصر کے تذکرے میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

''حکیم محمد وحید اللہ خاں ابن حکیم محمد سعد اللہ خاں تخلص وحید، ساکن بدایوں، یہ
اس کی گفت وشنید''۔ 5

جما ہے خون میرا اُس بتِ کافر کے خنجر پر　　　نیا گُلِ کھل گیا دیکھو چمن بندی کے جوہر پر
دعا الٹی ہی پڑتی ہے تو ہوں میں ہجر کا خواہاں　　　کہ شاید منعکس ہووے کبھی وصل ستمگر پر

سید محسن علی موسوی نے ان کا احوال قدرے تفصیل سے قلمبند کیا ہے اس طرح:

''ملازم راجا بھرت پور، حکیم وحید اللہ خاں وحید ولد حکیم سعید اللہ خاں ابن حاذق الملک حکیم عبد اللہ خاں قریشی، باشندۂ بدایوں، صاحب دیوان''۔

اورانھوں نے وحید کی دوغزلیں لکھی ہیں۔ ان کے مطلعے یہ ہیں۔

اشک اس بزم میں لائے ہیں جوبھر آنکھوں میں　　لطف دکھلا گئے کیا لختِ جگر آنکھوں میں
کیوں چُھپا تا ہے صنم تو تہِ داماں عارض　　پارۂ نور ہیں یہ کب ہوئے پنہاں عارض

ان شاعروں کے کلام پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ بدایوں اور آنولہ وغیرہ میں لکھنؤ کا اثر نمایاں حد تک غالب رہا ہے۔ یہاں حُسنِ مطلق کا چرچا کمتر معلوم ہوتا ہے البتہ حسین کے اعضا ملبوسات اور زیورات کے تذکروں کی طرف طبیعتوں کا میلان زیادہ رہا ہے۔

(ج) نثر

علمائے مذہب جن کے دل ودامن قناعت کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ سفر وحضر کی کشائشوں اور کشادگیوں کے باوجود اپنے مقاصد کی تکمیل میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کی نیتوں کی خوبی اور ہمتوں کے فیوض سے بدایوں اور اس کے مضافات میں اردو نثر میں تصنیف وتالیف کے سلسلے جاری رہے تھے۔ یہاں نمونہ کے طور پر محض چند تحریروں کا حال لکھا جاتا ہے۔

1- مولوی عبدالمجید قادری

ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے ان کے حالات مختلف مآخذ کے حوالے سے اس طرح لکھے ہیں:

> ''عبدالمجید ابن شیخ عبدالحمید عثمانی 29 رمضان 1177ھ (مارچ 1764) کو بدایوں میں پیدا ہوئے، ''ظہور اللہ'' تاریخی نام ہوا، یہ بدایوں کے پہلے بزرگ ہیں کہ جنھوں نے اردو زبان میں (نثر) میں تصنیف وتالیف کا آغاز کیا، پہلی کتاب نجات المومنین 1231ھ (1816) سے پہلے کسی وقت لکھی تھی، 17 محرم 1263ھ (جنوری 1847) کو انتقال ہوا''۔1

اردو نثر میں مولوی عبدالمجید کی جو تصانیف دستیاب ہیں ان کا مختصراً تعارف کرایا جاتا ہے۔

(الف) نجات المومنین

اس کتاب کو "رسالہ مسائلِ ہندی" بھی کہا گیا ہے۔ یہ رسالہ دو ابواب میں منقسم ہے:

پہلا باب: ایمان کے بیان میں۔ اس میں توحید و ملائکہ، کتب سماویہ، رسالت، قیامت، تقدیر اور مرنے کے بعد جی اُٹھنے اور پھر اُن شرطوں کا بیان ہے جو ناقص الایمان تھا۔

دوسرا باب: توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے مسائل کے بیان میں ہے۔

اس رسالے کے سبب تالیف میں مصنف نے لکھا ہے:

> "بعد حمد و صلاۃ کے جمع کرنے والا اس کتاب کا کہتا ہے کہ اس وقت میں اکثر مرد اور بیبیاں اسلام سے ایسی غافل ہیں کہ سوائے نام کے کچھ نہیں جانتے اور دینا اسلام کے سیکھنے کا ہرگز خیال نہیں کرتے، اور مانند جانوروں کے زندگی بسر کرتے ہیں، دنیا کے کاموں میں مشغول ہیں، اچھے کھانے اور پینے اور پہننے کی فکر میں دن رات رہتے ہیں، نماز، روزہ بھول گئے ہیں، اس واسطے گنہگار شرمسار نے احکام ایمان اور اسلام کے کہ نہایت ضروری تھے، موافق قرآن اور حدیث کے بڑی کتابوں سے دریافت کر کے اس کتاب کو ہندی زبان میں بیان کیا......
> اللہ تعالیٰ اس کتاب کو مسلمانوں کے دلوں میں مقبول کرے.... اور اس گنہگار شرمسار کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے صدقے اور طفیل میں بخشے"۔

کتاب جیسا کے اوپر مذکور ہوا حج کے مسائل پر ختم ہوئی ہے۔ چنانچہ اس میں آخر کی عبارت اس طرح ہے:

> "حدیث میں ہے جس نے حج کیا ہے اور میری زیارت نہ کی اس نے مجھ پر جفا کیا، باقی سب مسائل حج کے اس مختصر میں لکھنا چنداں مفید نہیں، جو شخص مکہ معظمہ کو جاویگا وہاں دریافت کر کے سمجھ جاویگا اور وہاں کے بتانے والوں سے معلوم کرے گا"۔

کتاب نجات المومنین میں بہت الفاظ ایسے آئے ہیں جو اب متروک ہیں مثلاً:

باسن (برتن)، باؤ (ہوا)، آزاری (بیماری)، نالایق (نامناسب) اس قدیم زمانے میں

لفظوں کی تذکیروتانیث کا تعین نہیں ہوا تھا،اس لیے بعض لفظ ہمارے زمانے کے طریق کے خلاف بھی لکھے ہیں، چنانچہ جفا کو مذکر کہا ہے وغیرہ۔

مضاف، مضاف الیہ وغیرہ کی صورت میں لفظوں کی ترتیب فارسی کے قاعدے کے مطابق آئی ہے۔اس لیے وہ بھی آج کے روزمرّہ کے خلاف ہے جیسے:

بے چوں حکموں شریعت کے اور موافق حکم شرع کے عمل کرنا

اور: یہ چار شخص کہ اب میں نے ذکر کیے ہیں سردار کافروں کے ہیں۔

(ب) محافل انوار

یہ مولوی عبدالمجید قادری بدایونی کی اردو نثر میں دوسری کتاب ہے یہ کتاب ایک مقدمے اور بارہ محفلوں (ابواب) پر منقسم ہے،ان محفلوں کی تفصیل اس طرح ہے:

محفل اول درذکر پیدائش نور باسرور آں حضرت ﷺ

محفل دوم درذکر ولادت باسعادت آں حضرت ﷺ

محفل سوم درذکر شیر دادن آں حضرت ﷺ

محفل چہارم درذکر بشاریر نبوت آں حضرت ﷺ

محفل پنجم درذکر شروع وحی وظہور دعوت آں حضرت ﷺ وبیان ایذاے کفار ناہنجار

محفل ششم دربیان معراج آں حضرت ﷺ

محفل ہفتم درذکر ہجرت آں حضرت ﷺ از مکہ معظمہ بہ مدینہ منورہ.............

محفل ہشتم درذکر وقایع سال دویم ہجرت تا سال دہم اجمالاً وذکر بعضے غزوات بہ اندک تفصیل

محفل نہم درذکر بعض معجزات محمدیہ ﷺ

محفل دہم درذکر خصائص وفضائل آں حضرت ﷺ

محفل یازدہم درذکر فضیلت درود شریف آں حضرت ﷺ

محفل دوازدہم درذکر وفات شریف آں حضرت ﷺ

یہ محفلوں کی بارہ پر تقسیم بھی لائق توجہ ہے۔ممکن ہے کہ یہ لکھنؤ اور رامپور کے حالات کا اثر

ہو۔مؤلف نے کتاب کے سبب تالیف میں بیان کیا ہے:

''سن بارہ سو اکتیس ھ (1816) میں حضرت سیدی وشیخی ، مرشد کامل، ہادیٔ مکمل، قافلہ سالار رہروان شریعت ... حضرت سیدی سندی سید شاہ آل احمد (عرف اچھے میاں مارہروی) نے اس عاجز گنہگار وشرمسار امید وار مغفرت پروردگار و شفاعت سید ابرار محمد عبد المجید ابن مولانا محمد عبد الحمید صاحب بدایونی سے کہ کمینہ مریدان اس جناب اور ادنا خاک روبان آستانہ اس ہدایت مآب کے ہے سے فرمایا کہ اگر کوئی شخص کچھ احوال سرور عالم ﷺ کے زبان ہندی میں بیان کرے... خاص وعام، مرد وزن، عالم، جاہل سب فیضیاب ہوویں، اس عاجز نے باوجودیکہ عربی وفارسی ہندی میں کچھ استعداد نہیں رکھتا اس سے کہ شاید خوشی دل فیض منزل مرشد کامل کی ہووے اور اس سبب سے نجات دارین حاصل ہووے، قصد کیا...... ان محبوب ذوالجلال کا ابتدائے پیدائش نور، وقت وصال شریف تک مدارج النبوۃ ومعارج النبوۃ وغیرہ کتابوں فارسی سے ہندی میں ترجمہ کیا، ... جیسا کتابوں مذکور میں منظور تھا نقل کیا اور اس کتاب کا محافل انوار فی احوال سید الابرار نام رکھا، اس کتاب میں بارہ محفلیں مذکور ہیں''۔

اس کتاب کی زبان خاصی صاف ہے۔البتہ مولف کو صنعت تجنیس اور رعایت لفظی سے زیادہ دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔اس نے بعض لفظوں کو قدیم روزمرہ کے مطابق استعمال کیا ہے۔ مثلاً کمینہ (حقیر، ہیچ) وغیرہ، زبان اردو کو اس نے معمولاً ہندی کہا ہے۔ یہ صورت حال بھی اس علاقے کی بول چال پر قدامت کے اثر کی مظہر ہے۔

(ج) ہدایت الاسلام

ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کی مرتب کردہ ''کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات'' کی فہرست مطبوعہ 1956 کے حوالے سے اس کتاب کو بھی مولوی عبد المجید قادری کی تصانیف میں شامل خیال کر لیا ہے۔لیکن مذکورہ فہرست کے جدید ایڈیشن (مطبوعہ 1990) میں اس کے مولف کا نام ایک سے زائد مقاموں پر اس طرح تحریر ہے:

"مولوی صاحب قبلہ وکعبہ مولوی محمد عبدالمجید صاحب بدایونی"۔2

اس کتاب کی زبان کے بارے میں ڈاکٹر ندوی کی رائے ہے کہ:

"دوسرے مناظرانہ رسائل کے مقابلے میں اس کی زبان زیادہ سنجیدہ و متوازن ہے"۔

مذکورہ مخطوطہ بمبئی کی کتابت بھی بہت ہی بعد کے زمانے میں ہوئی ہے، چنانچہ اس کا مولوی عبدالمجید بدایونی سے انتساب صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔

2۔ حکیم علی حسین

حکیم علی حسین عرف محمد انعام اللہ بھی اصلاً بدایوں کے رہنے والے تھے۔ کچھ عرصہ تک رامپور میں نواب احمد علی خاں کی خدمت میں رہے اور ان کی خاطر سے زبان اردو میں شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ایک رسالے کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ اس کے سبب تالیف میں لکھا ہے:

"بعد حمد و صلاۃ کے عرض حال بندہ علی حسین عرف محمد انعام اللہ ابن شیخ حافظ حیات اللہ بدایونی کا پوشیدہ نہ رہے، کہ عرصہ قریب گذرا کہ ایک رسالہ اسرار شہادت جناب حسنین علیہما السلام کا تصنیف ملک العلماء استاد علامہ مولانا عبد العزیز دہلوی کی ہے.... اس گنہگار نے واسطے استفادہ خلق کے بہ زبان ہندی کیا.... بعض بعض روایات صحیح نہایت کتب معتبرہ سے اس میں داخل کی اور نام رسالہ کا چمن حسنیہ و حسینیہ رکھا، جب کہ یہ رسالہ بہ نظر حضور پرنور نواب مستطاب معلی القاب حاتم زماں رستم دوراں فریدوں فر...... نواب احمد علی خاں بہادر ادام اللہ تعالیٰ اقبالہ کی گذرا، الحمد للہ قبول نظر حضور فیض گنجور کی ہوا۔ پس دامن میرا پُر از زر ہوگیا"۔

حکیم علی حسین کے دادا کا نام شیخ امین اللہ صدیقی حمیدی بدایونی بتایا گیا ہے اور اقتباس بالا میں جس فارسی رسالہ کا ذکر آیا ہے اس کا نام "سر الشہادتین" ہے۔

مولف کا کہنا ہے کہ اس نے:

"اس مختصر کو مرتب کیا چار باب اور ایک خاتمہ پر"۔

باب پہلی: گلدستہ حسینیہ ہے مشتمل اوپر اثبات ثواب گریہ امام عالی مقام علیہما السلام کے۔

باب دوسری: رسالہ ہے اسرار شہادت جناب حسنین علیہما السلام کا۔
باب تیسری: مشتمل ہے بیچ احادیث اخبار شہادت جناب امام حسین کی
باب چوتھی: مشتمل ہے بیچ فضایل اہل بیت نبی ﷺ کے
خاتمہ: بیچ اثبات لعن یزید پلید کے۔"

کتاب کے تیسرے باب کے اخیر میں مولف نے لکھا ہے کہ:

"بیچ رسالہ چمن حسینیہ و حسینیہ کے، اکثر کرامات اور معجزات جناب امام حسین علیہ السلام کے مندرج ہیں، بہ لحاظ طوالت کلام کے ان سے قاصر رہتا ہوں"۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب "چمن حسینیہ حسینیہ" کا اختصار ہے اور اس کی تالیف کا کام نواب احمد علی خاں کے اختیارات ریاست حاصل کرنے کے اور شاہ عبد العزیز کی وفات یعنی 1239ھ (1824) کے بعد کسی وقت مکمل ہوا ہوگا۔

کتاب میں بعض لفظوں کی تذکیر و تانیث میں بھی فرق دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ مولف بھی زبان اردو کو ہندی کہتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ نواب احمد علی خان بہادر کے اثر سے اس جوار میں شیعیت کا زور تھا۔ چنانچہ اس موضوع کے انتخاب کے علاوہ رسالے کے بعض مباحث اور الفاظ و تراکیب بھی اس خیال کے موید ہیں مثلاً جگہ جگہ لکھا ہے:

"جناب امام حسین علیہ السلام"۔

(4) رامپور

(الف) پس منظر	79
1-سلطان نواب نصر اللہ خاں	79
2-رند نواب احمد علی خاں	81
(ب) غزل و قطعہ	83
1-فقیہ مولوی فقیہ الدین	84
2-آشفتہ عنبر شاہ خاں	85
3-ثروت صاحبزادہ کریم اللہ خاں	87
4-رفعت غلام جیلانی	87
5-تسلیم محمد کبیر خاں	91
6-طالب مولوی اللہ داد	93
7-افسر صاحبزادہ احمد یار خاں	95
8-غفلت احمد خاں	96

9-مشتہر سید شرف الدین 99

10-اظہر شیخ امین احمد 101

11-رافت میاں رووف احمد 101

12-انور امام الدین خاں 102

13-ہمدم عبیداللہ خاں 103

(ج) ریختی وواسوخت 105

1-آشفتہ عنبر شاہ خاں 106

2-رفعت غلام جیلانی 107

(د) مثنوی 109

1-اکرم مولوی محمد اکرم 109

2-انور امام الدین خاں 110

3-حیدر صاحبزادہ غلام حیدر خاں 111

4-رافت میاں رووف احمد 112

5-رفعت مولوی غلام جیلانی 113

(ہ) قصیدہ 115

1-غفلت احمد خاں 115

2-عبدو 118

(و) ہجو 121

1-غفلت اخوندزادہ احمد خاں 121

2-کرم مرزا لکھو عرف کرم خاں 124

(ز) متفرقات 125

1 - چار بیت 125

خورشید کریم خاں

2 - مخمس 125

حیدر غلام حیدر خاں

نگین مولوی عبدالقادر

3 - مثل خالق باری 127

اکرم محمد اکرم

(ح) تاریخ و معمہ 129

1 - آشفتہ عنبر شاہ خاں 129

2 - انور امام الدین خاں 132

3 - غفلت اخوندزادہ احمد خاں 133

4 - فرحت اکبر شاہ خاں 134

5 - کرم مرزا لکھو عرف کرم خاں 134

6 - کیفی ایوب خاں 135

(ط) نثر

(1) قصہ 139

غفلت احمد خاں 139

(2)مذہبی نثر	139
ا-سید حسین علی	144
2-احمد یار خاں	146
3-رافت روؤف احمد	147
4-رقت حبیب النبی	152
5-محمد عمران	153
6-سوختہ غلام غوث	156
(3)متفرق نثریں	159
1-رفعت غلام جیلانی	159
2-فاخر حکیم احمد خاں	160

(الف) پس منظر

نواب غلام محمد خاں نے اپنے بڑے بھائی نواب محمد علی خان کے مقتول ہو جانے کے بعد رامپور کی ریاست حاصل کر لی تھی۔ لیکن یہ بات نواب آصف الدولہ بہادر کو نہیں بھائی۔ ''جنگ دوجوڑہ'' میں انگریزوں کی مدد سے غلام محمد خاں کو شکست دے کر آصف الدولہ نے محمد علی خاں کے کمسن بیٹے احمد علی خاں کو 5 جمادی الاول 1209ھ (دسمبر 1794) کو مسند ریاست پر بیٹھا دیا۔ امیر اللہ تسلیم نے اس موقع کا بیان ان شعروں میں کیا ہے۔

عمائد کے ساتھ آصف مہر فر — ہوئے شہر میں جلوہ بخش نظر
رئیسانہ انداز و معمول سے — ملے ابن نواب مقتول سے
بزرگانہ فرما کے شفقت وہیں — کیا شان وشوکت سے مسند نشیں
نئی طرح کے ساز وسامان ہوئے — رئیس آخر احمد علی خاں ہوئے
کیا نائب ان عمدہ سردار کو — جو محکم کر آئے تھے اقرار کو
حضور اراکین جاہ وحشم — ہوا دونوں میں عہد نامہ رقم [1]

1- سلطان

نواب نصر اللہ خاں بہادر سلطان تخلص نائب ومختار کار بنا دیے گئے۔ ان کے بارے میں

امیر مینائی نے تحریر کیا ہے:

''صفات ان کے کیا بیان کیے جائیں، نسخ نیں خطاط بے بدل تھے۔ نقاشی میں ضرب المثل تھے۔ صنعت زرگری اگر چہ دون مرتبہ تھی۔ اس میں بھی کمال حاصل تھا۔ سخاوت میں مشہور جوار و دیار تھے۔ شجاعت میں محسود روزگار تھے۔ الکن تھے اور فی الجملہ ثقل سماع بھی تھا مگر تمام عمر کسی پر ظاہر نہ ہوا۔ جوان خوش رو تھے۔ خوش خلق و خوشخو تھے''۔2

یہ سب صحیح ہے لیکن سب پر بھاری عیب یہ تھا کہ وہ غلام محمد خاں کے وفادار۔۔۔ دست راست تھے، اس کے علاوہ ان کا تخلص بھی ان کی عالی حوصلگی کا غماز تھا۔ ان حالات میں احمد علی خاں کو جو بن جانا چاہیے تھا وہی وہ بن کر رہے۔

26 شوال 1225ھ (نومبر 1810) کو سلطان نے وفات پائی تو نواب احمد علی خاں کو ریاست کے اختیارات حاصل ہوئے لیکن ان کا تو بقول امیر مینائی یہ حال تھا کہ

''بیشتر جنگلوں میں مصروف سیر و شکار رہتے تھے۔ جب دارالریاست میں آتے تھے، رات بھر رقص و سرود، عیش و طرب، عیش و لہو لعب میں جاگتے تھے اور دن بھر سوتے تھے''۔3

نواب احمد علی خاں آخر زمانے میں مستسقی ہو گئے اور اسی حال میں بیہوش رہ کر 25 جمادی الاول 1256ھ 26 جولائی 1840 کو رحلت کر گئے۔

سلطان نواب محمد عبداللہ خاں بہادر عاصی کے فرزند ارجمند تھے یعنی رئیس ابن رئیس اور شاعر ابن شاعر تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ہجر میں مجھ کو بھروسہ نہیں اپنے دم کا — کل گیا، آج گیا، صبح گیا، شام گیا
ہاتھ وہ بھی نہ لگا اپنے کہ جس کی خاطر — دین و دنیا کا مرے ہاتھ سے سب کام گیا
اس لب سے کیا لعل کا جب رنگ برابر — دیکھا تو نہیں اس کے یہ پاسنگ برابر
مجھ کو اپنی اس لیے بھاتی ہے آنکھ — کام تیری دید کے آتی ہے آنکھ
کاش پیتے نہ ہم یہ بادۂ عشق — جس کے اب تک خمار کی ٹھہری

نسبِ خوباں تھا نامِ معشوقی ۔۔۔ سو وہ اب روزگار کی ٹھہری
نگاہ گاہے جو زیورے تھے دشنام ۔۔۔ سو وہ اب بار بار کی ٹھہری
خوش ہے سلطان جو اس قدر، شاید ۔۔۔ آج کچھ وصل یار کی ٹھہری

سلطان کے کلام میں بے ساختگی ہے۔ فارسی کی ترکیبوں کا استعمال کم سے کم کیا گیا ہے۔ مضامین میں کوئی دقت اور پیچیدگی نہیں ہے۔

2- رند

نواب احمد علی خان بہادر نے سلطان کی سرپرستی میں بسر کی تھی گویا انھیں سے تربیت پائی تھی۔ عیش ونشاط کی محفلوں میں، سرخوشی کے عالم میں، کبھی کبھی شعر کہہ لیتے تھے۔ اس سے اپنے دل اور اہل محفل کو خوش کرنے کے سوا کچھ اور مقصود نہیں ہوتا تھا۔ اپنے لیے تخلص بھی انھوں نے حسب حال یعنی ''رند'' پسند فرمایا، لیکن عبدالغفور خاں نساخ کا کہنا ہے:

''احمد تخلص نواب احمد علی خان بہادر مرحوم مسند نشین رامپور کبھی رند بھی تخلص کرتے تھے''۔4

ان کے کچھ شعر یہ ہیں۔

ساقی ومطرب وشراب ہے آج ۔۔۔ خانۂ توبہ بس خراب ہے آج
کہ تجھے جب یار کے رخسار قمر تاب پہ ہاتھ ۔۔۔ چوم کر کیوں نہ رکھوں دیدۂ پرآب پہ ہاتھ
شوقِ میخواری تو دیکھو کہ میں بیخود ہو کر ۔۔۔ رات دوڑانے لگا ساغرِ مہتاب پہ ہاتھ
دل کو جب چمن کی جاتا ہے ۔۔۔ باغ پھولا نہیں سماتا ہے
مہر ہو یا کہ بیوفائی ہو ۔۔۔ رند اس در سے کوئی جاتا ہے

قطعہ

حشر کو جب حساب مانگیں گے ۔۔۔ اَلاماں شیخ وشاب مانگیں گے
اپنے ساقی لا اُبالی سے ۔۔۔ رند وہاں بھی شراب مانگیں گے

نواب رند کی شاعری کا معاملہ بھی کم وبیش سلطان ہی جیسا ہے۔ ترکیبوں کا صرف کم سے کم ہے۔ مشکل اور نامانوس الفاظ وتراکیب کا استعمال بھی نہیں کے برابر کیا گیا ہے۔ سامنے کی باتیں،

معمولی خیال اور روایتی مضامین ہیں۔ جن کو مقامی تلفظ روز مرہ اور محاورہ کے مطابق موزوں کر دیا گیا ہے۔ وہاں کی جگہ دھاں (داں) اور دیتا تھا کے بجائے دیوے تھا وغیرہ سے قطع نظر پہنچے کو پھونچے نظم کرنا توجہ طلب ہے۔ اس لفظ کا یہ تلفظ دہلی میں درد اور سودا کے زمانے میں بھی مروج تھا۔ بعد میں پونہچے (بروزن فاعلن) اور پھر پہنچے (بروزن فعلن) ہو گیا۔

نواب احمد علی خاں بہادر کے دور میں ارباب نشاط کی محفلیں خوب چمک رہی تھیں لیکن سیف وقلم کی کارگزاریاں عموماً کسمپرسی کے عالم میں تھیں، رامپور میں اس زمانے میں شعر وسخن گویا سبزۂ خودرو تھا کہ باہر سے آنے والی برساتی ہوائیں اس کی آبیاری کرتی رہتی تھیں۔

(ب) غزل وقطعہ

نواب نصر اللہ خاں سلطان رامپور میں عملاً خود مختار فرمانروا کی حیثیت رکھتے تھے۔ محمد قدرت اللہ صدیقی شوق تخلص متوطن موضع موی عملہ قصبہ کابر، توابع سرکار سنبھل نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''بایں فقیر اکثر صحبت طرح نمودن غزل می افتد و بسیار شفقت می فرمایند''۔1

سلطان کے اثر سے رامپور کے شعری ماحول پر قدرت اللہ شوق اور ان کے تلامذہ پوری طرح سے چھائے ہوئے تھے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس ریاست کے علمی مزاج کی ترتیب اور تشکیل میں انھوں نے بنیادی اور مرکزی کردار کی حیثیت اختیار کر لی تھی تو اسے مبالغہ تصور نہیں کیا جانا چاہیے۔

سلطان کی نیابت ہو یا رند کی مسند نشینی، دونوں میں انگریزوں اور آصف الدولہ کی حمایت اور اعانت کی کرشمہ سازی تھی۔ اس صورت حالات کا قدرتی طور پر نتیجہ یہ ہوا کہ اہل رامپور کی زبانوں پر بتدریج انگریزی الفاظ مثلاً ''پلٹن'' وغیرہ جاری ہونے لگے اور ان کے فکر و بیان میں کم و بیش اہل لکھنؤ کا انداز اپنا عکس دکھانے لگا۔ مکانی قرب کے باوجود اس زمانے میں رامپور کے شعر و ادب پر دہلی کا اثر کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتا ہے۔

نواب احمد علی خاں جب بااختیار ہوئے تو سب سے پہلے ان کے ذہن میں اپنے والد کے قاتلوں سے انتقام لینے کا خیال آیا۔ لیکن اس معاملے میں بوجوہ انہیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ البتہ ریاست کے حالات خراب سے خراب تر ہونے لگے۔ امیر مینائی کا بیان ہے کہ

"ہزارہا آدمی گھر چھوڑ کر ٹونک وغیرہ اور اور ریاستوں کو چلے گئے...... روز روز ملک ویران شہر برباد، گھر گھر خانہ جنگیاں، گلی گلی فتنہ و فساد"۔2

ایسے حالات میں شعر و شاعری کی محفلیں کون آراستہ کرتا؟ ممکن ہے اپنے دربار کی رونق کے لیے نواب نے بھی کچھ کیا ہو لیکن بطور مجموعی رامپور میں شعر و ادب کی بساط پر جو کچھ ہو رہا تھا اسے انفرادی عمل سے زیادہ کچھ نہیں کہا جائے گا۔ کچھ شاعر باہر سے آ کر یہاں بس گئے تھے اور کوئی صاحب حوصلہ مشاعرہ کا اہتمام بھی کر لیتا ہوگا۔

1-فقیہ

اس زمانے کے ایک شاعر کے ذکر میں امیر مینائی نے لکھا ہے:

"مولوی فقیہ الدین فقیہ تخلص خلف الرشید مولانا مولوی شاہ جمال الدین صاحب قدس سرہٗ صورت و سیرت دونوں میں یکتا تھے۔ عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں گویا تھے، قوت حافظہ کا یہ حال تھا کہ سات برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا، حکیم عطاء اللہ کا فارسی قصیدہ ایک بار سن کر مطلع سے مقطع تک اپنے کلام کی طرح پڑھ دیا۔ شعر کا بہت شوق تھا۔ اپنے مکان پر بھی مشاعرے کرتے تھے۔ 35 برس کی عمر پائی، صفر کی دوسری تاریخ دوشنبہ کے دن 1240ھ (ستمبر 1824) میں رحلت کی، کلام بہت کچھ تھا مگر سب تلف ہو گیا"۔3

اس فقیہ کے حالات اور کسی تذکرے میں نہیں ملے اور اس کا صرف ایک یہ شعر امیر مینائی نے لکھا ہے۔

تمہارے مصحفِ رُخ پر نظر تو کی سو بار   مگر نہ سورۂ اخلاص کا پتا نکلا

فقیہ کے مشاعروں کے اثر سے رامپور کے شعری ماحول میں ایک حد تک یکسانیت پیدا ہوئی ہوگی۔ لیکن کم عمری میں ان کے وفات پا جانے کی وجہ سے ان مشاعروں کے فائدے دیرپا ثابت

نہیں ہو سکے ہوں گے۔

علم و دانش کی کوئی بھی شاخ ہو، اس کے فروغ کے لیے کسی نہ کسی طور پر سر پرستی اور قدر شناسی کا ہونا ضروری ہے۔ رامپور میں اس زمانے میں اس کی بھی کمی تھی۔ چنانچہ یہاں شعر و ادب کا بھی معیار کچھ بلند نہیں ہو سکا۔ پھر یہ بھی ہوا کہ دارالسلطنت دہلی کے ساتھ جیسے کہ چاہیے تھے اس ریاست کے روابط نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہی نہیں ہوا کہ دہلی والے یہاں کے صاحبان علم و فن سے عموماً ناواقف رہ گئے بلکہ باہر سے جو باصلاحیت یہاں آ کر مقیم ہو گیا اس کے کمالات بھی بالآخر فراموش ہو گئے۔ سلطان، رند اور فقیہ کے احوال اور کلام سے بھی شعرائے اردو کے اکثر تذکرے خالی ہیں بایں ہمہ اپنی طبیعتوں کے جوش اور شوق کی بدولت جن شعرا نے نام پالیا تھا ان میں سے بعض کا حال مختصراً یہاں لکھا جاتا ہے۔

2- آشفتہ

عنبر شاہ خاں نام تھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں عنبر تخلص تھا اور قدرت اللہ شوق سے اصلاح لیتے تھے۔ اردو میں قائم سے کسب فیض کیا اور آشفتہ تخلص کرتے تھے۔ صاحب علم شخص تھے، کئی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ مختلف مآخذ میں ان کے نام اس طرح لکھے ہیں:

(الف) فارسی میں: گلشن فیض، جوش ہوش، سراج منہاج
سواد عنبر (انشا) اور بہار عنبر
1230ھ-1815ء میں لکھی تھی نوادر المصادر، سویدائے، عنبر گلزار عنبر
پنج گنج مسمی بہ اشراق الخیال ایذان الاوزان مقدمہ جوہر عنبر بطور آمدنامہ
مراۃ الاصطلاحات 1234ھ/1819ء میں مکمل کی۔ جوہر شجاعت یعنی قواعد دوا تنگ
ملکیتی تشریق الخیال (دیوان فارسی) 1233ھ/1818ء میں مرتب کیا، بیاض ریاض عنبر (ذکر شعرائے ہند و نظم تاریخ)

حافظ احمد علی خاں شوق نے پنج گنج کے بارے میں لکھا ہے کہ:

اشراق الخیال تاریخی نام ہے جس سے 1243ھ ہوتے ہیں، گویا 1243ھ

تک ان کا زندہ ہونا ثابت ہے"۔5

1243 کے عدد اشراق الخیال سے نہیں اشراق خیال سے برآمد ہوتے ہیں اس لیے کتاب کا صحیح نام اسی طور پر سمجھا جانا چاہیے۔

(ب) اردو میں: تدقیق الخیال (دیوان اردو) 1237ھ/1822-1821 میں مرتب کیا گیا تھا۔

اس کا ایک قلمی نسخہ جو خود مصنف کے ہاتھ کا 1237ھ کا لکھا ہوا اور ایک سو اڑتیس اوراق پر محیط ہے رامپور کی رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔

مندرجہ بالا فہرست میں جوہر شجاعت پر توجہ کی ضرورت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شعرا حسن وعشق کی داستانیں سنانے کے باوجود زندگی کے معرکوں کی طرف سے بھی غافل نہیں تھے اور فنونِ مفیدہ کو کاغذ کی تحویل میں دے کر انھیں نئی نسلوں کے لیے محفوظ کر رہے تھے۔

عنبر شاہ خاں رامپور کی بدحالی سے پریشان ہو کر آخر عمر میں مراد آباد چلے گیے تھے، وہیں 1239ھ (1823) کے بعد کسی وقت وفات پائی اور سید خاں کے گھیر میں مدفون ہوئے، ان کی غزلوں کا نمونہ یہ ہے۔

کس لیے کرتے ہو تم یہ نظر ہوشربا
بس ہے عشاق کو اس کا اثر ہوشربا

قتل عشاق کی خاطر نہ نکالو خنجر
ہم کو کافی ہے تمھاری نظر ہوشربا

دل ہے واماندہ اور اس زلف کی ہے راہ دراز
سخت پیش آیا ہے اس کو سفر ہوشربا

اشک اس چشم تر کو کھو بیٹھا
آہ یہ طفل گھر کو کھو بیٹھا

نہ پھرا شرم نارسائی سے
خط مرا نامہ بر کو کھو بیٹھا

زندہ مانندِ شمع پھر نہ اٹھا
اس کی محفل میں جا کے جو بیٹھا

ہر باغ میں ہے شورشِ آواز عندلیب
فصل بہار پھر ہوئی دمساز عندلیب

خوباں بغیر کون ہے عاشق کا راز داں
گُل کے سوا نہیں کوئی ہمراز عندلیب

آشفتہ نام عشق نہ لے پھر تمام عمر
دیکھے جو کوئی میرے دل زار کی شبیہ

قاصد مرے نامے میں عبارت نہیں رنگیں
ملفوف ہیں خط میں دلِ مہجور کے ٹکڑے

بیخودی دیکھیے کیا دکھلائے یار پھر مست خود آرائی ہے

شاعر کو مشکل ردیفوں اور تنگ قافیوں میں شعر کہنے کا شوق معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ قافیے بدل کر دوغزلے وغیرہ بھی کہتا ہے۔ بعض شعروں میں دعوے کے ساتھ دلیل بھی پیش کی گئی ہے۔ یہ طرز لکھنؤ میں زیادہ مقبول ہوا تھا۔ قدامت کے اثر کے باوجود زبان اس شاعر کی صاف ہے اور بیان میں بھی پیچیدگی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ بعض شعر تو بہت اچھے نکل گئے ہیں۔

عنبر شاہ خاں اپنے زمانے کے مقبول ترین شاعروں میں سے تھے۔ ان کو ''طبقۂ والیان ملک'' میں بھی رسوخ حاصل رہا ہے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ بعض کے نام یہ ہیں:

احمد شیخ احمد علی امیر سید محمد امیر شاہ خوشنود سید خوشنود شاہ۔

3-ثروت

صاحبزادہ کریم اللہ خاں نام اور نواب محمد فیض اللہ خاں کے صاحبزادے تھے۔ فن شعر میں عنبر شاہ خاں کے شاگرد تھے۔ ستاون برس کی عمر پا کر 13 شوال 1246ھ (اپریل 1831) کو رحلت کی۔ ان کی ایک غزل کے دو شعر یہ ہیں۔

خالی نہیں ہم ایک دم آہ ترے عتاب سے مرہی مٹیں گے جب تو یار چھوٹیں گے اس عذاب سے

دل میں تمھارے ثروت آہ قصد ہے وصل یار کا کرتا نہیں ہے بات بھی وہ تو ابھی حجاب سے

ظاہراً کلام میں کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوتی ہے۔ روایتی مضامین ہیں جن کو سیدھے سادے انداز سے موزوں کر دیا گیا ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ باوجودیکہ ثروت کا تعلق رامپور کے ''طبقۂ والیان ملک'' سے تھا اردو شاعروں کے بیشتر تذکروں میں ان کا نام اور کلام نہیں ملتا۔

4-رفعت

یہ پیلی بھیت کے رہنے والے شاعر تھے۔ شروع میں بیدم اور پھر رفعت تخلص کرتے تھے۔ ان کے استاد قدرت اللہ شوق نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

'' مجموعۂ خوبی ہائے انسانی، مولوی غلام جیلانی بیدم تخلص، حالا رفعت اختیار نمودہ، متوطن بلدۂ پیلی بھیت، نبیرۂ مولوی احمد خاں شاہجہاں پوری، قوم افغان،

جوان خوش عنوان، ....اگر چہ نومشق است فاما مذاق گفتگو یش پہلو بہ رتبۂ سخن

استاداں می زند...'' ۔7

شیخ مصحفی نے ان کو'' شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق'' لکھا ہے، اور عمر ساٹھ برس بتائی ہے۔8 امیر مینائی نے البتہ ان کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں:

'' عالم باعمل، معقول ومنقول میں ضرب المثل.... پدر بزرگوار آپ کے مولوی احمد صاحب گیلان سے بغداد کے مضافات سے ہے، روہیلکھنڈ میں تشریف لائے، وہیں مولوی صاحب (رفعت) کی ولادت باسعادت ہوئی، بعد برہمی ریاست حافظ رحمت خاں چیلی بھیت نے اس دارالریاست میں آئے، علوم عقلی مولوی حسن صاحب سے... چندے شاہجہاں آباد میں رہکر علوم نقلی مولانا عبد العزیز صاحب سے پڑھے، اسی دارالخلافہ میں بعض ایرانیوں سے کسب زبان فارسی کا اتفاق ہوا، تالیفات.....9

مثنوی مسمّٰی بہ: دُرِ منظوم کہ وہ جنگ نامہ نواب غلام محمد خاں صاحب کا ہے۔ایک دیوان فارسی اور چند ورق گداختہ متفرق.....

مولوی حیدر علی، مولوی خلیل الرحمٰن، مولوی محمد اور مفتی محمد شرف الدین یہ سب شاگرد مولوی صاحب موصوف کے ہیں۔کبیر خاں تسلیم، عنبر شاہ خاں عنبر، خلیف، محمد غیاث الدین، عزت تلمیذ زبان فارسی میں معروف ہیں۔قوت حافظہ کی یہ کیفیت سُنی گئی کہ بعد اتمام صحبت مشاعرہ اکثر شعرا کی غزلیں مطلع سے مقطع تک پڑھ دیتے تھے۔بہشت خلد نام ایک مجموعہ اشعار اساتذہ جس میں اوصاف سراپائے معشوق ہیں تالیف فرمایا ہے۔المختصر اسّی برس کی عمر مولوی صاحب نے پائی اور 27 ذی الحجہ 1234ھ (اکتوبر 1818) دوشنبہ کے دن چاشت کے وقت رحلت فرمائی...''۔

تعجب ہے کہ امیر مینائی نے مولوی احمد کو رفعت کا پدر بزرگوار لکھ دیا ہے جب کہ یہ مولوی احمد کے پوتے تھے۔

مولوی رفعت کے علم وفضل کا سبھی معاصر تذکرہ نویسوں نے اعتراف کیا ہے۔احمد علی خاں شوق نے ان کے مذکورہ حالات میں کسی قدر اضافہ کیا ہے۔لکھا ہے:

''رفعت مولوی احمد خاں شاہجہاں پوری کے پوتے تھے۔ پہلی بھیت سے آکر
رامپور کے محلّہ راج دوارہ میں ملاّ غیرت کا مکان اور احاطہ خرید کر مکان بنائے
اور وہیں قیام کیا۔ قوم کے بنگش تھے۔ مجموعۂ رفعت فارسی دیوان آپ کا ہے۔
تاریخ اس کی بیاض دلکشا ہے، اس کا 1230ھ (1815) کا نسخہ کتاب خانہ
ریاست میں موجود ہے''۔ 10

بیاض دلکشا سے 1168ھ کے عدد برآمد ہوتے ہیں اور یہ اس بیاض کی تالیف کا سال نہیں ہوسکتا کیونکہ اس وقت رفعت کی عمر 14 برس سے زیادہ نہیں تھی۔ رفعت کو شروع زمانے سے مشکل ردیفوں میں شعر کہنے کا شوق رہا ہے۔ انھوں نے بہ تبدیل قافیہ سہ غزلے بھی لکھے ہیں۔ ایک سہ غزلہ کے کچھ اشعار یہ ہیں۔

جس ادا سے ہے اس جواں کی ادا　　کون رکھتا ہے ایسی بانکی ادا
پند ناصح نہ کر کہ اب پتھر
دل ہوا، دیکھ ان بتاں کی ادا
کہیے کیا اپنے بے ادب کی ادا　　گرد ہے جس کے آگے سب کی ادا
زخم کرتی ہے دل میں جوں شمشیر　　مسکرانے میں اس کے لب کی ادا

قطعہ

سب پریشاں ہو کے کہنے لگے　　زلف اس کی نے رات جب کی ادا
آوے گی دن کو کیا بلا بیدم　　مار سب کو گئی یہ شب کی ادا
اور بھی کہیے مطلع تازہ
خوش لگی ہم کو اپنی اب کی ادا
آج کیا ان کے ہم نشیں کی ادا　　ہائے اس شوخ خشمگیں کی ادا
دھنس گیا خنجر مژدہ دل میں
مار گئی چشم سُرمگیں کی ادا

محمد تقی میر کی غزل پر بھی غلام جیلانی رفعت نے غزل کہی تھی۔ اس کے دو شعر یہ ہیں۔

اس دل کو نہ دینا تھا اس کو، افسوس یہ میں کیا کام کیا
اب لے کے جو اس کافر نے یہاں ناحق مجھ کو بدنام کیا
اس افغاں کی کاکل ہمدم شب سر پہ مرے یہ بلا لائی
میں نالہ دافغاں صبح سے لے، غم میں جس کے تا شام کیا

اسی زمانے کا ان کا ایک قطعہ یہ ہے ۔

خفا ہوے جو تم آنے سے اے میاں میرے — تو یہ غلام چلا، لیجیے بندگی صاحب
میں اب تو ثانی سودا ہوں شعر میں بیدم — ہو کیوں نہ فخر سخن اپنی شاعری صاحب
ہیں اپنی قدرتِ فکر بلند کے ناصر — مثال شوق ولی یعنی مولوی صاحب

غلام جیلانی بیدم کے تخلص کی تبدیلی کے بعد ان کے کلام کا نمونہ اس طرح ہے ۔

یار نے جب غزل تازہ سُنائی مجھ کو — صوتِ بلبل دہنِ غنچہ سے آئی مجھ کو
نگہت گل ہوں، قفس میں ہے مری خاطر جمع — ہے پریشانیِ دل تجھ سے رہائی مجھ کو
دشت میں شوخیِ آہو نہ سمجھ، کرتا ہے — ادب آموز جنوں، چشم نمائی مجھ کو
منقلب کار دوعالم نظر آیا رفعت
جب سے وہ نرگس جادو نظر آئی مجھ کو

اٹھ گیا رات جو اس ماہ جبیں کا پردہ — ہوگئی چادرِ مہتاب زمیں کا پردہ
نظر عشق سے محجوب نہیں جلوۂ دوست — پردۂ چشم ہے اس پردہ نشیں کا پردہ
شمع کافوریِ ساقینِ مصفا سے تری — پر پروانہ بنا دامن زیں کا پردہ
دیکھ کر اس مہِ تاباں کا زمیں پر جلوہ
پھٹ گیا مثل کتاں چرخ بریں کا پردہ

نئی عمر کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور اُن تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس ابتدائی زمانے کے کلام میں رفعت کی تعلّی قابلِ توجہ ہے۔

شاعری کو اس قدیم زمانے میں ایک فن سمجھا جاتا تھا اور اس فن کو سیکھنے کے لیے مشق ومزاولت کی اہمیت تھی۔ چنانچہ ابتدائی زمانے میں دوغزلوں، سہ غزلوں کا کہا جانا اسی سبب سے

ہے۔ اس مشاقی کا فائدہ یہ تھا کہ مشکل زمینوں میں بھی اچھے شعر کہہ لیے جاتے تھے۔ اسی قوتِ مشق نے معنی آفرینی کی راہ بھی دکھائی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس قدیم زمانے میں تعقید کو خواہ اس کی جو بھی صورت ہو بہت زیادہ معیوب نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ غلام جیلانی رفعت کے بعض شعروں میں بھی یہ صورت موجود ہے۔

نواب احمد علی خاں رند کے جو چند شعر ملے ہیں ان میں دو شعروں کا ایک قطعہ بھی ہے۔ بہ ظاہر اُس زمانے میں غزلوں میں قطعہ بند اشعار شامل کر دینے کے علاوہ الگ سے بھی قطعے لکھنے کا چلن ہو گیا تھا۔ غلام جیلانی رفعت نے بھی ایسے قطعے کہے ہیں چنانچہ ایک یہ بھی ہے۔

قطعہ

منھ پہ ہو یار، پشت پر ہو خدا　　　نہیں رہتی ہے پھر سیہ بختی
پیش وپس گر رکھو کسی کے دو شمع　　　پھر نہ دیکھو گے شکل سایے کی

شاعری کی روایتی اور عروضی پابندیوں کے ساتھ قطعہ میں کوئی بھی مفید مضمون نظم کیا جا سکتا تھا۔ افادیت کا تعیّن معمولاً اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے کیا جاتا تھا۔ قطعہ میں شعروں کی تعداد دو سے زیادہ بھی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ رفعت کے کلام میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

جیسا کہ مذکور ہوا رفعت اپنے زمانے کے مسلّم الثبوت استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ امیر مینائی نے عنبر شاہ خاں کو بھی ان کے شاگردوں میں شامل کیا ہے۔ ان کے علاوہ بعض اہم نام یہ ہیں:

حافظ حبیب النبی رقت　　نصیر الدین خاں صابر　　مولوی محمد غیاث الدین عزت

5- تسلیم

یہ بھی رفعت کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے بارے میں قدرت اللہ شوق نے تحریر کیا ہے:

"محمد کبیر خاں تسلیم ابن الامیر نبیرۂ رفعت دعوای نشاں بذ د خاں، جوان وجیہ سعادت نشان و بردبار خوش اخلاق، در نظم و نثر و انشا پردازی و شعر فہمی طاق، مجمع قابلیت و اہلیت.........ذہن صایب و رسا فکر مناسب و بجا دارد، اگر چہ گردشِ فلک

شعبدہ باز سفلہ نواز با او مساعد نیست، تاہم باوجود تفکرات دنیاوی ... بعد سالے

دماہے بہ تکلیف یاراں وتجویز دوستداراں غزلے مضبوط و مربوط بہم می رساند''۔ 11۔

احمد علی خاں شوق نے تسلیم کے دادا کا تعارف اور ان کے مدفن کا بیان اس طرح کیا ہے:

''محمد کبیر خاں تسلیم بڈ دخاں رئیس رام پور کے پوتے ہیں۔ جو امرائے نواب

غلام محمد خاں بہادر میں بڑے رتبہ کے آدمی تھے، قوم نبیر وال پٹھان رامپور میں

اشغال ہوا۔ 12۔

امیر مینائی نے تسلیم کی ولدیت، تلمذ اور تاریخ وفات وغیرہ کو اس طرح قلمبند کیا ہے:

''تسلیم کبیر خاں ولد محمد امیر خاں، مولوی غلام جیلانی رفعت کے شاگرد، مرد خوشگوار شاعری سے خوب ماہر، فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ ستر برس کا سن ہوا، 1251ھ (1825) میں قضا کی''۔

رامپور میں راج دوارہ میں پیلو والی مسجد کے برابر قبرستان میں کنکر کی قبر ہے۔ یہی محلہ ان کا مسکن ہے۔ اب اولاد میں کوئی نہیں ہے۔ تسلیم کے کلام کا انتخاب یہ ہے۔

اگر مدعا ہے مرا خوں بہانا   تو پھر کس لیے ڈھونڈتے ہو بہانا
ہوا سب کا تسلیم دشمن، نہ تو نے   کبھو دوست جانی نہ جانا نہ جانا
آپ کی دولت سے ہم اے آنسوو   اب تو آنکھوں سے بھی بیٹھے ہاتھ دھو
ہے بڑا نٹ کھٹ دلا مطرب کا طفل   اس کی بد قولی سے تو ایمن نہ ہو
ہم نشیں مت تنگ کر مجھ کو عبث   بات ہے کچھ اس دہاں کی گو مگو
اب تو اپنی جان سے تسلیم ہم   دل اُٹھا بیٹھے ہیں، ہونا ہو سو ہو

کھڑا ہو بات تو سُن لے مری تک او میاں بانکے
پڑا کیجیے کہاں تک پاؤں کہہ اس تیرے درباں کے
کیا ہے دیکھنے کو دل نے اس محبوب کے روزن
نہ دیکھو زخم کو سینے کے اے جراح تو ٹانکے

یہ تسلیم کی ابتدائی مشق کا کلام ہے۔ اس میں قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ تینوں غزلیں غیر

مردّف ہیں۔ شاعر نے قافیوں کی جستجو میں محنت کی ہے اور ان کے نظم میں لطف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

تسلیم نے بھی اپنے استاد اور بعض دوسرے شعرائے رام پور کے طریقے کے مطابق اپنی کچھ غزلوں میں قطعے بھی شامل کیے ہیں مثلاً۔

غیروں کے تو گھر جا جا تم باتیں بناتے ہو — پھر یہاں پہ جو آتے ہو کچھ اور بَن آتے ہو
منظور اٹھانا ہے میرا ہی مگر صاحب — غیروں کو جو تم ہر دم پاس اپنے بُلاتے ہو

قطعہ

انصاف بھلا کیجیے، کس طرح بنے تم سے — اس طور سے ہر اک پر غصے میں جو آتے ہو
گر بات کہے سیدھی تو ہوتے ہو ٹیڑھے تم — اور کاش کہ ٹیڑھا ہو تو سیدھی سُناتے ہو

اس غزل میں شاعر نے محاورات کو خوبی کے ساتھ صرف کر کے زبان و بیان پر اپنی حاکمانہ قدرت کا اظہار کیا ہے۔ اسے صنائع لفظی و معنوی کے استعمال کا بھی بہت شوق معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً صنعت تجنیس اور مناسبت لفظی سے اسے زیادہ دلچسپی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تسلیم نے اکثر الفاظ قدیمی روز مرّہ اور تلفظ کے مطابق نظم کیے ہیں۔ ساتھ ہی ان کے کلام میں بعض متروک الفاظ کا صرف بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا اپنے قطعے میں تسلیم نے کج خلقی اور ٹیڑھے پن کے عیب کا بیان کر کے بالواسطہ طور پر خوش معاملگی کی تلقین بھی کی ہے۔

6- طالب

یہ بھی شوق کے شاگردوں میں تھے۔ ان کے بارے میں شیخ مصحفی نے لکھا ہے۔

> "مولوی اللہ داد عرف حافظ شبراتی طالب تخلص، شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق، چشمش در ایام طفلی از چیچک رفتہ، باوجود نابینائی تحصیل علوم عربیہ نمودہ، فاضلے است متبحر و عالمے ست ..... مسکنش رام پور است عمرش چہل سالہ خواہد بود"۔14

شیخ مصحفی نے طالب کی دو غزلوں کے کچھ شعر نقل کیے ہیں۔ وہی یہاں نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔

دل سے اے نالہ، ہوئی صبح، بدر ہو اِس وقت
نور کا وقت ہے شاید کہ اثر ہو اِس وقت

ایک بھی تم نہیں دیتے، مری باتوں کا جواب
کس طرف دھیان ہے، فرماؤ کدھر ہو اِس وقت

ایک بوسے سے نہ تبدیل ہوا منہ کا مزہ
کیا مزہ ہے جو کرم بارِ دگر ہو اس وقت

بزمِ اغیار میں دیکھو ہو تماشا بیٹھے
کیا تماشا ہے جو طالب کو خبر ہو اس وقت

جی سے جاتا ہوں، مجھے تھام کسی صورت سے — کام دل دے بُتِ ناکام کسی صورت سے
قاصدا روز ہی وعدے کا بہانہ مت کر — لے پہنچ آج تو پیغام کسی صورت سے
نیکنامی میں تو حاصل نہ کیا کچھ میں نے — عشق اب کر مجھے بدنام کسی صورت سے
میں تو خوش ہوں کسی صورت پہ نہ بیمار طبیب — ہم کو ہوتا نہیں آرام کسی صورت سے
شکل ہے خوب کسی کی تو مجھے کیا طالب — میں تو رکھتا نہیں کچھ کام کسی صورت سے

حافظ شبراتی طالب کے بعض اوصاف اور ان کی عمر وغیرہ کا بیان امیر مینائی نے اس طرح کیا ہے:

> ''عالم باعمل، تقویٰ اور پرہیزگاری میں ضرب المثل تھے، تہجد گزار، شب بیدار، ملاحسن مرحوم کے شاگردوں میں نامور ہوئے، باوصف فقدانِ بصارت قوتِ بصیرت سے دور دور مشتہر ہوئے، خوش فکری ہر شعر سے ہویدا ہے، ستر برس کی عمر ہوئی، 29 رشوال 1275ھ (جون 1858) کو انتقال ہوا۔15

امیر مینائی نے ان کے کلام کا جو انتخاب اپنے تذکرے میں درج کیا ہے اس میں سے کچھ اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

جائے خوں سُرخیِ گُل تھی اس میں — چیر کر جب دلِ بلبل دیکھا
گریہ میں چشمِ تر سے دن رات چاہتا ہوں — بویا ہے تخمِ الفت، برسات چاہتا ہوں
کبھی آنسو سے کبھی لختِ جگر سے برسے — میری آنکھوں میں تو کچھ لعل گہر سے برسے

اشک امنڈے ہیں مرے ابر سے کہہ دے کوئی | آبرو چاہے تو ہٹ کر مرے گھر سے برسے
رات بھر نالے کیے ہم نے، تو دن بھر روئے | جس قدر شام سے گرجے تھے سحر سے برسے
مر کے بھی ہم نے سب کو دیکھ لیا | کوئی مرتا نہیں کسی کے لیے
نفس عیسوی نہ کر ممنون | ہم کو دو دن کی زندگی کے لیے
یہ ہجر کے صدمے وہ ترے وصل کے وعدے | جینے نہیں دیتے، مجھے مرنے نہیں دیتے

ان اشعار پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ شاعر کو بعض صنعتوں مثلاً رعایت لفظی وغیرہ سے بہت دلچسپی ہے۔ وہ اپنی قدرتِ کلام کے اظہار کے لیے لمبی اور مشکل ردیفوں میں بھی غزلیں کہتا ہے۔ اور ان میں بھی اچھے شعر نکال لیتا ہے، شعروں کے مضامین میں بھی بسا اوقات خاص قسم کی خود اعتمادی کا احساس پایا جاتا ہے۔ شاعر کو زبان پر قدرت تو حاصل ہے۔ لیکن اس کی لفظیات میں قدامت کا اثر نمایاں ہے۔

طالب بھی اپنے زمانے کے مسلّم الثبوت استادوں میں سے تھے۔ ان کے شاگردوں میں رام پور کے بعض معزز اور مؤقر لوگ بھی تھے۔ چنانچہ کچھ نام یہ ہیں:

صاحبزادہ محمد اسد علی خاں اسد، صاحبزادہ محمد شجاعت علی خاں شجاعت، نجف علی خاں نجف

حافظ شبراتی طالب نے اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ دیوان طالب کا ایک قلمی نسخہ بخط مصنف رامپور کی رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ جو دو سو پانچ اوراق پر محیط ہے۔

7-افسر

یہ تخلص ہے صاحبزادہ احمد یار خاں کا جو نواب محمد یار خاں امیر کے صاحبزادے تھے۔ امیر مذکور اپنے وقت کے مقتدر اور شعرا پرور امیروں میں سے تھے، قائم، فدوی، نعیم، پروانہ، وغیرہ ان کے دامن دولت سے وابستہ رہے تھے، بعد میں افسر نے بھی اپنے والد کی روایت کو قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ قائم وغیرہ ان کے ساتھ بھی رہتے تھے۔ بلکہ افسر نے تو قائم سے تلمذ بھی اختیار کر لیا تھا۔ قائم کے چلے جانے کے بعد افسر نے مولوی اللہ داد طالب سے اصلاح لینی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ امیر مینائی نے لکھا ہے:

''افسر صاحبزادہ احمد یار خاں بہادر ابن صاحبزادہ محمد یار خاں بہادر امیر...ان کے عم اکرم نواب محمد فیض اللہ خاں نے ان کے لیے سولہ ہزار روپیہ سال وجہ کفاف مقرر فرمایا....ابتدا میں قائم چاند پوری سے تلمذ تھا، آخر آخر حافظ شبراتی طالب سے بھی ان سے کچھ اصلاح لی۔ پچانوے برس کی عمر پائی، 28/ جمادی الاول 1262ھ (اپریل 1846) میں رحلت فرمائی۔ دو دیوان ان کے مرتب ہوئے تھے''۔16

احمد یار خاں افسر کے کلام کا انداز اس طرح ہے۔

قاصدا تو ہی بتا کون سا پیغام لکھوں ہوں میں گمنام، سرنامہ پہ کیا نام لکھوں
سیماب کی طرح سے بیتاب اک جہاں ہے تنہا نہ ایک میں ہی ہوں بیقرار تجھ بن
قدم حضرت کا ہے اب سر پہ افسر نہیں کچھ غم مجھے، رہتا ہوں مسرور

ان اشعار کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ احمد یار خاں افسر کے یہاں زبان اور بیان دونوں میں سادگی ہے۔ مطالب میں بھی کوئی دقت یا پیچیدگی نہیں ہے۔ فارسی کی ترکیبیں بھی وہ کم سے کم لاتے ہیں۔

8-غفلت

احمد خان غفلت بھی پرانے شاعروں میں سے تھے۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے اپنے تذکرے میں تحریر کیا ہے کہ:

''احمد خاں، قوم افغان یوسف زئی، ساکن رام پور، شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق، مصنف تذکرہ ریختہ گویان قدیم، جوان مہذب الاخلاق است، از اں شہر خود محض برائے ملاقات فقیر در لکھنؤ آمدہ بود، در قصاید و مثنوی داد معنی بندی می دہد، در طرحی مشاعرۂ ایں جا کہ گفتہ بود، انتخاب آں بہ نوک قلم می دہد، از دست 17۔

زخم بویا روشِ گل دلِ دلگیر میں تھا عطر کیا آب کی جا کہ تری شمشیر میں تھا
ساتھ ہی اس کے کھینچا ماہی نمط دل اپنا شست تھے شوخ کہ پیکاں نہ تیرے تیر میں تھا
آہ کیا کیجیے زبردستی گردوں کا بیاں درد پہونچایا وہ ہم کو جو نہ تقدیر میں تھا

گور اپنی پہ سدا مکڑی کا جالا ہی رہا
موئے پر دام میں ہوں جیتے جی زنجیر میں تھا
سر فرہاد جو خسرو نے منگایا غفلت
کیا کوئی کنگرہ کم شیریں کی تعمیر میں تھا
رہتی تھی زیست میں ہی نہ شام وسحر کھلی
ہے گور میں بھی جوں خُم نے چشم تر کھلی
نے بہر جود باز ہوئے نے پے طلب
جوں غنچہ اپنی مشت دکھانے کو زر کھلی۔
گریہ نے اپنے عقدۂ مشکل کو حل کیا
یہ طرفہ تر گرہ تھی کہ ہوتے ہی تر کھلی
بست وکشود کار میں اپنے رہا مدام
ایدھر دُھنویں کی طرح پڑی گانٹھ اُدھر کھلی
باغ جہاں میں غنچۂ تصویر کی طرح
غفلت یہ غافل آنکھ نہ آئی نظر کھلی''۔

شیخ مصحفی نے غفلت کے زمانۂ شباب تک کے حالات اور اس وقت تک کے کلام کی روشنی میں اپنے خیلات قلمبند کیے ہیں۔ امیر مینائی کا زمانہ بعد کا تھا۔ انھوں نے اپنے تذکرے میں زیادہ مفصل واقعات لکھے ہیں:

''غفلت تخلص، اخوندزادے احمد خاں مغفور ولد برہان الدین خاں مبرور، شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق کے تھے۔ بڑے مضمون آفریں، بڑے صاحب ذوق تھے، تعلّی مضامیں سے سرزمین سخن کو آسمان بنایا..., اکثر وطن میں رہے۔ چندے لکھنؤ تشریف لے گئے تھے۔ وہاں کے مشاعروں میں بھی شریک ہوئے تھے۔ چونسٹھ برس کی عمر پائی، یکم ذی الحجہ 1259 ھ (دسمبر 1844) کو رحلت فرمائی۔ مسودہ دیوان کا انھیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہاتھ آیا۔ وقت مطالعہ ہر رنگ میں ان کی طبع رسا کو قادر پایا''۔18

رامپور سے لکھنو جانے کا فائدہ یہ ہوا کہ غفلت کی شاعری وہاں کے طرز فکر و بیان سے متاثر بھی ہوئی لیکن بطور مجموعی رام پور کے ماحول کا اثر ہی غالب رہا۔ بعض الفاظ کا تلفظ بھی ان کے کلام میں قدیمانہ ہے مثلاً

جاگہ بجائے جگہ، ایدھر بجائے اِدھر، دھاں (واں) بجائے وہاں

تعقید کا عیب جو ان کے معاصروں کے کلام میں موجود ہے۔ ان کے شعروں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ رعایت لفظی سے انھیں بھی دلچسپی ہے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے ایک دلچسپ بات

لکھی ہے کہ:

"ان کے بیشتر اشعار میں مرنے کا مضمون ہوتا ہے"۔19

احمد خاں غفلت کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ایک دم ٹھہرا نہ اس آئینہ خانے میں کوئی — عکس کی صورت اِدھر آیا اُدھر جاتا رہا

منحصر جس میں تمام آفاق ہے — زلف ہے یا لام استغراق ہے

اسی میں دل ہے وہی اس دل حزیں میں ہے — مکان میں ہے مکیں اور مکاں مکیں میں ہے

سوزن سے ہوسکا نہ رفو اپنے زخم کا — پایا ہے کس نے فایدہ اپنے کمال سے

احمد خاں غفلت کے ان شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض وقت وہ "اشعار مدلّل" بھی کہتے تھے، یعنی ایک مصرعے میں دعوا اور دوسرے میں دلیل نظم کرتے تھے۔ یہ طرز بھی ان کے بعض معاصرین کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

اپنے ہم وطنوں اور ہم عصروں کی طرح غفلت بھی غزلوں میں قطعہ شامل کرتے تھے اور ان قطعوں میں کوئی مفید مضمون لاتے تھے، مثلاً

قطعہ

سکندر آے زمیں ناپنے جو تالب گور — صدا یہ کان میں آئی دہانِ تربت سے

بس اب نہ کیجیے گام ورسَن سے پیمائش — یہاں کی ہوگی مساحت جریب قامت سے

دیگر

آیا سوادِ نجد سے جو کوئی اس طرف — میں نے کہا کہ قیس کے کیا کیا نشاں ملے

کہنے لگا کہ لپٹے ہوئے برگِ بید سے — جوں تارِ عنکبوت کئی استخواں ملے

ان دونوں قطعوں میں عبرت کے مضامین نظم ہوئے ہیں اور اس اعتبار سے بھی یہ قدر کے لائق ہیں کہ ان قطعوں میں اگرچہ فارسی ترکیبیں آئی ہیں یہ بات توجہ طلب ہے کہ ایک بھی مرکّب ترکیب نہیں ہے اور زبان کم وبیش بول چال سے قریب تر ہے۔

احمد علی خاں شوق نے غفلت کے ذکر میں لکھ دیا ہے کہ "ان کے سینکڑوں شاگرد تھے"۔20 اس قول میں بہت زیادہ مبالغہ ہے۔ اس قدیم زمانہ میں رام پور میں کسی بھی شاعر کے پاس

درجنوں شاگرد بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ غور کیجیے تو اس ریاست میں شاعروں کی کل تعداد بھی سینکڑوں میں نہیں تھی۔ اُس زمانے میں وہاں شاعری کے لیے کم از کم ریاست کے نظام کے اعتبار سے ماحول سازگار نہیں تھا۔ شعر گوئی افراد کے ذاتی ذوق اور کاوش پر ہی منحصر تھی۔ بہر نوع غفلت اس زمانے کے معروف استادوں میں سے تھے اور کچھ شک نہیں کہ ان کے بعض شاگردوں نے اپنے علاقے میں نام پیدا کیا تھا۔ چنانچہ کچھ درج ذیل ہیں:

احمد اللہ خاں احمد	سید حسین شاہ افزوں	صاحبزادہ حاجی امداد علی خاں امداد
اخونزادہ محمد سعد الدین خاں شعور		مولوی محمد قیام الدین فرحت
صاحبزادہ عبدالقادر خاں قادر		غلام رسول خاں مشتاق

احمد خاں غفلت کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ جس کی ضخامت ایک سو تریپن ورق کی ہے رامپور کی رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔

9- ششدر

یہ احمد خاں غفلت کے ابتدائی زمانے کے شاگردوں میں سے تھے۔ چنانچہ مصحفی کے تذکرے میں لکھا ہے:

> ''میر شرف الدین ششدر ولد میر غیاث الدین، ساکن رامپور، شاگرد احمد خاں غفلت است، از کلامش نومشقی معلوم می شود، عمرش بست و چہار سالہ خواہد بود''۔ 21

اس نوعمری میں بھی شاعر کو اپنی قوت مشقی کے اظہار کا شوق تھا۔ چنانچہ قافیے کی تبدیلی کے ساتھ وہ دوغزلے اور سہ غزلے کہہ لینے کا بھی حوصلہ رکھتا تھا۔ چنانچہ ایک یہ ہے۔

نک جو آنکھوں سے ہوا میری وہ اوجھل باغ میں ۔۔۔ کیا ہی بیکل سا میں پھرتا تھا پڑا کل باغ میں
رشک سے نرگس ہو گئی خاک جل جل باغ میں ۔۔۔ شوخ مت جا تو لگا آنکھوں میں کاجل باغ میں
ایک تو ہم بیکلی سے مر رہے ہیں آپ آج ۔۔۔ دوسرے ناصح نے مارا کر کے کل کل باغ میں
گو کہ خوش ہوتا ہے سب کا میر سے دل باغ میں ۔۔۔ پر ہمیں روتے ہیں گل سے خوب مل مل کے باغ میں
مر گیے ہیں ہم کسی گلرو کی دوری میں صبا ۔۔۔ کر کسی صورت سے میری خاک داخل باغ میں
سیر کو جس دم گیا وہ باتجمل باغ میں ۔۔۔ کیا ہی شرمندہ ہوئے سب غنچہ و گل باغ میں

کیا تعجب ہے اگر ہوجائے اے ششدر کباب   سُن کے میرا نالۂ دلسوز بلبل باغ میں

اس سہ غزلے میں ردیف طویل نہ سہی مشکل ضرور ہے اور پھر تبدیلی کے باوجود قافیے بھی آسان نہیں ہیں۔ بااین ہمہ شاعر نے یہ سہ غزلہ مکمل کرلیا ہے۔ اس کی محنت اور کاوش لائق ستائش ہے۔ اس سے اس کی موزونیتِ طبع اور زورِ تخیل کا ثبوت ملتا ہے۔ امیر مینائی نے اس شاعر کی عمر اور تاریخِ وفات وغیرہ کا بیان اس طرح کیا ہے:

> ''ششدر تخلص، میر شرف الدین، ساٹھ برس کی عمر پائی، پچیسویں ذی الحجہ کو بارہ سو چوہتر ہجری (اگست 1858) میں قضا کی، کلام ان کا تلف ہوگیا''۔22

ان کا ایک مطلع یہ ہے۔

لے کے دل پوچھتے ہو نام مرا   اس تجاہل کو ہے سلام مرا

اوپر قدرت اللہ شوق کے چار شاگردوں اور ان میں سے ہر ایک کے ایک ایک شاگرد کا حال نمونہ کے طور پر تحریر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ شوق کے اور بھی کئی شاگرد رام پور میں موجود تھے۔ مثلاً مولوی شیخ غلام علی حرفت   حکیم احمد خاں فاخر، مرزا محمد عُرف کرم خاں کرم، غلام محمد خاں ماہر مولوی غلام قادر مسکین   ،میر محب علی مفلس،   حاجی گل محمد خاں وفا،   وغیرہ۔

ان میں سے ہر ایک کے کئی کئی شاگرد تھے اور اس طرح شہر رامپور میں غالب اکثریت میں ہونے کی وجہ سے وہاں کی شعری محفلوں میں انھیں کا غلبہ بلکہ تسلط رہتا تھا۔ جو کچھ اور جیسا کچھ بھی یہ کہتے تھے وہی اس زمانے میں وہاں کا طرزِ خاص مانا گیا۔ ان کے اثر سے اس شہر میں غزل گوئی کا رواج ہوا اور یہاں کے شاعر بیشتر دوغزلے اور سہ غزلے کہہ کر اپنی قدرتِ کلام کا اظہار کرتے تھے، ساتھ ہی قطعے بھی کہتے تھے اور معمولاً وہ قطعے مفید اور سبق آموز بھی ہوتے تھے۔

رام پور کی شاعری بطور مجموعی صناعی تھی اور اس صناعی کی کشش نے اس زمانے کے بعض معتبر استادوں کے شاگردوں کو بھی اس دارالریاست میں کھینچ لیا۔ ان کے اثر سے یہاں کی زبان کی اصلاح بیان میں بہتری اور فکر میں تنوع کی صورت پیدا ہوئی۔ ذیل میں ایسے ایک دو شاعروں کا حال تحریر کیا جاتا ہے۔

10-اظہر

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے سلسلے کے شاگرد تھے۔ مصحفی نے ان کے بارے میں اتنا لکھا ہے کہ:

''ساکن رامپور، جوانیست موزوں طبع... عمرش بیست وسہ سالہ است''۔23

امیر مینائی نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''اظہر تخلص، شیخ امین احمد ولد شیخ عزیز احمد، یہ بزرگ حضرت امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس سرہ کی اولاد امجاد سے تھے اور شیخ محمد بخش واجد شاگرد میاں مصحفی مرحوم سے اصلاح لیتے تھے۔ پینتالیس برس کی عمر ہوئی۔ بارہ سو بیالیس ہجری (27-1826) میں قضا کی''۔

طویل ردیفوں اور مشکل قافیوں میں غزلیں خوب کہہ لیتے تھے۔ عمر زیادہ نہیں پائی۔ ورنہ شاید نام پیدا کرتے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

بام پر وہ شکلِ مہ جس دم عیاں ہو جائے گا	جوں کتاں ہر ایک کا پھر امتحاں ہو جائے گا
سوزش داغ جگر یوں ہی رہی گر بعد مرگ	شمع ساں روشن مرا ہر استخواں ہو جائے گا
ٹک منہ تو دکھلاؤ صنم پھر ہم کہاں اور تم کہاں	اک دم کے ہیں مہمان ہم پھر ہم کہاں اور تم کہاں
اب پاس تو آؤ مرے ہوتے ہیں کوئی آن میں	ہم رہرو ملک عدم، پھر ہم کہاں اور تم کہاں
اس شب ہے اے جان جہاں اظہر تمھارا میہماں	ہے کوچ اپنا صبح دم پھر ہم کہاں اور تم کہاں

11-رافت

یہ شیخ قلندر بخش جرأت کے شاگرد تھے۔ مصحفی کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے۔ شیخ مصحفی کے تأثرات اس کے بارے میں یہ ہیں:

''میاں رؤوف احمد رافت پیرزادۂ سرہندی، جوان غریب و مسکین است، پیش ازیں چند سال در زمان عہد نواب آصف الدولہ از رام پور بہ لکھنؤ گذر افگندہ بہ ملاقات فقیر آمدہ بود، ارادۂ تلمذ در دل داشت...... کلام شکستہ بستۂ خود را بپاے خامۂ اصلاح من در آورد، بعد چند روز شاگرد جرأت شدہ، پیش عاصی برائے رخصت باز آمدہ، یک دو جزو از دیوان خود بر دست داشت، در مزاجش وجشع

وتلو نے بود، عمرش بی و چہار سال بہ سمع رسید"۔25

امیر مینائی نے ان کے حالات میں اتنا اضافہ کیا ہے:

"رافت خلف شاہ شعور احمد، یہ بزرگ خلفائے شاہ غلام علی میں بڑے صاحب تصرفات وکشف وکرامات تھے، پینسٹھ برس کی عمر پائی۔ راہ حرمین شریفین میں رحلت فرمائی"۔26

ان کے کلام کا انتخاب اس طرح ہے۔

غم یار ایسا ستانے لگا کہ جی تن سے گھبرا کے جانے لگا
رقیبوں سے مل مل کے وہ نازنیں مجھے خاک وخوں میں ملانے لگا

ہوئے جو چاہت کی اپنے چرچے تو اشک بھر آئے چشم تر میں
کنارہ کش ہو سبھوں سے بیٹھا، وہ اپنے گھر میں، میں اپنے گھر میں
ادا وانداز ، ناز وعشوہ جو کچھ ہے اس شوخ فتنہ گر میں
نہ وہ پری میں، نہ حور میں ہے، نہ ہے وہ غلماں میں، نے بشر میں
لگا نہ جراح اس پہ مرہم کہ داغ جاوے تو جائیں مرہم
یہ رکھتے ہیں سوختہ جگر ہم چراغ اُجڑے ہوئے نگر میں

جس نے بالوں میں ترے عطر بسا دیکھا ہے اس پہ آئی ہے بلا ہم نے بسا دیکھا ہے

کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو تجنیس اور ذو معنین وغیرہ صنعتوں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ چنانچہ اوپر کی غزلوں میں بھی زیادہ تر اشعار انھیں صنعتوں کی خاطر کہے گئے ہیں۔

وہ زمانہ تھا جب رام پور میں گویا شعر وسخن کی بساط بچھائی جا رہی تھی۔ اس وقت تک وہاں استادی شاگردی کی روایت بھی مستحکم اور عام نہیں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں وہاں کئی ایسے شاعر موجود تھے جنھوں نے کسی استاد کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا اور اپنی طبع سلیم پر اعتماد کر کے خود اپنے طور پر شعر گوئی میں مصروف تھے۔ ان میں سے بعض کا ذیل میں تعارف کرایا جاتا ہے۔

11-انور

امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''انور امام الدین خاں خلف غلام حسین خاں کسی کے شاگرد نہ تھے، 65 برس کی عمر میں ربیع الآخر کی بارھویں تاریخ بارہ سو انسٹھ ہجری (اپریل 1843) میں قضا کی۔ ایک دیوان ناتمام اور ایک مثنوی مختصر ملی۔ اس میں سے یہ کلام انتخاب کیا گیا''۔27

خط آنے پر ہوا ہے وعدہ بوسے کا ز بے طالع — خضر کے گھر میں ساماں ہے ہماری میہمانی کا
بعد مرنے کے کیا چاک جو سینہ میرا — خار ماہی کی طرح سینکڑوں خنجر نکلا
گو کہ وعدے پر نہ تھا اس کے یقیں تب بھی تو رات — کان تھے آواز پا پر، آنکھ تھی در کی طرف

قطعہ

دیر قاصد کے لگانے سے جو رات افلاک پر — میری آہوں کے دھوئیں اٹھ کر غبار آ سا گیے
دیکھنا شوخی، وہ بولا اب نہیں آنے کے طور — آسماں پر آپ کی قسمت سے بادل چھا گیے

انور کے کلام میں مقامی بول چال ملتی ہے اور کہیں کہیں زبان کے قواعد سے انحراف بھی ہے چنانچہ ''سینکڑوں خنجر نکلا'' میں ہے۔

13- ہمدم

ان کے بارے میں امیر مینائی نے تحریر کیا ہے:

''صاحبزادہ عبید اللہ خاں ہمدم تخلص ابن صاحبزادہ فتح علی خاں ...... یہ بزرگ آزادی مشرب غلبۂ ذوق میں شعر فرماتے تھے۔ واردات قلبی اس پردے میں زبان پر لاتے تھے۔ 27 محرم کو بارہ سو اکاون ہجری (مئی 1835) میں رحلت فرمائی۔''28

ان کے کچھ شعر یہ ہیں۔

عمر تھوڑی ہے نہ ڈر جائے کہیں اس خوف سے — داغ بھی اپنے کلیجے کے دکھا سکتا نہیں
نو گرفتار ہوں کچھ رسم مجھے یاد نہیں — اس لیے لب پہ مرے نالہ و فریاد نہیں
کس کو حالِ دلِ غمگیں میں سناؤں اپنا — قیس صحرا میں نہیں کوہ میں فرہاد نہیں

(ج) ریختی، واسوخت

اس میں شک نہیں کہ ریختی کی اصطلاح بہت قدیم نہیں ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسا کلام جس پر اس اصطلاح کا پوری طرح اطلاق ہوتا ہے دکن کے قدیم شاعروں۔ کے دواوین میں بھی مل جاتا ہے۔ چنانچہ علی عادل شاہ ثانی متخلص بہ شاہی کے کلیات میں غزل کے علاوہ مخمس جھولنا وغیرہ مختلف ہیئتوں میں بھی ایسا کلام دیکھا جاسکتا ہے۔ وقت کی بات ہے کہ شمالی ہند کے باکمالوں نے اس قسم کی شاعری کو فراموش کر دیا تھا۔ پھر ایک مدت کے بعد انشاء اللہ خاں انشا اور سعادت یار خاں رنگین کی طبیعت اس طرف مائل ہوئی اور انھوں نے نہ صرف اس قسم کے اشعار کہے بلکہ ان کے لیے ریختی کی اصطلاح کو بھی رواج دیا۔ رنگین کا یہ شعر اس سلسلے میں مشہور ہے۔

ریختی کہنی اجی رنگین کی ایجاد ہے　　　منہ چڑھاتا ہے مُوا انشا جیا کس واسطے

انشا اور رنگین کے وقت سے ریختی کے لیے عموماً غزل کی ہیئت متعین ہوگئی تھی۔ البتہ بعد کے شاعروں نے ریختی میں قصیدے وغیرہ بھی لکھے ہیں۔

اپنے مزاج کے اعتبار سے واسوخت کی صنف گویا ریختی کا جواب یا اس کی ضد کی حیثیت رکھتی ہے اور اس صنف میں شمالی ہند کے بھی بعض قدیمی شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ چنانچہ شاہ مبارک آبرو کے کلیات میں بھی واسوخت کے نمونے موجود ہیں۔ ریختی کی طرح واسوخت کو بھی

(ج) ریختی، واسوخت

اس میں شک نہیں کہ ریختی کی اصطلاح بہت قدیم نہیں ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسا کلام جس پر اس اصطلاح کا پوری طرح اطلاق ہوتا ہے دکن کے قدیم شاعروں۔ کے دواوین میں بھی مل جاتا ہے۔ چنانچہ علی عادل شاہ ثانی متخلص بہ شاہی کے کلیات میں غزل کے علاوہ مخمس جھولنا وغیرہ مختلف ہیئتوں میں بھی ایسا کلام دیکھا جاسکتا ہے۔ وقت کی بات ہے کہ شالی ہند کے باکمالوں نے اس قسم کی شاعری کو فراموش کر دیا تھا۔ پھر ایک مدت کے بعد انشاء اللہ خاں انشا اور سعادت یار خاں رنگین کی طبیعت اس طرف مائل ہوئی اور انھوں نے نہ صرف اس قسم کے اشعار کہے بلکہ ان کے لیے ریختی کی اصطلاح کو بھی رواج دیا۔ رنگین کا یہ شعر اس سلسلے میں مشہور ہے۔

ریختی کہنی اجی رنگین کی ایجاد ہے　　　منہ چڑھاتا ہے مُوا انشا جیا کس واسطے

انشا اور رنگین کے وقت سے ریختی کے لیے عموماً غزل کی ہیئت متعین ہوگئی تھی۔ البتہ بعد کے شاعروں نے ریختی میں قصیدے وغیرہ بھی لکھے ہیں۔

اپنے مزاج کے اعتبار سے واسوخت کی صنف گویا ریختی کا جواب یا اس کی ضد کی حیثیت رکھتی ہے اور اس صنف میں شالی ہند کے بھی بعض قدیمی شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ چنانچہ شاہ مبارک آبرو کے کلیات میں بھی واسوخت کے نمونے موجود ہیں۔ ریختی کی طرح واسوخت کو بھی

لکھنؤ میں بہت فروغ حاصل ہوا تھا۔ معمولاً واسوخت کے لیے مخمس اور مسدس کی ہیئت کو رواج حاصل ہوا ہے۔

اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی کے زمانے میں رامپور کی ریاست میں شعر و سخن عملاً تشکیل کی منزل میں تھی۔ چنانچہ ریختی اور واسوخت وغیرہ کے بھی جو نمونے ملتے ہیں اپنی نوعیت اور معیار کے اعتبار سے ابتدائی ہیں۔ پختگی کی صورت بعد میں پیدا ہو سکی تھی۔

1-ریختی

عنبر شاہ خاں آشفتہ کا ذکر غزل گو کی حیثیت سے کیا جا چکا ہے۔ ان کے کلام کے بارے میں امیر مینائی نے لکھا ہے کہ:

''معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت ظرافت کی طرف بہت مایل تھی، حتی کہ صاحبقران کے رنگ پر بھی کچھ کہا ہے مگر ہیچمدان نے بہ نظر تہذیب اس قسم کے اشعار میں سے کوئی شعر اس تذکرہ میں نہیں لکھا ہے''۔1

لالہ سری رام نے امیر مینائی کے اس بیان کی روشنی میں یہ لکھ دیا ہے کہ:

''کبھی کبھی صاحبقران کے رنگ میں ریختی بھی کہہ لیا کرتے تھے''۔2

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ صاحبقران ریختی گو نہیں تھے اور جو کلام ان کے رنگ میں ہوا سے ریختی کہنا خلافِ واقعہ بات ہوگی۔ امیر مینائی کا دعویٰ جو بھی ہو انھوں نے عنبر شاہ خاں کے جو چند شعر نقل کیے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔

کل انھیں عار نہ تھی اپنی ہم آغوشی سے   یا اب اک بوسے پہ سو طرح کی تکرار ہے آج

اس سے عنبر شاہ خاں کے طرزِ کلام کا اندازہ تو کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ طرز ریختی کا نہیں ہے۔

عبدالباری آسی نے آشفتہ کی شوخ مزاجی اور ظرافت کا ذکر کیا ہے اور ان کے نام سے یہ دو شعر نقل کیے ہیں۔

شرارت تھی بھری ہرجائی کی ایک ایک بوٹی میں
ہوئی سوکن گرفتار آخر اپنی ناک چوٹی میں

کوئی نوچ ایسے مُسلنڈے سے اپنے جی کو اُلجھا دے
مِری انگیا گئی ہوتی ابھی نوچا کھسوٹی میں

یہ دونوں شعر صاف ریختی کے ہیں۔ رام پور کا اس زمانے کا مخصوص ماحول اس صنف کے لیے سازگار تو معلوم ہوتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ آسی نے اپنے آخذ کی نشاندہی نہیں کی ہے۔

2-واسوخت

اس زمانے میں رامپور میں واسوخت کے نمونے بھی خال خال ملتے ہیں۔ اور وہ بھی ابتدائی نوعیت کے ہیں، مثال کے طور پر غلام جیلانی رفعت کا جو کلام امیر مینائی نے نقل کیا ہے اس میں دو بند واسوخت کے بھی شامل کیے ہیں، اس طرح۔

بند ہائے واسوخت

کیا عجب دن تھے کہ وصل یار حاصل تھا ہمیں — بے خلش اغیار کی، دیدار حاصل تھا ہمیں
سیرِ گل اور جامِ مُل ہر بار حاصل تھا ہمیں — ساز عیش و نغمۂ سرشار حاصل تھا ہمیں
یاد آن روزیکہ در میخانہ منزل داشتیم
جام مے بردست و جاناں در مقابل داشتیم

اب وہ صورت ہے جدائی اور تنہائی سے آہ — پیش و پس کوئی نہیں ہے یہاں بجز ذات اللہ
مونس و غمخوار بھی اپنے ہوئے ایک اک تباہ — اب نہیں آتا نظر کوئی جدھر کیجیے نگاہ
آن کہ می سوزد بہ درد من دلش جان من است
واں کہ می گرید بحالم چشم گریان من است

یہ دونوں بند اچھے ہیں لیکن محض ان سے نہ تو پوری نظم کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ہے اور نہ رفعت کو واسوخت لکھنے والوں کی صف میں شامل کر دینا مناسب ہے۔

(د) مثنوی

اس میں شک نہیں کہ غزل اردو شاعری کی جان ہے۔ لیکن انسانی زندگی کے مختلف مراحل اور مدارج میں قصے کہانی کی افادیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ نواب احمد خاں رند کے دور میں کہ جب وہ خود ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے، ان کی اہمیت زیادہ ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس ابتدائی زمانے میں بھی رام پور میں نظم ونثر میں قصے (مثنوی اور داستان) کے لکھے جانے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ بعض ایسے شاعروں نے بھی کہ جنھوں نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا تھا مثنوی میں طبع آزمائی کی تھی۔ اس زمانے میں لکھی جانے والی بیشتر مثنویاں مختصر تھیں اور معروف روایتوں، مشہور قصوں یا واردات اور واقعات پر مبنی رہی ہیں۔

1- اکرم

یہ اکرم فارسی کے صاحب تصانیف صاحب قلم تھے۔ چنانچہ امیر مینائی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''مولوی محمد اکرم ولد مولوی محمد نور بخش، شیخ صدیقی، ستر برس کی عمر پائی، رمضان کی پہلی تاریخ 1240ھ (اپریل 1824) میں رحلت کی۔ مولوی محمد نور گوپاموی کے شاگرد تھے۔ مولوی غلام نبی خاں ان کے پوتے سے معلوم ہوا کہ گلشنِ افضال، انشائے اکرم، مراۃ الرحمان، اور خالق باری اکرم، ان کی

تصانیف سے ہیں۔ایک شعر ان کی غزل کا اور دو شعر جنگ نامۂ ضابطہ خاں کے ہاتھ آئے''۔1

وہ جنگی معرکوں کا زمانہ تھا اور اس زمانے کے جنگی معرکوں کو اپنے اپنے وقت میں مختلف شعرا نظم کرر ہے تھے۔اکرم نے بھی رواج زمانہ کے مطابق ایک جنگ نامہ لکھا تھا،نمونہ یہ ہے۔

جنگ نامۂ ضابطہ خاں

نہ جانو اسے تم کہ وہ فوج ہے　　　وہ دریاے عماں کی اک موج ہے

حواس اس کے ایسے ہوئے باختہ　　　کہ شاہیں سے جیسے چُھپے فاختہ

اس نظم کا سال تصنیف وغیرہ کچھ معلوم نہیں البتہ ان دو شعروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک اچھی رزمیہ نظم رہی ہوگی۔

2-انور

امام الدین خاں نام،غلام حسین خاں ابن غلام جیلانی خاں کے بیٹے تھے۔انھوں نے اپنی تصنیف مجمع الکرامات میں اپنے حالات تفصیل سے لکھے ہیں جو مختصراً اس طرح ہیں:

''قوم افغان میں یوسف زئی تھے،میرے چچا اور والد کے حال پر شاہ درگاہی صاحب کی بہت عنایت تھی،میں نے بغیر تاکید آباء واجداد کے چند روز میں قرآن حفظ کر لیا۔(شاہ درگاہی نے)ایک روز اپنے منہ سے پان نکال کر مجھے کھلایا۔اس کی برکت سے میری گویائی ایسی ہوگئی کہ بچپن میں شجرۂ قادریہ کو جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

شاہ درگاہی ساجن کا پیر ہو　　　وہ بھلا کس بات سے دلگیر ہو

نظم کر کے پیش کیا۔بہت پسند فرمایا۔اس کے بعد شاعری کا شوق روز بروز بڑھنے لگا.....دو جلدیں دیوان فارسی کی اور تین مثنویاں اردو فارسی میں لکھیں۔ان کو ردّی کر دیا اور از سرِ نو دیوان مرتب کرنے لگا،اردو میں ابتدا سے انور تخلص تھا۔وہی قائم رکھا،فارسی میں امام تخلص اختیار کیا''۔2

انور نے مذکورہ شجرہ نقل نہیں کیا ورنہ وہ ان کے نوعمری کے کلام کا نمونہ ہوتا۔امیر مینائی نے ان کے کلام کے سلسلے میں لکھا ہے:

''تالیف ان کی بہت تھی مگر وقتِ تالیفِ تذکرہ ایک دیوان ناتمام اور ایک مثنوی

مختصر ملی"۔3

مذکورہ مثنوی کے چند شعر انھوں نے اس طرح تحریر کیے ہیں:

مثنوی فراق نامہ

عشق سے ہے زلف کا مصرع دراز　　عشق روئے حُسن کا آئینہ ساز
عشق ہے قفلِ دل تنگِ چمن　　عشق ہے بوئے گل ورنگِ چمن
عشق بازی کا سُنا چاہے جو حال
پوچھ انور سے کہ ہے اس کو کمال
دل کی سوزش سے وہی آگاہ ہے　　اُس کو اِس آتش کدے میں راہ ہے
لالہ ساں رکھتا نہیں عشرت کا جام　　خونِ دل پیتا ہے جوں غنچہ مدام
کون اس کا ہم نشیں غمخوار ہے
ایک پہلو میں خیال یار ہے

یہ تمہید کے اشعار ہیں اور اچھے ہیں لیکن محض ان چند شعروں کی بنیاد پر پوری مثنوی اور شاعری کی مثنوی نگاری کے بارے میں کوئی حکم لگا دینا مناسب نہیں ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ مثنوی فراق نامہ کا ایک قلمی نسخہ جو گیارہ اوراق پر محیط ہے رامپور کی رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ لیکن فی الوقت ہمیں اس تک رسائی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔

3-حیدر

حیدر تخلص ہے۔ صاحبزادہ غلام حیدر خاں رامپوری کا جو صاحبزادہ قاسم علی خاں ابن نواب محمد فیض اللہ خاں کے فرزند تھے۔ ان کے حال میں امیر مینائی نے لکھا ہے:

> "شاگرد میاں رفیع الدرجات نزہت، بچپن برس کی عمر ہوئی، 22 ذی الحجہ بارہ سو اٹھاون ھ (جنوری 1843) میں قضا کی، ایک مختصر مثنوی اردو مسمّٰی بہ یاقوتِ سخن ملی۔ اس میں سے چند شعر لکھے گئے"۔

مثنوی یاقوت سخن کا ایک قلمی نسخہ جس کی ضخامت اڑتیس ورق ہے، رامپور میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کا سال تصنیف 1227ھ (1812) ہے اور اس نسخہ کی

کتابت 1231ھ میں ہوئی تھی۔امیر مینائی نے اس کے صرف دو شعر اپنے تذکرہ میں نقل کیے ہیں۔اس طرح:

سراپا از مثنوی یاقوت سخن

وہ رخسار اس کے تھے آفت کے ٹکڑے　　　کیے تھے جس نے دل خلقت کے ٹکڑے
صراحی دار وہ گردن نمودار　　　جسے ہوں دیکھ کر سب مست ہشیار

ظاہراً یہ سراپا کا بیان تو اچھا ہے،اور اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مثنوی اسم با مسمّی ہے۔

4-رافت

رافت کا شاہ رؤف احمد نام تھا،وہ 14 محرم 1201ھ (نومبر 1785) کو مصطفےٰ آباد عُرف رام پور میں پیدا ہوئے تھے۔5 ان کے دادا نے تاریخی نام رحمان بخش (1201ھ) رکھا تھا۔علوم عقلی سے فارغ ہونے کے بعد شاہ درگاہی سے بیعت کی۔عبدالغفور خاں نساخ نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''ہر فن میں.....اُن سے ایک دو رسالے یادگار ہیں،یہ جمیع اصناف سخن پر قادر تھے''۔6

اور امیر مینائی کے تذکرے میں ہے کہ:

''ایک معراج نامہ نثر میں اور ایک یوسف زلیخا ان کی تصانیف سے ملی ہے۔''7

رافت کے منظوم معراج نامہ کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا ہے،البتہ امیر مینائی نے اس کا ایک شعر اس طرح نقل کیا ہے:

از معراج نامہ

نہ دست وہم پھونچے سایۂ اسرار کو اس کے　　　ظہور دو جہاں سایہ ہے جس شہ کے سراپا کا

اچھا شعر ہے،انتخاب اور بندشِ الفاظ اس قدیم زمانے کے اعتبار سے بہت خوب ہے، علاوہ ازیں یہ شعر تلاش مضمون تازہ کی بھی اچھی مثال ہے۔

رافت کی یوسف زلیخا کے جو اشعار امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں یہ ہیں۔

صفتِ عشق از مثنوی یوسف زلیخا

غمِ عشق جس دل کو حاصل نہیں   ہے اک پارۂ سنگ وہ دل نہیں

صفتِ زلیخا

سوا بدر سے گو کہ تھی خوش جمال   گھٹا کر غموں نے کیا تھا ہلال
سیاہی مو شامِ ہجراں ہوئی   ہر اک زلف خواب پریشاں ہوئی

غسل فرمودن حضرت یوسف علیہ السلام در دریائے رود نیل

پلا ساقیا مجھ کو جائے شراب   وہ پانی کہ ہو جس میں موتی کی آب
یہی ہے مری آبرو کی سبیل   لگا دے مرے لب سے دریائے نیل
نہانے کو جاتا ہے وہ سوے آب   کہ ہر نقشِ پا جس کا ہے آفتاب
خوشا روے پُر نور کی آب و تاب   ہوے برج خورشید سارے حباب
بنا آب حیواں سب آبِ رواں   تجلّی میں ہر موج تھی کہکشاں

شاعر نے کلام کو مختلف قسم کی صنعتوں سے آراستہ کیا ہے۔ تشبیہات اور تمثیلات سب برمحل ہیں۔ پوری مثنوی اگر موجود ہوتی تو قابلِ قدر ہوتی۔

اوپر کے تیسرے شعر میں لفظ نہانے کا تلفظ توجہ طلب ہے کہ اہلِ لکھنؤ نے اس کو بعد کے زمانے میں رواج دیا تھا۔

5- رفعت

دہلی کے نیشنل میوزیم میں اسلامیات کے موضوع سے متعلق ایک قلمی کتاب "نظمِ ہدایت" ہے۔ 8 مصنف کا نام مولوی غلام جیلانی ہے ان کے حالات رفعت تخلص کے ساتھ پہلے لکھے جا چکے ہیں۔ کتاب کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

کہہ دلا تو حمد اس خالق کی سب سے اوّلا   جس نے مشتِ خاک کے تئیں نعمتِ ایماں دیا

اور آخری شعر یہ ہے۔

یا الٰہی کر مری یہ سب دعائیں مستجاب   تا کہ ہوں جلدی ترے فضل و کرم سے کامیاب

ان شعروں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاعر کی زبان پر قدامت کا اثر غالب ہے

باوجود اس کے زبان کے انداز اور بیان کے طرز میں سادگی پائی جاتی ہے۔ اس مخطوطہ کا ترقیمہ اس طرح ہے:

"بالتمت تمام شد نسخہ متبرکہ مسمّی بہ "نظم ہدایت" در علم دین شرع متین، تصنیف سیادت و شریعت پناہ، معرفت و حقیقت آگاہ، مسالک خدا ادانی، اسوۂ بارگاہ ربانی مولانا مولوی غلام جیلانی دام فیضہٗ و عمّ نوالہ..... کاتبہ، بتاریخ یازدہم شہر ذیقعدہ 1263ھ (اکتوبر 1847)"۔9

کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا ہے البتہ ترقیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی وفات کے کوئی 30 برس بعد یہ نقل تیار کی گئی۔ مرتب فہرست نے ترقیمہ کے برخلاف کتاب کا نام "نظم الہدایت" لکھ دیا جو صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔ مخطوطہ کوئی ساٹھ اوراق پر محیط ہے۔

6-غفلت

اخوند زادہ احمد خاں غفلت کا بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے ایک مثنوی 1241ھ/1825 میں لکھی تھی جس کا نام ہے:

"فسانۂ رام و سیتا موسوم بہ ظفر کام"

اس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔

رامپور میں اس زمانے میں اور بھی کئی مثنویاں لکھی گئی تھیں، بعض جن کے قلمی نسخے رضا لائبریری میں موجود ہیں یہ ہیں:

نام مثنوی	مصنف	زمانۂ تصنیف	ضخامت	کیفیت
1-نور نامہ	امیر رامپوری	1250ھ/1834	۲۸ ورق	بخط مصنف
2-معجزہ نبیؐ	سید امیر شاہ رامپوری (برائے قلندر خاں	1250ھ/1834 کتابت 1254ھ 1838	۲۹ ورق	ایضاً
3-نسخۂ یاقوت	مولوی ناصر خاں رامپوری ناصر	1233ھ/1818	27 ورق	

ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں بھی رامپور میں مثنوی کی صنف سے بخوبی دلچسپی لی جا رہی تھی۔

(ہ) قصیدہ

رام پور میں نواب نصر اللہ خاں سلطانؔ اور پھر نواب احمد علی خاں رند عملاً خود مختار فرمانروا تھے۔ کچھ شبہ نہیں کہ وہ دونوں بھی اپنے دربار کی رونقوں کے خواہاں رہے ہوں گے۔ قیاس کہتا ہے کہ ان کی اور بزرگانِ مذہب کی تعریف میں بھی کچھ کچھ قصیدے لکھے گئے ہوں گے۔ امام الدین خاں انور کے حالات میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ انھوں نے اپنے بزرگوں کا شجرہ نظم کیا تھا۔ غلام جیلانی رفعت کے بارے میں قدرت اللہ شوق نے لکھا ہے کہ:

''دیگر قصاید و غزلیات پُر زور و بسیار دارد، تا کجا در حیز تحریر آرد''۔1

غلام جیلانی کے ممدوح کون لوگ تھے اور ان کے معاصرین میں سے کن کن شاعروں نے مدحیہ قصیدے لکھے تھے وغیرہ ان میں سے کوئی بات اب معلوم نہیں، امیر مینائی وغیرہؔ نے ضمناً بعض قصیدوں کی نشاندہی کی ہے۔

1-غفلت

اخوندزادہ احمد خاں غفلت کا ذکر کیا جا چکا ہے جو اپنے زمانے کے باکمالوں میں سے تھے، ان کے بارے میں امیر مینائی کا بیان ہے کہ:

''بڑے مضمون آفریں، بڑے صاحب ذوق تھے، تعلّی مضامین سے سرزمین سخن

کو آسان بنایا۔ مدح و قدح دونوں میں شعرائے سلف کا رنگ دکھایا"۔

احمد خاں غفلت کے جن قصیدوں کے اقتباس امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں ان میں سے بعض کے ممدوح کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کوئی نواب کی مدح میں ہے یا نہیں۔ ایک قصیدے کا عنوان اور اس کا ایک شعر اس طرح ہے:

"درمدح مولوی مفتی شرف الدین صاحب مرحوم

بسمل ہو زاغ جہل میانِ سوادِ شام　　پھینکے جو سوئے روم وہ تیر کمان علم

احمد علی خاں شوق نے ان مفتی صاحب کے بارے میں لکھا ہے:

"قوم سید علوی، پنجاب کے رہنے والے تھے۔ رامپور میں آ کر علم و فضل میں وہ شہرت حاصل کی کہ علمائے رام پور کا سلسلۂ علم آپ تک ختم ہوتا ہے۔ نواب سید احمد علی خاں صاحب بہادر نہایت عزت کرتے تھے۔ عہدۂ قضا آپ کے سپرد تھا، ....نواب سید احمد علی خان بہادر ایک بار دیوانہ بن گئے ....گھیا کے باغ میں قیام تھا۔ نواب صاحب کے متعلق جو انتظام اہل کاروں نے تجویز کیا اس میں مفتی صاحب بھی شریک تھے۔ سب کے خیالات سُن کر نواب صاحب نے اصلی حالت اختیار کر لی، مفتی صاحب بھی مثل دیگر اہل کار گرفتار ہوئے مگر آپ کے ولایتی شاگرد قید سے نکال کر لے گئے۔ رام پور سے لکھنؤ اور کلکتہ کا سفر کیا۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد رام پور آئے۔ نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں کہ یہ شرفی الدین تھے، شرف الدین نہ تھے اور سنت رسولؐ اللہ سے سب سے زیادہ بعید خلوق الٰہی میں یہ شخص تھا.....محب دنیا تھے"۔ 3

ان واقعات سے بالواسطہ طور پر غفلت کے نواب احمد علی خاں رند کی خدمت میں رسوخ کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ اخوندزادہ احمد خاں غفلت کا ایک دوسرا قصیدہ جو مولوی قدرت اللہ کی تعریف میں ہے اس طرح شروع ہوتا ہے:

"در شکایتِ زمانہ"

جہاں میں ہو نہ تنک مایہ کامیاب کبھی — کرے نہ دانۂ شبنم کو سبز ابر مطیر
سوائے قمرئ آتش نہ دے قفسِ آہن تکو — جو کوئی کھولے دہن لاکھ بار جوں گلگیر

اس قصیدے میں مدح کا انداز یہ ہے:

"درمدح مولوی قدرت اللہ"

اگر وہ جانب دریا نگاہ فیض کرے — ہوا سے پائے ترقی حباب کی تعمیر

غفلت نے اپنے قصیدوں کی تشبیب کے انداز اور مضامین میں بھی تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ایک اور قصیدہ کا آغاز انھوں نے تعلّی کے مضامین سے کیا ہے، اس طرح:

"در تعلّی خود"

ہوں وہ روشن طبع گر ہو مجھ سے روکش آفتاب — چرخ نظروں سے گرادے صورت تیر شہاب
ماہ کا دوران سر، خورشید کا رعشہ ہو دور — آئے گر سوئے طبابت اپنی رائے باصواب
گرم جولاں ہے جہاں میرا سمند فکر، وہاں — اُڑتی ہے گرد شکست رنگ ماہ و آفتاب

اس قصیدے میں شاعر نے اپنے ممدوح کے ہاتھی کی تعریف میں یہ شعر کہے ہیں:

"قطعہ در صفت فیل ممدوح"

حُسن و خوبی اس کے ہاتھی کی بیاں کیا کیجیے — مائلِ رفتار ہو جس وقت وہ رفعت مآب
دیکھ کر مستوں کو آئے ابر تیرہ کا خیال — گوشۂ مغرب میں جائے شب سمجھ کر آفتاب

یہ قصیدہ ظاہراً کسی صاحب اقتدار شخص کی مدح میں کہا گیا ہوگا۔

اپنے ایک اور قصیدہ کو غفلت نے نعتیہ اشعار سے شروع کیا ہے، اس طرح:

"در نعت"

زہے دیار مدینہ کہ جس میں آکر حور — نکالتی ہے بہشت بریں میں لاکھ قصور
غبار دشت کا اس کے بیاں ہو کیا عالم — مشام مشک سمجھتا ہے اور نگہ کا نور
شعاع مہر و رگ ابر میں نہ ہو تمیز — سحاب کا اگر اس کے سواد میں ہو مرور
جو وھاں کا قطرۂ آب زلال لال پئے — اگر وہ شرق میں بولے تو پہونچے مغرب میں شور
بہ شکل کاسۂ مجنوں پیالہ توڑے جم — جو نقش پا کا ترے ناقے کے سُنے مذکور

کو آسان بنایا۔ مدح و قدح دونوں میں شعرائے سلف کا رنگ دکھایا"۔

احمد خاں غفلت کے جن قصیدوں کے اقتباس امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں ان میں سے بعض کے ممدوح کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کوئی نواب کی مدح میں ہے یا نہیں۔ ایک قصیدے کا عنوان اور اس کا ایک شعر اس طرح ہے:

"درمدح مولوی مفتی شرف الدین صاحب مرحوم

بسمل ہو زاغِ جہل میانِ سوادِ شام   پھینکے جو سوئے روم وہ تیرِ کمان علم

احمد علی خاں شوق نے ان مفتی صاحب کے بارے میں لکھا ہے:

"قوم سید علوی، پنجاب کے رہنے والے تھے۔ رامپور میں آ کر علم و فضل میں وہ شہرت حاصل کی کہ علمائے رام پور کا سلسلۂ علم آپ تک ختم ہوتا ہے۔ نواب سید احمد علی خاں صاحب بہادر نہایت عزت کرتے تھے۔ عہدۂ قضا آپ کے سپرد تھا، ....نواب سید احمد علی خان بہادر ایک بار دیوانہ بن گئے ....کھیا کے باغ میں قیام تھا۔ نواب صاحب کے متعلق جو انتظام اہل کاروں نے تجویز کیا اس میں مفتی صاحب بھی شریک تھے۔ سب کے خیالات سُن کر نواب صاحب نے اصلی حالت اختیار کر لی، مفتی صاحب بھی مثل دیگر اہل کار گرفتار ہوئے مگر آپ کے ولایتی شاگرد قید سے نکال کر لے گئے۔ رام پور سے لکھنؤ اور کلکتہ کا سفر کیا۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد رام پور آئے۔ نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں کہ یہ شر فی الدین تھے نہ شرف الدین نہ تھے اور سنت رسول اللہ سے سب سے زیادہ بعید مخلوق الٰہی میں یہ شخص تھا.....محب دنیا تھے"۔3

ان واقعات سے بالواسطہ طور پر غفلت کے نواب احمد علی خاں رند کی خدمت میں رسوخ کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ اخوندزادہ احمد خاں غفلت کا ایک دوسرا قصیدہ جو مولوی قدرت اللہ کی تعریف میں ہے اس طرح شروع ہوتا ہے:

"در شکایتِ زمانہ"

جہاں میں ہو نہ تنک مایہ کامیاب کبھی — کرے نہ دانۂ شبنم کو سبز ابر مطیر
سوائے لقمۂ آتش نہ دے فلک اس کو — جو کوئی کھولے دہن لاکھ بار جوں گلگیر

اس قصیدے میں مدح کا انداز یہ ہے:

''در مدح مولوی قدرت اللہ''

اگر وہ جانب دریا نگاہ فیض کرے — ہوا سے پائے ترقی حباب کی تعمیر

غفلت نے اپنے قصیدوں کی تشبیب کے انداز اور مضامین میں بھی تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ایک اور قصیدہ کا آغاز انھوں نے تعلی کے مضامین سے کیا ہے، اس طرح:

''در تعلی خود''

ہوں وہ روشن طبع گر ہو مجھ سے روکش آفتاب — چرخ نظروں سے گرادے صورت تیر شہاب
ماہ کا دوران سر، خورشید کا رعشہ ہو دور — آئے گر سوئے طبابت اپنی رائے باصواب
گرم جولاں ہے جہاں میرا سمند فکر، وہاں — اُڑتی ہے گردِ شکست رنگِ ماہ و آفتاب

اس قصیدے میں شاعر نے اپنے ممدوح کے ہاتھی کی تعریف میں یہ شعر کہے ہیں:

''قطعہ در صفت فیل ممدوح''

حُسن و خوبی اس کے ہاتھی کی بیاں کیا کیجیے — مائلِ رفتار ہو جس وقت وہ رفعت مآب
دیکھ کر مَستوں کو آئے ابر تیرہ کا خیال — گوشۂ مغرب میں جائے شب سمجھ کر آفتاب

یہ قصیدہ ظاہراً کسی صاحب اقتدار شخص کی مدح میں کہا گیا ہوگا۔

اپنے ایک اور قصیدہ کو غفلت نے نعتیہ اشعار سے شروع کیا ہے، اس طرح:

''در نعت''

زہے دیارِ مدینہ کہ جس میں آکر حور — نکالتی ہے بہشتِ بریں میں لاکھ قصور
غبار دشت کا اس کے بیاں ہو کیا عالم — مشامِ مشک سمجھتا ہے اور نگہ کا نور
شعاعِ مہر و رگِ ابر میں نہ ہو تمیز — سحاب کا اگر اس کے سواد میں ہو مرور
جو دھاں کا قطرۂ آبِ زلال لال پئے — اگر وہ شرق میں بولے تو پھونچے غرب میں شور
بہ شکلِ کاسۂ مجنوں پیالہ توڑے جم — جو نقشِ پا کا ترے ناقے کے سُنے مذکور

اس قصیدے میں بھی شاعر نے ہاتھی کی مدح شامل کی ہے۔ چنانچہ دو شعر یہ ہیں:

''صفت فیل''

علوے شاں ترے ہاتھی کی ہو رقم کیونکر ۔۔۔ نمود ارض و سماوات ہے یہ جس کے حضور

گر اس پہ چڑھ کے تلے دیکھیے تو آئے نظر ۔۔۔ فرشتہ شکل عصافیر، آدمی جوں مور

احمد خان غفلت نے بہ گمان غالب نعتیہ قصیدے زیادہ لکھے تھے، ایک قصیدہ سودا کے مشہور قصیدے کی زمین میں بھی لکھا تھا، اس کے ابتدائی چند شعر یہ ہیں:

''در تمہید''

سلوک آفاق میں بے جوہروں سے کون کرتا ہے ۔۔۔ نہیں دیکھا کہ دے شمشیر جوہر کو کوئی پانی

کروں گر پیروی الیاس کی، وہ راہ گم کر دے ۔۔۔ جو بیٹھوں نوح کی کشتی میں تو ہو جائے طوفانی

فغاں ہے بخت بد سے ایک تو بیمار خواہاں ہوں ۔۔۔ بتاتے ہیں اطبائے زمانہ اس پہ خوبانی

''در نعت''

اگر یہ جانتا شیطاں کہ ہے آدم میں نور اس کا ۔۔۔ جھکا تا بہر سجدہ سب سے اوّل اپنی پیشانی

اگر اس کی زباں سے شکل عیسیٰ حرف قُم نکلے ۔۔۔ عدم سے آئیں سب غیر شریک ذات ربانی

ترا کیا عظم شاں کیجیے بیاں جب تیری اُمت سے ۔۔۔ کہے کوئی اَنا الحق اور بولے کوئی سبحانی

اُن مثالوں سے یہ حقیقت بخوبی سامنے آجاتی ہے کہ غفلت ایک قادر الکلام قصیدہ گو تھے۔ اور اپنے موضوعات کے اعتبار سے ان کے قصائد میں خاص تنوع پایا جاتا تھا۔ اپنی گونا گونی اور رنگا رنگی کے لیے ان کی تشبیہیں خصوصیت سے توجہ طلب ہیں۔ یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ اس ابتدائی دور میں قصیدے میں بھی ہر بات کو قطعیت کے ساتھ مدلّل انداز سے کہنے کی کوشش کی گئی ہے اور کلام میں طوالت سے احتراز بھی کیا گیا ہے۔

2-عبدو

اسی زمانے میں عبدو نام کا ایک شاعر ہوا ہے۔ اس نے نواب احمد علی خان رند کے والد نواب محمد علی خان بہادر ابن نواب محمد فیض اللہ خاں کے حالات نظم کیے ہیں۔ اس شخص کی نظم کے دو قلمی نسخے رضا لائبریری میں محفوظ ہیں۔ اس کا عنوان اس طرح ہے:

''واقعات نواب محمد علی خان بہادر''

ان میں سے ایک نسخہ سید امیر شاہ رامپوری کے ہاتھ کا 1233ھ (1818) کا لکھا ہوا ہے
اور تین اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ نظم اگرچہ قصیدہ نہیں ہے۔ اس میں نواب موصوف کا ذکر تعریفی
انداز سے کیا گیا ہے۔ اس لیے یہاں اس کا ذکر مناسب معلوم ہوا۔

(و) ہجو

عام طور سے قصیدہ (مدح) گویوں کے مقابلے میں ہجو کہنے والوں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ لیکن اس معمول کے برخلاف معلوم ہوتا ہے کہ نواب احمد علی خاں رند کے دور میں رام پور کی فضا ہجو کے لیے زیادہ مناسب اور سازگار ہوگئی تھی۔ نتیجہ کے طور پر اس صنف میں طبع آزمائی نسبتاً زیادہ کی گئی تھی۔

1-غفلت

امیر مینائی نے اخوندزادہ احمد خاں غفلت کے بارے میں صحیح لکھا ہے کہ انھوں نے مدح کے ساتھ قدح میں بھی اساتذۂ سلف کا رنگ دکھایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ہی سب سے زیادہ اور ہر قسم کی ہجویں لکھی تھیں۔

غفلت کی دو شخصی ہجویں امیر مینائی نے نقل کی ہیں۔ ان دونوں میں بات کو عمومی رنگ دے دیا گیا ہے۔ یعنی جس شخص کی ہجو کی گئی ہے اس کا نام وغیرہ بتا کر اس کی شخصیت کو متعین نہیں کیا گیا ہے:

(الف)-''مثنوی در ہجو جراح''

ایک ہے جراح در ملکِ عجم   لیتے ہیں قصاب سب اس کے قدم

گر کہیں باروت سے کوئی چلے | توڑ کر مکڑی کے انڈے کو ملے
انگڑے کے بدلے یہ پھونچائے ہاتھ | گھاد میں گھس جائے یہ سلائی کے ساتھ

(ب) ''مثنوی در ہجو قاضی''

مرد سے بولے کہ نہ کر دو (۲) نکاح | زن سے کہے چار ہیں شوہر مباح
بیاہ اگر کوئی جہاں میں کرے | مہر سے دونا یہ نکاحا نہ لے
کوڑی کوئی ہاتھ پہ اس کی دھرے | نوح کی کشتی میں یہ رخنہ کرے
دے کوئی ہندو، گر اسے ایک دام | گائے مسلماں پہ یہ کر دے حرام

ان مختصر ہجویات میں شاعر نے اپنے غم وغصہ کا اظہار کر دیا ہے۔ ان کی افادیت یہ ہے کہ ان کے واسطے سے یہ حقیقت ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئی ہے کہ اس قدیم زمانے میں بھی بعض پیشوں میں اناڑی اور ایمان فروش لوگ ہوتے تھے۔

دوسری قسم کی ہجویات وہ ہیں جن میں شاعر نے موسموں کی شدتوں اور تکلیفوں کا بیان کیا ہے۔ احمد خاں غفلت کی اس قسم کی بعض ہجویں یہ ہیں:

(ج) ''مثنوی در بیانِ شدّتِ سرما''

برد سے گم ہیں ساعت کے بھی ہوش | دیکھیے اب جس کو، ہے پنبہ بہ گوش
اپنے اپنے گھر میں اب پیر و جواں | آگ روشن کر کے بیٹھے غنچہ ساں
شمع سے ہے اُنسِ پروانہ غلط | سینکنے کو ہاتھ آتا ہے فقط
بسکہ ہے آتش سے ہر طایر کو ساز | پنقہ اور جگنو میں کب ہو امتیاز
آگ پر گرتا ہے عالم اس طرح | شمع پر دوڑے پتنگا جس طرح

(د) ''مثنوی در بیانِ شدّتِ بادِ تند''

ہے یہ امسال شدتِ صر صر | اُڑ گئے جس سے ہوشِ جن و بشر
اب محل یوں ہوا میں جاتا ہے | برج جیسے کوئی اُڑاتا ہے
مَردمِ دیدہ کی یہ ہے حالت | پُتلیاں ناچتی ہیں جس صورت
کیا میں دیوانوں کی کروں تقریر | وہ پتنگ اور ڈور ہے زنجیر

کیونکہ ہو فرقِ آہو وشہباز　　سب کی اوج ہوا پہ ہے پرواز
راہرو سے ہے قولِ نقشِ قدم　　دیکھیں چلتا ہے آگے تو یا ہم
اس نے بیدم کیے صغیر وکبیر　　نہیں صرصر، اجل کی ہے شمشیر
گر کوئی بوسہ لے کسی کا اب　　شکلِ گلگیر پُر ہو خاک سے لب
گر اطبا سے کوئی پوچھے دوا　　اس کو بتلائیں اب یہ خاک شفا

رامپور میں اس زمانے میں بعض وباؤں کا زور رہا ہوگا۔ شاعر نے اس سلسلے کے سانحات کی کیفیتوں کو بھی نظم کیا ہے چنانچہ ایک مثنوی یہاں درج کی جاتی ہے:

(ہ) ''مثنوی در بیان شدّتِ وبا''

کثرتِ امراض ہے اب اس قدر　　آسماں کو ہوگیا دورانِ سر
ہے کوئی بیمار بالائے سپہر　　صبح قارورہ جو لے جاتا ہے مہر
قطرۂ شبنم نہیں وقتِ سحر　　پتّی اُچھلی ہے گلوں کے جسم پر
کانپتا جو مہرِ پُر انوار ہے　　آگ پانی کا اسے آزار ہے
ہے عدم میں بھی مگر رنج ومحن　　سر سے باندھے غنچہ آتا ہے کفن
بحر میں گر دام مارے صید گیر　　جائے ماہی مُردہ ہوجائے اسیر

(و) ''مثنوی در بیان شدّتِ برف باری''

گرم جو حمام تھا شکلِ سعیر　　کردیا سردی نے اس کو زمہریر
صورتِ کافور آب سرد ہے　　بادہ میں تاثیر ماء الورد ہے
ہوگیا یک دست ٹھنڈا آفتاب　　جس طرح سے گجھے کا آفتاب
برف نے یکساں کیے یاقوت وسنگ　　ایک سا ئر خاب، بگلے کا ہے رنگ
پیر وبرنا کا کھلے کس طرح بھید　　برف سے دونوں کی ہے، ڈاڑھی سفید
برف میں ہے شکلِ عالم آشکار　　کینچلی میں جوں نظر آتا ہے مار

یہ چھوٹی چھوٹی سی ہجویں روایت کے مطابق سب مثنوی کی ہیئت میں ہیں اور اسی لیے شاعر نے ان کو خود بھی مثنوی کہا ہے۔ ان میں موضوع کی قباحتوں کا بیان مبالغے کے ساتھ کیا گیا ہے،

مقصود اس مبالغے سے پڑھنے (سننے) والے کے ذہن کو شدت سے متاثر کرنا ہے۔ بعض مثنویوں میں شاعر نے بات کو اچانک ختم کر کے بھی قاری کو سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے اور اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں بخوبی کامیاب ہے۔

2۔ کرم

مرزا ملکھو عرف کرم خاں کرم تخلص کا بھی غزل گو کی حیثیت سے ذکر کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے بھی ایک مختصر ہجو لکھی ہے:

''اشعار در ہجو آب کوٹہ''

پئیں گر خضر آکر یہاں کا پانی   تو پھر آخر ہے عمر جاودانی
بہشتی یہاں کے کرتے ہیں بڑا قہر   کہ پانی بیچتے ہیں گھول کر زہر
بجھائیں یہاں کے پانی میں جو تلوار   نہ مانگے اس کا مارا آب زنہار

کہا جا چکا ہے کہ رامپور میں وہ شعر وسخن کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس لیے زبان وبیان ہی نہیں مطالب میں بھی سادگی کی صورت ہے۔ اپنی بات کو آسانی کے ساتھ اور اختصار سے کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مدح اور قدح دونوں میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ طوالت اور رنگینی کا دور بعد میں آئے گا۔

(ز) متفرقات

1- چار بیت

امیر مینائی نے کریم خاں ولد بہادر خاں متخلص بہ خورشید کے بارے میں اطلاع دی ہے کہ:

> "اکثر چار بیت کہتے تھے، فن شعر میں صاحبزادہ کفایت سے تلمذ تھا، اسّی برس کی عمر میں 1254ھ (1838) میں قضا کی"۔1

افسوس کی بات ہے کہ انھوں نے خورشید کا ایک بھی چار بیت نقل نہیں کیا۔

> "چار بیت" رجز کی قسم کا کلام ہوتا ہے۔ جنگی معرکوں کے لیے جاتی ہوئی فوجوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہ دف پر گایا جاتا ہے۔ معظم عباسی نے اپنے جنگ نامے میں کہا ہے۔

بجاتے چلے سینکڑوں دف وہاں — پڑھیں چار بیت اور جنگی بیاں

یہ صنف اصلاً پشتو زبان میں تھی اور وہیں سے اردو میں آئی ہے۔ اسے رامپور کی خاص چیز سمجھا جانا چاہیے۔

2- مخمس

اپنی قدرت کلام اور قوت مشق کے اظہار کے لیے اکثر شعرا مخمس اور مسدس وغیرہ کہہ لیتے

تھے۔رام پور میں بھی بتدریج اس کا رواج ہونے لگا تھا۔

(1) صاحبزادہ غلام حیدر خاں

صاحبزادہ غلام حیدر خاں حیدر تخلص کا ذکر پہلے آچکا ہے۔امیر مینائی نے ان کے حال میں لکھا ہے:

"ایک تضمین غزل جرأت کی ہاتھ آئی، اس میں سے ایک بند منتخب ہو کر درج تذکرہ ہوا"۔2

مخمس بر شعر جرأت

اگر چہ صحبت اس عیار سے شب خوب بن آئی　　پہ وعدے وعدے ہی میں اس نے ساری رات بہلائی
طبیعت اپنی جب اس شوخ پر بیڈھب ہی للچائی　　شب اس نے توڑ کر موتی کی سرن ہم سے بنوائی
دکھایا وصل میں عالم نیا اختر شماری کا

(2) مولوی عبدالقادر چیف رامپوری

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے ان کے قلمی روزنامچہ کا جو فارسی زبان میں ہے تعارف کرایا ہے اور اسی کے واسطے سے بعد کے زمانے میں یہ معروف ہوئے۔مولانا عبدالباری آسی نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

"غمگین مولوی عبد القادر مرحوم متوطن رامپور کا تخلص ہے۔ نہایت جید عالم وفاضل تھے۔ مراد آباد میں عہدۂ جلیلہ صدر الصدوری پر ممتاز تھے۔ تذکرۂ صابر میں لکھا ہے کہ باوجود پیرانہ سالی کے ظرافت پسند تھے۔مگران کا کچھ کلام ظریفانہ درج نہیں کیا"۔4

امیر مینائی نے بھی ان کی ظرافت کا ذکر کیا ہے،ان کا بیان ہے:

"غمگین مولوی عبدالقادر خاں صدر الصدور خلف مرزا محمد کرم آشنا مغفور ساتھ علم وفضل کے شوخ طبیعت مزاج میں مزاح وظرافت۔ چودہ برس کے سن میں تحصیل کتب درسیہ سے فارغ ہو کر دستار فضیلت زیب سرکی۔ مدتوں عالم سیاحت میں بسر کی۔ سرکار انگلسیہ میں عمدہ عمدہ نوکریاں پائیں.....65 برس کی

عمر پائی، 1265ھ(1849) میں رجب کی ساتویں تاریخ زیرِ خاک آرام کیا۔ کہتے ہیں کہ عربی، فارسی، اردو، بھاکا، مرہٹی سب زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ایک خمسہ کا بند یہ ہے۔

خدمتیں ساری فراموش، شکایت اک یاد　　شہ میں ایک خطا کے ہمہ نیکی برباد
بندگی صاحب من خانۂ نیکی برباد　　گر نہادت ہمہ این است زہے نیک نہاد
در سرشت ہمہ این است زہے نیک نہاد

کہا جا چکا ہے کہ خمسہ گوئی سے معمولاً اپنی قدرتِ کلام اور قوتِ مشق کا اظہار مقصود ہوتا تھا۔ کچھ شبہ نہیں کہ رام پور میں ان دو کے علاوہ اور بھی شاعروں نے مخمسے لکھے ہوں گے۔

غمگین کی شوخی اور ظرافت کے ذکر کے باوجود اہلِ تذکرہ نے ان کے ظرافت آمیز شعر نقل نہیں کیے ہیں۔ آسی نے البتہ یہ دو شعر لکھے ہیں۔

جو مے رہی نہ تو شیشہ جھکا کے ساقی نے　　کہا یہ رندوں سے لیجے سلام شیشہ کا
بندہ کی طلب ہووے تو سرکار میں آوے　　خلوت میں نہ ہو حکم تو دربار میں آوے

3۔ مثلِ خالق باری

مولوی محمد اکرم کے حالات میں احمد علی خاں شوق نے ان کی تصانیف کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

"خالق باریِ اکرم مطبوعہ مطبع جعفری لکھنؤ میری نظر سے گذری ہے۔ ساٹھ صفحہ کی کتاب ہے، آغاز کتاب:

بول اے طوطیِ شکر گفتار　　کھول کر بحرِ خفیف میں منقار

مختلف بحروں میں لُغات کو مثلِ خالق باری نظم کیا ہے اور بہت سے لُغات جو عام لغتوں میں کم ملتے ہیں نظم کیے ہیں۔ اخیر میں دوازدہ بروج کے ہندی اور عربی نام سبعہ سیاروں کے مقام، مہینوں کے فارسی، ہندی، رومی، ترکی، عربی نام، چاند کا مقام جاننے کا طریقہ اوزان وغیرہ لکھے ہیں۔ خود ہی اس کی تصنیف کی تاریخ بھی کہی ہے:

"خالق باریِ اکرم"

جس سے 1205ھ نکلتے ہیں۔

''باری'' کے نیچے اگر اضافت کی صورت میں دو ''یا'' شمار کیے جائیں تو اس سے 1215 کے عدد برآمد ہوں گے۔ ظاہراً یہی یعنی (1215ھ=1800) اس کتاب کا سال تصنیف ہوگا۔ اس کتاب کو اس دیار میں لغت نویسی کے رجحان کا ابتدائی مظہر خیال کرنا چاہیے۔

(ح) تاریخ و معمہ

نواب احمد علی خان بہادر رند کے زمانے میں رام پور کے قادر الکلام شاعروں نے اپنے زمانے میں رونما ہونے والے قابلِ توجہ واقعات کے لیے قطعاتِ تاریخ کہنے شروع کر دیے تھے۔ وہ ابتدائی دور تھا۔ اس لیے معمولاً سیدھے سادے طریقوں سے تاریخیں کہی جاتی تھیں اور قطعے بھی بیشتر مختصر ہوتے تھے۔ ان قطعات سے اس زمانے کے حالات اور معاملات کی تفہیم میں خاصی مدد ملتی ہے۔

1- آشفتہ

اس ابتدائی زمانے کے، رام پور میں، سب سے زیادہ مشاق اور مقبول تاریخ گو عنبر شاہ خاں عنبر و آشفتہ تھے۔ انھوں نے اپنے بیشتر معاصرین کے مرنے کی تاریخیں کہی تھیں اور ان تاریخوں کو شہرت بھی ملی تھی۔ چنانچہ بعض تاریخیں تذکرہ انتخاب یادگار اور تذکرہ کاملان رامپور وغیرہ سے نقل کی جاتی ہیں:

(1) تاریخ وفات مولوی قطب علی استادِ عنبر

قطب علی کہ از سر اندوہ ماتمش　　　آشفتہ زلفِ حور نمط سنبلِ بہشت
چوں رفت سوے خلدِ بریں جہان پست　　　نالید از وفور غمش بلبلِ بہشت

تاریخ فوت سالِ نصیبش فزاے او
رضواں بگفت یاد نصیبش گلِ بہشت

1216ہجری=1801ء

ان مولوی قطب علی کے حالات بالکل معلوم نہیں ہو سکے۔ مادہ تاریخ بہت اچھا ہے۔ موقع کے لحاظ سے دعا کا مفہوم بھی ظاہر ہے۔ اسی تاریخ کی بدولت مولوی قطب علی کا نام اور یہ بات کہ وہ عنبر کے استاد تھے محفوظ و باقی رہ گئی ہے۔

(2) تاریخ رحلت نواب محمد نصر اللہ خان بہادر سلطان تخلص

یک ہزار و دو صد بہ بیست و پنج   بود از ہجرتِ رسولؐ گواہ
ماہ شوال بود بست و ششم   کہ بہ جنت رسید نصر اللہ

قطعہ بہت خوب ہے، صوری اور معنوی دونوں قسم کی تاریخیں اس میں ہیں اور تاریخ و ماہ کا بیان بھی کر دیا ہے۔ لیکن بڑی قباحت یہ ہے کہ چوتھے مصرع سے جو مصرع تاریخ ہے، 1215 کے عدد برآمد نہیں ہوتے ہیں۔ صحیح سال یعنی 1225ھ اسی صورت میں نکلے گا جب نصر اللہ کے بجائے ''نصیراللہ'' (حرف یا کے ساتھ) ہو۔ نواب نصر اللہ خاں کے حالات کا بیان شروع میں کیا جا چکا ہے۔

(3) قطعہ تاریخ ارتحال صاحبزادہ کفایت اللہ خاں کفایت تخلص

چوں زیب صدر ریاست کفایت اللہ خاں   وداع کرد جہاں، دل بجوش فکرت رفت
یک ہزار و دو صد سالِ ہجرت بست و ہشت   بہ بست و پنجم ماہ صفر بجنت رفت

1228 =28 + 1200

شاعر نے یہ صوری تاریخ کہی ہے اور سال کے ساتھ مہینے اور تاریخ کا بھی بیان کیا ہے۔ لیکن قطعہ کے کسی بھی مصرع سے جمل کے قاعدہ سے تاریخ برآمد نہیں ہوتی ہے۔ یہ کفایت جن کی وفات کا یہ قطعہ ہے ''صدر ریاست'' یعنی نواب نصر اللہ خاں سلطان کے صاحبزادے تھے اور باپ کے کوئی ڈھائی برس کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔

(4) تاریخ انتقال حکیم درویش محمد

آں مسیحائے زماں عیسیٰ قدسی انفاس — کہ نشانید بہ غم ماتم او افلاطوں
شیخ درویش محمد کہ ارسطا طالیس — رفت بربست ازیں منزل وشد خلد دروں
چوں دلِ نازکِ او از مطبِ دہر آشفت — بہرِ حکمت شدہ از مدرسۂ او ممنوں

بہرِ تاریخِ وفاتش جگرِ عنبر کرد
وائے از رحلتِ درویش محمد بیروں
17 - 1233=1250

شاعر نے تاریخ نکالنے کے لیے تخرجہ سے کام لیا ہے اور یہ تخرجہ اچھا ہے۔
یہ درویش محمد جن کی وفات کی یہ تاریخ ہے نواب احمد علی خاں رند کے طبیب تھے اور بقولے شاہجہاں پور کے رہنے والے تھے۔

(5) تاریخ وفات مولوی غلام جیلانی رفعت تخلص

چوں از دنیا جنابِ پاکِ رفعت — گذشت از غم، دلم اندوہگیں شد
نہ تنہا جانم از مرگش طپاں است — کہ جانِ عالم از فوتش حزیں شد
زباں در سوگ او پیوست باہم — جہاں در ماتمش باغم قریں شد
وجود پاک او از نیک ذاتی — جناں را بسکہ ہردم دلنشیں شد

ازاں بہرِ حسابِ سالِ فوتش
بتاریخش دلِ خلد بریں شد
1234ھ

رفعت اس زمانے کے معروف شاعر تھے اور ان کے حالات لکھے جاچکے ہیں۔

(6) تاریخ فوت شدنِ غلام فرید

چوں غلامِ فرید پاک سرشت — بہر گلگشت رفت سوئے بہشت
از پے یادگارِ سالِ وفات — کردم ایں بیت را بدل اثبات

نامِ نامیِ آں خجستہ خصال
گشت تاریخِ فوتِ او بے قال

نام تاری= غلام فرید قوال

1365 -131=1234ھ

بہت اچھی تاریخ ہے۔ تخرجہ بھی بہت خوب ہے۔ لیکن اس قسم کی تاریخیں معمہ کی حدوں میں پہنچ جاتی ہیں۔

(7) وفات میر غلام علی عشرت تخلص

چوں موسم بہاراں در بوستانِ دوراں	گل کرد از شگوفہ ناگاہ مرگ عشرت
از شورِ عندلیباں اندر چمن بہ شیون	تاریخ مُردنِ او شد آہ مرگ عشرت

1236ھ

واقعہ کا بیان بھی ہے اور وہی تاریخ بھی ہے۔ تخرجہ، تعمیہ کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ ایسے ہی بیساختہ مادوں میں توارد واقع ہو جاتا ہے۔

یہ انھیں غلام علی عشرت کی تاریخ ہے جنھوں نے میر ضیاء الدین عبرت کی ناتمام اردو مثنوی "پدماوت" کو مکمل کیا تھا۔

(8) تاریخ ارتحال مصاحب جنگ

چوں گذشت از جہاں مصاحب جنگ	رگِ جانم کشاد نشترِ آہ
وز پے استفسارِ سالِ وفات	از غمِ سینہ سوز شد بر آہ

1238 - 1=1237ھ

ان مصاحب جنگ کے بارے میں بس اسی قدر معلوم ہو سکا ہے کہ غلام جیلانی رفعت کی "ہشت خلد" کے ترتیب دینے والوں میں یہ بھی شامل تھے۔

2-انور

انور تخلص اور امام الدین خاں نام تھا۔ انھوں نے فارسی میں ایک کتاب "مجمع الکرامات" لکھی تھی۔ اس کی تاریخ خود انھوں نے اس طرح کہی تھی۔

سالِ ایں نسخہ را ہمیں جستند | قمر و آفتاب تا مرّیخ

پس از لوح قلم فرو خواند ند   فیض درگاہ قطب در تاریخ
1231ھ

ان کی کہی ہوئی کوئی اور تاریخ فی الوقت ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی ہے۔

3-غفلت

رامپور میں اخوندزادہ احمد خاں غفلت اپنے وقت کے باکمالوں میں سے تھے۔ جن کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ ع : سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

موقع اور محل کی مناسبت سے تاریخ بھی کہہ لیتے تھے۔

کریم اللہ خاں عرف مرزا لکھو کرم تخلص رشتہ میں ان کے ماموں ہونے کے علاوہ ان کے ہم عصر اور استاد بھائی بھی تھے، 7 ذی الحجہ 1253ھ (مارچ 1838) کو انھوں نے وفات پائی تو غفلت نے ایک طویل اور معلومات افزا قطعہ کی صورت میں تاریخ کہی۔

شاعرِ کامل و ذی حوصلہ ماموں صاحب   جن کو استاد کرم خاں کہے اعلا ادنا
متخلص بہ کرم نام کریم اللہ خاں   مجمع خوبی واہلِ ہنر و شرم و حیا
ایک استاد کے شاگرد تھے ہم وہ دونوں   تھا اس اتفاق میں دونوں کا برابر شہرا
مرضِ ضیق کی تکلیف اٹھائی دو سال   شصت و یک سال تلک کھائی ہوائے دنیا
آخر اس کو بھی نہ خوش یہاں کی اقامت آئی   تا ابد کوئی جہاں میں نہ رہے گا نہ رہا
سوئے اقلیمِ بقا ملک فنا سے جس دم   وہ سخن فہم جہاں رختِ سفر باندھ اٹھا
ظہر و یکشنبہ و ہفتم مہہ ذی الحجہ کی تھی   کہتے پھاگن تھے اسے ہند میں بیر و برنا

طلب اس خسرو ثانی نے کیا سال وصال
آئی ہاتف کی یہ آواز کہ خوش فکر موا

1253ھ

اچھا مادّہ ہے۔ نہ تخرجہ ہے نہ تعمیہ ہے۔ مادّہ سے واقعہ کا بھی پتا چلتا ہے۔ قطعہ میں شاعر نے مہینہ تاریخ دن اور وقت کے علاوہ مرنے والے کی عمر، نام تخلص، موت کی وجہ (= مرض)، خود سے اس کے تعلقات اور اس کی مختلف خوبیوں کا بھی بیان کیا ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ واقعہ

کے ہندوستانی مہینہ کا بھی ذکر کر دیا ہے۔

4-فرحت

فرحت تخلص اور اکبر شاہ خاں نام تھا۔ صاحب علم شخص تھے اور اپنے وقت میں معزز اور موقر بھی۔ غالباً نواب احمد علی خان بہادر کے مقرب بھی تھے۔ چنانچہ ان کے زمانے کی بعض تعمیروں کی بھی تاریخیں انھوں نے کہی تھیں۔ کچھ یہ ہیں:

(1) تعمیر کوٹھی خورشید منزل کی تاریخ

اُٹھا کر سر، ہوش زانو سے کہہ　　　بنا اک مرقع لیے تصویر کا

1231ھ

پہلے مصرع کے الفاظ سے تخرجہ کا گمان ہوتا ہے لیکن وہ صحیح نہیں ہے، دوسرے مصرع سے بغیر تعمیہ و تخرجہ کے تاریخ نکل آتی ہے۔

(2) خورشید منزل کے سامنے والی نہر کی تاریخ

بنی آگے کوٹھی و دالان کے　　　عجب نہر پاکیزہ، نزہت سرشت

میں تاریخ اس کی جو پوچھی، کہی　　　خرد نے کہ ہے نہر نہر بہشت

1232ھ

(3) باغ بے نظیر کی تاریخ

ہوئی تعمیر باغ نو جس دم　　　اور نام اس کا بے نظیر رکھا

دل نے روئے حساب سے تاریخ　　　کہی مجھ سے کہ بینظیر بنا

1233ھ=1225 + 8

یہ مادّے سب اچھے ہیں، اور شاعر کی خوبیِ فکر پر دلالت کرتے ہیں۔ البتہ زبان پر قدامت کا اثر نمایاں ہے۔ جس سے ثقالت کا احساس ہوتا ہے۔

5-کرم

مرزا ملکھو عرف کرم خاں کی وفات کا قطعہ اوپر لکھا گیا ہے۔ یہ بھی اپنے وقت کے اچھے تاریخ گویوں میں سے تھے۔ ان کی کہی ہوئی تاریخوں کی مثالیں یہ ہیں:

(1) وفات نواب غلام محمد خاں (حاجی حرمین شریفین)

ز دنیا سوِ خلد رحلت نمود چو نواب حاجی بیت الحرام
ریاض جناں گشت آرام گاہ بسالش خرد گفت رضواں مقام
1238ھ

بہت مختصر اور مکمل مادّہ ہے، جس میں تعمیہ یا تخرجہ کی بھی ضرورت نہیں۔ اس زمانے کے رواج اور مرنے والے کے مرتبے کے بھی مطابق ہے۔

(2) وفات مستقیم خاں وسعت تخلص

سنینِ رحلتِ وسعت کرم گفت نہم ز اول جمادی معدش خلد
1247ھ

مادّہ تاریخ اس اعتبار سے اچھا ہے کہ اسی سے تاریخ اور مہینہ بھی معلوم ہوجاتا ہے۔ لیکن پہلے مصرع میں لفظ "سنین" آیا ہے اس کی رعایت بھی ضروری تھی۔

6- کیفی

ان کا ایوب خاں نام تھا، شیخ احمد علی احمد کے شاگرد تھے۔ گمان غالب ہے کہ نواب احمد علی خاں بہادر کے مقرب تھے۔ کبھی کبھی تاریخ بھی کہہ لیتے تھے، چنانچہ ایک یہ ہے:

قطعۂ فارسی رحلت گھیا مطربہ مخاطب بہ امتیاز محل زوجۂ نواب احمد علی خان بہادر مرحوم

چوں رسیدش زخمِ مضرابِ قضا ماند چنگِ قدِ اوبے تارہا
خواستم تاریخ، گویم ناگہاں گفت زہرہ ارغنوں شد بے نوا
1250=57-1307ھ

مطربہ کے لیے یہ تاریخ بہت خوب ہے۔ واقعہ کی مناسبت سے شاعر نے متعدد رعایتیں بھی جمع کر دی ہیں۔ تخرجہ بھی بہت خوب اور حسب حال ہے۔

گھیا کا وجود بجائے خود بھی نواب احمد علی خان بہادر رند کے معاملات اور ان کے عہد کے حالات میں بہت معنی خیز تھا۔ اس کے باغ کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

معمّہ

تاریخ گوئی اور معمہ میں قریبی تعلق ہے۔ چنانچہ اوپر جو تاریخیں نقل کی گئیں ہیں ان میں سے بعض میں معمہ کا اثر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ معمہ کے لیے غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے اور نواب احمد علی خان بہادر رند تخلص کے رامپور میں اس فن کے فروغ کے لیے مواقع کمتر تھے۔ پھر بھی یہ صنف وہاں بیگانہ نہیں رہ سکی تھی۔ عبدالغفور خاں نساخ نے مولوی اللہ داد عرف حافظ شبراتی طالب تخلص کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"علوم عربی وفارسی میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ علم معما میں لاثانی تھے"۔[3]

افسوس ہے کہ نساخ نے ان کا ایک معمہ بھی نقل نہیں کیا۔

(ط) نثر

(الف) قصہ

غفلت

رامپور کے قرب و جوار میں اردو نثر میں قصے لکھے جا رہے تھے۔ خود رامپور کا ماحول بھی ان کے لیے موافق اور سازگار تھا۔ پھر وہاں اخوندزادہ احمد خاں غفلت جیسا باصلاحیت شخص موجود تھا۔ غفلت لکھنؤ تک کا سفر بھی کر آئے تھے۔ انھیں صرف محرک کی ضرورت تھی اور قسمت سے اس کی صورت بھی پیدا ہوگئی، کسی موقع سے نواب احمد علی خان بہادر رند نے غفلت کو طلب کرلیا چنانچہ خود غفلت نے لکھا ہے:

''ایک دن جو طالع سعید و بخت بیدار یار و انصار تھے، خاکسار نے حسب الطلب سرکار آستان، رفیع المکان، فلک نشان (=نواب احمد علی خاں رند) پر مسیح وار صعود کیا تو یہ فرمان آیا کہ غفلت اس نسخے کو زبان اردو میں تحریر کر کے شتاب موقف عرض میں پھونچا، اس ارشاد سے سر افتخار آسمان پر پھونچایا اور اپنے حوصلے کے مناسب جو کچھ ہو سکا لکھ کے حضور پرنور میں گزرنا، گرچہ شان عالی کے روبرو یہ نہایت ناچیز ہے، لیکن نوازش خداوندی سے وہ توقع ہے

کہ اگر ابروئے قبول کے اشارے سے ایک حرف بھی زینت پائے تو کتاب مسیحا

کی منسوخ ہوجائے، حَسبِیَ اللہ نعم الوَکیل نعم المولیٰ ونعم النّصیر"

غفلت نے رام اور سیتا کے قصے کو اردو نثر میں لکھا۔ نواب نے اس قصے کی کوئی روایت غفلت کو دے کر اسے اردو میں منتقل کرنے کے لیے کہا ہوگا۔ نواب نے اس قصے کا اردو میں انتخاب کیوں کیا تھا اس بارے میں وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ امکان اس بات کا بھی ہے کہ اس سے مقامی رعایا کی جو اکثریت میں تھی تعلیم وتربیت مقصود رہی ہوگی:

غفلت نے 1241ھ (=26-1825) میں اس کام کو مکمل کیا اور کتاب کے آخر میں یہ قطعۂ تاریخ کہہ کر شامل کیا۔

فسانہ رام وسیتا کا جو غفلت ہوا اک ماہ کے عرصے میں اتمام
زبس تھا ذکرِ فتح شہر لنکا کہی تاریخ ہاتف نے ظفر کام
1241ھ

اس قصے کے ایک سے زیادہ قلمی نسخے رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ کا جس کی ضخامت 97 ورق ہے، عنوان اس طرح ہے:

"فسانہ رام وسیتا موسوم بہ ظفر کام"

اس کتاب کو نواب کی خدمت میں پیش کرنا تھا اس لیے اس میں علمی لیاقتوں کے اظہار کے لیے عربی فارسی وغیرہ زبانوں سے اپنی واقفیت کا دکھانا اور زبان اردو کی انشاپردازی پر اپنی مہارت اور قدرت کو بھی ظاہر کرنا ضروری تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ عبارت میں تکلف اور تصنع کی صورت نمایاں ہوگئی۔ پھر بھی بطور مجموعی اس افسانے کی نثر میں روانی موجود ہے۔ چنانچہ ذیل کے اقتباس میں بھی ہے:

"جنک نے تعظیم زاہد سروقد کی اور ایک خلوت گاہ خاص میں لے گیا اور آہستہ پوچھا کہ یہ نوجوان کون ہے؟ اور لباس فقیری کیوں پہنا ہے؟ اس کی پیشانی سے اقبال بادشاہی روشن ہے، وشوامتر نے تبسم کرکے کہا کہ:

یہ صاحب قِران مقبول انام رام ہے، شمشیر زن اعدا شکن، اس کے

سامنے فیل جیوں مور، سیمرغ بہ شکل عصفور، شیر بسان روباہ، کوہ مثال کاہ، کچھ
حقیقت نہیں رکھتا۔ دیوزاد کا شر و فساد دفع کر کے عالم کو اس نے دلشاد کیا"۔

ایسے مواقع پر جہاں کسی کی توصیف مقصود ہے غفلت نے ترکیبوں اور فقروں میں قافیے کا التزام کیا ہے البتہ واقعہ کا بیان جہاں مقصود ہوتا ہے عبارت صاف اور سلیس ہوتی ہے۔ اس ابتدائی زمانے کے اعتبار سے غفلت کا یہ فسانہ قابلِ قدر ہے۔

(2)مذہبی نثر

رامپور کا ماحول شروع سے ہی مذہب پسند رہا ہے اور اس صورتِ حال کے وجود میں آنے کے لیے وہاں کے نوابین کے معاملات کو بھی دخل رہا ہے۔ نواب غلام محمد خان بہادر کے حالات میں مذکور ہے:

> ''ایک بار کوہستان میں ایک قلعہ لڑ رہا تھا اور آپ اس قلعے کے قریب پہاڑ پر ظہر کی نماز پڑھتے تھے، دو تین گولے سجدے کے مقام سے ہاتھ دو ہاتھ کے فاصلے پر گرے... جب آپ سلام پھیر چکے لوگوں سے کہا کہ جب تک آدمی کی موت نہیں ہوتی ہزار طرح چاہے رویاں میلا نہیں ہوتا، دیکھو میں نے ہر چند چاہا کہ نماز میں رتبۂ شہادت پاؤں مگر کچھ نہ ہوا''۔1

نواب محمد علی خاں کے قتل کے وجوہ میں بھی مذہب کا ذکر آتا ہے۔ ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ آخر وقت میں انھوں نے اپنے کمسن بیٹے نواب احمد علی خاں کو بلا کر وصیت کی کہ:

> ''میں امامیہ مذہب ہوں، اگرچہ جانتا ہوں کہ تجہیز و تکفین میری اس مذہب پر نہ ہو سکے گی مگر تم کو اپنے مذہب سے آگاہ کر دیا۔ پھر انھیں اس مذہب کی تلقین بھی کی۔ دوسری نصیحت یہ کی کہ تم نواب وزیر الممالک (= آصف الدولہ) کی سرکار

میں مستفیض ہو نا وہ ضرور تمھاری کمک کریں گے اور... وقت پاکر بہ طرز مناسب

میرے دشمنوں سے انتقام ضرور لینا''۔2

نواب احمد علی خان بہادر نے ریاست۔ کے اختیار حاصل ہونے کے بعد اپنے والد کی تلقین کو یاد کیا اور جتنا کچھ ممکن ہو سکا عمل کرنے کی کوشش بھی کی۔ ان کے دور میں مذہب امامیہ سے متعلق بعض کتابیں بھی لکھی گئی تھیں۔

1- سید حُسین علی

یہ نواب احمد علی خاں کے مقرب اور رامپور کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اردو نثر میں ایک کتاب ''تعزیت نامہ'' کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے سبب تالیف میں ہے:

''عصیان پناہ، معاصی دستگاہ، امید وار رحمت یزداں وشفاعت خواہ سرور مرسلاں، خاک پائے آل محمد، کترین اولاد علیؑ، بندہ حسین علی، متوطن شہر پُر سرور، مصطفٰے آباد عرف رامپور کا کہ... نواب احمد علی خاں... کو دوست باصفا، جناب امامین شریفین کا پاکر حالات شہدائے کربلا کے تئیں واسطے استفادہ عام کا اور ذریعۂ بہبود دنیا و آخرت کا بوجھکر بہ زبان ہندی فراہم کیا''۔3

مؤلف نے اس کتاب کے مضامین کو بارہ روضوں پر تقسیم کیا ہے، اس طرح:

روضۂ اول: دربیانِ وفات محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم
روضۂ دوم: ذکر وفات حضرت فاطمۃ الزہرا صلوٰۃ اللہ علیہا
روضۂ سوم: دربیانِ شہادت اسد اللہ الغالب علیؑ بن اَبی طالب
روضۂ چہارم: دربیانِ شہادت حضرت امام حسنؑ
روضۂ پنجم: دربیانِ شہادت حضرت مسلم بن عقیل
روضۂ ششم: دربیانِ شہادت فرزند عالی شان حضرت مسلم
روضۂ ہفتم: دربیانِ شہادت حضرت حُر بنؓ یزید ریاحی
روضۂ ہشتم: دربیانِ شہادت حضرت امام قاسم
روضۂ نہم: دربیانِ شہادت حضرت عباس

روضۂ دہم: در بیانِ شہادت حضرت علی اکبر

روضۂ یاز دہم: در بیانِ شہادت حضرت علی اصغر

روضۂ دوازدہم: در بیانِ شہادت جناب امام حسین

مولف نے اس کتاب کی تالیف کا یہ قطعۂ تاریخ دیباچے میں لکھا ہے۔

اسی غم میں جب فکر تاریخ میں ہوا سر بہ زانو، قلم کو اٹھا

جب آ عقل نے مجھ سے رو رو یہی کہا تعزیت نامۂ کربلا

1236ھ (1821)

کتاب تعزیت نامہ کی زبان اور طرز بیان کا مظہر یہ اقتباس ہے:

''راوی اس حکایتِ الم آسود اور حاکی اس داستان غم واندوہ کے نے ایسا لکھا ہے کہ دسویں سال ہجرت اور آخری ماہ ذیقعدہ کے سیدالانبیاءﷺ حج کو تشریف لے گئے اور حج ادا کیا۔ عرفات میں یہ آیت نازل ہوئی کہ مضمون اس کا یہ ہے: کامل کیا میں نے واسطے تمھارے تمھارا دین اور تمام کیں میں نے اوپر تمھارے نعمتیں اپنی اور راضی ہوا میں تم سے سبب اسلام کے اور دین کے''۔

ان مقاموں پر جہاں کسی مصنف کو کسی کی توصیف مقصود ہے عموماً فقروں میں قافیہ کا اہتمام کیا ہے۔ جہاں عبارت بیانیہ ہے، اکثر مضاف، مضاف الیہ اور فعل، فاعل کی ترتیب فارسی کے طریقہ کے مطابق لائے ہیں۔ مولّف نے عربی فارسی کے ادق اور نامانوس لفظوں کا بھی استعمال کیا ہے۔ کہیں کہیں اردو کے بھی ایسے الفاظ آئے ہیں جو بعد میں متروک ہو گئے مثلاً تئیں، بوجھ کر دغیرہ۔

کتاب تعزیت نامۂ کربلا کا ایک قلمی نسخہ 1268ھ (1852) کا لکھا ہوا رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ اس میں کل 103 ورق ہیں۔ اس کی عبارت کے بارے میں امتیاز علی عرشی نے لکھا ہے:

''اثنائے کلام میں مولّف نے غزلیں، مثنویاں اور فردیات بھی نقل کیے ہیں۔ غزلوں میں زیادہ تر حسین تخلص کی ہیں۔ جو بظاہر خود مولّف کا کلام ہے۔

کچھ نظمیں عشرت تخلص کی بھی ہیں۔ بعید نہیں کہ ان سے مراد میر غلام علی
عشرت بریلوی ہوں''۔

2-مولوی احمد یار خاں۔

یہ بھی رامپور کے رہنے والے تھے۔ کچھ مدّت کے لیے بھوپال میں جا کر ملازمت کر لی تھی، اردو نثر میں انھوں نے ایک مولود شریف بھی لکھی تھی جس کا نام تھا:

''رسالۂ احمدی در بیان مناقب محمدی''۔ 5

رضا لائبریری رامپور میں اس کے چند نسخے محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ کی کتابت 20 ربیع الاوّل 1246ھ (=ستمبر 1830) کو چوبیس اوراق پر مکمل ہوئی تھی۔ چنانچہ ترقیمہ کی عبارت اس طرح ہے:

''تمت تمام شد، کار من نظام شد، کاتب ایں حروف فقیر حقیر کمترین عباد اللہ عبد الرحمٰن بن مولوی محمد بن خواجہ خدا بخش انصاری ساکن قصبہ پانی پت است۔ وایں رسالہ از راہ مسودہ بہ نوکِ قلم آوردہ شد بتاریخ بستم شہر ربیع الاول روز پنجشنبہ سنہ 1246ھ دوقتِ نیم روز بہ انجام رسیدہ است۔ وایں رسالہ برائے خود نگاشتہ است''۔

احمد یار خاں کی اس کتاب کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے:

''حمد اور شکر اس ذات واجب الوجود کو لائق ہے کہ جس نے پہلے سب سے نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نور احدیت سے پیدا اور ذاتِ مطلق کو اسی صورت سے ہویدا کیا اور اسی نور سے تمام عالم کو ظہور میں لایا''۔

اور اس کے خاتمے کے جملے اس طرح ہیں:

''اللہ سب مسلمانوں کو توفیق خیر کی دے۔ خصوصاً اس رسالے کے جمع کرنے والے احمد یار خاں گنہگار کو اور سب لوگوں کو جو اس مجلسِ متبرک میں بہ سبب تعظیم وتکریم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے حاضر ہوتے ہیں، محبت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ان کی آل اور اصحاب کی دیوے اور مرادیں دینی اور دنیوی حاصل

کرائے۔آمین یارب العالمین''۔

کتاب کے نسخہ بمبئی میں اس کے ہر جز کو پارہ کہا گیا ہے اور ہر پارہ کے بعد قصیدہ بردہ کا یہ شعر لکھا ہے۔ 6

یَـارَبِّ صَـلِّ وَسَـلِّـم دَائِـمـاً اَبَـداً   عَلٰی نَبِیِّکَ خَیـرِالـخَلـقِ کُلِّهِم

3-رافت

رافت کا شاہ رؤف احمد نام تھا۔شیخ مجدد الف ثانی کی اولاد میں سے تھے۔امیر مینائی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''ذیقعدہ کی پچیسویں تاریخ 1240ھ تھے کہ راہ حرمین شریفین میں رحلت فرمائی۔ایک معراج نامہ نثر...میں لکھا تھا''۔7

عبدالغفور خاں نساخ نے ان کی وفات کی تاریخ اس طرح نکالی ہے۔

بہر تاریخ رحلتش نساخ ؛ شد رقم قدوۂ جنت رافت

1249ھ(=1833)

اور یہی زیادہ معتبر ہے۔احمد علی خاں شوق نے رافت کی نثری تصانیف کا بیان اس طرح کیا ہے۔

''تفسیر رؤفی بہ زبانِ اردو 1239ھ (1824) میں شروع کی اور 1248ھ (1832) میں ختم کی۔بمبئی (نامی پریس میں 1305ھ/ 1888) میں دو جلدوں میں طبع ہوئی۔8

کتاب دار المعارف (فارسی) میں ملفوظات شاہ غلام علی کے جمع کیے ہیں اور وہ چھپ گئی ہے...اس کتاب میں شاہ درگاہی سے اپنی بیعت وغیرہ کا حال قلمبند کیا ہے۔

نثر اردو میں ایک معراج نامہ بھی لکھا تھا اس کے علاوہ ارکانِ اسلام نو صفحوں کا رسالہ مطبع نظامی کانپور میں 1297ھ (1880) میں شائع ہوا ہے''۔

ان میں سے تیسری کتاب جسے عموماً معراج نامہ کہا گیا ہے۔اس کا نام ''مرغوب القلوب فی معراج المحبوب'' 9 ہے،اس کا آغاز ان جملوں سے ہوا ہے:

"طیارانِ عروجِ اخبار اور سیارانِ بلندی آثار نے وقت وقوعِ معراج میں آپؐ کے روایات متعددہ اور حکایات مُتنوّعہ لکھی ہیں۔ ربیع الاول میں بارھویں برس نبوت سے واقع ہوا۔ بعضے کہتے ہیں ایک برس پانچ مہینے پہلے ہجرت سے ہوا۔ اس تقدیر پر شوال کی گیارہویں تاریخ ہوتا ہے۔ ایک قول میں رجب کی ستائیسویں شب ہوا۔ اکثر محدثین اس قول پر ہیں۔ ایک روایت میں سترھویں رمضان کی ہے۔ بارھویں برس نبوت سے اور اکثر علماء و محدثین اس قول پر ہیں کہ شب دوشنبہ تھی اور اصل معراج میں کسی فرقۂ اسلامیہ کا اختلاف نہیں ہے"۔

کتاب کا خاتمہ منظوم ہے اور وہ مطالب کے اعتبار سے مناجات ہے۔ اس مناجات کے آخری اشعار یہ ہیں ؎

میں رافت ہوں بندہ ترا اے خدا — مرا اور سب اہلِ اسلام کا
کر ایمان، اسلام پر خاتمہ — طفیل نبیؐ و بنی فاطمہؓ
الٰہی ہزاروں درود اور سلام — پیمبرؐ پہ نازل تو فرما مدام
پھر آل اور اصحاب پر آپؐ کے — پھر ازواج واحباب پر آپؐ کے

دہلی کے نیشنل میوزیم میں بھی اس کتاب کا ایک مخطوطہ ہے۔ اس کے ترقیمے کی عبارت اس طرح ہے:

"مسمّیٰ بہ مرغوب القلوب فی معراج المحبوب، تمام شد نسخۂ معراج نامہ من تالیفات حضرت عمدۃ الاولیا۔ مولانا شاہ رؤوف احمد رافت، بتاریخ چہار دہم شہر رجب المرجب روز یکشنبہ وقت چاشت 1250ھ در بلدۂ دار الاقبال تال (بھوپال)، کاتب فقیر حقیر سید نجف علی...... باشندہ شاہجہاں آباد صورت اتمام بتاریخ دواز دہم ماہ شوال بوقت دوپہر 1264ھ تمام شد"۔10

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تالیف کا کام 14 رجب 1250ھ (=نومبر 1834) میں مکمل ہو گیا تھا۔

اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رامپور میں اس زمانے میں سُنّیوں کی تحریروں

میں شیعہ سُنّی اتفاق واتحاد کی کوشش کی جارہی تھی۔ دونوں عقیدوں میں جو باتیں مشترک ہیں جہاں موقع ہوتا تھا، ان کا ذکر کرتے تھے، چنانچہ مندرجہ بالا مناجات میں بھی یہ مصرع

ع طفیل نبیؐ و بنی فاطمہ

اسی قبیل سے ہے۔

رافت کی پہلی کتاب "تفسیر مجدّدی المعروف بہ تفسیر رؤفی" نے اپنے مصنف کے نام کو زندگی جاوید عطا کردی ہے۔ خود مصنف نے اس کی تکمیل کی تاریخ اس مصرع سے نکالی ہے ع

تفسیر قرآں ہندی زباں ہے

1248

یہ تفسیر بروز چہار شنبہ 11 ذیقعدہ 1248ھ (= اپریل 1833) کو مکمل ہوئی تھی اور بمبئی سے دو جلدوں میں اور پھر منشی نولکشور کے مطبع سے تین جلدوں میں چھپی تھی۔ کہا گیا ہے کہ اردو زبان میں یہی پہلی مکمل تفسیر ہے۔ جو سب سے پہلے زیور طبع سے آراستہ ہوئی تھی۔ اس تفسیر میں جن امور کا التزام کیا گیا ہے خود مولف کے لفظوں میں یہ ہیں:

> "سمجھ لیجیے کہ اس تفسیر میں جو معانی مسطور ہوں گے اِن شاءَ اللہ تعالیٰ کتب تفسیر سے یا بعضی جا مناسب مقام کے احادیث صحیحہ سے یا کہیں کہیں مسایل موافق آیہ شریفہ کے کتب فقہ معتبرہ سے مذکور ہونگے کہیں دخل اپنے ذہن کا نہ ہوگا، مگر اتنا کہ عبارت عربی اور فارسی کو زبان ریختہ میں بیان کرنا اور جس مقام پر کلام نظم لانا، وہ البتہ اپنی ہی طبع ناقص سے موزوں بنانا ہوگا، کوئی شعر ہندی کے شاعر کا کہیں نہ لایا جائیگا، اور مقام تصوف میں کتب معتبرۂ صوفیہ سے نقل کیا جاویگا، اور بعضی جا موافق اپنی فہمیدگی کے بھی بیان ہوگا، اور جس کتاب سے معانی منقول ہونگے وہاں نام بھی اس کتاب کا اگر مقام مشکل ہوگا تو لکھا جاویگا، اگر سہل ہویگا تو ترک کیا جاوے گا"۔

اس اقتباس میں جن امور اور اصولوں کا بیان کیا گیا ہے آج بھی اہلِ تحقیق ان پر کار بند رہنے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

تفسیر رؤفی میں زبانِ اردو کے لیے کہیں لفظ ریختہ اور کہیں ہندی آیا ہے۔ چنانچہ اقتباسِ بالا میں بھی یہ قدیم اصطلاحیں ہیں اور اُس زمانے تک رامپور اور بھوپال وغیرہ مراکز میں رائج رہی تھیں۔ اس کے برخلاف اخوندزادہ غفلت نے جو لکھنؤ تک کی سیر کر آئے تھے اس زبان کو اردو ہی کہا ہے۔

رافت کا زبانِ اردو میں ایک رسالہ ''ارکانِ اسلام'' کے نام سے بھی ہے۔ اس کے مطالب تو اس کے نام سے ہی ظاہر ہیں۔ اس کی ابتدائی عبارت یہ ہے:

''سب حمد و ثنا ثابت ہے واسطے خدا تعالیٰ کے اور درود اور سلام نازل ہو جیو اوپر ذات پاک کے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور جو جو اصحاب اقربا ان کے ہیں... بعد حمد و صلوٰۃ کے کہتا ہے فقیر رؤف احمد، بخشے اللہ تعالیٰ گناہ اس کے کہ بعضے لوگ جو علم سے بہرہ نہیں رکھتے ہیں، عربی فارسی ان کو سمجھنا مشکل ہے، ان کے واسطے کتنے مسئلے ضروری لکھے تا ڈھب ڈول ایمان اسلام کا جانیں اور کفر سے بچیں اور راہ دین وآئین کی پہچانیں''۔

اس رسالہ کا اختتام اس دعا پر کیا ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ مجھے اور سب مسلمانوں کو توفیق عمل کی کرامت فرمادے کہ کوئی مستحب اور سنت ترک نہ ہووے، آمین''۔

رافت کی ان تحریروں میں بعض الفاظ ایسے آئے ہیں جو اب متروک ہیں مثلاً تقدیر بمعنی قرینہ، انداز ہ، اور فہمیدگی بجائے فہم وغیرہ۔

رافت کو مُرادف اور قریب المعنی لفظوں کو یکجا کرنے کا بھی شوق معلوم ہوتا ہے جیسے ڈھب ڈول، ایمان اسلام، دین آئین۔

وہ کلمہ ''اور'' سے ایک کے بعد دوسرے جملے کو جوڑتے چلے جاتے ہیں۔ اب ایسے موقعوں پر ہر مختصر جملے کو الگ لکھتے ہیں تاکہ پڑھنے اور سمجھنے میں سہولت ہو۔ بطور مجموعی رافت کی زبان قدامت کے اثرات کے باوجود بہت صاف سلیس اور سادہ ہے۔

جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں رافت کی ایک اور کتاب ''ترجمہ حصن حصین'' 11 کا

قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ مترجم یعنی رؤوف احمد رافت نے اصل کتاب کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''کتاب حصن حصین تالیف استاد متاخرین محمد بن الجزری کہ جامع ادعیۂ ماثورہ اور صحاح اخبار ہے۔ لیکن ہندوستان والوں، کم پڑھوں کو سمجھنا اس کا بہت دشوار ہے۔ اس واسطے زبان ہندی میں ترجمہ اس کا لکھتا ہوں تاکہ ہر ایک کو جو دعا جس وقت میں کہ پڑھنے کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے ہیں بہ لحاظ معنی اس وقت میں پڑھے''۔

مترجم نے اس کتاب میں اپنا سلسلۂ نسب بھی اس طرح بیان کیا ہے:

''رؤوف احمد بن شعور احمد بن محمد شریف بن رضی الدین بن زین العابدین بن شیخ محمد یحییٰ بن مجدد الف ثانی:

شاہ محمد یحییٰ چوتھے فرزند مجدد الف ثانی کے تھے۔''

اصل کتاب شروع کرنے سے پہلے مترجم نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔ اس کی کیفیت انھیں کے لفظوں میں اس طرح ہے:

''پہلے ترجمہ لکھنے کے تعریف حدیث کی اور اقسام اس کی اور احوال بعضے مصنفین کا ایک مقدمے میں واسطے سمجھانے عام کے لکھتا ہوں''۔

آغاز اس کتاب کا اس طرح ہے:

''حصار محکم واسطے امن پانے کے لشکر دیو لعین سے، تحمید اس کی ہے کہ جو حیٔ سے ہے۔ حاکم ہے، حکیم ہے اور قلعۂ اعظم جہت پناہ پکڑنے کے افواج اعدائے دین سے، تقدیس اس کی ہے کہ جو قدوس ہے، قادر ہے، قدیم ہے''۔

اور خاتمہ کتاب کا اس طرح ہے:

''اور بعضوں نے کہا ہے کہ من واسطے ابتدا کے ہے اور متعلق ہے ساتھ ''ینفع'' کے، یعنی نفع نہیں کرتی ہے، توفیق طاعت اور عبادت کی۔ بعضوں نے کہا ہے کہ جد بمعنی پدر ہے یعنی نفع نہیں کرتے نزدیک تیرے نسب اور شرف اب۔ بلکہ نفع کرتے ہیں''۔

4-رقّت

رقت تخلص، مولوی حبیب الٰہی ابن ضیاء الٰہی، غلام جیلانی رفعت کے شاگردوں میں ممتاز تھے۔امیر مینائی کے تذکرے میں ہے کہ:

"مولوی جمال اور مفتی محمد شرف الدین سے کتب درسیہ پڑھیں اور علم تفسیر و حدیث کی سند مولوی نور الاسلام سے حاصل کی۔ ترپن برس کی عمر پا کر 4 رجب 1261ھ (= اگست 1845) کو رحلت فرمائی، دیوان ان کا تلف ہو گیا"۔12

اردو نثر میں ان کی دو کتابیں ملتی ہیں۔ پہلی "تحفۂ احمدی یا رقت افزا" ہے۔اس کے نام کا پہلا جزو نواب احمد علی خاں رند کے نام کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسرا جزو خود مصنف کے تخلص سے مطابق ہے۔مصنف نے اس کے سبب تالیف میں لکھا ہے:

"تحفۂ حمد و ثنا کا پیشکش اس ذات کے ہے کہ وہ...شریک انباز سے منزا ہے، صمد، احد، فرد، یکا اکیلا ہے، بے چون اور بے چگون ہے، بے شبہ، بے نمون ہے، دریائے قدرت میں اس کے، آسمان ایک حباب ہے، شعلۂ حسن و جمال اس کے سے، آفتاب اور ماہتاب ایک تاب ہے.... بعد حمد و ثنا کے خاک پا رسول اللہ کا اور گرد اُن کی راہ کا حبیب الٰہی ابن ضیاء الٰہی متخلص بہ رقت عفی اللہ عنہ ولوالدیہ یوں عرض کرتا ہے...کہ میں نے تھوڑا احوال آں سرور کا اور حضرت شاہ (= علیؓ) کا اور حضرت زہراؓ کا اور حضرات حسنین کا مع شہدائے کربلا اس کتاب میں لکھا ہے کہ ہر آدمی اس کو دیکھے اور پڑھ کر روئے اور تعویذ جان کا کرے، اور خدا مجھ سے راضی ہووے اور برکت ان کی سے آلائش گناہوں کی میرے دل سے دھووے"۔

کتاب تحفۂ احمدی میں دس "ماتم کدہ" یعنی ابواب ہیں اس طرح:

ماتم کدہ پہلا: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال میں

ماتم کدہ دوسرا: حضرت سیدۃ النسا کے احوال میں

ماتم کدہ تیسرا: حضرت مرتضیٰ علی شیر خدا کے احوال میں

ماتم کدہ چوتھا: حضرت امام حسن کے احوال میں

ماتم کدہ پانچواں: حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت میں

ماتم کدہ چھٹا: ان کے فرزندوں کے احوال میں

ماتم کدہ ساتواں: امام قاسم کے احوال میں

ماتم کدہ آٹھواں: حضرت عباس علی کے احوال میں

ماتم کدہ نواں: حضرت علی اکبر کے احوال میں

ماتم کدہ دسواں: حضرت امام حُسین کے احوال میں

اس کتاب کا جونسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ اس کا تعارف کراتے ہوئے امتیاز علی خاں عرشی نے لکھا ہے:

> ''مولف نے جابجا اپنے اشعار سے نثر کو آراستہ کیا ہے۔ ہر ماتم کدے کے خاتمے میں نواب (احمد علی خاں) صاحب کے لیے دعا کی ہے۔ جس میں خصوصیت کے ساتھ اولاد نرینہ کے ہونے کا ذکر ہے۔... بہ ظاہر وہی نسخہ معلوم ہوتا ہے جو مولف نے نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا''۔14

مولوی حبیب النبی رقت کی اس کتاب کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس زمانے میں رامپور کے عام سُنی مسلمان ہی نہیں علما بھی ماتم اور بکا کو وجہِ ثواب سمجھتے تھے اور ان عملوں میں دوسروں کے شریک بھی رہتے تھے۔

رقت کی دوسری کتاب کا ذکر کرتے ہوئے حافظ احمد علی خاں شوق نے لکھا ہے کہ:

> ''قصیدہ طحاویہ کی آپ نے بہ زبان اردو بسیط اور مدلل شرح لکھی ہے''۔15

اس شرح کے بارے میں تفصیلات حاصل نہیں ہوسکیں۔ بہ گمان غالب اب یہ نایاب ہے۔

5-ملاّ محمد عمران

ملاّ محمد عمران اپنے زمانے کے رامپور کے نام برآوردہ عالم مولوی محمد غفران مصطفا آبادی کے فرزند اور خود بھی صاحب تصنیف شخص تھے۔ مولوی محمد حیدر کے ساتھ یہ رامپور سے کلکتہ تک 1230ھ (=1815) میں گئے تھے۔ اردو نثر میں ان کے ایک سے زائد رسالے یادگار ہیں:

الف۔رسالہ تجہیز وتکفین

یہ ملا عمران کے دستیاب رسالوں میں سے پہلا ہے۔اس کے سبب تالیف میں انھوں نے لکھا ہے:

"بعد حمد اور صلوٰۃ کے بندہ کثیر العصیان، ضعیف البنیان محمد عمران...
متوطن شہر مصطفیٰ آباد عُرف رامپور کا کہنا ہے کہ ایک شخص محتاج بظاہر خوار وبے اعتبار، اور حقیقت میں دیانتدار اور تقویٰ سے آراستہ کمال ایماندار، رہنے والا دار الامارۃ کلکتہ کا، بنگالی الاصل، شب و روز قال اللہ وقال الرسول کی طلب میں سرگرم لیکن بہ سبب تقدیر الٰہی کے ...علم سے بے بہرہ تھا، جس کو سنتا کہ وہ عالم، فاضل، پرہیزگار، دیندار، مقبول درگاہ الٰہی کا ہے اس سے جا کر استفادہ کرتا اور جو کچھ شک وشکوک مسائل دینی میں ہوتے پوچھتا...ایک روز (مولانا سے) بولا کہ حضرت، ہم کہاں تک مسائل پوچھ سکیں گے، علم دریا ہے....التماس بندے کی یہ ہے کہ مسایل مسلمان کی تجہیز و تکفین کے ...اگر اردو زبان میں مذکور ہوں تو نہایت فیض عام اور قریب فہم عوام ہوں، حضرت مولانا (محمد حیدر علی) صاحب نے یہ سن کر...اس عاجز کو ارشاد فرمایا کہ تو یہ مسائل فقہ کی معتبر کتابوں سے نقل کر کے بطور ایک رسالے کے جمع کردے تاکہ فیض عام اور فایدہ تام ہو جاوے، پس بندے نے.....جو مسئلے متفق علیہ تھے سب لکھے اور جن مسئلوں میں اختلاف علماء کا تھا اس کو مع اختلاف کے ذکر کیا....پھر موافق سوال طالب مذکور کے اس رسالے کا نام

"<u>تجہیز و تکفین مسلمان کی</u>"

1242ھ (=1826-27)

رکھا گیا اور حسن اتفاق سے تاریخ ہجری بھی اس کی یہی ہوئی"۔

یہ مادۂ تاریخ بہت بے ساختہ اور لائق تحسین ہے۔اس رسالے کا خاتمہ ذیل کی عبارت پر ہوا ہے:

''میں اپنے باپ کو دیکھا تو پوچھا کہ کیونکر گذری، اس نے کہا جب مجھ کو قبر میں
رکھ دیا اور فرشتے عذاب کے آئے میرے ہاتھ اور سینے پر فرشتوں نے
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا ہوا دیکھ کر کہا کہ نہ ذر تو عذاب سے تمام ہوا'' ۔17

نسخۂ حیدر آباد کے ترقیمے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ 1261ھ (1845) میں مولوی عبدالفتاح صاحب لکھنوی کی فرمائش سے جزیرہ معمورہ بمبئی میں عبداللہ مجید پوری کے اہتمام سے مطبع ابراہیمی میں چھپ کر شائع ہو گیا تھا۔

عبارت اس رسالے کی صاف سلیس اور رواں ہے۔ یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ اس رسالے کے مولف نے اپنی تحریر کی زبان کو ''اردو'' ہی کہا ہے اور رافت وغیرہ کی طرح ریختہ یا ہندی نہیں کہا ہے۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ رامپور ہی میں رہتے تھے اور جنھیں باہر جانے کے مواقع نہیں ملے تھے۔ یا جن کے مطالعے میں جدید تصانیف نہیں آ سکی تھیں وہ اس زبان کو ریختہ یا ہندی کہتے رہے تھے۔

ب۔ رسالہ تکمیل الایمان

چالیس صفحوں کا یہ رسالہ بھی ملا محمد عمران رامپوری کا تصنیف کردہ ہے اس کے آغاز کی عبارت اس طرح ہے:

''اور عام مومنان کو جمعہ کے روز بعض لوگ عورات کو عام لوگوں میں داخل کیے
ہیں۔ یعنی عورت کو عام لوگوں کی برابر جمعہ کو دیدار ہوگا۔ یہ دیدار بہشت میں
داخل ہونے کے بعد کا ہے۔ کافران اور منافقان کو دیدار ہوگا لاکن جلال اور قہر کی
صفت سے اور دیدار کے بعد محجوب ہوں گے''۔

اس رسالے میں عقائد کے کئی مسائل بیان کیے گئے ہیں، ایمان کے اجزا اور شرطوں کا بھی ذکر ہے اوپر کے اقتباس سے ظاہر ہے کہ یہ نسخۂ حیدر آباد ناقص الاوّل ہے اور شروع کے کئی صفحے ضائع ہو چکے ہیں۔ رسالہ تکمیل الایمان کا خاتمہ ذیل کی عبارت پر ہوتا ہے:

''اعلموا أن الله شديد العقاب وأن الله غفور رحيم، یعنی واقف رہو تم
کہ اللہ تعالٰی سخت عذاب دینے والا ہے اور تحقیق کہ اللہ تعالٰی بخشنے والا اور رحمت

کرنے والا ہے۔ شکر اللہ تعالیٰ کا یہ رسالہ ختم خدا کے خوف اور امید اور اس کی رحمت پر ہوا۔ عاقبت بخیر باد''۔

اس مخطوطہ کے آخری صفحہ پر ایک مُہر غلام احمد 1255 کی ثبت ہے اور ایک نوٹ یہ بھی درج ہے کہ:

''1263ھ میں مطبع ابراہیمی میں یہ کتاب طبع ہوئی''۔

پہلے رسالے کے اندراج کی روشنی میں سمجھا جانا چاہیے کہ یہ مطبع ابراہیمی بمبئی ہی میں ہے، امکان ہے کہ ان دو کے علاوہ ملا عمران کی کوئی اور تصنیف بھی ہو۔ جس کا ہمیں علم نہیں ہو سکا''۔

6-سوختہ

نواب احمد علی خان بہادر ریاست کے معاملوں میں جو بھی کرتے رہے ہوں، واقعات شاہد ہیں کہ اپنے عقیدے کی ترقی اور ترویج کے باب میں وہ خاصے مستعد تھے۔ چنانچہ یہ ذکر آ چکا ہے کہ سُنّی علماء بھی ان کے زمانے میں ایسی کتابیں لکھنے لگے تھے جن میں امامیہ فرقے کے معتقدات سے کسی درجے میں موافقت پائی جاتی ہو۔ ان کی اس طور پر سرپرستی کا چرچا دور تک پہنچ چکا تھا اور دور دراز کے بھی بعض سُنّی علما رامپور پہنچ کر اس قسم کی کتابیں لکھنے میں مصروف ہو گئے تھے۔

مولوی غلام غوث دیوا کے رہنے والے تھے۔ شعر و شاعری کا ملکہ بھی رکھتے تھے۔ سوختہ تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے رامپور پہنچ کر ملازمت کی اور مشہور کتاب روضۃ الشہداء کو اردو زبان میں ''دہ مجلس'' کے نام سے منتقل کیا۔ سبب تالیف میں لکھا ہے کہ:

> ''یہ بندہ گنہگار امید وار مغفرت پروردگار کا، عنایت ائمہ اطہار سے کہ عرصۂ امتداد سے بمقتضائے آبخورش کے مصایبات زمانہ ناہنجار سے گرفتار، وارد قصبہ مصطفا آباد رامپور کا ہوا کہ موطن و مولد اس احقر کا بیچ جوار لکھنؤ کے قصبہ دیوہ نام اس کا ہے اور سرکار دولت مدار نواب والا جاہ مالکِ ملک و سپاہ نواب احمد علی خان بہادر دام اقبالہ وظلہ کہ اس جناب کو محبت خاص ائمہ معصومین کا جان کر نسخۂ روضۃ الشہداء کو بیچ فارسی کے بہ نظر فہمید کے نہایت مشکل تھا واسطے آسانی تمام کے، بہ تحریک و سلسلہ جنبانی بعض احبا کے وسیلہ مغفرت کا جان کر بہ انتظام اس

کتاب کے ہر ایک متنفس مغفرت اس گنہگار کی جانب سید الشہدا سے سوال
کریں اور یہ مسمی غلام غوث متخلص بہ سوختہ جناب ائمہ اطہار سے بہ خلوص ثنا
خوانی اس جناب کی استدعا رکھتا ہے''۔19

اس کتاب کی ابتدا ان کلمات سے ہوئی ہے۔

''ثنائے واحد اس خدا کے تئیں کہ جس نے پنج تن کو افضل کیا اور جمیع ہفتاد و دو تن
شہیدان دشتِ کربلا کو باوجود نبوت اور ولایت کے شربت شہادت کا پلایا اور
درود محکا ثر ایسے نبی مرسل کو کہ بیچ اس کے لما خلقت الافلاک فرمایا''۔

روضۃ الشہدا کے اس ترجمہ کا جو قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے وہ خود مترجم کے ہاتھ کا 1233ھ (1817ء) کا لکھا ہوا ہے اور اس کی ضخامت اُنسٹھ ورق کی ہے۔ یہ دراصل روضۃ الشہدا کے فارسی زبان میں کسی خلاصہ کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ کی زبان کسی قدر ثقیل بلکہ گنجلک ہے اور اکثر موقعوں پر قافیہ آرائی بھی کی گئی ہے۔

علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں ایک مختصر سی مثنوی بھی سوختہ تخلص کے کسی شاعر کی ہے جس کا عنوان ہے:

''قصہ اسلام یہودی''20

اس کا سال کتابت 1278ھ (62-1861) ہے، امکان ہے کہ یہ سوختہ اور غلام غوث سوختہ ایک ہی شخص ہوں۔

(3) متفرق نثریں

1-رفعت

نواب سید احمد علی خان بہادر کا زمانہ رامپور میں اردو نظم ونثر کی ابتدا کا تھا۔ اس زمانے تک اردو نثر میں وہاں پر نہ تو کوئی تذکرہ لکھا گیا تھا اور نہ سفر نامہ ہی قلمبند ہو سکا تھا لیکن تذکرہ نویسی کے ابتدائی خدوخال جھلک دکھانے لگے تھے۔ امیر مینائی نے غلام جیلانی رفعت کے حال میں لکھا ہے:

''ہشت خلد نام ایک مجموعۂ اشعار اساتذہ جس میں سراپائے معشوق ہیں تالیف فرمایا ہے''۔21

احمد علی خاں شوق نے اس مجموعے کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے:

''ہشت خلد فارسی: مختلف شعراء کے اشعار حمد ونعت اور سراپائے معشوق، اشعار شوقیہ اور احوال عاشق جمع کیے ہیں، اس کتاب کی ترتیب ضیاء الدین عبرت نے شروع کی تھی ان کے انتقال کے بعد محمد کبیر خاں تسلیم، کرامت علی، شجاعت علی، عنبر شاہ خاں، مصاحب جنگ، ہمت خاں ہمت وغیرہ اس کی تکمیل کرتے رہے، غلام مصطفیٰ خاں بہادر معروف بہ نجو خان .....کے حکم سے اس کی ترتیب ہو رہی

تھی، جنگ دوجوڑہ میں وہ شہید ہوگئے، پھر سٔو خاں بہادر نے اس کتاب کی
ترتیب شروع کرائی اور 1210ھ (96-1795) میں یہ مکمل ہوگئی، دیباچہ
میں کئی سوشعراء کے تخلص اور کلام حمد ونعت میں نہایت خوبی سے تحریر کیا ہے۔ یہ
کتاب کتابخانہ ریاست میں موجود ہے"۔

بلاشبہ یہ مجموعہ تذکرے کی ذیل میں نہیں آسکتا ہے لیکن اس سے "سراپائے شوق" سے متعلق اشعار شوقیہ کو جمع اور مرتب کرنے کا واضح رجحان سامنے آتا ہے۔ یہی رجحان بتدریج ترقی کرتا گیا اور کوئی نصف صدی کے بعد اسی رجحان نے کانپور میں تذکرہ سراپا سخن کی صورت اختیار کرلی تھی۔ تفصیلات کا بیان وہیں پر کیا جائے گا۔

2- فاخر

کسی فرد یا انسانی جماعت کے لیے لوازمات زندگی سے صرف نظر کرلینا ممکن نہیں۔ صنعتی یا تجارتی کاروبار ہوں یا مختلف علوم وفنون، براہ راست اور بالواسطہ طور پر سبھی لوازمات زندگی میں شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ کا تعلق عمل اور تقریر سے ہی ہوتا ہے اور بعض تحریر میں بھی آجاتے ہیں۔ کسی واقعہ یا عمل کا ضبط تحریر میں نہ لایا جانا اس کے عدم وجود کو ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ حالات جیسے بھی رہے ہوں، نواب احمد علی خان بہادر کے دور میں علوم وفنون کے رواج سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اہل تحقیق نے اس دور کی طرف نہیں کی برابر توجہ کی ہے۔ تلاش کریں تو اس زمانے میں بھی رامپور میں علمی تصانیف مل سکتی ہیں۔

حکیم احمد خاں فاخر کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔ مولوی قدرت اللہ شوق کے شاگرد تھے اور نواب احمد علی خان بہادر کے عہد میں ان کا شباب تھا۔ امیر مینائی نے لکھا ہے:

> "اپنے ہم چشموں میں ممتاز رہے۔ فنِ طب میں دو کتابیں کہ ایک کا نام طب
> سعیدی اور دوسری کا نام نوطرز حکمت ہے ان سے یادگار ہیں۔ فی الحقیقت یہ
> تالیفات بہت نافع روزگار ہیں"۔23

نوطرز حکمت اردو میں ہے اور عہد نواب احمد علی خاں کی تصنیف ہے۔ کوئی سوا سو اوراق پر محیط ہے۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ حکیم فاخر کے بارے میں

احمد علی خاں شوق نے تحریر کیا ہے کہ:

"نواب سید احمد علی خان بہادر کے معالج تھے۔ عربی نثر و نظم پر بھی پوری قدرت تھی۔ طب سعیدی میں نظم عربی موجود ہے۔ تاریخ گوئی میں بھی ملکہ تھا"۔

نواب احمد علی خاں رند کے دور میں لکھی جانے والی علمی کتابوں میں سے چند یہ بھی ہیں:

تقریر تحدید قوانی: اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں۔ البتہ اس کے مخطوطۂ رامپور کی عنبر شاہ خاں نے 1237ھ (22-1821) میں کتابت کی تھی۔ یہ صرف دو ورقی رسالہ ہے، اس کی زبان فارسی ہے۔

بیاض نسخہ جات آتش بازی وغیرہ: یہ اُناسی اوراق کا ایک قلمی رسالہ ہے، جس میں مختلف لوگوں نے 1242ھ (1826) سے 1253ھ (1837) تک اندراج کیے ہیں۔ اس میں اردو کے کچھ اشعار بھی لکھے ہوئے ہیں۔

کتاب طب انگریزی: اس قلمی کتاب کے مصنف کا نام اور احوال معلوم نہیں، البتہ یہ 1250ھ (1834) میں تالیف ہوئی اور اس کی کتابت بھی اسی سال میں ہوئی تھی، اس میں کل ایک سو اٹھاون اوراق ہیں۔

ان تینوں کتابوں کے قلمی نسخے رضا لائبریری میں محفوظ ہیں۔ آخر الذکر کتاب کا وجود بجائے خود اس حقیقت پر دلالت کر رہا ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کو تازہ ترین علوم کے حصول کا شوق تھا اور یہ بات بجائے خود بہت اہم اور توجہ طلب ہے۔

(5) شاہجہاں پور

(الف) غزل 163

1-احمد مولوی احمد خاں 163

2-حُسین نواب غلام حسین خاں 164

3-حاذق حکیم شاہ عالم خاں 165

4-خورشید یٰسین علی 167

(ب) متفرق منظومات 169

1-کالے صاحب 169

2-غلام علی 171

3-عطا 171

(الف) غزل

افغان عموماً مذہب پسند اور خدا دوست رہے ہیں اور شاہجہاں پور افغانوں کے شہر کی حیثیت سے مشہور چلا آتا ہے۔ اس شہر کو اکثر علمائے مذہب کا مسکن ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان میں سے چند معروف نام یہ ہیں:

1- قطب الدین شاہ شاہجہاں پوری

2- محمد اکرم ولد شیخ محمد خاں شاہجہانپوری از تلامذۂ حاجی صبغت اللہ خیر آبادی

3- احمد خاں شاہجہانپوری خلف مولانا محمد طاہر

4- عبدالجبار خاں شاہجہانپوری

اس میں تو شک نہیں کہ اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی کے زمانے میں اس شہر کو شعر وسخن کے مرکز کا درجہ حاصل نہیں تھا اور ممکن ہے کہ اس صورت حال میں مذہب کے غلبہ کو بھی دخل رہا ہو۔ لیکن بعض لوگ انفرادی طور پر فارسی اور اردو میں شعر کہتے رہے ہیں اور اپنی خوبی فکر اور مشق ومزاولت کے نتیجے میں انھوں نے نام بھی پیدا کرلیا تھا۔ یہاں ان میں سے صرف بعض کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

1- احمد

یہ اپنے زمانے کے صاحب علم شخص اور نام برآوردہ شاعر تھے۔ قدرت اللہ شوق نے ان

کے بارے میں لکھا ہے:

''مولوی احمد خاں شاہجہانپوری، از مدت بہ سبب رفاقت حافظ رحمت خان در قصبہ پیلی بھیت وطن اقامت گرفتہ بود، مدتے شد کہ ازیں جہاں رحلت نمود، عالم تبحر و تحریر و صاحب سخن وخوش تقریر بود، او سبحانہ از لطف ابدی شفاعت احمدی نصیب او گرداند، قصاید عربی و دیوان فارسی ترتیب دادہ بود، فلما مسودہ اش بر باد رفت، گاہے یک در غزل ہندی بہ تقریبے بہم می رساند''۔1

شاعر کی حیثیت سے مولوی احمد خاں کو خاصی شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ بعد کے لکھنوی تذکرہ نویس محسن نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح:

''صاحب دوزبان مولوی احمد خان احمد شاہجہانپوری''۔2

مولوی احمد کی ایک غزل بہت مشہور ہوئی تھی۔ چنانچہ ہر تذکرہ میں اسی کے ایک دو شعر لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ یہاں صرف مطلع اور مقطع نقل کیا جاتا ہے۔

کیوں نہ ہووے دل مرا نخچیرِ زلف　　عاشقاں کی قید ہے زنجیرِ زلف
دشتِ مجنوں کا مجھے احمد ہے شوق　　دل پہ میرے ہے مگر تاثیرِ زلف

2-حُسین

یہ شاہجہانپور کے ممتاز امرا میں سے تھے اور شاعر کی حیثیت سے ان کو دہلی اور لکھنؤ وغیرہ تک شہرت ملی تھی۔ شیفتہ کے تذکرہ میں ہے:

''حُسین تخلص، نواب غلام حسین خاں از طایفۂ افاغنہ ورؤسائے شاہجہانپور است، نوشتہ اند کہ آداب واخلاق درست داشت''۔3

اور لکھنوی تذکرہ نویس محسن نے اس پر اتنا اضافہ کیا ہے:

''دار لکھنو فارسی اکثر اور ریختہ کمتر فرماتے تھے''۔4

اور کلکتے کے عبدالغفور خاں نساخ نے مزید لکھا ہے کہ:

''حُسین تخلص، نواب غلام حسین خاں، خلف نواب محمد شیر دار خاں قوم افغان، رئیس شاہجہانپور، شعر فارسی کہتے تھے''۔5

لالا سری رام نے خسین کے حالات سے متعلق خاصی مفید اطلاعات قلمبند کردی ہیں، اس طرح:

"شاعر فصیح البیان نواب غلام حسین خاں خسین مرحوم، ان کے والد نواب شیر دار خان رئیس شاہجہانپور نواب دلیر خاں مصبدار دربار شاہجہانی دبانی قصبہ شاہجہانپور کی اولاد میں تھے، تمام عمر بڑی عزت وتوقیر سے بسر اوقات کرتے رہے، زیادہ تر توجہ فارسی نظم کی طرف تھی، اردو بہت کم کہتے تھے، 1296ھ تک حیات تھے"۔6

اس اقتباس میں آخری دو باتیں صحیح نہیں ہیں، خسین نے 1281ھ (1864-65) میں وفات پائی تھی اور وہ اردو میں صاحب دیوان تھے۔ ان کا اردو کا دیوان رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ ایک سو اکیس اوراق پر محیط ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

میں تو تدبیر میں تھا زخمِ جگر کی مصروف — دل بھی پہلو میں تپاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
آگے ملنے کی کوئی راہ نکل آئے گی — بے قراری تو مجھے اس کے تو در تک پہنچا

تشنۂ آب دم خنجر ہے بسمل اور بھی
دست نازک کو ذرا تکلیف قاتل اور بھی

مرے اعمال ہیں رونے کے قابل — خدائی سالہا مجھ پہ ہنسا کی
ناصحِ مشفق نصیحت کچھ اگر آکر کرے — اس میں کیا نقصان ہے اپنا سُن کے ہاں ہاں کیجیے
آگ سے موسیٰ کے ہاتھ آیا چراغ مدعا — آشکارا قہر ہے الطاف پنہاں کیجیے

غور کریں تو اس کلام سے شاعر کے حوصلہ اور طبیعت کی خوبی کا ثبوت ملتا ہے۔ خسین کی زبان خاصی حد تک صاف اور جدید روز مرہ کے مطابق ہے۔ انھیں مضامین تازہ کی تلاش کا بھی شوق معلوم ہوتا ہے۔

3-حاذق

شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے بھی اپنے ایک شاہجہانپوری شاگرد کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"حکیم شاہ عالم خاں حاذق تخلص ولد مولوی محمد عالم ابن مولوی محمد عزیز، قوم

افغان یوسف زئی، ساکن شاہجہانپور، جوان دانشمند است، ودرفن طبابت بقدر حال استعداد دارد واز چند سال بہ حکم موزونی طبع خیال بہ گفتن شعر ہندی کردہ، برائے اصلاح رجوع بہ فقیر آوردہ، اعتقاد تمام بہ این عاصی دارد، عمرش بست و ہفت سالہ خواہد بود"۔7

اس نو مشقی اور نو عمری کے زمانے کے ان کے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

اُٹھ کے میرے پاس سے جس وقت وہ جانے لگا — بیخودی طاری ہوئی ایسی کہ غش آنے لگا
گو میں بھی اس کے اُٹھ کے سے فرشتوں کی طرف — کیا خوشی سے اُٹھ کے میں آغوش پھیلانے لگا
میں نے گر چشم خریداری سے دیکھا اس طرف — پھول نرگس کا بھی مجھ کو آنکھ دکھلانے لگا
اے صبا باغ سے خنداں تجھے آنا کیا تھا — موسم گل میں اسیروں کو ستانا کیا تھا
ہے شب وصل، کرو وصل کی باتیں پیارے — شب ہجراں کا بھلا یاد دلانا کیا تھا
روز واں باڑھ دھری جاتی ہے تلواروں پر — کوئی ہوتا ہے خفا اتنا گنہگاروں پر
ذبح کر یا انھیں آزاد کر اس دم صیاد — حالت نزع ہے اب تیرے گرفتاروں پر
گرم بازاری خوباں کا خدا خیر کرے — کہیں بجلی نہ گرے ان کے خریداروں پر
عشق میں جب سے پڑا ہے دل ناشاد سے کام — ہے مجھے نے کی طرح نالہ وفریاد سے کام
مثل ماہی جو ہوے حلق بریدہ پیدا — ان کی گردن کو ہے کیا خنجر جلاد سے کام
سخت مشکل ہے فن شعر کا آنا حاذق — چاہیے نت رہے شاگرد کو استاد سے کام

شاعر نے عموماً کیفیات اور معمولات کو موضوع بنایا ہے اور ان کو بڑی خوبی سے نظم کیا ہے۔ زبان بھی بہت صاف اور رشتہ ہے۔ البتہ بعض قدیمی الفاظ کا استعمال شاعر کے زمانے کے روزمرہ کا اثر دکھاتے ہیں۔

سعادت خاں ناصر نے اپنے تذکرے میں حاذق کا ذکر تو کیا ہے۔ لیکن ان کے حالات میں کچھ اضافہ نہیں کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"مسیحائے خلائق، حکیم شاہ عالم خاں تخلص حاذق، ولد مولوی محمد عالم، قوم افغان یوسف زئی، شاگرد میاں مصحفی"۔8

اس نے حاذق کے یہ دو شعر لکھے ہیں۔

خود بخود تو جو ہوا آج پشیماں ایسا　　کام کیا تجھ سے ہُوا اے دلِ ناداں ایسا
سنبلِ زلفِ بتاں کو نہ رہی تابِ نگاہ　　ان دنوں حال ہُوا اپنا پریشاں ایسا

4-خورشید

یہ بھی اس علاقے کے معروف شاعروں میں سے تھے۔ قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے:

"یٰسین علی خورشید، متوطن سبز دار، حالا در قصبۂ تلہر استقامت دارد، دیوان ریختہ ترتیب دادہ"۔ 9

ان کے کچھ شعر یہ ہیں۔

کب تئیں یوں عمر بسر کیجیے　　شام سے رو رو کے سحر کیجیے
دور ہے خورشید کچھ اوجِ فلک　　جس کی مسافت پہ نظر کیجیے
چاہیے تو دن میں کئی مرتبہ　　عرشِ معلا پہ گزر کیجیے

شاہجہاںپور میں اس زمانے میں شعر گوئی کی گویا ابتدا تھی۔ اس وقت اس شہر میں استادی اور شاگردی کی روایت بھی مستحکم نہیں ہوئی تھی۔ البتہ جن شاعروں کو اپنے علاقے سے باہر جانے کا موقع مل گیا تھا انھوں نے جدید فکر و خیال کو اختیار کرنے کی شعوری کوشش کی تھی۔ چنانچہ بعض نے استادی اور شاگردی کے طریقے کی اہمیت کا اظہار بھی کیا ہے۔ شاہجہاںپور کے علاقے میں قدامت کے اثر کے باوجود زبان میں عموماً سادگی اور صفائی بھی پائی جاتی ہے۔

متفرق منظومات

1- کالے صاحب

شاہجہانپور کے مضافات میں بھی بعض لوگ شعر کہہ رہے تھے لیکن سنجیدہ شاعری کے مسلمہ مراکز سے دور ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری اعتبار کا درجہ حاصل نہیں کرسکی تھی۔ آسی نے اپنے تذکرے میں ایسے ایک شاعر کا حال اس طرح لکھا ہے:

> "کالے صاحب تلہر ضلع شاہجہانپور کے رہنے والے تھے، نظیر اکبرآبادی کو کلام دکھایا کرتے تھے۔ کم اوقات غریب آدمی تھے۔ مگر ظرافت کے پتلے تھے۔ ظریفانہ غزلیں نظمیں بہت سی کہی تھیں۔ مگر چونکہ زمانے نے قدر نہ کی وہ سب ضائع ہو گئیں، کچھ شعر جو ایک دوست کے حافظے میں محفوظ تھے مجھ تک بھی پہنچ گئے"۔1

ایک غزل کے دو شعر یہ ہیں ؎

میں کہا چل مرے گھر، کہنے لگی کتنی دور   میں کہا چار قدم، کہنے لگی چل رہ جھوٹے
میں کہا رویا بہت، بولی کوئی شاہد لا   میں کہا چشم ہے نم، کہنے لگی چل رہ جھوٹے

پھر اس غزل کو انھوں نے خمسہ کیا۔ ایک بند یہ ہے ؎

میں کہا پاس تو آ میرے تو اے ماہ جبیں   تو کہوں حال دل اپنے کا میں اے لعبت چیں

لیکے دل تو نے نہ دیکھا یہ مرا حالِ حزیں　　ہنس کے کہنے لگی دل تو نے دیا کس کے تئیں
میں کہا کھا تو قسم کہنے لگی چل رے جھوٹے

ان کی ایک مختصر سی نظم یہ ہے۔

جی میں مرے بیٹھے بیٹھے آیا　　چل یار کے گھر کسی بہانے
زنار پہن کے قشقہ کھینچا　　لے ہاتھ میں پوتھی کوئی جانے
کاشی سے ابھی نئے ہیں آئے　　جو کہیے کسی سے سو وہ جانے
القصہ میں اس گلی میں جاکر　　آواز بدل لگا لگانے
پنڈت ہوں، شگن بچارتا ہوں
اشلوک کے یاد ہیں فسانے
یا پاس کھڑا ہونے نہ دیتا　　یا آپ لگا مجھے بلانے
تب ہاتھ میں ہاتھ لگ کے بندہ　　سچ جھوٹ اسے لگا بتانے
روٹھا جو یار وہ تمھارا　　تم جاؤ اگر اسے منانے
وہ آئے اگر تمھارے گھر پر　　دولت لگے اس کے ساتھ آنے
پر کھا میری بات کو وہ چالاک
معشوق تو ہوتے ہیں سیانے
کہنے لگا پھر وہ مجھ سے ہنس کر　　بھیجا تھا آج بے حیا نے
کھسکا دبے پاؤں پھر تو بندہ　　جی مفت بچالیا خدا نے
پہچانتا گر وہ مجھ کو قاتل　　تو آج لگی تھی جان ٹھکانے
یہ پیچ کی باتیں من سے کالے
کیوں لہر میں آئے ہو دوانے

ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے آسی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''ظرافت کے ساتھ ساتھ فحش گوئی کا بھی چسکا تھا۔ مگر وہ ایسی نہیں ہے کہ ان کو پڑھا جائے اور اس سے تفنن کے بجائے تفریح ہو۔ لہٰذا نظر انداز کرتا ہوں''۔

ان کالے صاحب کا حال اور کلام کسی اور تذکرے میں ہماری نظر سے نہیں گذرا۔

2- غلام علی

کہا جا چکا ہے کہ شاہجہانپور کے علاقے میں مذہب کا اثر غالب رہا ہے۔ اس ماحول کے تقاضے سے حافظ شاہ غلام علی شاہجہانپوری نامی ایک عالم نے ایک کتاب ''مولدِ نبی'' کے نام سے لکھی تھی۔ اس میں نظم و نثر ملی جلی ہے۔ اسی لیے اس کا یہاں پر ذکر بے محل نہیں خیال کیا گیا۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ جو چھبیس اوراق پر 1258ھ (=1842) کا لکھا ہوا ہے۔ رامپور کی رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔

3- عطا

اسی علاقے کے کوئی شاعر حضرت عطا بھی تھے۔ ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ انھوں نے اردو میں ایک مثنوی لکھی تھی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہے۔ اس کی کیفیت اس طرح لکھی گئی ہے:

''مثنوی اردو	از	حضرت عطا
اوراق تیرہ	،	سطریں تیرہ

ابتدا۔

عطا حمد الٰہی کا محل ہے — بجا مضمونوں کو جنگ و جدل ہے

خاتمہ۔

— گئے ناچار وہ افتاں وخیزاں — شکر لب پاس پہنچے اشک ریزاں'' ۔2

حضرت عطا کی یہ مثنوی اپنے زمانے میں بہت مقبول رہی ہے۔ کئی معاصر شاعروں نے اس کی منظوم تقریظیں لکھی تھیں۔ ان تقریظوں کو بھی یکجا کر لیا گیا تھا۔ اس مجموعہ کا بھی ایک قلمی نسخہ آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کا حال اس طرح قلمبند کیا گیا ہے:

''تقاریظ منظوم بر مثنوی عطا، امیر الدین آزاد ، شہیدی جلوانی،
نواب غلام حسین خاں بہادر اور سید سعادت علی عیش مشہدی
اوراق پانچ — سطریں تیرہ

ابتدا:

نشو نما پذیرفتہ دگلبرگ لبان ریحاں　　　استادی شمشاد محمد امیر الدین آزاد
عطا نے مثنوی لکھی بہت خوب　　　ہوئی عشاق کی خاطر مرغوب

خاتمہ:

کر اس تصنیف کو عالم میں مقبول　　　رہے عاشق کو عیش وغم میں مقبول

ان اندراجات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عطا شاگرد تھے امیر الدین آزاد کے اور نواب غلام حسین خاں بہادر جن کا تخلص حسین تھا اور جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، اپنے زمانے کے معزز اور موقر شاعروں میں سے تھے اور انھوں نے بھی عطا کی مثنوی کے لیے منظوم تقریظ لکھی تھی۔

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں شاہجہانپور میں کچھ اور منظومات بھی وجود میں آئی ہوں گی۔ لیکن بطور مجموعی ان کا معیار کچھ بلند نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بھی ایک وجہ ان کے محفوظ اور باقی نہ رہنے کی ہوسکتی ہے۔

اس زمانے کی کوئی اور نثری کتاب یا رسالہ حافظ غلام علی کی ''مولد نبی'' کے علاوہ دریافت نہیں ہوسکی ہے۔ خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں شاہجہانپور میں اردو نثر کا رواج نہیں ہوسکا تھا۔

(6) فرخ آباد

الف۔غزل	175
(1) مظفر جنگ	176
1-بلیغ امانت علی	177
2-بالا بالا میاں	177
3-حجام عنایت اللہ	178
4-خوشدل امر سنگھ	180
5-عزیز ہر بھیج رائے	180
6-حسرت ذوقی رام	180
7-ذرہ، مہر مہر چند	181
8-عاشق کشن چند	182
9-ہندو گوکل چند	183
(2) ناصر جنگ	183
10-خادم شیخ خادم علی	184
11-قلندر	185
12-غنی محمد غنی	185

13-قاسم سید قاسم علی	186
14-کمتر کمتر شاہ	187
15-گویا شیخ حیات اللہ	187
(3) شوکت جنگ	188
(4) حشمت جنگ	189
16-شائق نذیر الدین حسین	191
17-استاد شیخ محمد یار علی	192
18-خلیق میر محمد مستحسن	192
(ب) مثنوی	195
1-آفریں شیخ غلام حسین	195
2-حسن عبدالکریم	196
(ج) متفرق منظومات	199
1-سید اولاد حسن حسن	199
2-سید امداد علی امداد	200
3-رشک میر علی واسط	201
(د) نثر	203
ا-حسین علی علی	203
۲-اولاد حسن	205
۳-سید محمد ولی اللہ	209
۴-قلندر علی	210

الف۔ غزل

نواب محمد خان بہادر غضنفر جنگ بنگش افغان تھے اور انھوں نے دلیری اور دانش مندی سے فرخ آباد کی ریاست کا ڈول ڈالا تھا۔ ان کے بعد نواب محمد قائم خان بہادر قائم جنگ اور پھر نواب محمد احمد خان بہادر غالب جنگ بنگش مسند نشین ہوئے۔ آخر الذکر نہایت شجاع اور دور اندیش شخص تھے۔ لکھا ہے کہ:

> ''یہ احمد خاں وہی روہیلہ ہے جس نے نائب نول رائے صفدر جنگ کو تہِ تیغ کر کے فرخ آباد میں اپنا عمل وتصرف کر لیا تھا، اور جس کے استیصال کے واسطے نواب صفدر جنگ نے بہ معیت مرہٹوں کے بہت سی کوششوں کے بعد برائے نام کامیابی حاصل کی۔۔۔۔ مگر در حقیقت وہ اپنی ریاست پر قابض رہا''۔1

نول رائے کا قتل اس زمانے میں محض ایک سیاسی واقعہ تھا جس سے دونوں ریاستوں کے روابط ضرور متاثر ہوئے تھے۔ لیکن بعد کے زمانے میں انگریزوں نے اسے دوسرا رنگ دے کر اپنے تسلّط کو مستحکم کرنے میں فائدہ اٹھایا تھا۔

(1) مظفر جنگ

احمد خاں بنگش نے 1185ھ (1771) میں وفات پائی۔ اس کی جگہ دلیر ہمت خان بہادر مظفر جنگ مسند نشیں ہوئے۔ ان سے کاروبار ریاست سنبھل نہ سکے۔ نواب شجاع الدولہ سے اعانت طلب کی اور نتیجہ میں پوری ریاست پر سے قبضہ کھو بیٹھے۔ مظفر جنگ اور ان کے بعد ان کی اولاد کو بھی خطاب نوابی اور برائے نام ہی جاگیر پر قانع رہنا پڑا تھا۔

مفتی محمد ولی اللہ فرخ آبادی نے اپنی تاریخ میں تحریر کیا ہے کہ:

"آصف الدولہ بعد وفات پدر خود نواب شجاع الدولہ در 1188ھ (1774) در فیض آباد بہ مسند ریاست نشستہ و در 1189ھ بہ فرخ آباد آمدہ، بہ جانب شمال از شہر بر لب گنگ خیمہ ساخت، نواب مظفر جنگ ہر روز حاضری شد وحسب المقدور بہ ضیافات و تحالیف آں چناں پرداخت کہ آصف الدولہ خوشنود شدہ باز کوچ بہ فیض آباد فرمود"۔

اس بیان سے بھی ظاہر ہے کہ فرخ آباد اُسی زمانے میں اودھ کے تابع تھا اور مظفر جنگ اپنے عمل سے اس کا ثبوت پیش کرتے رہے تھے۔ البتہ علم و دانش کی جو شمع احمد خان بنگش روشن کر گئے تھے وہ اب تک بدستور لو دے رہی تھی۔ ارباب علم و ہنر اب بھی دور دور سے یہاں آ رہے تھے۔ چنانچہ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

علما و حکما:

مولوی فضل اللہ بہاری، بدل خاں معروف بدن خاں بنگش (متوفی 1241ھ)، غلام مصطفیٰ بردوانی، غلام نبی بلگرامی برادر زادۂ میر اسماعیل بلگرامی، امیر اللہ خاں غازیپوری، رام جی بھٹ ماہر ویدک و جیوتش

مشائخ و فقرا:

شاہ حسام الدین بداونی، سید شاہ زاہد علی جونپوری (متوفی ربیع الآخر 1227ھ)

شاہ حسام الدین گوالیاری، بسم اللہ شاہ (ایک عورت جو مردانہ لباس میں رہتی تھی)، منسا رام بیراگی انبرت سادھ فقیرے بود از قوم سادھ کہ او را نسبت بہ توحیدی کند۔

اس مقام پر یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں ''سادھ'' ایک فرقہ ہے جو خود کو موحد مانتا ہے اور جس کا اصل مسکن فرخ آباد ہے۔

نوابین فرخ آباد میں اس زمانے کی روایت کے مطابق بعض تو خود شاعر تھے۔ اور باقی شاعر نواز تھے۔ چنانچہ ان کے اثر سے وہاں کی آبادی کے تقریباً ہر طبقہ میں شعر وسخن کا چلن موجود تھا۔ بعض معروف شاعر یہ ہیں:

1- بلیغ

''3 امانت علی خاں نام، از دودمانِ عمدہ زادگان نواب غضنفر جنگ است، پدرش محمدی خاں وجدش رسول خاں، چندے بہ نیابت نواب مظفر جنگ پرداختہ''۔

یہ فارسی کے شاعر تھے، اردو میں ان کے اشعار دستیاب نہیں ہو سکے۔

2- بالا

ان کا نام بالا میاں تھا۔ مارہرہ کے بزرگ زادوں میں سے تھے، فارسی اور ہندی (اردو) دونوں زبانوں میں شعر خوب کہتے تھے۔ ایک غزل کے کچھ شعر یہ ہیں۔

نہ پھرا قول دے، جو شب کوئی — مرگیا ہو کے جاں بلب کوئی
خوب سکوں جو پاؤں ہائے تجھے — ایسا آتا نہیں ہے ڈھب کوئی
ہم جو کہتے تھے وہ خفا ہے نہ چھیڑ — بات بگڑی بنے ہے اب کوئی
ہیں کچھ اور ہی ترے سخن بالا — یوں تو کہتے غزل ہیں سب کوئی

مقطع میں شاعر نے ''اور ہی'' کو ''اوری'' نظم کیا ہے۔ تلفظ کی یہ صورت میر علی اوسط رشک کے کلام اور ان کے لغت میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ سب کوئی (ہر ایک) دے (دیکر) اور سکوں وغیرہ الفاظ پر توجہ کی ضرورت ہے۔ ان میں مقامیت کے ساتھ ساتھ پورب کی بول چال کا اثر بھی معلوم ہوتا ہے۔ شاعر اپنے طرز خاص کو ممیّز اور منفرد کہہ رہا ہے۔ یہ بات بھی ایسی نہیں ہے جسے سرسری طور پر نظر انداز کیا جا سکے۔ اس غزل میں فارسی کے مروّجہ طریقوں کے مطابق کسی ترکیب کا استعمال نہیں ہوا ہے۔

3-حجام

''4 حجام تخلص، عنایت اللہ نام، عرف میر کلو از مردم سہار نپور است، بہ پیشۂ
حجامی کہ بجاز اموتراشی (سرتراشی یا خاص تراشی) را حجام گویند، کسب معاش می
ساخت و بہ فخر تکمذ مرزا رفیع سودا سر بہ فلک می افراخت، مولانا فخر الدین را....
دست ارادت بہ دامن زدہ، فکرتش بدل می ساز دو لختے از اشعار اوی طراز د''۔

یہ شخص بھی فرخ آباد میں آ گیا تھا۔ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی نے اس کو اپنے شہر کے شاعروں میں شمار کیا ہے اور اس کی غزلوں کے بھی چند شعر بھی نقل کیے ہیں۔ دو یہ ہیں۔

مثال ناقۂ لیلا کی یک دو گام غلط　　　خدا کرے کہ ادھر بھی ترا سمند کرے
رقیب ہوگیا دیوانہ یہ ترا حجام　　　جو حکم ہو تو ابھی فصد چار بند کرے

''چار بیت'' کا ذکر رامپور کے حالات میں آ چکا ہے۔ شاید شاعر نے ضرورت شعری سے یہاں چار بیت کی مناسبت سے چار بند کہہ دیا ہے۔ واللہ اعلم، حجام کے چند شعر یہ بھی ہیں۔

بینا نظر اپنا تو ستمگر نہیں آتا　　　بے وصل ترے، سو یہ میسر نہیں آتا
اک روز نصیبوں سے کہیں وہاں تئیں پھونچوں　　　پھر سر ہے مرا اور در و دیوار تمھارے
ہے جی میں کہ اک روز میں ان آنکھوں سے پوچھوں　　　بچتے نہیں کس واسطے بیمار تمھارے
اس کاوشِ مژگاں کا گلہ مجھ سے عبث ہے　　　اے آنکھو یہ بوئے ہوے ہیں خار تمھارے
روز رخسار کے لیتا ہوں مزے خوبوں کے　　　بہتر اس شغل سے حجام ہنر کیا ہوگا

بعض شعروں میں اپنے پیشہ دارانہ تجربات اور بعض میں زندگی کے معمولات و مشاہدات نظم کیے ہیں۔ غور و فکر اور علمی موشگافیوں کا اس کلام میں نشان بھی نہیں ملتا ہے۔ زبان بھی صاف اور بول چال کے مطابق ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ ریاست خود دوسری ریاست کی تابع اور مطیع تھی۔ اس لیے زندگی کے کسی معاملے میں بھی پوری طرح آزادی خیال و فکر کا اظہار نہیں ہوتا اور جہاں یہ نہ ہو، شاعری یا علم و دانش کے معیاروں کے بلند ہونے کا امکان بھی نہیں ہوتا ہے۔

''یکم جنوری 1797 (جمادی الاوّل 1205ھ) کو نواب سعادت علی خاں لکھنؤ میں مسند وزارت پر بیٹھائے گئے، اس کارگزاری کے نتیجے میں آدھا ملک نواب کے قبضے میں آیا اس طرح

ایک طرف: اعظم گڑھ، گورکھپور، الہ آباد وغیرہ اور دوسری طرف باندہ، بریلی، فرخ آباد، کھیراگڑھ وغیرہ

اوراس کے بدلے میں انگریزوں نے:

حافظ رحمت خاں کی اولاد نواب ناصر جنگ اور احمد خاں بنگش کی اولاد، بنارس میں مقیم دہلی کے شاہزادوں اور دوسرے جاگیرداروں وغیرہ کے مصارف کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی"۔5

فرخ آباد پر قبضہ حاصل کر لینے کے بعد انگریزوں نے اسے بھی فوجی چھاؤنی بنادیا اور اس طرح کانپور اُن کا بڑا کیمپ (CAMP) ہوا اور اُس کے قریب ہی فرخ آباد چھوٹا کیمپ یا کمپو مقرر ہوا۔ خلیفہ محمد معظم عباسی نے اپنے جنگ نامے میں کہا ہے ۔

وہ کنپو جو تھا فرخ آباد کا   بنا تھا وہ آتش کا اور باد کا
وہ کنپو جو تھا کانپور کا بڑا   مقابل کو آگے ہوا وہ کھڑا
شمبھو ناتھ تھا داہنے ہاتھ کو   وہ گرواس مَل اس کے تھا ساتھ کو

جنگ دوجوڑہ کے موقعہ پر کانپور اور فرخ آباد کے کیمپ بھی آصف الدولہ کی حمایت میں روانہ ہوئے تھے ۔

فرنگی کا کنپو جو تھا کانپور   چلا جلد تر وہ بحکم حضور
چلا دوسرا فرخ آباد سے   سبک، تیز رَو، جلد تر باد سے
ظفر جنگ بنگش چلا عزم کر   چلا فرخ آباد سے جلد تر

ظفر جنگ سے مراد مظفر جنگ ہے۔ یہ تخفیف ضرورت شعری سے کی گئی ہے۔

انگریز آصف الدولہ کے دوست اور حامی تھے۔ لیکن اس دوستی سے مقصود روہیلوں کی طاقت کو کچل دینا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے خود آصف الدولہ کے لشکر میں بھی صاحب مناصب زیادہ تر ہندو تھے۔ چنانچہ نواب کی سواری کے بیان میں ہے ۔

ہنومان، کپتان، ہربار سنگھ   دو لم اور بھوانی، دہرتار سنگھ
چلے فوج میں خلف سالار جنگ   وہ اکبر، وہ قاسم علی بیذرنگ
مہاراج ادھیراج راجہ ٹکیت   سوار ہو چلے وہ بر اسپ کمیت

ساتھ میں راجہ جھاؤ لال کی فوج بھی تھی اور راو بھولا مہاراج بخشی خزانہ کے مالک کی حیثیت سے ساتھ تھے، غرض اس زمانے کے حالات و معاملات سے متعلق حکم لگاتے وقت ان جزوی حقائق کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔

فرخ آباد میں جو انگریزوں کا ایک کیمپ تھا اس میں ہندوؤں کی بہ گمان غالب بخوبی پذیرائی ہو رہی تھی۔ چنانچہ دور دور سے وہ یہاں آ کر آباد ہو رہے تھے۔ ایسے چند شاعروں کا حال ذیل میں لکھا جاتا ہے:

4-خوشدل

''امر سنگھ خوشدل، قوم کایستھ، ساکن غازی پور، در ابتدائے عمل انگریزی بہ دیوانی کلکٹر رسل صاحب وارد فرخ آباد گردیدہ، نظم و نثر خوب می گفت''۔ 8

یہ فارسی کے شاعر تھے اور ان کا اردو کلام ہمیں دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔

5-عزیز

ہر بنج رائے عزیز، قوم کھتری، در صغر سن از لاہور آمدہ، بہ فرزندی منشی مہر چند در آمدہ ساکن فرخ آباد گردید، جوانے خوب است، شعر نیکو می گوید۔ 9

بھولتا ہر گز نہیں دل سے خیال اس شوخ کا ۔۔۔ کھپ رہا ہے بس کہ آنکھوں میں جمال اس شوخ کا
تیرے ہی در پر ہے تکیہ ہر گدا و شاہ کا ۔۔۔ پھر سوا تیرے مجاور کس کی ہو درگاہ کا

یہ دیکھنے کی بات ہے کہ فرخ آباد میں پہلے کی سرپرستی انگریز کلکٹر نے کی اور دوسرے کو ایک شخص نے اپنی فرزندی میں لے لیا تھا۔

6-حسرت

ذوقی رام حسرت کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ مراد آباد میں مقیم تھا۔ حالات کو زیادہ سازگار پا کر وہ بھی فرخ آباد آ گیا۔ چنانچہ شیفتہ نے لکھا ہے:

''حسرت تخلص، ذوقی رام نام، اصلش از جہان آباد است، ودے در فرخ آباد بسری بردہ''۔10

اور لالہ سری رام نے تو ان کی خوب ہی تعریف کی ہے، فرماتے ہیں:

''منشی ذوقی رام حسرت اگروال ویش قدیم رئیس شاہ جہان آباد فارسی زبان پر
بہت اچھی قدرت تھی، ایرانیوں کوان پر اہل زبان ہونے کا دھوکا ہوتا تھا، مدتوں
ریاست رام پور اور فرخ آباد میں رہے، اساتذہ کا کلام انھیں بہت یاد تھا، کبھی
کبھی اردو میں بھی فکرِ سخن کیا کرتے تھے۔'' 11

آنکھ تو رو کے چھوٹ جاتی ہے　　دل بیچارے پہ آفت آتی ہے
شمع کے طور آتشِ الفت　　سر سے پاؤں تک جلاتی ہے
دردِ دل کس سے میں کروں اظہار　　سُن سکے کون کس کی چھاتی ہے
دن تو گذرا پہاڑ سا جوں توں　　دیکھیے رات کیسی آتی ہے
غیر کے پاس روز جاتے ہو　　اپنے حسرت سے عار آتی ہے
عیب معشوق کا کب اہلِ وفا کہتے ہیں　　خوب نہیں کرتے جو خوبوں کو بُرا کہتے ہیں
ہائے کس سے کہوں کہ او بد عہد　　کیا کہا اور کیا کیا تو نے
گر کوئی لیتا ہے مرا نام اس کے روبرو　　دے ہے مجھ کو سینکڑوں دشنام اس کے روبرو

کلام میں نہایت سطحیت ہے، محبوب کوئی بدعہد، بازاری ہے اور خود عاشق کی غیرت کی بھی داد دی جانی چاہیے کہ یہ جانتے ہوئے کہ وہ غیر کے پاس روز جاتا ہے عاشق اپنی روش پر قائم ہے۔ کیوں نہ ہو کہ وہ تو سینکڑوں دشنام سُننے کا عادی ہے۔

7-ذرہ، مہر

مفتی ولی اللہ فرخ آبادی نے ذرہ تخلص کے ایک شاعر کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''مہر چند ذرہ قوم کھتری از مردمِ پنجاب، وارد فرخ آباد شدہ، اقامت ایں جا
گزیدہ در فارسی ذرہ تخلص می کند، و در ریختہ مہر، و در دوہرہ و کبت بہ زبان بھاکا چند
شعری گوید''۔ 12

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بھی اس شاعر کا ذکر کیا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں:

''مہر تخلص، منشی مہر چند، وطن و اقامتِ وے فرخ آباد ست، پیشتر در لکھنو و اکبر آباد
بسر بُردہ، عمرش صرفِ پیشکاری تحصیل مواضع مختلفہ نمودہ''۔ 13

مہر چند مہر کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

اے کماں ابرو جہاں جاتا ہوں وھاں تیرا خدنگ — پہنچتا ہے ایک دم پاس مرے پَر لگا
نیند آ گئی ابرو کے تصور میں جو مجھکو — تھا خواب میں کھینچے ہوئے تلوار کوئی شخص
یہ تو اپنی خواب میں بھی بر نہ آئی آرزو — ہم خیالِ وصل جاناں بیشتر باندھا کیے
سُرمگیں چشم کے بیمار کی لے جلد خبر — بولتا ہی نہیں، کہتے ہیں، بڑی دیر ہوئی

پہلے شعر میں "کمان ابرو" کو بغیر اضافت کے نظم کرنا عجزِ کلام کی صورت ہے، مصرع اس طرح بہتر ہوتا ع "اے کمان ابرو جاتا ہوں جہاں تیرا خدنگ"

اس شاعر کو معنی آفرینی کا شوق ہے۔ لیکن کہیں کہیں بات چیستاں کی حد تک پہونچ جاتی ہے۔ چنانچہ آخری شعر میں یہی صورت ہے۔

مہر کے حالات باطن اور نساخ وغیرہ نے بھی لکھے ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان کا کوئی کبت یا دوہرہ نقل نہیں کیا ہے۔ غالبًا یہ دوہرے، کبت وغیرہ انھوں نے خود بھی اپنے دیوان میں شامل نہ کیے ہوں گے۔

8-عاشق

مہر چند مذکور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر فرخ آباد پہنچے تھے۔ یہ جگہ ان کے لیے زیادہ سازگار ثابت ہوئی چنانچہ انھوں نے اپنے خاندان کے بعض افراد کو بھی وہیں بُلا لیا تھا، مفتی ولی اللہ فرخ آبادی نے لکھا ہے:

"کشن چند عاشق کھتری برادر بزرگ مہر چند شعر خوب می گوید"۔14

اس کے چند شعر یہ ہیں۔

جی میں ہے جو قیس لیلیٰ وش کوئی پیدا کروں — پھر نئے سر سے جنوں کا سلسلہ برپا کروں
سر بہ صحرا ہو نکل جاؤں میں عاشق اب کہیں — بیٹھ کر دلچسپ سی جا گہ میں میں رویا کروں
ویسے کب بھولے ہے تیری یاد سوتے جاگتے — رات دن ہے نالہ وفریاد سوتے جاگتے
کیونکہ عاشق ہو میسّر وصل اس بُت کا مجھے — ہے رقیب اس پاس جوں ہمزاد سوتے جاگتے

دوسری غزل میں ردیف کو اچھی طرح صَرف کیا ہے اور اپنی قادرالکلامی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

دوسرے شعر میں البتہ 'نہیں مَیں'' کھٹکتا ہے۔ اسی طرح پہلے شعر میں بھی ''پیدا کروں'' شاعر کے لیے خلافِ واقعہ اور خلافِ فطرت خیال ہے۔ شاعر نے بعض متروک الفاظ وغیرہ بھی نظم کیے ہیں۔ مثلاً جاگہ اور اُس، پاس وغیرہ۔

9- ہندو

مہر چند کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا جس کا نام گوکل چند تھا اپنے بھائیوں کے اثر سے وہ فارسی میں بھی شعر کہنے لگا تھا۔ اس نے ہندو تخلص اختیار کیا تھا اور فرخ آباد میں رہنے لگا تھا۔ اس کا اردو کا ایک بھی شعر ہمیں دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ ان کے علاوہ فرخ آباد کے کیمپ میں اور بھی ہندو شاعر رہے ہوں گے اور ان کی قابلِ توجہ تعداد اس علاقے میں موثر بھی ہوسکتی تھی۔ چھاؤنی کی ملی جلی زبان جو گوروں کی بول چال سے بھی کسی نہ کسی طور پر متاثر ہو رہی تھی اور علمی اور کتابی زبان نہیں ہوسکتی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ فرخ آباد کی زبان کو کبھی سند کے طور پر پیش نہیں کیا گیا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ باہر سے آنے والے اچھے بُرے شاعروں کے اثر سے وہاں بعض نئے الفاظ، فکر و خیال کے نئے طرز اور بیان کے جدید انداز بھی کسی نہ کسی صورت میں پہونچ رہے تھے اور اس صورتِ حال نے فرخ آباد کے باکمالوں کی نظم و نثر دونوں کو تنوع اور جدت کی راہ دکھائی تھی۔15

(2) ناصر جنگ

نواب مظفر جنگ کی وفات کے بعد 1211ھ (97-1796) میں نواب امداد حسین خاں بہادر ناصر جنگ مسند نشیں ہوئے، ان کا سالِ ولادت 1197ھ (1783) بتایا گیا ہے۔ یہ شاعر بھی تھے اور شاعر نواز بھی ناصر تخلص کرتے تھے۔ ظاہراً یہ تخلص مسند نشینی کے بعد اختیار کیا ہوگا۔ شیفتہ نے ان کے تعارف میں مختصراً لکھا ہے:

''ناصر تخلص، نواب ناصر جنگ فرزند نواب مظفر جنگ بنگش است کہ شمع جلالتِ ایشاں چوں چراغِ صبح مستغنی از افروختن است، در 1228ھ (1813) روز

کسوفِ شمس ماہِ عرش منکسف شد"۔16

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

بکھری ہوئی چہرے پہ پڑی زلفِ رسا ہے زنجیر ہے، یا دام ہے، ناگن، یہ بلا ہے
وہ دستِ حنا بستہ مرے ہاتھ میں ہے آج رنگین یہ مضمون مرے ہاتھ لگا ہے
آگے تو تھی ہی ہر سرِ پیچش کمندِ زلف پیچھے پڑی ہے کاہے کو کاکل بلا کی طرح

مصرع آخری میں کاف کی آواز کی تکرار کھٹکتی ہے۔ دونوں مصرعوں میں آگے اور پیچھے لا کر شاعر نے تضاد کا لطف بھی پیدا کر دیا ہے۔

10-خادم

قدرت اللہ خاں قاسم نے خادم تخلص کے ایک شاعر کے تعارف میں مفید اطلاعات قلم بند کر دی ہیں لکھا ہے کہ:

"خادم تخلص، شیخ خادم علی کیتھلی است، وے در شاہجہاں آباد تربیت یافتہ عمش در سرکار دولت مدار نواب احمد خاں بنگش بمبلغ پنج صد روپیہ مواجب می یافت وخودش نیز تا الیوم در سلکِ ملازمانِ مظفر جنگ پسر خواندۂ نواب موسوم بہ ماہیانہ بمبلغ دو صد روپیہ منسلک است، بسیار مردِ قابل، خلیق و مہربان و شفیق و متواضع و نیک اختلاط، موذب و کرم ارتباط واقع شدہ"۔17

اس شاعر نے بعد کے نوابوں کا زمانہ بھی دیکھا تھا، چنانچہ شیفتہ نے ذکر کیا ہے کہ:

"خادم تخلص، خادم علی خاں از اہل فرخ آباد است، بہ استادی نواب ناصر جنگ کہ از حکام آں بلدہ بودہ، امتیاز داشتہ۔ گویند کہ در فارسی صاحب دیوان است، ملاحظہ نہ شدہ"۔18

ان کا کلام اس طرح ہے۔

ہو غریقِ رحمتِ پروردگار آج ساقی کا پیالا ہو گیا
ہائے رے غفلت تیرا خانہ خراب قافلہ جاتا رہا میں سو گیا
ہمیں کارِ دنیا سے کیا کام آیا مگر ایک لینا ترا نام آیا

مجھ کو کہتے ہو کہ چل باہر ہو　　آپ کے کہنے سے کب باہر ہو

چھوٹی بحروں میں شاعر نے اچھی چلتی پھرتی رواں اور سلیس غزلیں کہی ہیں۔ روزمرّہ اور محاورہ بندی سے اسے زیادہ دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔

فرخ آباد کے روہیلہ بھی عموماً مذہب پسند تھے۔ زبان کے نہایت پابند تھے۔ وہ دشمن جانی کے ساتھ بھی فریب نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن انگریزی سیاست کی بنیاد حصول مطلب پر تھی۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روہیلے ہی میں پورے ملک کے مسلمان انگریزوں کی سازشوں اور عیاریوں کے مقابل پوری طرح ماند کھا گئے۔ فرخ آباد کے پرانے شاعروں کے حالات اور کلام پر نظر کریں تو ان کے یہاں بھی مذہب اور صداقت کی طرف رجحان نمایاں معلوم ہوگا۔ ضمناً ایک دو شاعروں کا مثالاً میں ذکر کیا جاتا ہے:

11-قلندر

"قلندر تخلص، فقیر ست، سیاح اکثر در نواحی فرخ آباد اقامت دارد، دیوان ریختہ ترتیب دادہ واز وست" ۔19

قلندر اب کہ فقیروں سے خو برو بہتر　　نگاہ کرم کریں جس اوپر دو ہیں حق ہو

12-غنی

"محمد غنی کہ غنی تخلص می کند خلف خواجہ محمد حسن المتخلص بہ تائب بن خواجہ عبدالوہاب ناصرؔ است، وطن بزرگانش خطہ کشمیر وخودش در فرخ آباد تولد یافتہ، جوان مہذب الاخلاق وشیریں گفتار، ودیدمش بہ تجارت پشمینہ کہ پیشہ قدیم آبائی اوست، بسر می برد وبہ حکم موزونی طبع کہ دولت ایرانی است فکر شعر ہندی بیشتر می کند وچوں پدرش در شعر فارسی مہارتے داشت استفادہ فیض سخن از والد خود حاصل نمود عمرش سی وہفت سالہ خواہد بود بہ حساب یقینی در آمدہ، از کلام اوست" 20

شب نشے میں وہ کھولے رخ پہ زلف تیر تھا　　چشم بددور، الغرض اک عالم تصویر تھا

سیر کی شہر جنوں کی پایا ویرانہ تمام　　ہاں مگر آباد وھاں اک خانۂ زنجیر تھا

ناتوانی چشم کو گو دن بہ دن تھی ہجر میں　　زور پر لیکن ہمارا نالۂ شبگیر تھا

خط کے آنے سے ہُوا رتبہ زیادہ یعنی تب — خط سوادِ رخ تو مصحف تھا پہ بے تفسیر تھا
بیگناہی میری ٹھہرا کر گنہ، مارا مجھے — واقعی ایسا ہی بندہ واجب التعذیر تھا
بعد مرنے کے ہوا معلوم یہ سیماب وار — کشتہ ہوتا ہی غنیؔ حق میں اکسیر تھا
ملے اسی کو عزیز و سراغ راہ عدم — جو چشم غول کو جانے چراغ راہ عدم
حصول کر تو غنیؔ رتبۂ فنا فی اللہ — کہ تا ہو زیست میں حاصل فراغ راہ عدم
مسی سے یوں دُر دنداں مہ پیکر چمکتے ہیں — شب تاریک میں جس طرح سے اختر چمکتے ہیں

آخری مطلع میں۔ دُر دنداں کا مثل اختر چمکنا ثابت نہیں ہے، کیونکہ مسی کے اثر سے وہ سیاہ ہو جائیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مہ پیکر کے چہرے کو شب تاریک کہنا کسی طرح درست نہیں ہے، اس سے پہلے کے مطلع میں شاعر نے رتبہ فنافی اللہ کے حصول کی آرزو کی ہے۔ یہ آرزو کبھی بہت نمایاں ہو جاتی ہے اور کبھی اس کے مختلف شعروں میں اس خواہش کا عکس جھلکتا ہے۔

مشکل ردیفوں اور تنگ قافیوں میں غزل کہنے سے مقصود اپنی قدرت کلام اور قوت مشق کا اظہار ہوتا تھا اور یہ صورت حال اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ اس زمانے میں فرخ آباد کے علاقے میں شعر گوئی کا چلن اس حد تک ہو گیا تھا کہ شاعروں میں تفوق اور مسابقت کا جذبہ نمایاں طور پر کارفرما نظر آتا تھا۔

13- قاسم

حالات نے رفتہ رفتہ ''سرکار انگریزی'' کی ملازمت کو مسلمانوں کی نظروں میں بھی قابلِ ذکر اعزاز کا درجہ عطا کر دیا تھا۔ چنانچہ بعض شاعروں کے حالات میں اس کا تذکرہ بھی ہے، مثلاً:

''سید قاسم علی قاسم مادرش دختر میر محمد حسین عطا خاں مرصع رقم است، وے بہ تحصیل داری اطراف بلدہ فرخ آباد اکثر ماموری ماند، وگاہے دریں بلدہ تشریف می فرماید، صاحب طبع وقاد ذہن نقاد است''۔21

شیفتہ نے قاسم کی ماموری کی نوعیت کی بات زیادہ وضاحت سے کہی ہے کہ:

''سابقاً خدمت تحصیل محالات بہ سرکار انگریزی داشتہ، اکنوں در لکھنؤ می گذارند''۔22

تحسین بھی اپنے زمانے میں ایک انگریز کی خدمت میں رہے تھے۔ اس لیے قاسم کی ملازمت کو خاص فرخ آباد کے حالات پر محمول کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

ایک بوسے کے عوض دیں اس نے لاکھوں گالیاں — بیشتر لذت ملی تقصیر سے تعذیر میں
زمیں کو کر دیا رشکِ فلک رفتارِ جاناں نے — فروغ پنجۂ خورشید ہے ہر نقش میں پا کے
واعظا غم نہیں دوزخ کی گرفتاری کا — بیقراری نے دیا عالم سیماب مجھے

14-کمتر

اسی زمانے میں ایک شاعر کمتر شاہ ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں تحریر ہے:

"کمتر شاہ کمتر پدرش اسلم خاں از عمدہ ملازمان سرکار نواب احمد خاں بودہ داد بعد وفات پدر طریقۂ درویشی اختیار کردہ، مرید شاہ احسن اللہ دہلوی گشت بعد ازاں بہ لکھنؤ رفتہ ... بعد 1240ھ (25-1824) ازیں جہاں رفت بہ دارالآخرہ کشید"۔23

انھوں نے ریاست کا شباب دیکھا تھا۔ پھر اس کا حال خراب دیکھا نہ گیا فقیری لے لی۔ شہر کو بلکہ اس جہاں فانی کو ہی چھوڑ گئے۔ کلام میں بھی انھیں حالات وتاثرات کی عکاسی کی ہے۔

تجھے چھوڑ کر میں اگر جاؤں گا — تو پھر دو جہاں سے گذر جاؤں گا
جلاتا ہے ٹھوکر سے پیارے تو مردہ — قدم نیچے کل ترے مرجاؤں گا
بقا کس کو ہے دار فانی میں کمتر — رہا آج کل کر سفر جاؤں گا

کمتر شاہ قدیمی شاعر تھے۔ زبان کا حال بھی وہی ہے۔ تعقید لفظی کو وہ غالباً معیوب نہیں جانتے تھے۔

15-گویا

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اس زمانے کے ایک اور شاعر گویا کے تعارف میں لکھا ہے:

"گویا تخلص شیخ حیات اللہ از اہل فرخ آباد بہ مناصب ممتاز در سرکار انگریزی بہرہ ور ماندۂ از دست"۔24

جس کم سخن سے کیجئے تقریر بول اٹھے ہے ہم میں وہ کمال کہ تصویر بول اٹھے

سعادت خاں ناصر نے اس شعر کے بارے میں ایک حکایت نقل کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''میاں دلگیر صاحب کہتے تھے کہ ایک دن میں شیخ ناسخ کی خدمت میں حاضر تھا کہ میر سعادت علی خاں تسکین تشریف لائے۔ شیخ صاحب نے کہا: کچھ ارشاد فرمائیے میر صاحب نے شعر مرقوم الصدر پڑھا۔ شیخ نے کہا: شعر آپ کا خوب ہے اگر کم سخن کی جگہ بے زبان ہو تو کمال آپ کا ظاہر اور وہ نادر ہو جائے۔ میر صاحب نے دخل ان کا قبول فرمایا۔ ناصر نے اس طرح شعر لکھا ہے 25

جس کم سخن سے میں کروں تقریر بول اٹھے ہے مجھ میں وہ کمال کہ تصویر بول اٹھے

واقعی بات ہے کم سخن کا بول اٹھنا کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے اور تصویر کوئی بھی ہو وہ کم سخن نہیں ہوتی ہے۔ ناصر نے تسکین کے کلام کے ساتھ اس شعر کو بھی لکھا ہے لیکن شعر کا مضمون خود ''گویا'' تخلص کا طالب معلوم ہوتا ہے چنانچہ باطن نے بھی جو بات بات پر شیفتہ کی گرفت کرتا ہے ان کے انتساب کو قبول کیا ہے۔ البتہ اس گویا کے نام سے ناواقف ہونے کی وجہ سے غلطی کی ہے۔ نساخ نے بھی اس مطلع کو تسکین کے بجائے گویا ہی سے منسوب کیا ہے۔

3-شوکت جنگ

نواب ناصر جنگ کے بعد نواب خادم حسین خاں بہادر شوکت جنگ مسند پر بیٹھے۔ مگر دس برس کے بعد ہی 1238ھ (23-1822) میں وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے دور میں سابقہ شعری اور علمی روایتیں بدستور جاری رہیں۔

نواب شوکت جنگ خاں بہادر بھی فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، شوکت تخلص کرتے تھے۔ لکھا ہے:

''نواب خادم حسین خاں بہادر شوکت ولادتش بتاریخ 28 صفر 1217ھ (جون 1802) است بعد وفات ناصر جنگ مسند نشیں شد وبتاریخ 29 شوال 1238ھ (جون 1823) جان بجاں آفریں سپرد''۔ 28

دیکھنے کی بات ہے کہ کوئی گیارہ برس کی عمر میں یہ مسند نشیں ہوئے تھے اور اکیسویں سال میں

وفات پا گئے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کیسی صلاحیتیں لے کر آئے تھے۔ شاعری کا نمونہ یہ ہے۔

ہور ہے ہو جو تم خفا مجھ سے کون سی ہو گئی خطا مجھ سے

چشم تر ہے جو تری اے شوکت کچھ بیاں کر تو ماجرا مجھ سے

کون کہہ سکتا ہے کہ اس کم سن نے ان شعروں میں اپنے دل کے درد کا بیان نہیں کیا ہے۔ انگریزی جبر واستبداد نے نوابوں کی زندگی کو بھی تنگ کر دیا تھا۔ گھٹ گھٹ کر بھلا کوئی کب تک زندہ رہ سکتا تھا۔

4-حشمت جنگ

شوکت جنگ مرے تو ان کا بڑا بیٹا تجمل حسین کوئی دو برس کا تھا۔ وہی جاگیر کا مالک ووارث ہوا۔ جاگیر کے انتظام کے لیے ''کونسل انگریزی'' ایک نائب مقرر کرتی تھی۔ پھر اسے معزول کر کے دوسرے کا تقرر کرتی تھی۔ لکھا ہے کہ:

''فرزندانِ آں نواب، تجمل حسین خاں بہادر کہ ولادتش بتاریخ غرہ جمادی الآخر 1237ھ (جنوری 1822) است، وقت وفات شوکت جنگ کمتر از دو سالگی بود، ہمہ مردم در بار بہ مشاہدۂ اطوار وعظایم او صائش متفق الکلمہ اند، بر لیاقت امارت وے، نظر بہ صغر سن نواب تجمل حسین خاں برائے حراست وخدمت اطفال ونساء، ایں دودمان از تجویز اعیان کونسل انگریزی از لاامتاز العلما، قاضی سعید الدین خاں مقرر شدہ، قریب سہ سال بایں کار مامور ماندہ، وبعد عزلِ ایشاں مفتی ابوالحسن خاں قرار یافتہ وبعد ازاں نواب احمد یار خاں فرزند نواب ذوالفقار خاں بہادر''۔29

حالات کی سختیوں کو یہ بھی زیادہ برداشت نہ کر سکے کوئی چھبیس برس کی عمر پا کر عالم بالا کو سدھارے، اور اس طرح فرنگیوں کی قید سے رہائی حاصل کی۔

فرنگیوں کے معاملات سے زیادہ تکلیف دہ معاملات غالباً آنکھوں کے اندھوں، غرض کے بندوں، چاپلوسوں اور خوشامدیوں کے تھے۔ جو ان امیروں کو چوس ڈالنے کے بہانے نکال لیتے تھے، ذیل میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کے ایک خط کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

''شغلِ وکالتِ دیوانی چرا گذاشتید دریں فرخندہ ہنگام امیر سلطان شکوہ،

نصیر الدولہ معین الملک تجمل حسین خان بہادر حشمت جنگ کے وسادہ نشین ریاست فرخ آباد است، بہ من روے آوردہ، وورود من بہ فرخ آباد آرزو کردہ ہر چند گوشہ نشیں ونامرادی آئین منست لمابہ مشاہدۂ مہرے کہ ایں والا جاہ با من می ورزد، آہنگِ آں دارم کہ پائے خوابیدہ را بہ رفتار آوردم واز دہلی بہ فرخ آباد پویم شار ابا خویشتن بُرم چہ خوش باشد کہ پیوند اقامت پذیری کہ نہ بر اندازۂ ارزش شماست بہ گسلید و بعذ ریں ہفتہ بہ من پیوندید" 30

مرزا غالب نے اس نوعمر، نوخیز تجمل حسین خاں کی مدح میں جو غزل کہی تھی، بہ وجوہ وہ زبان زد خلائق ہوگئی ہے۔اس کے چند شعر یہ ہیں ۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے　　بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے
زباں پہ بارے خدایا یہ کس کا نام آیا　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لیے
نصیرِ دولت ودیں اور معینِ ملّت وملک　　بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے
زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش　　بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

اس نوعمر نواب کے حالات پر نظر کیجیے اور پھر ان شعروں کو پڑھیے تو زبان پر غالب ہی کا یہ مصرع خود بخود آجائے گا کہ :ع　　ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

نواب تجمل حسین خاں خود بھی شعر کہتے تھے ظفر تخلص کرتے تھے اپنے حالات کو سمجھتے تھے۔ چنانچہ مزاج میں انکساری آگئی تھی محسن نے ان کا ذکر ان لفظوں کیا ہے:

"نواب نصیر الدولہ معین الملک تجمل حسین خاں بہادر ظفر جنگ، ظفر تخلص خلف نواب شوکت جنگ بن نواب ناصر جنگ مسند آرائے فرخ آباد، سید اسمٰعیل منیر ان کے ملازم تھے"۔31

ان کے واسطے سے یہ غزل آئی ہے ۔

سلجھایئے نہ گیسوِ خمدار ہاتھ سے　　جاتے رہیں گے مفت خریدار ہاتھ سے
اچھا نہیں ہے دامنِ محشر کا پھیلنا　　چھوڑو نہ پائنچے دم رفتار ہاتھ سے

لالا سری رام نے ان کے حالات میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ:

"ظفر تخلص، معروف بہ حشمت جنگ اپنے چھوٹے بھائی نواب سخاوت حسین
خاں کے مشورے سے شعر کہتے تھے۔ بڑے سیر چشم عالی حوصلہ دریا دل امیر
تھے۔ علمِ موسیقی میں اچھا دخل تھا۔" 32

نواب تجمل حسین خاں کا ایک شعر یہ ہے۔

اشک سے تر مرا گریباں ہے   ملکِ گوہر مرا گریباں ہے

اس نوعمری اور ان مخصوص حالات میں اس قسم کے شعر کہے جا سکتے تھے۔ زبان کی صفائی لائق ستائش ہے اور بیان کی سادگی داد طلب ہے۔

16- شائق

نواب تجمل حسین خاں کے عہد کے شاعروں میں نذیر الدین حسن شائق خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے والد نے بریلی میں حافظ رحمت خاں کے دور میں قرآن پاک کے سولہ پاروں کی تفسیر نظم کی تھی اور خود شائق کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"نذیر الدین حسن بہ رفاقت احمد یار خاں نائب رئیس فرخ آباد گردیدہ، ہمیں جا
وفات یافتہ بہ زیر دیوار قلعہ مقبور گشت، گاہے شعر ہم می گفت و شائق تخلص می کرد" ۔33

اس شاعر کی ایک غزل کے کچھ شعر یہ ہیں 33

غضب ہے مجھ سے تو چھپتا پھرے اے سیمبر بر بر   پھر وں میں ڈھونڈتا دن رات اپنا چھوڑ گھر گھر گھر
خزاں کو دیکھ بلبل کیوں نہ روو ے تیرہ روزی سے   کہ اس کا کر گئی برباد سب نور بصر صرصر
دکھا دے حُسن کا جلوہ کہ میرے جی میں جی آوے   ترے دروازہ تک پہونچا ہوں اے رشک قمر مر مر
فدا کرتے ہیں شیرینی پہ جس کی طوطیاں جاں کو   بھلا کیوں کر نہ لوں اس لب کے بوسے میں شکر کر کر
علانیہ نہیں لیتے ہو گو تم نام شائق کا   یہ باتیں ہم سمجھتے ہیں جو کہتے ہو ادھر دھر دھر

اس غزل سے شاعر کی زبان و بیان اور مشق و مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شائق اپنے علاقے کے قابلِ قدر استادوں میں سے تھے۔

نواب کو ریاست کے معاملوں میں کچھ دخل نہیں تھا اس لیے وہ دلجمعی سے علم و شعر کی سرپرستی میں مصروف تھے۔ ان کی نوازشات کی شہرت بتدریج دور دور تک پہنچنے لگی تھی اور نتیجہ کے طور پر یہ

شہر ایک بار پھر شعر و سخن کے مرکز کی حیثیت حاصل کرنے لگا تھا۔ چند شاعروں کا حال یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

17-استاد

امیر الدین محمد آزاد بریلوی کا اپنے موقع پر ذکر آ چکا ہے اس جوار میں ان کے کئی شاگرد تھے۔ لیکن حالات سے مجبور ہو کر یہ اپنے بال بچوں کو لے کر شیخ عظمت علی خاں کے ساتھ فرخ آباد آ گئے تھے۔ ان کے ایک بیٹے کا نام شیخ محمد یار علی تھا، استاد تخلص کرتا تھا34۔ اس کی ایک غزل یہ ہے۔

ورق دل پہ وہ تصویر رقم کرتے ہیں   ہم خرابے میں بنا باغ ارم کرتے ہیں
صبحدم وہ جو علم تیغ دودم کرتے ہیں   آدمی کیا سر خورشید قلم کرتے ہیں
ہم بھی کیا چاؤ بھرے ہیں کہ ترا کر کے خیال   دم بہ دم سورۂ اخلاص کو دم کرتے ہیں
ضعف سے اب تو ہے یہ حال کہ آجائے ہے غش   گر مکاں سے حرکت ایک قدم کرتے ہیں
بندہ صیاد نہیں، آہوِ صحرا نہیں تم   کس لیے آپ مجھے دیکھ کے رم کرتے ہیں
فرخ آباد چلو چھوڑ وطن کو استاد   خوبرو تم پہ بریلی کے ستم کرتے ہیں

اس غزل کا مقطع بہت توجہ طلب ہے کہ اس میں شاعر نے اس دور کے دونوں مقاموں کے حالات کا بڑی خوبی سے بیان کر دیا ہے۔

18-خلیق

بہو بیگم صاحبہ کی وفات اہل فیض آباد کے لیے گویا قیامتِ صغریٰ تھی۔ خانہ برباد، پریشان حال، جس طرف سمجھ میں آئی نکل کھڑے ہوئے۔ میر علی اوسط رشک کے خاندان کے بھی بعض لوگ وہاں سے فرخ آباد پہنچے میر حسن جب دہلی سے فیض آباد گئے تھے فرخ آباد کی طرف سے بھی گذرے تھے۔ اب وقت پڑا تو ان کے صاحبزادے میر محمد مستحسن خلیق فیض آباد سے نکل کر دہیں پہنچے۔ سید محمد خان رند نے اس ترک وطن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بعد چندے میر موصوف محمد مستحسن خلیق روانہ فرخ آباد شد ندر راقم آثم بتاریخ ہفتم رجب 1240ھ (فروری 1825) از فیض آباد وارد دار الخلافہ لکھنؤ گردید''۔35

فیض آباد کے زمانہ قیام میں وہاں ان خلیق سے بہتر کوئی شاعر (غزل گو) نہیں سمجھا جاتا

تھا۔ فرخ آباد میں بھی شعری اور علمی اعتبار سے کم و بیش ویسا ہی ماحول تھا یہاں نہ صرف ان کی ہر طرح پذیرائی کی گئی ہوگی۔ بلکہ ان کی استادانہ شخصیت سے بہتوں نے فیض بھی اٹھایا ہوگا۔ ان کی غزلیں مدت تک فرخ آباد میں لوگوں کو یاد تھیں۔ نادر نے بھی اپنے دیوان غریب میں ان کی یہ غزل شامل کی ہے۔

مرغانِ قفس کرتے ہیں سب نغمہ سرائی — کیا فصل بہاری کی چمن سے خبر آئی
گلشن میں یہ کس شخص کا ہے ذہیر کہ بلبل — منقار میں لے جا کے کئی پھول دھر آئی
مدت سے ہم رہتے تھے جس گھر میں ہم اور یار — اب دیکھ کے خالی وہ مکاں آنکھ بھر آئی
کیا پوچھتے ہو حال اسیرانِ قفس کا — گلشن سے جو بے خود ہو نسیم سحر آئی
ایسا تو جہاں میں کوئی ہو ویگانہ رسوا — آفت جو خلیق جگر افگار پر آئی

اس غزل کا تیسرا شعر تو صاف بول رہا ہے کہ ابھی شاعر کا گھر چھوٹا ہے۔ چوتھے شعر میں بھی اسی غم کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ مقطع بھی انھیں حالات کا موید ہے۔

محسن نے البتہ اپنے تذکرے میں خلیق کی جو غزل نقل کی ہے وہ کسی طرحی مشاعرہ کے لیے لکھی گئی ہوگی۔ دو شعر یہ ہیں۔

مثل آئینہ ہے اس رشکِ قمر کا پہلو — صاف ادھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو
جانب دل ہے مری آہ شرر بار کا گھر — روئی کے پھوئے سے سینکو نہ ادھر کا پہلو

سعادت خاں ناصر نے بھی میر خلیق کی جن غزلوں کے اشعار تحریر کیے ہیں ممکن ہے کہ بعد کے زمانے میں کہی گئی ہوں۔ اس لیے ان کا یہاں نقل کرنا مناسب معلوم نہیں ہوا۔

فرخ آباد میں حالات اور اسباب جو بھی رہے ہوں مقامی ہی نہیں باہر سے آنے والے بھی تقریباً سبھی شاعروں کے کلام میں:

(الف) عموماً مذہب کی طرف کم و بیش میلان پایا جاتا ہے۔

(ب) مضامین حقائق اور واقعات پر زیادہ ترمبنی معلوم ہوتے ہیں۔ دور از کار اور محض خیالی باتیں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔

(ج) محبوب مجسم ہوتا ہے۔ اکثر اس کے بیان اور حرکات و سکنات سے اس کا جنسِ اناث

سے ہونا بھی یقینی حد تک ظاہر ہوتا ہے۔ بایں ہمہ بات ابتذال یا عریانیت کی حد تک نہیں پہنچ پاتی۔ صحبت نایافتہ مدعیان سخن کی بات الگ ہے۔

(د) غزلیں عموماً بہت طویل نہیں ہوتیں۔ اکثر مطلع سے مقطع تک تمام شعروں کی فضا میں اس قدر یکسانیت پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ صورت وہاں کے مخصوص حالات کے سبب سے معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شاعر کی کوشش یا ارادہ کا دخل عموماً معلوم نہیں ہوتا ہے۔

(ب) مثنوی

اس زمانے میں فرخ آباد کے علاقے میں مثنویوں کے لکھنے کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں کی گئی تھی۔ بعد تلاش بسیار یہاں پر جو مثنویاں دستیاب ہو سکی تھیں ان کا تعلق عقائد سے رہا ہے۔ ایک دلچسپ اتفاق یہ بھی ہے کہ فرخ آباد میں لکھی جانے والی بعض مثنویوں کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہیں۔

1-آفریں

ترقیمہ میں اس کی مثنوی کا نام اور مصنف کا ذکر اس طرح آیا ہے:

''تمام شد مثنوی بحر العشق من تصنیف شیخ غلام حسین متخلص بہ آفریں ساکن قصبہ تونجہ، پرگنہ بھوجپور، ضلع فرخ آباد بخدمت ارباب استعداد عرض ی دہم ۔1

بنارس ہے عجب یک شہر رنگیں　　کہ چیں مانے ہے جس سے کشور چیں

بنارس خطۂ جنت نشاں ہے　　پے گل گشت سعدی بوستاں ہے

غبار اُس کا ہے سرمۂ چشم عشاق　　بتوں کا اس کے یک عالم ہے مشتاق

فرخ آباد کے ایک شاعر کا بنارس کے خطے کی تعریف کرنا اور وہاں کی ایک عشقیہ داستان کو نظم کرنا توجہ طلب ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ شاید آفریں کسی سلسلے میں بنارس میں جا کر سکونت پذیر ہوا

ہوگا۔مثنوی میں جو قصہ نظم ہوا ہے اس کا خلاصہ اس طرح ہے:

اس کے قصہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

''عشق کے نتیجے میں لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد یہ عاشق و معشوق بھی آخر محروم وصال رہ کر دنیا سے فوت ہو گئے ہیں،،اس قصہ میں شہر بنارس میں ایک مہاجن کی بیٹی نہایت حسین تھی اور نام اس کا سندر رنی تھا۔ ایک روز وہ اپنے بام پر کھڑی تھی کہ ایک عاشق مزاج کی اس پر نظر پڑ گئی اور وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا اور بالآخر وہ بڑی بڑی صعوبتیں اٹھا کر عالم بقا کو راہی ہو گیا-اس مثنوی کا اختتام ان شعروں پر ہوا ہے ۔

کیا برباد آخر عشق نے آہ　　گئے دنیا سے دونوں یار دل خواہ
سمجھتا عشق کوئی آفریں خوب　　نہ طالب اس سے بچتا ہے نہ مطلوب

اَللّٰھُمَّ احفظ قاریھا وَناظرھا کاتبھا و سامعھا..... بحق احمد مجتبیٰ محمدؐ مصطفیٰ صلعم و بحق حضرت ابو بکر صدیق و حضرت عمر فاروق و حضرت عثمان بن عفان و حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم

مثنوی کے خاتمہ کے بعد یہ عبارت بھی لکھی ہے:

2-حَسن

کتب خانہ آصفیہ کے علاوہ ان کی مثنوی سیف و قاطع کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں بھی ہے۔نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اس کے مصنف کے بارے میں لکھا ہے:

''مصنف کا نام دراصل عبدالکریم تھا اور حَسن کے فرضی نام سے انھوں نے اس کتاب کو لکھا ہے۔ علمائے بریلی میں آپ شامل تھے۔ اصل وطن قنوج تھا۔کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔''2

مثنوی کے آغاز کے کچھ شعر یہ ہیں ۔

کروں میں شکر پہلے اُس خدا کا　　کہ جو خالق ہے سب ارض و سما کا
کیے جن و بشر اُس نے ہی پیدا　　نبی مرسل کیے ان پر ہویدا

کہ تا پاویں ہدایت، ہوں نہ کافر عبادت میں رہیں حق کی وہ حاضر

یہ ایک مختصر مثنوی ہے۔ اس میں شیعی عقائد کا رد کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں سخت کلمات استعمال کیے ہیں۔ مثنوی سے متعلق ضروری امور کا بیان اس طرح کیا گیا ہے

بس اے سُنّی حسن خاموش ہو رہ نصائح بس سے زیادہ ان سے مت کہہ
نواقض رفض کے سب کچھ لکھ چکا تو پر اب تاریخ و نام ان کا سُنا تو
سُنا ہاتف نے جب مضمون سارا رکھا تب سیف قاطع نام اس کا
بہ دل تاریخ بھی یوں ہووے قابض کہ ہے یہ مثنوی سہم الروافض

1223ھ

شاعر نے اپنی اس کتاب کا اختتام ان شعروں پر کیا ہے۔

توقع ہے محبوں سے دعا کی کریں گے عفو گر میں نے خطا کی
محبّ تو سُن کے ہوں گے شاد و خرم خجالت سے مخالف ہوں گے بریم
حمد و ہشتاد و یک منہ ہیتگے ابیات مقرر ہو ویں ان سے رافضی مات

خاتمہ کے کلمات یہ ہیں:

''تمام ہوئی مثنوی ردّ روافض بنائی ہوئی مولوی حسن صاحب کی ہے، تمت تمام''۔

اسی قسم کی چھوٹی بڑی بعض مثنویاں اس زمانے میں اور بھی لکھی گئی ہوں گی لیکن ان کا معیار کچھ بلند معلوم نہیں ہوتا ہے۔ زبان ان کی البتہ فارسی آمیز ہے۔

(ج) متفرق منظومات

فرخ آباد کے علاقے میں مذہب کا اثر زیادہ رہا ہے اور اسی صورت حال کا نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں غزل کے علاوہ دوسری مختلف اصناف سے بھی کم وبیش دلچسپی لی جا رہی تھی۔ چنانچہ یہاں صرف بعض کا نمونہ کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے:

1 - سید اولاد حسن حسن

مولوی سید اولاد حسن قنوجی اس جوار کے ایک معروف عالم تھے۔ وہ اپنی نثری تحریروں کی وجہ سے عام طور سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک مختصر سا منظوم رسالہ بھی ''راہِ سنت'' کے نام سے لکھا تھا۔ اس رسالہ کا ایک قلمی نسخہ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ سید علی نامی کسی شخص نے 1253ھ (1837) میں اس کی کتابت کی تھی۔ اس میں پندرہ سطری مسطر پر کل اڑتیس ورق ہیں۔ ابتدا اس کی اس شعر سے ہوتی ہے

حمد کے لائق ہے حق سُبحانہٗ   سب سے فائق ہے تعالیٰ شانہٗ

اور اس کا آخری شعر یہ ہے۔

دور رکھیو مجھ سے نارِ حاطمہ   ہو حَسن کا اس پہ حُسنِ خاتمہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید اولاد حسن اپنے نام کی مناسبت سے حسن تخلص کرتے تھے۔ ان

کا یہ رسالہ مثنوی کی ہیئت میں ہے اور اس کا موضوع ''منع چراغاں بر قبور'' ہے۔

2۔سید امداد علی امداد

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے امداد تخلص کے ایک شاعر کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''امداد، حافظ سید امداد علی ولد حافظ سید مہدی علی متوطن فرخ آباد، ساکن محلہ نل خام''۔2

بنیادی طور پر یہ شخص غزل گو شاعر تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسے تاریخ گوئی اور تخمیس وغیرہ کا بھی شوق تھا اس کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس کے تعارف میں لکھا ہے:

''یہ مخطوطہ دیوان امداد علی خاں امداد کی اردو غزلیات اور مسدس پر مشتمل ہے، دیباچے سے پتا چلتا ہے کہ یہ دیوان 1243ھ (28-1827) میں مرتب کیا گیا تھا''۔3

فہرست نگار نے اس شخص کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''امداد کا تعلق بنگش خاندان سے تھا وہ نواب قاسم علی خاں بنگش کا بیٹا اور نواب فیض اللہ خاں بنگش کا پوتا تھا''۔

لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔صحیح وہ ہے جو نادر نے لکھا ہے اور وہی نساخ اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے بھی تحریر کیا ہے، دیوان کے شروع میں فارسی میں ایک دیباچہ ہے۔اس کا آغاز ان لفظوں سے ہوتا ہے:

''بعد از حمد خداوند جہاں آفریں و نعت ختم المرسلینؐ و آل و اصحاب ارکان دین متین مخفی نہ ماند کہ صاحبزادۂ عالی ہمت معدن سخاوت.....الخ''۔

اور دیوان کا خاتمہ خود امداد کے کہے ہوئے اس قطعہ تاریخ سے ہوتا ہے جس کا آخری شعر یہ ہے۔

کہا یہ لوگوں نے امداد سے، کہو اشعار   جو میں نے فکر کی تاریخ کی وہیں یکبار

اس کے بعد کے شعر مخطوطے میں آگے کے اوراق (یا ورق) پر رہے ہوں گے جو ضائع ہو گئے ہیں۔

3-رشک

شیخ ناسخ کے مشہور شاگرد میر علی اوسط رشک کے ایک خالہ زاد بھائی میر امانت علی ان کے بہنوئی بھی تھے۔ وہ قنوج کے رہنے والے تھے ان کی وفات کا قطعہ تاریخ میر رشک نے اس طرح کہا تھا۔

اے فلک آں عمہ زادم بود وز وج خواہرم	چوں نہ گویم بہر مرگش از تعب افسوس وائے
میر امانت بود نام نامی او باعلی	شیعی وبہ جرات وعالی نسب افسوس وائے
مولدش قنوج ومدفن خاکِ فیض آباد شد	درد دارم نالہ با شور وشغب افسوس وائے
بعد مرگِ والدِ من تربیت کرد او مرا	چوں نیارم در غمِ او تا بہ لب افسوس وائے
یافتم تاریخ مرگ اے رشک از ہاتف چنیں	آں چہارم بود از شہر رجب افسوس وائے

(1838) 1254ھ

میر امانت علی نے میر رشک کی تربیت کی تھی اور ان سے اولاد کی طرح محبت کرتے تھے۔ اس تعلق سے میر رشک کا قنوج اور فرخ آباد کی طرف آنا جانا رہا تھا۔ چنانچہ عبداللہ خاں ضیغم نے ذکر کیا ہے:

"جس زمانے میں میر علی اوسط رشک لکھنوی فرخ آباد میں آئے تو انھوں (غلام محمد خاں خبیر) نے ان کی شاگردی اختیار کی"۔4

اور سعادت خاں ناصر نے بھی لکھا ہے کہ:

"میر بہادر علی حزیں ساکن فرخ آباد میر رشک کی زبانی معلوم ہوا کہ چند غزل اس کی میری نظر سے گذری ہیں"۔5

فرخ آباد کے بعض صاحبان علم سے میر رشک کے روابط بھی قائم ہو گئے تھے۔ چنانچہ ذیل کے قطعہ تاریخ وفات سے بھی ظاہر ہے۔

سید ترمذی ولی اللہ	بہ علوم اکمل وبہ رتبہ رفیع
شاغلِ حلِ معنیِ قرآن	صاحب طبع استوار ومنیع
کرد در پنجم رجب رحلت	تنگ شد در غمش جہانِ وسیع

فرخ آباد شد الم آباد   اشک می ریخت ہر شریف ووضیع
داد مرگبش بجان اہل علوم   غم ورنج وسوادم وتصدیع
رشک بنوشت مصرع تاریخ   باد قرآں بقبر انیس وشفیع

1249ھ (=1833-34)

میر رشک نے 1248ھ (1832-33) میں ایک مثنوی ''در بیان رجعت امام مہدی'' لکھی تھی۔ وہ فرخ آباد میں پہنچے تو میر امانت علی اس مثنوی کو دیکھ کر خوش ہوئے اور انھوں نے اسے اپنے لیے نقل کیا چنانچہ وہ نسخہ کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ اس کا ترقیمہ یہ ہے:

''سید امانت علی قنوجی مدظلہ العالی تحریر نمودنی 1248ھ ماہ رجب المرجب (=1833) اللہم اغفر للکاتب والمؤلف...''[6]

ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ میر رشک کا کلام اور اس کے اثرات فرخ آباد میں بھی پہنچ رہے تھے۔

(د) نثر

فرخ آباد میں اردو غزل کے فروغ پر نظر کریں تو خود بخود خیال ہوتا ہے کہ وہاں اردو نثر نویسی کی طرف بھی توجہ ضرور کی گئی تھی۔

1- حسین علی علی

اتفاق سے ایک مخطوطے کے تعارف میں قاضی محمد سعید کی یہ تحریر نظر سے گذری:

''ایجاد ہندی نثر ع قلم کے اگر ہوں زباں بے شمار''[1]

مصنف: محمد امین الدین حسین فاروقی عُرف حسین علی متخلص بہ علی۔ دیباچہ میں لکھتا ہے کہ:

میں خان ابن الخان عبدالرحیم خاں کا رفیق ہوں، انھیں منشی مہر چند ...تحصیلدار پرگنہ کھٹیر کا قصہ جو زبان اردو میں ہے پسند آیا، ہر چند لکھنا اردوے معلاّ کا او پر ذات محمد عطا حسین خاں صاحب لکھنوی کے ختم ہے لیکن میں نے جرات کر کے ایک قصہ لکھا ہے۔

هوئی جب کہ ایجاد ہندی تمام — طفیل محمد علیہ السلام
هوئی مجھ کو تاریخ کی جستجو — لگا کہنے ہاتف یہ شیریں کلام
اٹھا کاف یاں سے حسین علی — کہ پاویں مراد اپنی سب خاص و عام

20 -: 1252=1232ھ(1817)

کاتب: افضل علی خاں عظیم آبادی، کتابت در آگرہ 1263ھ (1847)''

مہر چند کھتری اور اس کے بعض متعلقین کا حال شاعر کی حیثیت سے لکھا جا چکا ہے۔ اس شخص نے ایک قصہ اردو نثر میں:

''نوآئینِ ہندی المعروف بہ قصۂ ملک محمد گیتی افروز''

کے نام سے بقول ڈاکٹر سہیل بخاری 1209ھ (=1794) لکھا تھا۔2 کسی شخص نے اس کی اہمیت جتاتے ہوئے لکھا ہے کہ سب سے پہلے تحسین کی نوطرز مرصع کا ذکر قصہ ملک محمد گیتی افروز مصنفۂ مہر چند کھتری مہر میں نظر آتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ نوطرز مرصع کوئی نایاب یا گمنام تصنیف نہیں تھی۔ مہر چند کھتری نے جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہے تحسین کی کتاب کا جواب پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''عطا حسین خاں نے چار درویش کا قصہ فارسی سے ہندی میں تضمین کر کے نوطرز مرصع نام رکھا سو الحق نوطرز مرصع ہے لیکن جو ریختہ زبان میں الفاظ و قیق اور عبارات رنگین موزوں کیا ہے اس سبب سے مطبوع انگریزوں کے نہیں ہوا''۔

یہ صحیح ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں قصۂ چہار درویش کو میر امن سے لکھوایا گیا لیکن یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ تحسین کا کام انگریزوں میں پسند نہیں کیا گیا تھا۔ تحسین کی کتاب 11/جمادی الثانی 1262ھ (3/فروری 1846) میں بمبئی سے چھپی تھی۔ اس پر حکومت کے مترجم ویئس کینڈی کا یہ سرٹیفکٹ بھی چھپا ہے:

"I do here -by certify that I have looked over the accompanying Hindustani work entitled, Nau- Tarz-Murassa containing the tales of Farkhunda Sir, King of Rum. This work appears to me to be written in a pure and correct style. and were it there fore published, it would, in the great want of Hindustani books, materially facilitate the acquisition of knowledge of that language."

بیان اور زبان کا انداز وقت ہی نہیں علاقوں میں بھی بدلتا رہتا ہے۔ تحسین نے پہلی مرتبہ

پورب کے علاقوں میں رہ کر مرصّع نثر لکھی تھی۔ کھتری نے جو روہیل کھنڈ کے علاقے میں رہ رہا تھا اور جسے اس علاقے میں مقیم اردو کے بہترین استادوں سے استفادہ کے مواقع حاصل تھے۔ اپنے انگریز آقاؤں کے مشورے سے اور تحسین کی کتاب کے مطالعے کے بعد اپنا قصہ لکھا تھا۔ اور اس کا یہ قصہ بھی طبع زاد نہیں تھا۔ بلکہ ایک فارسی قصہ ''آزر شاہ دمن رخ بانو'' کا ترجمہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے نوطرز مرصع کو تالیف تو کیا ترجمہ بھی کہنا گوارا نہ کیا اور ''تضمین'' کے درجے میں رکھا۔ اس جسارت کی داد وہ شخص تو ضرور ہی دے گا جس کا نانا برسوں افغانستان میں رہنے کے بعد بھی کثافت کو 'س' سے ہی لکھتا رہا۔ کثافتیں جو طبیعتوں میں گھر کر جاتی ہیں خدا جانے کہاں جا کر دور ہوں گی۔

حسین علی متخلص بہ علی نے تحسین کے علمی کارنامے کی ناقدری دیکھی تو اس کے ازالے کی فکر کی۔ لکھنے والا جو لکھ گیا تھا اسے محذوف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ناچار اس نے خود ایک قصہ لکھ کر پیش کیا۔ ظاہراً اس میں تحسین کی حمایت میں بھی کچھ ضرور ہوگا۔

حسین علی کا قصہ ہنوز غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سے دستیاب نہیں ہے۔ لیکن شروع میں جو اقتباس نقل کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی نثر سلیس اور رواں بلکہ جدید نثر کے قریب تک پہنچتی ہوئی ہوگی۔ بے شک قدیم اور مقامی الفاظ ومحاورات بھی اس میں اپنا جلوہ دکھا رہے ہوں گے اور اس زمانے کے چلن کے مطابق مولف نے عبارت کو خود اپنے اور دوسرے شاعروں کے کلام سے آراستہ کیا ہوگا۔ مولف نے قصہ کی تکمیل کی تاریخ بھی نظم کردی ہے۔ افسوس ہے کہ حسین علی متخلص بہ علی کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

2-اولاد حسن

سید اولاد حسن قنوجی کا شاعر کی حیثیت سے ذکر کیا جا چکا ہے۔ وہ حسن تخلص کرتے تھے۔ شاعر ہونے کے علاوہ وہ اپنے زمانے کے قابل ذکر اردو نثر نگاروں میں سے بھی تھے۔ 1200ھ (86-1785) میں قنوج میں پیدا ہوئے تھے۔ وہیں مولانا عبدالباسط قنوجی سے تعلیم پائی۔ پھر لکھنؤ جا کر تکمیل کی۔ عربی فارسی میں متعدد کتابیں لکھی ہیں اردو میں بھی ان سے چند کتابیں یادگار ہیں۔

سید صاحب کا آبائی مذہب امامیہ تھا۔ پھر انھوں نے توبہ کر کے سُنّی مذہب اختیار کیا۔ شاعری کا بھی اس حد تک شوق تھا کہ اپنی نثری تصانیف میں بھی حسن تخلص کے ساتھ انھوں نے اپنے کچھ کچھ اشعار شامل کر دیے ہیں۔

اردو نثر میں ان کی سب سے زیادہ معروف کتاب ''ہدایۃ المومنین'' ہے۔4 یہ رسالہ ایک مقدمہ اور تین فصلوں پر مشتمل ہے اس طرح:

مقدمہ: بدعتوں کے ظاہر ہونے کے سبب کے بیان میں

فصل اول: عقلی و شرعی دلائل سے تعزیے کی بُرائی کے بیان میں

فصل دوم: جاہلوں کے بعض سوالوں کے جواب میں

فصل سوم: آیات و احادیث سے تعزیے کی بُرائی کا بیان

کتاب کا ان شعروں سے آغاز ہوا ہے ؎

شکرِ خدا جن نے بتایا ہمیں　　راہ پیمبرؐ پہ چلایا ہمیں
غم میں ہمیں صبر کی تعلیم دی　　راہ بتائی ہمیں تسلیم کی
بھیج دیا ہم کو قرآن وحدیث　　اس پر عمل جو نہ کرے ہو خبیث

اور ؎

جو کہ ہیں اصحاب رسولؐ خدا　　دین، سعی ان کی سے شائع ہوا
ہو جو ان سب پہ ہمارا سلام　　نثر میں اب کرتا ہوں آگے سلام

کتاب کے سبب تالیف میں مولف نے لکھا ہے:

> ''بندۂ خیر خواہ حسن قنوجی نے کہ اللہ اس کو حسنؓ و حسینؓ کے طریقے اور محبت میں رکھے، چاہا کہ اپنے ملنے والوں اور جن کو خدا توفیق دے برائی ان رسموں کی سمجھا دیوے مگر دیکھا تو ان کا عجب حال ہے کہ بے خون نکالے ان کے مزاج کے فساد کا پورا دور ہونا ممکن ہی نہیں .... اس لیے اس وقت میں کہ سن 1243 ھ (28-1827) ہے یہ رسالہ ہندی زبان میں لکھا تا ہر کوئی اپنی بولی میں سمجھ کر بے تکلف سمجھ لے، اور سوجھ بوجھ پکڑے۔ پھر دریافت کیا تو سب رسموں سے دو

رسموں کا چھوڑنا لوگوں پر بہت مشکل ہے اور شاق، ایک تو منت، پوجا اولیا وغیرہ

کی، اور دوسرا تعزیہ کا بنانا۔ بیت

چھاتی پہ گر پہاڑ بھی ہووے تو ٹل سکے ، مشکل ہے جی میں بیٹھے، وہ جی سے نکل سکے

اور منت پوجا کے بیان میں رسالہ نصیحت المسلمین لکھا پایا۔ اس واسطے اس رسالہ

میں فقط بُرائی تعزیہ کی صاف صاف بیان کی ..... اور نام اس رسالہ کا

ہدایت المومنین رکھا''۔

اس رسالہ ہدایت المومنین کا خاتمہ اس طرح ہوا ہے:

''جو اس پر نہ سمجھو تو بھاڑ میں جاؤ، اپنا سر کھاؤ، موت قریب ہے منکر نکیر قبر میں

سمجھادیں گے''۔

خاتمے کے اشعار یہ ہیں۔

خدا کے واسطے بدعت کو چھوڑو ، اگر کچھ دل میں ہے خوفِ خدائی
حجاب اب رسم وعادت کا اٹھادو ، کہ تا مضمون حق دیوے دکھائی
اگر اس پر نہ بوجھو بو جہل ہو ، خدا نے مُہر ہے دل پر بٹھائی
حسن خاموش ہو اتنا بہت ہے ، جسے چاہے خدا دیوے سُجھائی

نذیریہ پبلک لائبریری دہلی میں اس کتاب کے دو قلمی نسخے ہیں، پہلے کی کتابت

12 رجمادی الاول 1243ھ (دسمبر 1827) کو اور دوسرے کی بہت بعد میں

ہوئی تھی۔5 اس دوسرے نسخہ کا ترقیمہ یہ ہے:

''تمام ہُوا یہ رسالہ ہدایت المومنین تاریخ تیرھویں، وقت دوپہر ماہ شوال

1291ھ (نومبر 1874) دستخط بے ربط عاصی پُر معاصی پھول خاں ساکن مئو

قریب فرخ آباد کے واسطے خاطر اپنی لکھا گیا''۔

اس اقتباس میں مئو سے مُراد چھبرامئو ہے جو اس زمانے میں ضلع فرخ آباد میں ایک اہم قصبہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ کتاب ہدایت المومنین کے بارے میں مشفق خواجہ نے جو لکھا ہے ماحصل اس کا یہ ہے:

"یہ کتاب کئی مرتبہ طبع ہو چکی ہے، پہلی مرتبہ مطبع احمدی کلکتہ سے 1243ھ (1828) میں، پھر ششمبر ناتھ پنڈت کے مطبع کلکتہ سے 1244ھ میں چھپی، مطبع ناصری بمبئی میں بھی یہ کتاب چھپ چکی ہے، مگر اس پر سال طباعت درج نہیں ہے"۔ 6

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے بھی اس کتاب کے ایک قلمی نسخے کا تعارف کرایا ہے اور اس کے مصنف کے بارے میں لکھا ہے:

"اولاد حسن قنوجی بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں کے والد بزرگوار تھے۔ 1210ھ (=1795-96) میں قنوج میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان تین پشتوں سے شیعہ تھا۔ مگر جب انھیں مولوی عبد الباسط قنوجی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا تو تشیع سے توبہ کرلی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت سید احمد شہید کے ہاتھ پر بیعت کرلی"۔

2- رسالہ در بیان ما اُھِلَّ بہٖ لغیر اللہ

یہ بھی اولاد حسن قنوجی کی تصانیف میں سے ایک ہے۔ اس کتاب کا مخطوطہ کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں محفوظ ہے۔

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"اس نام کا ایک رسالہ مولوی اولاد حسن قنوجی کی تصانیف میں بھی ہے۔ چونکہ یہ اسی موضوع سے متعلق ہے اور طرز بیان بھی ان کی دیگر تصانیف سے ملتا جلتا ہے قرین قیاس ہے کہ یہ انھیں کا رسالہ بیان میں ما اُھِلَّ بہٖ لغیر اللہ کے ہوگا"۔

جیسا کے نام سے ظاہر ہے اس میں خدا کے سوا کسی کے نام پر ذبح کیے جانے والے جانور کی حلت وحرمت سے بحث کی گئی ہے۔ مخالفین کی طرف سے کیے جانے والے بیشتر اعتراضوں کا قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب بھی دیا گیا ہے۔ ضمناً سید احمد شہید سے متعلق بعض جوابی اشارے بھی کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ شرک کرنا بڑی بے انصافی ہے، بڑی بے انصافی تو جب ہوگی کہ اس کے بعد کوئی درجہ بے انصافی کا باقی نہ رہے۔ پس عوام الناس میں لوگ دو طرح کے ہیں ایک لوگ درجہ اعلیٰ رکھتے ہیں کہ ان سے بڑا مرتبہ کسی کا نہیں جیسے بادشاہ، دوسرے لوگ ادنیٰ درجہ رکھتے ہیں کہ ان سے ادنیٰ کوئی نہیں''۔

اور خاتمہ کے الفاظ یہ ہیں:

''لوگ بھی کہتے ہیں کہ جانور فلانے کے نام کا ہے اور فلانے کے واسطے ہم ذبح کرتے ہیں۔ پھر ذبح کے وقت میں نام خدا لیویں تو ہرگز حلال نہیں۔ ہاں اگر اس نے نادانی سے شہرت دیا۔ بعد اس کے خبردار ہو کر تقرب غیر اللہ کی نیت چھوڑ کر نام خدا پر ذبح کرے تو حلال ہے۔ تمام ہوا بیان عزیزیہ کا''۔

جناب مشفق خواجہ نے مختصراً مصنف کے حالات اور اس کی کتابوں کی فہرست بھی درج کی ہے اس میں ان کی درج ذیل دو اردو کی کتابوں کے نام بھی شامل کیے ہیں:

رسالہ معنی کلمۂ توحید میں اور

ترجمہ اردو حبل المتین لقول المسجین فی حقوق الخلق اجمعین

ان کے علاوہ دو کتابوں کے نام اور بھی لکھے ہیں۔ لیکن یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ وہ کس زبان میں ہیں۔ شاید اردو ہی میں ہوں:

رسالہ آداب وعظ و تذکیر اور انشائے حسن

3- سید محمد ولی اللہ

تاریخ فرخ آباد (فارسی) کے مصنف مولوی مفتی سید محمد ولی اللہ فرخ آبادی بن سید احمد علی قصبہ سانڈی علاقہ فرخ آباد کے رہنے والے تھے۔ وہیں 14 رشوال 1165ھ (26 اگست 1751) کو پیدا ہوئے تھے، اگست 1805 (1220ھ) کو مفتی کے عہدے پر ان کی تقرری ہوئی۔ وفات سے چار برس پہلے اس سے علاحدگی اختیار کر لی، 5 جمادی الثانی 1249ھ (18 نومبر 1832) کو رحلت کی، تاریخ ہوئی

ع گنجِ معنی برفت زیرِ زمیں

1249

فارسی میں انھوں نے کم سے کم چار کتابیں یادگار چھوڑی تھیں۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں اردو نثر میں ان کا ایک قلمی رسالہ محفوظ ہے جس کا نام "اذکار النجات" ہے۔ یہ دراصل ان کے ایک فارسی رسالہ کا اردو ترجمہ ہے چنانچہ اسے:

"ترجمہ وردِ المقرب وحزب التوسل الی سید الانبیاء والرسل"

بھی کہا گیا ہے۔ اس نسخہ علی گڑھ کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس کی کتابت محمد ولی حیدر حسینی ترمذی فرخ آبادی مؤلف اذکار محمدی نے 1281ھ (65-1864) میں ایک سو کیا ون اوراق پر کی ہے۔ ہر صفحہ پر پندرہ سطریں ہیں۔ کتاب اس فقرے سے شروع ہوتی ہے

نَحمدکَ یا من ھَدَیتَنا اِلیٰ صِراطِ مستقیم .....

اور آخری الفاظ یہ ہیں:

"اے زیادہ مہربانی کرنے والے مہربانوں کے اور بہت بخشش کرنے والے بخشش کرنے والوں کے، ایسے ہی ہو۔ ایسے ہی ہو۔ ایسے ہی ہو"۔

4-قلندر علی

اسی زمانے کے کوئی مذہبی عالم مولوی قلندر علی فرخ آبادی بھی تھے۔ انھوں نے ایک کتاب "دقائق الایمان" کے نام سے لکھی تھی۔ جس کا زمانۂ تالیف 1248ھ (33-1832) سے قبل کا بتایا گیا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ بنارس میں ہے جس کی کتابت 1260ھ میں ہوئی تھی۔

مذکورہ تصانیف کی روشنی میں یہ کہنا غالباً صحیح ہے کہ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں فرخ آباد کے خطے میں اردو نثر پر عموماً اور نظم پر بھی کسی حد تک مذہب کا غلبہ رہا ہے۔ ان تصانیف میں چونکہ موضوع اور مسائل ومباحث کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ زبان وبیان کے معاملات اور معیار وغیرہ کی طرف توجہ کمتر رہی ہے۔

حواشی

(1) بریلی

الف۔غزل

1-انتخاب یادگار ص23تا24

2-تواریخ نادر العصر ص76تا78

3-طبقات الشعرا ص563

4-ریاض الفصحا ص350

5-سراپا سخن ص9

6-خوش معرکہ زیبا جلد1 ص160

7-ریاض الفصحا ص327

8-گلشن بے خار ص46

9-خمخانہ جاوید جلد2 ص216

10-گلشن بے خار ص109

11-طبقات الشعرا ص578

12-تذکرہ سرور ص327

13-ریاض الفصحا	ص339
14-گلشن بے خار	ص323
15-گلستان بے خزاں	ص255
16-سخن شعرا	ص536
17-ریاض الفصحا	ص228
18-گلشن بے خار	ص12

ب۔نعت

1-اردو مخطوطات آصفیہ جلد 1	ص71
2-سخن شعرا	ص405تا406

ج۔ہولی و پھاگ

1-گلستان بے خزاں	ص256
2-فہرست نمائش پٹنہ	ص16

د۔نثر

1-اردو داستان	ص342
2-ذخیرۂ شیرانی	ص25تا26
3-علما کا حصہ	ص390تا393
4-اردو مخطوطات رامپور	ص260تا261
5-اردو مخطوطات علی گڑھ	ص128
6-ایضاً	ص330
7-ایضاً	ص331

(2)مرادآباد

الف۔غزل مخمس

1-	طبقات الشعرا		ص328
2-	ایضاً		ص605
3-	ایضاً		ص601
4-	ایضاً		ص607
5-	گلشن بے خار		ص62
6-	خوش معرکۂ زیبا	جلد1	ص34
7-	سراپا سخن		ص17
8-	ریاض الفصحا		ص176تا177
9-	گلشن بے خار		ص87
10-	گلستانِ بے خزاں		ص96
11-	خم خانۂ جاوید	جلد2	ص415
12-	طبقات الشعرا		ص608تا609
13-	ریاض الفصحا		ص671تا177
14-	گلشن بے خار		ص126تا127
15-	گلستان بے خزاں		ص143
16-	خوش معرکۂ زیبا	جلد1	ص31
17-	انتخاب یادگار		ص207
18-	خم خانہ جاوید	جلد5	ص343
19-	ریاض الفصحا		ص202
20-	خم خانہ جاوید	جلد3	ص63

21- ایضاً ایضاً ص36

22- خوش معرکۂ زیبا جلد1 ص440

23- سراپا سخن ص290

24- ریاض الفصحا ص71 تا 72

25- خوش معرکۂ زیبا جلد1 ص438

26- گلشن بے خار ص83

27- ایضاً ص93

28- سخن شعرا ص231

29- ریاض الفصحا ص225

30- گلشن بے خار ص130 تا 131

31- ایضاً ص163

32- تذکرہ ہندی ص245 تا 246

ب۔ مثنوی و قصیدہ

1- اردو مخطوطات انجمن کراچی جلد3 ص34

2- اردو مخطوطات علی گڑھ ص188

3- ایضاً ص428 تا 429

4- گلشن بے خار ص137

5- طبقات شعرائے ہند ص492

6- اردو مخطوطات آصفیہ ج1 ص388

ج۔ مذہبی نثر

1- علما کا حصہ ص457 تا 458

2- تذکرۂ سرور ص258

3- اردو مخطوطات رامپور ص310 تا 311

4- ایضاً ص340 تا 341

د۔ قصے کہانی

1- خوش معرکہ زیبا جلد 1 ص282

2- اردو داستان ص347 تا 349

3- گلستان سخن جلد 1 ص337

4- اردو مخطوطات علی گڑھ ص119

5- ایضاً ص122

6- دہلی کے اردو مخطوطات ص71 تا 72

7- اردو مخطوطات علی گڑھ ص121 تا 122

8- انتخاب یادگار ص178

(3) بدایوں

الف۔ پس منظر

1- اخبار حسن ص74

2- جنگ نامہ آصف الدولہ ص74

3- بہار بے خزاں ص52

4- ایضاً ص126

5- خوش معرکہ زیبا جلد 1 ص111 تا 112

ب۔ غزل

1- ریاض الفصحا ص234

2- خوش معرکہ زیبا جلد 1 ص505

3- خوش معرکہ زیبا جلد 1 ص 413

4- سراپا سخن ص 247

5- خوش معرکہ زیبا جلد 4 ص 570

6- سراپا سخن ص 245

ج۔ نثر

1- علما کا حصہ ص 347 تا 348

2- اردو مخطوطات بمبئی ص 94 تا 95

3- علما کا حصہ ص 461 تا 463

4- اردو مخطوطات رام پور جلد 1 ص 336 تا 338

(4) رامپور

الف۔ پس منظر

1- تواریخ بدیع ص

2- انتخاب یادگار ص 174

3- ایضاً ص 66

4- سخن شعرا ص 15

ب۔ غزل، قطعہ

1- طبقات الشعرا ص 468

2- انتخاب یادگار ص 66

3- ایضاً ص 296

4- ایضاً ص 4 تا 5

5- کاملان رامپور ص 271 تا 278

6-انتخاب یادگار ص101

7-طبقات الشعرا ص502

8-ریاض الفصحا ص103

9-انتخاب یادگار ص151تا152

10-کاملان رامپور ص282تا287

11-طبقات الشعرا ص555

12-کاملان رامپور ص328تا329

13-انتخاب یادگار ص95

14-ریاض الفصحا ص190ط

15-انتخاب یادگار ص208

16-ایضا ص27

17-ریاض الفصحا ص242تا243

18-انتخاب یادگار ص265تا266

19-سخن شعرا. ص351

20-کاملان رامپور ص8

21-ریاض الفصحا ص148

22-انتخاب یادگار ص181

23-ریاض الفصحا ص35

24-انتخاب یادگار ص26

25-ریاض الفصحا ص106

26-انتخاب یادگار ص143تا144

27-ایضاً ص53

28-ایضاً ص399

(ج) ریختی، واسوخت

1-انتخاب یادگار ص5

2-خم خانۂ جاوید جلدا ص

3-خندۂ گل ص14

4-انتخاب یادگار ص153

(د) مثنوی

1-انتخاب یادگار ص29

2-کاملان رامپور ص55تا57

3-انتخاب یادگار ص53

4- انتخاب یادگار ص132

5-کاملان رامپور ص143تا145

6-سخن شعرا ص178

7-انتخاب یادگار ص144

8-دہلی کے اردو مخطوطات ص145تا146

(ہ) قصیدہ

1-طبقات الشعرا 523

2-انتخاب یادگار ص266

3-کاملان رامپور ص170

(و) ہجو

1- انتخاب یادگار ص269تا271

2-ایضاً ص315

(ز) متفرقات

1-انتخاب یادگار ص126

2-ایضاً ص122

3-دستور الفصاحت، دیباچہ مصحح ص93

4-خندہ گل ص366

5-انتخاب یادگار ص271

6-کاملان رامپور ص51تا52

(ح) تاریخ و معمہ

1-کاملان رامپور ص48تا49

2- انتخاب یادگار ص 318

3-سخن شعراء ص299

(ط) نثر

1-انتخاب یادگار ص64

2-ایضاً ص45

3-علما کا حصہ ص441تا444

4-مخطوطات رامپور ص334تا335

5-ایضاً ص331تا313

6-اردو مخطوطات جامع مسجد بمبئی	ص176
7-انتخاب یادگار	ص144
8-کاملان رام پور	ص143تا147
9-علما کا حصہ	ص444تا448
10-دہلی کے اردو مخطوطات	ص165
11-اردو مخطوطات بمبئی	ص67
12-انتخاب یادگار	ص158
13-علما کا حصہ	ص482تا485
14-اردو مخطوطات رامپور	ص338تا340
15-کاملان رام پور	ص101
16-نمونہ منثورات	ص102تا103
17-اردو مخطوطات آصفیہ جلد2	ص105تا106
18-ایضاً جلد2	ص۱۳۲تا۱۳۳
19-علما کا حصہ	ص543تا545
20-اردو مخطوطات علی گڑھ	ص350
21-انتخاب یادگار	ص152
22-کاملان رامپور	ص284تا284
23-انتخاب یادگار	ص280
24-کاملان رامپور	ص8

(5) شاہجہاں پور

(الف) غزل

1-طبقات الشعرا	ص480
2-سراپا سخن	ص145
3-گلشن بے خار	ص60
4-سراپا سخن	ص72
5-سخن شعرا	ص133
6-خمخانۂ جاوید جلد 2	ص464
7-ریاض الفصحا	ص84
8-خوش معرکۂ زیبا جلد 1	ص491
9-طبقات الشعرا	ص287

(ب) متفرق منظومات

1-خندۂ گل	ص349
2-اردو مخطوطات علی گڑھ	ص242
3-ایضاً	ص234

(6) فرخ آباد

(الف) غزل

1-تواریخ نادر العصر	ص64
2-تذکرہ شعرائے فرخ آباد	ص54
3-ایضاً	ص25 تا 26

4-گلشن بے خار ص55تا56

5-تواریخ نادر العصر ص76تا77

6-جنگ نامہ ص60

7-ایضاً ص39تا41

8- شعرائے فرخ آباد ص29

9-ایضاً ص39

10-گلشن بے خار ص57

11-خم خانۂ جاوید جلد2 ص415

12- شعرائے فرخ آباد ص30

13-گلشن بے خار ص209

14- شعرائے فرخ آباد ص38

15-ایضاً ص50

16-گلشن بے خار ص220تا221

17-مجموعہ نغز حصہ1 ص231

18-گلشن بے خار ص64تا65

19-طبقات الشعرا ص592

20-ایضاً ص598

21- شعرائے فرخ آباد ص43

22-گلشن بے خار ص156

23- شعرائے فرخ آباد ص44

24-گلشن بے خار ص165

25-خوش معرکۂ زیبا جلد1 ص176

26-گلستانِ بے خزاں ص199

27-سخن شعرا ص403

28- شعرائے فرخ آباد ص59

29- شعرائے فرخ آباد ص39

30-پنج آہنگ ص217تا218

31-سراپا سخن ص201

32-خمخانۂ جاوید جلد5

33- شعرائے فرخ آباد ص58

34-ایضاً ص23

35-گلدستۂ عشق ص168

(ب) مثنوی

1-اردو مخطوطات آصفیہ جلد2 ص323تا324

2-ایضاً جلد2 ص159تا160

(ج) متفرق منظومات

1-اردو مخطوطات علی گڑھ ص158

2-تذکرہ نادر ص32

3-دہلی کے مخطوطات ص78

4-یادگارِ ضیغم ص136

5-خوش معرکۂ زیبا جلد2 ص367

6-اردو مخطوطات آصفیہ جلد2 ص373تا374

(د) نثر

1-فہرست نمائش پٹنہ ص101

2-اردو داستان ص91تا92

3-نوطرز مرصع ص7

4-علما کا حصہ ص131تا134

5-دہلی کے مخطوطات ص173تا196

6-جائزہ مخطوطات اردو جلد1 ص109تا119

7-بمبئی کے اردو مخطوطات ص47تا48

8-ایضاً ص60

9-جائزہ مخطوطات اردو جلد1 ص112

10-اردو مخطوطات علی گڑھ ص47

11-ایضاً ص54

12-اردو ادب جون1953 ص130

(7) لکھنو

	صفحہ
(الف) لکھنو کی آبادی	231
(الف) غزل	237
(1)	
1۔ جرأت قلندر بخش	237
2۔ میر محمد تقی	238
3۔ انشا انشاء اللہ خاں	239
4۔ سلیمان شکوہ شاہزادہ	242
5۔ مصحفی شیخ غلام ہمدانی	243
6۔ رنگین سعادت یار خاں	246
(2)	
7۔ آصف نواب آصف الدولہ	249

8۔ وزیر — نواب وزیر علی خاں — 250

9۔ بادشاہ — نصیر الدین حیدر — 250

10۔ ترقی — مرزا محمد تقی خاں — 251

11۔ ہوس — مرزا محمد تقی خاں — 251

12۔ سوزاں — مرزا احمد علی خاں — 254

13۔ سرسبز — مرزا زین العابدین — 254

(3)

14۔ ناسخ — شیخ امام بخش — 258

15۔ آتش — خواجہ حیدر علی — 266

16۔ عیشی — میاں طالب علی — 273

17۔ خلیق — میر محمد مستحسن — 279

(4)

18۔ اثر — حسین علی خاں — 284

19۔ فصیح — مرزا جعفر علی — 297

20۔ طرب و دلگیر — چھنو لال (غلام حسین) — 301

21۔ وزیر — خواجہ محمد وزیر — 314

22۔ رشک — میر علی اوسط — 329

23۔ عرش — میر حسن عسکری — 343

(5)

24۔ نوازش — نوازش حسین خاں — 347

25۔ غافل — منور خاں — 351

(6)

26۔ ناصر	مرزا امیر ناصر	358
27۔ رند	سید محمد خاں	359
28۔ صبا	میر وزیر علی	363
29۔ خلیل	میر دوست علی	366
(ب) قصیدہ		369
1-مصحفی	شیخ غلام ہمدانی	373
2-ناسخ	شیخ امام بخش	374
3-گویا	فقیر محمد خاں	378
4-املا	احسان علی	383
5-غالب	مرزا اسداللہ خاں	383
(ج) نعت		389
1-وزیر	خواجہ محمد وزیر	390
2-گویا	فقیر محمد خاں	390
(د) مثنوی		393
(1)		
1-ناسخ	شیخ امام بخش	394
2- فصیح	مرزا جعفر علی	404
3-ضمیر	میر ظفر حسین	408
4-صفا	سید ذوالفقار علی	416

5-وحشت میر بہادر علی 421

(2)

6-خان اشرف خاں 424

7-تراب شاہ تراب علی 429

8-عیشی طالب علی خاں 432

9-اختر قاضی محمد صادق خاں 433

(ہ) مرثیہ 437

1- دلگیر چھنولال 441

2-فصیح مرزا جعفر علی 446

3-خلیق میر محمد مستحسن 449

4-ضمیر میر مظفر حسین 455

(و) واسوخت 461

1-آتش خواجہ حیدر علی 462

2-رند نواب سید محمد خاں 463

3-عرش میر حسن عسکری 464

نثر 467

(1) رقعہ 467

(2) تنقید 469

(3) مذہبی نثر 472

1-غافل مرزا مغل محمد ہادی 472

2-مغموم سید اکبر علی 474

3-فصیح مرزا جعفر علی 477

4- مرزا محمد ہادی 478

(4) انگریزی سے ترجمے 481

1-کمال الدین حیدر 484

2-عبدالسلام 487

3-میل صاحب 489

(5) کتب قانون 491

1-مکند لال 492

2-لچھمن رام 492

(6) تذکرے 493

دستور الفصاحت 493

(7) مطبعے 497

حواشی 500

''پہلے فیض آباد حاکم نشین شہر تھا۔ لکھنو محض ایک قصبہ تھا۔ آصف الدولہ مرحوم کو اس کے آباد کرنے کا شوق ہوا۔ زیادہ تر یہاں رہنے لگے۔ ان کے سبب سے امرا کو بھی یہاں رہنا پڑا اور عمارات کا تعمیر کرنا واجب ہوا گر دو گھرے تھے۔ ایک قدم یہاں رہتا اور ایک وہاں۔'' 1

میر حسن مرحوم لکھنؤ میں آئے۔ انھوں نے یہاں جو کچھ دیکھا مثنوی کے قالب میں اُسے اس طرح ڈھالا ہے۔

جب آیا دیارِ لکھنؤ میں — نہ دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں
بہت ہیں گرچہ اہل اللہ اس جا — ولے جا گہ جو بد ہو تو کریں کیا
زبس یہ ملک ہے بیہڑ پہ بستا — کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا
کسی کا آسماں پر گھر ہَوا میں — کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں
نہیں یہ لکھنؤ، یہ ہے زمانہ — زمانے پر عبث رکھنا بہانا
عجب ہے یاں کی رسم و راہ گندی — گہے پستی ہے اور گاہے بلندی
ہر اک کوچہ یہاں تنگ تر ہے — ہَوا کا بھی بہ مشکل واں گذر ہے
ہُوا ہے راہ چلنا سب کو دشوار — خطر ہے گر پڑے سر پر نہ دیوار
جو کوئی رات کو بھولے یہاں گھر — پھرے گلیوں میں ٹکراتا وہ دردر
لکھوں کیا چوک کی تنگی کا احوال — کمیتِ خامہ چل سکتا نہیں چال

کسی سودے کو واں گر کوئی جائے　　خدا ہی ہو تو پھر جیتا گھر آئے
زبس کوفہ سے یہ شہر ہم عدد ہے　　اگر شیعہ کہے نیک اس کو بد ہے

111

سوائے تودۂ خاک اور پانی
یہاں ہر جنس کی دیکھی گرانی

کوفہ = لکھنو

111　　111

ان شعروں میں میر حسن نے ضمناً ایک بات کہہ دی ہے جس کی عبدالحلیم شرر کے ایک مضمون میں گویا اس طرح سے توضیح کی گئی ہے:

''نحو و صرف، معانی، بیان، عربی منطق و فلسفہ اور فقہ و اصول فقہ کی منفرد درسگاہ لکھنؤ تھا۔ لکھنو ہی نہیں لکھنؤ کے بہت سے قصبات مثلاً بلگرام، سندیلہ، گوپامئو، امیٹھی وغیرہ بھی علم و فضل کی مستقل درسگاہیں تھے جہاں شائقینِ علم اقطارِ ہند سے کھنچ کر آتے تھے اور برسوں رہ کے کمال پیدا کرتے۔ یہ لوگ عربی علم و فن کے علاوہ اردو کا ادبی مذاق اور سخندانی کا ذوق بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔''2

لکھنؤ کے اسی ماحول اور فضا کا اثر یہ تھا کہ یہاں کے اساتذہ نے اپنی اردو شاعری کی بنیاد عربی فارسی کی قواعد اور بیان و بدیع وغیرہ علوم کے اصولوں پر رکھ کر تحقیقِ الفاظ اور اصلاحِ زبان کو اپنی فکر و کاوش کا مرکز و محور بنالیا تھا۔

نواب آصف الدولہ نے شہر لکھنؤ کو بنایا اور بسایا تھا۔ ان کی توجہ سے یہ ایسا بارونق ہوگیا کہ بایدوشاید مذکور ہے کہ:

''نواب آصف الدولہ کی فیاضی اور فیض رسانی سے شہر کی آبادی اس درجہ بڑھی کہ اتنا بڑا شہر اب تک بھی ہندوستان میں نظیر نہیں رکھتا۔ رومی دروازہ، امام باڑہ آصف الدولہ کا بنایا لائق دیکھنے اور تعریف کے ہے۔''3

ایک ایک کر کے ملک کے مختلف علمی مراکز سے اس زمانے کے بیشتر نام برآوردہ عالم اور

شاعر کھنچ کھنچ کر یہاں آ رہے تھے۔

لکھنو کے اس ماحول میں جہاں ایک طرف علوم وفنون کی تعلیم اور تحصیل کے چرچے جاری تھے اور دوسری طرف نواب کی سرپرستی میں ہرروز روزِ عید اور ہرشب شبِ برات تھی۔ نواب آصف الدولہ کی قدردانی محمد تقی میر کو لے تو آئی تھی لیکن ان کا اکرام ممکن نہیں ہوسکا تھا۔ میر نے اپنے کلام کی طرف نواب سے متوجہ ہونے کے لیے مُنہ پھوڑ کر درخواست کی تو جواب یہ ملا کہ:

''جو شعر ہوگا آپ متوجہ کرلے گا۔''[4]

یعنی اب تک میر صاحب نے جو پڑھے تھے وہ شعر نہیں تھے۔ اس ماحول میں یا تو خان آرزو اور سودا کا سکہ چل سکتا تھا یا پھر میر سوز کامیاب ہوسکتے تھے جو:

''شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے اور لوگ بھی نقل اتارتے تھے۔''[5]

چنانچہ خود نواب میر سوز کے شاگرد ہوگئے تھے۔ میاں جرأت بھی لکھنؤ میں نہایت مقبول ہوئے۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''ان کی طبیعت بجائے محنت پسند ہونے کے عشرت پسند تھی۔ تعجب یہ ہے کہ زمانے نے شکر خورے کو شکر دیکر تمام عمر قدردان اور ناز بردار امیروں میں بسر کردی جہاں رات دن اس کے سوا چرچا ہی نہ تھا۔''[6]

1212ھ (=98-1797) میں نواب آصف الدولہ نے رحلت کی۔ نواب وزیر علی خاں ان کی جگہ مسند نشین تو ہوئے لیکن چند ماہ کے بعد، اس الزام میں کہ وہ نواب کے بیٹے نہیں ہیں، معزول ہوکر انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار کرلیے گئے۔ یہ الزام بجائے خود نہایت افسوسناک تھا اور اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ اس ریاست میں گوروں کے ہاتھوں سے کسی کی بھی عزت آبرو محفوظ نہیں رہ گئی تھی۔

یمین الدولہ سعادت علی خاں اپنا آدھا ملک انگریزوں کے حوالے کردینے کا وعدہ کرکے مسند نشین تو ہوگئے لیکن اس غم میں کہ فرخ آباد، ریٹھ، چکلہ کوڑہ، کڑہ، اٹاوہ، کھیرا گڑھ، اعظم گڑھ، صوبہ الہٰ آباد، چکلہ بریلی اور باندہ وغیرہ پر بغیر لڑے بھڑے انگریز قابض ہوگئے تھے، تمام عمر کڑھتے رہے۔

نزلہ عضوِ ضعیف پر ہی گرتا ہے۔ رعیت پر جو گذر گئی واقعات سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

نواب اپنے ملک کو بہ تدبیر واپس لینا چاہتے تھے۔ آخر میں کامیابی کی کچھ امید بھی ہوئی تھی کہ ایک رات یخنی پیکر لیٹے۔ پھر نہ اُٹھے۔ کہتے ہیں کہ وہ مسموم تھی۔ 23 رجب 1229ھ (1814) کو تریسٹھ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ملک کی واپسی کے لیے روپیہ کی فراہمی ضروری تھی اس لیے اخراجات میں کمی کی تھی۔ شعر و شاعری کی طرف ایسے میں طبیعت بھلا کیا مائل ہوتی۔ شاعروں کے جمگھٹ کو کم کر دیا لیکن خلوت میں خیال آتا تو ملال ہوتا تھا کبھی حالات کو بحال کرنے کی بھی فکر کی لیکن حقیقت آئینہ دکھا دیتی تھی۔ محمد تقی میر کے احوال میں مذکور ہے:

''نواب آصف الدولہ مر گئے سعادت علی خاں کا دور ہوا تو یہ دربار کا جانا چھوڑ چکے تھے۔ ایک دن نواب کی سواری جاتی تھی۔ یہ تحسین کی مسجد پر سرِ راہ بیٹھے تھے۔ نواب نے پوچھا تو انشا نے عرض کیا کہ یہ وہی گدائے متکبر ہے جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے۔ سعادت علی خاں نے خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھجوایا۔ میر صاحب نے واپس کر دیا۔ آخر انشا کے کہنے سننے سے قبول فرمایا اور دربار میں کبھی کبھی جانے لگے۔''7

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنو سے تھا　　وہیں میں کاش مر جاتا، سراسیمہ نہ آتا یاں

اسی طرح انشاء اللہ خاں کے حالات میں بھی مذکور ہے کہ:

''ایک دن سید انشا نے بہت ہی گرم لطیفہ سنایا۔ پھر بولے کہ حضور کے اقبال سے قیامت تک ایسی ہی کہے جاؤں گا۔ نواب چیں بہ جبیں ہو کر بولے بھلا زیادہ نہیں، فقط دو لطیفے روز سنا دیا کیجیے۔ چند روز میں یہ عالم ہو گیا کہ دربار کو جانے لگتے تو جو پاس بیٹھا ہوتا اسی سے کہتے کہ کوئی نقل، کوئی چٹکلا یاد ہو تو بتاؤ۔ ایک دن سعادت علی خاں نے انھیں بلا بھیجا۔ یہ کسی امیر کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ خفا ہو کر حکم دیا کہ ہمارے سوا کسی اور کے ہاں نہ جایا کرو۔ اس قیدِ بے زنجیر نے انھیں بہت دق کیا۔''8

اسی حال میں انشا نے وہ درد آمیز غزل کہی جس کا یہ شعر مدّت تک زبانوں پر جاری رہا۔ ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی　　تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

سعادت علی خاں کے بعد غازی الدین حیدر مسند کے حصول میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ مدّت کے بعد نواب معتمد الدولہ آغا میر کی کوششوں سے سرکار انگریز نے انھیں "شاہِ زمن" کے خطاب سے بادشاہ بنا دیا اور خود معتمد الدولہ وزیر اعظم کہلائے لیکن حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں تھی کہ یہ ساری شان وشوکت بخشی ہوئی ہے۔ زورِ بازو سے حاصل کی ہوئی نہیں ہے۔ اس زمانے کے بیشتر معاملات اور معمولات میں بھی ظاہری زیبائش اور خارجی آرائش نمایاں تھی۔ نظم ونثر کا انداز دیکھو تو اس میں بھی نمائش اور چمک دمک زیادہ ہے۔ مغز کم سے کم ہے۔ اربابِ قلم کا زیادہ فخر اس بات پر تھا کہ وہ دہلی کے نہیں، لکھنو کے کسی استاد کے شاگرد ہیں۔

27 ربیع الاول 1243ھ (=اکتوبر 1827) کو غازی الدین حیدر بادشاہ اوّل نے وفات پائی اور ابوالنصر قطب الدین سلیماں جاہ" کے لقب سے ان کے ولی عہد نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے۔ ان کے مزاج میں استقلال نہیں تھا وزارت کو جلدی جلدی بدلتے رہے۔ کل دس برس تک حکومت کر کے 3 ربیع الثانی 1253ھ (=1837) کو راہی ملکِ بقا ہوئے۔ ان کے عہد میں اگر چہ شیخ ناسخ کی استادی کا سکّہ چلتا تھا۔ نئی نسل کے بعض شاعروں کے رویّے الگ تھے۔

نواب شجاع الدولہ نے بڑی محنت سے اپنی حکومت کی حدیں بہت وسیع کر لی تھیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ بہت بعد تک بھی ان علاقوں میں اہل لکھنو کے اثرات مرتب ہوتے رہے تھے۔ عبدالحلیم شرر نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ:

> "شمالی ہند میں پنجاب سے لے کر بریلی تک دہلی کا اسکول مرکز زبان مانا جاتا ہے، لہٰذا اہل لاہور، میرٹھ، آگرہ، علی گڑھ، مراد آباد، بدایوں، اٹاوہ اور بریلی خالص دہلی کی زبان کے پیرو ہیں۔ شاہجہانپور سے لیکر کلکتہ تک لکھنؤ کے اسکول کے پیرو ہیں چنانچہ شاہجہانپور، کانپور، فیض آباد، جونپور، گورکھپور، بنارس، اعظم گڑھ، غازی پور، پٹنہ، عظیم آباد، مرشد آباد، ڈھاکہ، کلکتہ، ان سب مقامات کے لوگ لکھنو کی زبان کو دہلی پر ترجیح دیتے ہیں۔" 9

اس تقسیم میں کسی قدر مبالغہ ہو سکتا ہے لیکن بطورِ مجموعی اسے غلط نہیں کہا جا سکتا چنانچہ ہر مقام سے متعلق صورتِ حال کا بیان اس کے موقع پر کیا جائے گا۔

غزل

(1)

1۔ جرأت

لکھنو کے قدیمی استادوں میں شاید سب سے زیادہ موثر شخصیت میاں قلندر بخش جرأت کی تھی۔ شیخ امام بخش ناسخ بھی ان سے نہایت متاثر تھے۔ سعادت حسن خاں ناصر کا بیان ہے کہ:

> "اپنے عہد میں تمام شعرا میں بے مثال، مشاعروں میں سر سبز اور دوں پر، اکثر موزون الطبع لکھنو حلقۂ بیعت کے اندر، غزل در غزل کہنا اس کا ایجاد، شیخ ناسخ اسے اور ریختہ گویوں سے مسلّم بلکہ رکن سالم جانتے تھے۔" 1

خود ناسخ نے ان کے مرنے کی تاریخ اس مصرع سے نکالی ہے۔

<u>ہائے ہندستاں کا شاعر مُوا</u>

1225

اس سے 1225 کے عدد برآمد ہوتے ہیں لیکن جرأت کا صحیح سال وفات 1224ھ ہے۔ بہر نوع اس مادۂ تاریخ سے ظاہر ہے کہ ناسخ جرأت کو کس سطح کا شاعر سمجھتے تھے۔ دہلوی تذکرہ نویس مرزا قادر بخش صابر نے ناسخ کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''آخیر عمر میں غلبۂ ظرافت سے جرأت کی وضع کو اختیار اور اسی ڈھنگ کے ابیات سے مالا مال لکھا۔ ہر چند جرأت کی شاعری کا حال جیسا ہے اہلِ بصیرت اور اربابِ بصارت کہ کامل استعداد اور سنجیدۂ سخن کے نقاد ہیں خوب جانتے ہیں لیکن جو کہ ہمیشہ مضامین بوس و کنار اس کے منہ چڑھے ہوئے اور مدام اس کی فکر سے ہمکنار رہتے تھے اور یہ اس ہوس کے دام میں تو گرفتار، یہ تقلید خوب بن نہ آئی اور بعض مقام میں یہ تو ناز و انداز میں محو ہوا اور شاہدِ معنی نے اس کو غافل کر کے بیا کانہ تجلۂ ابیات سے اپنے گھر کی راہ لی خفت کھینچا و غایت تنگ اٹھایا لیکن درد مندان سخن جانتے ہیں کہ اتنی نا سرہ کاری سے اس کے نقد کمال کو بٹہ نہیں لگتا۔''2

مشہور ہے کہ جرأت کی شاعری کے بارے میں محمد تقی میر نے کہا تھا کہ ''کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو، اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو۔''3 لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس ماحول میں یہی چوما چاٹی خاص و عام میں مقبول ہوئی اور وہاں کی شاعری میں اس کا اثر تا دیر جھلکتا رہا ہے۔ جرأت نے اپنی اکثر غزلوں میں محبوب کا سراپا نظم کیا ہے اور یہ روش بھی لکھنو میں عام ہوئی تھی۔

2۔ میر

جرأت کے انتقال کے کوئی ایک برس بعد تک محمد تقی میر زندہ رہے۔ وہ اپنے زمانے کے مستند اور معتبر استادوں میں سے تھے اور اپنی شاعری کے وہ خود قدر شناس تھے۔ سعادت خان ناصر نے لکھا ہے کہ:

''جب مرض الموت سے میر صاحب بیمار ہوئے وصیت کی: میرے جنازے کے اٹھانے میں تعجیل نہ کرنا۔ جو سنے گا کہ میر نے رحلت کی ہے خواہ مخواہ نقد اور سامان معقول بھیجے گا۔ سو جب وصیت کے صبح سے شام ہوئی۔ کسی نے کچھ نہ بھیجا۔ آخر شیخ امام بخش ناسخ کی اعانت زادِ آخرت ہوئی۔''3(الف)

لکھنو میں اپنے قیام کا ذکر کرتے ہوئے ایک شکار نامے میں میر صاحب نے فرمایا ہے ؎

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا خریدار لیکن نہ پایا گیا

متاع ہنر پھیر کر لے چلو　　بہت لکھنو میں رہے گھر چلو

اسی طرح ایک غزل میں بھی وہ کہتے ہیں۔

عیب آدمی کا ہے جو رہے اس دیار میں　　مطلق جہاں نہ میر رواج ہنر رہے

لکھنو کے اس ماحول میں محمد تقی میر کی شاعری کا کوئی نمایاں اثر معلوم نہیں ہوتا ہے۔

3۔ انشا

سید انشاء اللہ خاں انشا کے بارے میں شیخ احمد علی خادم سندیلوی نے لکھا ہے کہ:

4 ''انشا تخلص، مہین خلف حکیم الدولہ، سرامد اطبائے زماں، میر ماشاء اللہ جعفری نسب نجفی الوطن ست۔ جدش شاہ نور اللہ نجفی در ہندوستان متولد گشتہ و میر ماشاء اللہ بخلاف پدر بزرگوار سعیہا در تلاش دنیا نمودہ۔ در بنگالہ علاجہائے نمایاں از وبظہور رسیدہ و اکثر در میدان کار زار بیش از دیگراں داد شجاعت دادہ، تمام بدنش جراحت گاہ بود۔ در عالم تنزل کہ عہد نواب قاسم علی خاں بود پیش نواب شجاع الدولہ مرحوم آمد۔ آں روز ہا باوصف بربادی اسباب نوزدہ فیل ہمراہ داشت۔ سخاوتش بدرجہ بود کہ در حسب او نام حاتم ذکر کردن باعث خجالت است وبذات خود مرغ پلاؤ و نان جو را مساوی داشت و ہمیشہ بر زمین می خوابید و شب زندہ دار بود۔ آخر باچوں زمانہ را بکام ناکساں دید کمر را وا کردہ در فرخ آباد منزوی شد۔ نواب مظفر جنگ چیزے بقدر ضرورت تواضع می کرد۔ چند سال است کہ در ہماں شہر بجوار رحمت ایزدی پیوست و مزارش نیز ہماں جاست۔ سید انشاء اللہ خاں در صغر سن کتب صرف و نحو و منطق و حکمت تا بہ صدرا خواندہ، چوں بہ شانزدہ سال رسید بحضور نواب شجاع الدولہ داخل جلسا شد۔ دراں وقت دیوان ہندی بطور خود وطرز نوی بے استاد ردیف دار تمام نمودہ بود و پارۂ از اشعار فارسی و عربی ہم بر اوراق ثبت داشت۔ چوں صورت مطبوع و تقریر دلچسپ یافتہ بود و در تمام دربار احدے بہ حسن تکلم او نمی رسید، مورد عنایت بندگان عالی و محسود اہل دربار شد۔ بعد چندے کہ نواب وزیر موصوف قضا کرد و دربار آصف الدولہ

مجلس اراذل شد، خان مزبور چندے بہ لشکر نواب نجف خاں مرحوم، ومدتے در بندیلکھنڈ، بعد چند روز باز ہمپائے پدر بہ دہلی رفتہ، با محمد بیگ خاں ہمدانی معز زمی بود وچند بارخودرا برروئے توپ وتفنگ وتیروتبرزد لیکن چوں حیاتِ مستعار باقی بود بہ سلامت برگشت ودرے جگر بر سر حرفے با میرزا اسماعیل بیگ ہمدانی برادرزادہ محمد بیگ ہمدانی درافتادو کنارکشیدہ بطرفش دوید، ہر چہ بہ زبان آمد بجا وبیجا مضایقہ نہ کرد۔ جان وحرمت اورابعدش نگہباں شد، وللّٰہ در کشتہ شدن اوجائے تامّل نبود۔ بالجملہ ازاں طرفہاباز بہ لکھنو آمدہ، مدتہا از مخصوصانِ حضور اقدس مرشد زادہ آفاق میرزا سلیمان شکوہ بہادر بود۔ از بسکہ پُرنازک مزاج ست رفاقت الماس علی خان بہادرگزید۔ بعد چند روز نواب سعادت علی خاں بہادر اور ادرسلکِ مقربانِ خودش سرفراز فرمود، ہردووقت شریک طعام با آں جناب می باشد۔ بندہ نیازے درخدمتش دارم............اشعار در چہار زبان می گوید فارسی وترکی وعربی وہندی وتفسیر چند سورہ بہ ہمیں زبان (= عربی) غیر منقوط نوشتہ بود.....''4

مولوی کریم الدین کا کہنا ہے کہ انشا نواب سراج الدولہ کے عہد (1169ھ/1756ء تا 1170ھ/1757ء) میں پیدا ہوئے تھے۔ مردان علی خاں مبتلا نے میر محمد جعفر خاں بہادر کے دور 1171ھ 1758ء تا 1174ھ 1761ء میں ان کو ''صغرسن'' میں دیکھا تھا۔5 اس وقت انشا کی عمر پانچ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ انھوں نے سولہ برس کی عمر میں 1184ھ (1770ء) کے قریب بغیر کسی استاد کی مدد کے اپنا پہلا دیوان مکمل کرلیا تھا۔ ایک برس بعد 1157ھ میں مصحفی جو عمر میں انشا سے بڑے تھے اودھ میں پہنچے۔ انھوں نے ایک قطعہ میں انشا پر اس طرح چوٹ کی تھی۔

بعضوں کا گماں یہ ہے کہ ہم اہل زباں ہیں ۔۔۔ دلّی نہیں دیکھی ہے زباندان یہ کہاں ہیں
سیفی کے رسالے پہ بنا ان کی ہے ساری ۔۔۔ سو اس کے بھی گھر بیٹھے وہ آپی نگراں ہیں

نواب شجاع الدولہ کی وفات (1188ھ) کے بعد انشا اپنے والد کے ساتھ قسمت آزمائی کے لیے اودھ سے نکلے۔ مظفر جنگ (1185ھ تا 1211ھ) اور پھر نجف خاں (1185ھ تا

1196ھ) وغیرہ کے یہاں ہوتے ہوئے وہ دہلی پہنچے۔ وہ وقت تھا جب شاہ عالم ثانی (1202ھ میں) آنکھیں گنوا چکے تھے۔ آصف الدولہ کے آخری زمانے میں انشا پھر لکھنؤ پہنچے۔ اس وقت وہاں شاہزادہ سلیمان شکوہ بھی مقیم تھے چنانچہ انشا کا یہ شعر شاہد ہے۔

بیٹھا ہو جہاں پاس سلیمان کے آصف　　واں کیوں نہ جھکے قیصر و فغفور کی گردن

انشا کے پہنچنے کے بعد شیخ مصحفی کے مشاہرہ میں سلیمان شکوہ نے تخفیف کر دی تو انھوں نے کہا۔

چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لائق　　تھا مردِ معمر کہیں دس بیس کے لائق

اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے　　ہم بھی تھے کئی روز وں میں پچیس کے لائق

استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر　　ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشا تقریباً چالیس برس کی عمر میں (1208ھ 94-1793 کے قریب) لکھنؤ میں پہنچے تھے۔ مولوی کریم الدین کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ:

''درمیان 1200ھ کے وہ اس شہر (لکھنو) میں تھا''6

احد علی یکتا نے انشا کے آخر وقت کا حال اس طرح لکھا ہے:

''عمرش تخمیناً از شصت سال متجاوز بود...... آخر آخر مجنوں شدہ چند سال گذشتہ بودند کہ بہ ہماں مرض در گذشت۔ خدا اش بیامرزد۔''7

اور سعادت خاں ناصر نے انشا کے حالات میں اس طور پر رائے زنی کی ہے:

''ایک دن یہ مولف میاں مصحفی صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ کچھ ذکر انشاء اللہ خاں کا آیا۔ اس مصنف نے فرمایا کہ کوئی شاعر ایسے لب ولہجہ کا نہیں ہے۔ شیخ امام بخش ناسخ بھی بیشتر تعریف اس کے فضل وکمال کی کیا کرتے تھے۔ ایسے ایسے قصیدے نواب (یمین الدولہ سعادت علی خاں) کی تعریف میں اس نے کہے ہیں کہ کوئی قصد ان کے تتبع کا کر نہیں سکتا۔ چار دیوان، ایک فارسی، ایک دیوان ہندی، ایک بے نقط، ایک ریختی میں تصنیف کیے ہیں کہ مزا ہر ایک کا جدا۔ ایک کہانی نثر ہندی میں اس سے یادگار، لفظ عربی اور فارسی کا اس میں نہیں آیا، یہ نہایت دشوار ہے۔ نام کا اپنے یہ ترجمہ کیا ہے: جو چاہا بھگوان کا۔''8

ان کے مرنے کا حال متداول مآخذ میں کسی قدر فرق کے ساتھ یہی لکھا ہے کہ:

''وہ چہکتا ہوا بلبل اپنے گھر کے پنجرے میں بند کیا گیا اور وہاں سے گمنامی کے ساتھ زمین کا پیوند ہوا کہ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ بسنت سنگھ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ 1233 ہجری میں فوت ہوئے۔ تاریخ

شمعِ انتقالِ میر انشا دل غمدیدہ تا نشاط شگفت
سالِ تاریخ اوز جانِ اجل عرفی وقت بود انشا گفت

1233 = 1230 = + 3ھ

قتیل کے رقعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ 25ھ میں وہ موقوف ہو کر خانہ نشین ہوئے تھے مگر معلوم نہیں ہوتا کہ یہی آخری خانہ نشینی تھی یا بعد اس کے پھر بھی بحال ہو گئے۔''9

سید انشا نے غازی الدین حیدر کی نیابت کا زمانہ بھی پایا تھا لیکن کسی بھی ماٴخذ میں اُن کے وقت کے انشا کے حالات منقول نہیں ہیں بلکہ شاید 1225ھ (=1810) میں ہی انشا کی بساط الٹ چکی تھی اور اس کے بعد اگرچہ کئی برس تک زندہ رہے شعر و ادب کی دنیا میں موثر نہیں تھے۔

3۔ سلیمان شکوہ

شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ، شاہ عالم ثانی کے تیسرے بیٹے تھے۔ غلام قادر روہیلہ کے فتنے کے بعد لکھنو آ گئے تھے۔ غازی الدین حیدر کی تخت نشینی کے بعد وہاں کی سکونت ترک کر کے کاسگنج اور پھر آگرے میں جا کر رہ پڑے۔ وہیں وفات پائی۔ خود شاعر اور شاعر نواز تھے چنانچہ پہلے شیخ مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔ پھر جب وہاں سیّد انشا پہنچے تو ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ ان کی سرپرستی میں انشا اور مصحفی وغیرہ کے مابین جو معرکے ہوئے تھے وہ تاریخ میں یادگار ہیں۔ اس زمانے میں معاشرے میں جو زوال آ گیا تھا اس کا اثر ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔ شاہزادہ سلیمان شکوہ کے چند شعر نمونہ کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔

گالی نہ دیا کرو کسی کو بس بس اپنی زبان سنبھالو
غرفہ میں سے جھانک، پاس اپنے غیر کو ہنسی خوشی بُلا لو

اور ہم سے ہزار حیف پیارے　　مُنہ کو شرما کے یوں چُھپالو
آج تم غیر سے چھینٹے جولڑے پانی کے　　پڑگئے ہم پہ گویا لاکھ گھڑے پانی کے
وہاں جو رات وہ غیروں سے ہم کنار رہا　　ہمارے دل کو یہاں سخت اضطرار رہا
وہ پری بولی کہ یاد آتی ہے مجھ کو ہے ہے　　چاندنی رات میں کرنی وہ سلیماں کی سیر
ٹک تختِ ہَوا دار کو لے تھام سلیماں　　یاں کہتے ہیں تجھ پر ہوئی ہے ایک پری غش
وہاں جب دردِ تنہائی کا اُٹھا قیس کے دل میں　　تو یاں چھاتی پکڑ لیلا ہوئی غش اپنی محمل میں

وہ چونک نیند سے اور دیکھ اپنی چوٹی کو
پکارے سانپ تھا ہے ہے مرے بچھونے میں

ان شعروں پر غور کریں۔ بیشتر میں بہت واضح طور پر محبوب کوئی عورت ہی ہے۔ اردو کی معاشرت سے ناواقفوں کے لیے شاہزادہ کے کلام کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔ کچھ شک نہیں کہ شاہزادہ سلیمان شکوہ کی شخصیت لکھنو اور آگرہ وغیرہ مراکز میں بھی نہایت موثر بلکہ زمانہ ساز تھی۔

اس مقام پر یہ ذکر مناسب ہے کہ سعادت علی خاں کی وفات کے وقت لکھنو میں تقریباً سبھی نام برآوردہ اساتذۂ قدیم مصحفی اور رنگین کے علاوہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور غازی الدین حیدر کی مسند نشینی کے وقت وہاں کی بساطِ شاعری پر دہیں کے اساتذۂ فن دادِ سخنوری دے رہے تھے۔

5۔ مصحفی

شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے خود اپنے حالات خاصی تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ مختصراً وہ اس طرح ہیں:

> ''احوال حسب ونسب از کتاب مجمع الفواید معلوم نمائی۔ چوں پیش ازیں تذکرہ فارسی و ہندی جمع کردہ ام سبب برین تالیف کثرت موزونان دیار لکھنو کہ بالفعل آبادی شاہجہاں آباد بہ پاسنگ اوئی رسد، شد۔ اگر از تحصیل علمی من بہ ری گویم بتو کہ تکمیل فارسی و نظم ونثر آں بہ شاہجہاں آباد در سی سالگی بخوبی میسر آمدہ بود و دریں دیار علم عربی یعنی طبیعی و الٰہی و ریاضی از مولوی مستقیم سکنۂ گوپامئو شاگرد مولوی حسن خواجہ تاش مولوی مبین عالم العلما خواندہ ام و کافیہ را از مولوی مظہر علی کہ

در صرف و نحو ثانی ایشاں کم پیدا می شود زیا فتہ غرض تصنیف دیوان عربی راارادہ می کروم۔ معنی متن قرآن را بے احتیاج تفسیر حرف بہ حرف بہ سینہ دارم۔ در زبان اردوے ریختہ قریب صد کی بہ حلقۂ شاگردی من آمدہ باشند۔ چوں زبان فارسی از بے علمی صاحبانِ زمانہ رو در نقاب انتفادار دطبیعت بابیشتر متوجہ ریختہ اند...... سنہ عمرم تاالی الیوم قریب بہ ہشتاد رسیدہ۔"10

سعادت خاں ناصر نے ان کے حال میں کئی صفحے سیاہ کیے ہیں۔ ان کا خلاصہ اس طرح ہے:

"آسمانِ شاعری و سخنوری، شاعر اولی العزم و ناظم نظم میاں غلام ہمدانی تخلص مصحفی ولد ولی محمد ابن درویش محمد، خاقانی ثانی، تربیت یافتۂ میاں مانی۔ دلّی سے تا لکھنو سینکڑوں شاگرد رشید، پُرگو اور خوش گو چنانچہ آٹھ دیوان ہندی اور تین فارسی کے تصنیف کیے ہوئے اس کے موجود۔ واسطے تحصیل معاش کے جو اشعار اس کے غیروں کے نام پر ہیں وہ اگر جمع ہوں کئی دیوان کے برابر ہیں۔ وقت اخیر پوتھی مہابھارت کی شاہ جیو کی فرمائش سے نظم کی تھی مگر بہ سبب تمامی اس کی عمر کے وہ ناقص رہی۔ اکثر شبہات کہ اس کے کلام میں واقع ہیں سبب اس کا پُرگوئی ہے۔ مفتی غلام حضرت کے انتقال کی تاریخ کہی۔ بیتاب نے کہا مفتی کی 'ی' زایدہ ہے۔ اسے درست کر دیجیے، میاں صاحب (مصحفی) نے کہا تمھیں خبر ہے سو جگہ مصحفی کی 'ی' تقطیع سے گرتی ہے، کس کس کو درست کیجیے۔ باوجود اس کے کہ امیرانِ نامدار اس کے شاگرد تھے کسی بے ہمت نے موافق اس کے کفاف کے خدمت نہ کی۔ بڑے تو بڑے چھوٹے سبحان اللہ غریب جو اس کے شاگرد تھے اسے خیال میں نہ لاتے تھے چنانچہ اس غزل کی قیل وقال رنجش پر خواجہ حیدر علی آتش کی دال۔

بے عقل تیرے حق میں کہے کچھ تو مصحفی — تو یہ سمجھ چڑھی ہے اسے بھنگ شاعری

اس جہان گذراں سے داغ بیقدری اپنے دل پر لے گیا۔"11

مصحفی نے اپنے دیوان ششم کے دیباچہ میں اُس زمانے کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے:

"حصہ رفعت الوان ایں خوان بہ شیخ امام بخش ناسخ کہ یکے از دوستان محمد عیسا تنہا

ست دبہ فقیر ہم رسوخے از تہ دل دارد، موسوم گشت، تخلص خودرا اسم با مسمیٰ انگاشتہ، بطرزِ ریختہ گویانِ سادہ کلام درعرصۂ قلیل خطِ نسخ کشیدہ واز قفایش برقدم اوخواجہ حیدرعلی آتش ہم دررسیدہ، سمندِ تیزگام خیال راز دایرۂ چرخ بیروں بُرد۔ وہم چنیں ثالث ایشاں طالب علی عیشی.......اگر چہ عاصی ہم ازگروہ سادہ گویاں بودلیکن بہ فیض صحبت بزرگاں درفن فارسی مہارت کلّی داشت بلکہ ریختۂ خودرا مہمانِ طفیلی فارسی داشت، درمجلسہائے مشاعرہ ازروے ایں صاحبان کہ اقرارِ استادیِ من نفس الامردارند، خجالتے نہ کشید بلکہ غزلیات ایں دیوان ششم را اکثرے بہ رویۂ ایشاں گفتہ، ازحسنِ قبول محروم مباد۔"12

شیخ مصحفی نے غازی الدین حیدر کی نیابت اور پھر بادشاہت کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔ اس وقت شاعری کی بساط پر ان کے بقول ناسخ آتش اور عیشی پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ مصحفی نے زمانے کے رخ کو پہچانا اور خودبھی انھیں کے طرز میں ایک دیوان مرتب کرڈالا بایں ہمہ نہ تو مصحفی اس نئے زمانے کے لائق تھے اور نہ لکھنو کا نیا ماحول ان کو انگیز کرنے کے لیے تیار تھا۔

سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

"کسی شاگرد نے تاریخ اس کی وفات کی یہ کہی کہ

آتش بہ مصحفِ حرام آمدہ

اس مصرع سے 1250 کے عدد برآمد ہوتے ہیں۔ شاید پہلے مصرع میں تخرجہ یاتعمیہ کا کوئی اشارہ ہو مصحفی نے 1240ھ (=25-1824) میں وفات پائی تھی۔ ان کے چند شعر یہ ہیں۔

جیتا تو ہوں میں اب تئیں میاں مصحفی ولے
کیاخاک زندگی ہے اکیلے کی زندگی

کیااب کے شاعروں میں تری قدر مصحفی
مانا میں یہ تو افصح ہندوستاں ہُوا

مصحفی پوچھ نہ افلاس کا میری باعث
تھا میں مغرور کبھی تادرِ سلطان نہ گیا

قریب ساحل آپہنچی ہے کشتی
غنیمت ہے کوئی دم زندگانی

ہمیں اے مصحفی اتنی برس میں
نہیں اب اعتمادِ عمرِ فانی

6۔ رنگین

جرأت اور انشا کے ساتھ سعادت یار خاں رنگین کا بھی نام لیا جاتا ہے اور صورت اس کی یہ ہوئی ہے کہ نواب آصف الدولہ کے عہد میں رنگین لکھنؤ میں رہے تھے۔ شیخ مصحفی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"رنگین پسر طہماسپ بیگ خاں تورانی کہ مشارٌ الیہ در عہد نواب نجف خاں مرحوم اقتدارِ کلی داشت۔ جوان فہمیدہ و سنجیدہ، در فنِ سپاہگری و سواریِ اسپ بے نظیر و در فکرِ سخن خامۂ خیالش بسیار خوش تحریر۔ ہر چند چنداں بہرۂ از علم ندارد، اما ذکاوتِ طبعش بر صاحب علمان غالب۔ در ایامِ آغازِ شوقِ شعر تا در دہلی بود، شعرِ خود را از نظرِ شاہ حاتم علیہ الرحمۃ می گزرانید۔ حالا کہ بہ فضلِ الٰہی در نظم کلام ترقی و امتیاز تمام پیدا کردہ از راہِ انصاف دیوانِ خود را از اوّل تا آخر بہ نظرِ مولف در آوردہ۔ کلامش بسیار کم اصلاح بر آمدہ و چوں مزاجش مشتاقِ افتادہ اکثر قطعہاے خوب خوب و غزل و نامہ ہاے نغز نغز بہ سلکِ نظم کشیدہ، ہمیشہ بہ حضورِ مرشدزادہ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر حاضری باشد و تقرب و امتیاز تمام دارد۔"13

لکھنؤ میں اپنے قیام کے بارے میں میاں رنگین نے خود کہا ہے کہ۔

وہاں سے جو پھر دانا پانی اُٹھا　　تو اس جا سے میں لکھنؤ کو گیا
رہا واں بڑی ہی فراغت سے میں　　تھا آسودہ ہر ایک آفت سے میں
رہا نو برس شاہزادے کے ساتھ　　پہنچتا رہا واں ہر اک شے کو ہاتھ

جب آخر گیا آصف الدولہ مر
وہاں سے پڑا مجھ کو کرنا سفر

یعنی بھرت پور سے لکھنؤ پہنچ کر میاں رنگین مرزا سلیمان شکوہ کی مصاحبت میں نو برس تک رہے۔ پھر آصف الدولہ کی وفات کے بعد وہ مرشد آباد کی طرف چلے گئے۔ اس کے بعد سوداگری کے سلسلے میں انھیں چند بار لکھنؤ جانا پڑا تھا لیکن باقاعدہ اقامت کی صورت نہیں ہوئی۔ آزاد نے سید انشا کے حال میں رنگین کے چند بار لکھنؤ جانے کا حال اس طرح قلم بند کیا ہے:

''خان (رنگین) موصوف کہا کرتے تھے کہ لکھنو میں سید انشا کے وہ رنگ دیکھے جن کا خیال کر کے دنیا سے جی بیزار ہوتا ہے۔ ایک تو وہ اوج کا زمانہ تھا کہ سعادت علی خاں کی ناک کے بال تھے۔ اپنی کمال لیاقت اور شگفتہ مزاجی کے سبب سے مرجع خلائق تھے۔ دوسری وہ حالت کہ پھر جو میں لکھنو گیا تو دیکھا کہ ظاہر درست تھا مگر درخت اقبال کی جڑ کو دیمک لگ گئی تھی۔ میں نے ایک شخص ملاقاتی سے کہا کہ ایک ہمارا دوست انشا ہے کہ دوست کے نام جان دینے کو موجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ اچھا آج آپ ان سے کہیے کہ ہمیں ایک تربوز خود بازار سے لا کر کھلا دو۔ میں نے اسی وقت پہنچ کر انشا سے کہا کہ ایک تربوز لا کر کھلاؤ۔ انھوں نے کہا: یہ بات کیا ہے؟ تب میں نے داستان سنائی۔ انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا: بھائی وہ شخص سچا اور ہم تم دونوں جھوٹے۔ ظالم کی قید میں ہوں۔ سوا دربار کے گھر سے نکلنے کا حکم نہیں ہے۔ تیسرا رنگ میاں رنگین بیان کرتے ہیں کہ سوداگری کے لیے گھوڑے لے کر لکھنؤ گیا۔ معلوم ہوا کہ قریب ہی مشاعرہ ہوتا ہے۔ میں بھی پہنچا۔ ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزائی پہنے، سر پر میلا سا چھینٹا، گھٹنا پاؤں میں، گلے میں پکوں کا توبڑا ڈالے، ایک لکڑ کا حقہ ہاتھ میں لے آیا۔ سلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا۔ بولا کیوں صاحب، ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا؟ لوگوں نے کہا: سب صاحب آجائیں تو شروع ہو۔

وہ بولا کہ صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھ دیتے ہیں۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں   بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

وہ تو غزل پڑھ، کاغذ پھینک، سلام علیک کہہ کر چلے گئے۔ چوتھی دفعہ لکھنو گیا تو پوچھتا ہوا ان کے گھر پہنچا۔ دیکھا کہ ایک کونے میں بیٹھے ہیں تن برہنہ، دونوں زانو پر سر دھرا ہے۔ آگے راکھ کا ڈھیر ہے۔ ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ہے۔ میں نے پکارا: سید انشا، سید انشا، سر اٹھا کر نظرِ حسرت سے دیکھا۔ ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: شکر ہے۔ پھر اسی طرح سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔'' 14

میاں رنگین بلاشبہ بڑے باصلاحیت اور باکمال استاد تھے لیکن مسافروں کی طرح لکھنؤ آتے جاتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنو والے ان کو نہ جاننے کی طرح جانتے تھے۔ سعادت خاں ناصر نے بھی اپنے تذکرے میں ان کے فرسنامے اور ریختی کا ذکر کیا ہے۔ لکھنؤ کے شعری ماحول پر ان کا اثر بھی نہ ہونے کی برابر ہے۔

(2)

7۔ آصف

نواب آصف الدولہ نے فیض آباد سے آ کر لکھنو کو بسایا تھا۔ انھوں نے اس شہر کو بحدِ امکان رونق دینے کی کوشش کی تھی۔ قدرتی طور پر ان کی خواہش یہ تھی کہ ان کا یہ شہر دوسرے شہروں، حتیٰ کہ شاہ جہاں آباد کے مقابلے میں بھی زیادہ آباد ہو، چنانچہ لکھا ہے کہ:

> ''فیاضی اس نواب کی مشہور ومعروف ہے۔ 'جس کو نہ دے مولا اس کو دے آصف الدولہ' اب تک لوگوں کی زبان پر جاری ہے۔ مرزا وزیر علی خاں کی شادی اس زمانے میں ایسی کی کہ شاید ہندوستان میں کسی نے نہیں کی ہوگی۔ ہر ملک کے سوداگر، عالم فاضل، پیشہ ور امیدوار اس شہر میں کثرت سے آنے جانے لگے۔ رومی دروازہ و امام باڑہ آصف الدولہ کا بنایا لائق دیکھنے اور تعریف کے ہے۔ دریائے گومتی کا پل اب تک یادگار ہے۔''16

آگرہ تاج محل کے لیے، دلّی جامع مسجد کے واسطے معروف ہے۔ آصف الدولہ نے دونوں سے علاحدہ راہ نکالی اور لکھنو امام باڑہ کے لیے ممتاز ہوا۔ آصف الدولہ کے بارے میں شیخ مصحفی نے لکھا ہے:

"آصف تخلص نواب وزیر آصف الدولہ بہادر یحییٰ خاں است کہ شور سخاوتش غلغلہ در چار دانگِ عالم انداختہ و برق شمشیر سطوتش زہرۂ شیران آہنی چنگال آب ساختہ ۔ ازبسکہ از ابتدائے عمر در جمیع فنون دانائے یگانۂ روزگار است، بہ مقتضائے موزونی طبع گاہ گاہے خیال شعری فرمایند۔" 17

شاعری میں نواب آصف الدولہ کے تلمذ کی کیفیت کا سعادت خاں ناصر نے اس طرح بیان کیا ہے:

"ابتدا میں میر محمد علی وہم سے افادت اندوز، بعد ازاں میر محمد سوز سے۔" 18

یہاں نمونہ کے طور پر ان کے صرف دو شعر نقل کیے جاتے ہیں ۔

تجھے غیر سے جب ہم دیکھتے ہیں ۔۔۔ نہ دیکھے کوئی جو کہ ہم دیکھتے ہیں
تو جلدی سے آ، ورنہ میرے مسیحا ۔۔۔ کوئی دم میں راہِ عدم دیکھتے ہیں

8۔وزیر

آصف الدولہ کے بعد ان کے بیٹے نواب وزیر علی خاں مسند نشین ہوئے۔ وہ بھی کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

"صاحب حکومت و ریاست، نواب وزیر علی خان بہادر وزیر، حقیقا نواب آصف الدولہ بہادر، بوقت قیدِ فرنگ یہ مطلع اس نے ارشاد کیا 19

اٹھ گئے محفل سے سارے یار اور ہلچل پڑی ۔۔۔ اے خلل انداز گردوں اب تو تجھ کو کل پڑی

9۔بادشاہ

کہا جاتا ہے کہ سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر بھی شعر کہتے تھے لیکن ان کا مستند کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ بادشاہِ دوم نصیر الدین حیدر البتہ شاعر تھے اور بادشاہ تخلص کرتے تھے سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

"شہریارِ ذوی الاقتدار، ذرہ ذرہ اس کی ہمت سے آفتاب، عاشق آلِ حضرت رسالت مآب، شاہِ جمجاہ نصیر الدین حیدر تخلص بادشاہ، یہ دو شعر اس غفران مآب

سے انتخاب ہیں ۔

بلبلِ شیدا نے پوچھا گل سے یہ فصلِ بہار　　اے گل رعنا ترے دامن سے کیوں لپٹا ہے خار
تیغ ابرو دیکھ، یہ آئی ندا اے بادشاہ　　لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار" 20ء

ان کے تلمذ کا حال تو معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ فقیر محمد خاں گویا نے اپنے ایک قصیدہ میں بادشاہ سے اصلاح پانے اور ان کا شاگرد ہونے کا فخریہ اعتراف کیا ہے۔

10۔ ترقی

نواب محمد تقی خاں ترقی بہو بیگم صاحبہ کی وفات کے بعد لکھنو میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ وہ اپنے وقت کے نہایت موقر اور موثر امرا میں سے تھے۔ محسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ:

"امیر باتوقیر نواب اسداللہ، رستم الملک، آغا مرزا محمد تقی خان بہادر فیل جنگ مغفور خلفِ سید محمد امین، بزرگ ان کے باشندہ نیشاپور کے، ان کا مسکن فیض آباد، مقیم لکھنو صاحب دیوان، شاگرد رشید میر محمدی سوز۔" 21ء

ان کے کلام کا انداز بھی قدیمانہ تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ۔

گر ایک شب بھی وصل کی لذت نہ پائے دل　　پھر تجھ سے کس امید پہ کوئی لگائے دل
اک دل تجھے مدام ستانے کو چاہیے　　تیرے لیے کہاں سے کوئی روز لائے دل
دنیا کے جو مزے ہیں، ہرگز وہ کم نہ ہوں گے　　چرچے یہی رہیں گے، افسوس ہم نہ ہوں گے
یاران رفتگاں پر روتے ہو کیا ترقی　　کیا ہم روانہ سوئے ملکِ عدم نہ ہوں گے

مرزا ترقی کے کلام کی بنیاد تجربے، مشاہدے اور محسوسات پر ہے۔ مضامینِ خیالی کم سے کم نظم کیے ہیں۔ بیان میں سادگی کے ساتھ اثر اور کیفیت بھی ہے۔

11۔ ہوس

یہ موتمن الدولہ نواب محمد اسحاق خاں کے پوتے اور نواب مرزا محمد علی خاں سالار جنگ کے بھتیجے تھے۔ لہٰذا الزہرا نواب بہو بیگم صاحبہ ان کی سگی پھوپھی تھیں۔ اس طرح یہ آصف الدولہ کے حقیقی ماموں زاد بھائی ہوتے تھے۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"نواب میرزا محمد تقی خاں ہوس تخلص خلفِ نواب میرزا علی خاں مرحوم، جوانے

ست بہ زیورِ فضل وکمال آراستہ، درحال مہذب الاخلاق پیراستہ، محامدِ خاندانِ علیۂ ایشان از روے حسب ونسب محتاج بہ شرح وبیاں نیست، بزرگانِ ایشاں ہمیشہ مقرب ملوک وسلاطین بودہ آمدہ اند۔ خود مقربِ نواب وزیر۔ ابتداے سلسلہ نسب بہ مالک اُشتر ختمی می شود۔ چوں در آغازِ ریعانِ جوانی موزونی طبع داشتند، چیزیکہ موزوں می کردند، بہ نظرِ میر حسن مصنفِ مثنوی سحرالبیان می گزرانیدند۔ بعد از فاتِ آں بزرگ فقیر را بہ شرفِ استادی عز امتیاز بخشیدہ، در عرصۂ قلیل زخشِ طبیعت را از میدانِ فصاحت و بلاغت تیز تر دوانیدند، مثنوی لیلیٰ مجنوں و دیوانِ غزلیات از تصنیفاتِ ایشاں بر صفحۂ روزگار یادگار راست واشعارِ آبدارش زبان زدِ صغار وکبار، چوں در تذکرۂ اول بہ سبب سہوِ طرفین مرفوع القلم ماندہ بودند، لہذا بہ تلافیِ آں پرداختم تا حقِ نمک تلف نہ شود۔ عمرش از چہل متجاوز خواہد بود۔''22

اوپر کہا جا چکا کہ ہوس کے والد سالار جنگ کے حقیقی بھائی تھے۔ بظاہر وہ آصف الدولہ سے زیادہ قریب تھے اس لیے ان کے ساتھ ہی فیض آباد سے لکھنؤ آگئے تھے۔ یہیں ہوس نے شعر کہنا شروع کیا اور میر حسن کے شاگرد ہوئے۔ سعادت خاں ناصر نے مصحفی کے تذکرۂ اول میں ان کے مرفوع القلم رہ جانے کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے:

''یہ معتا شرح طلب ہے وہ سہو یہ تھا کہ میاں مصحفی کی تنخواہ بہت سی چڑھ گئی تھی۔ ایک روز اپنی عسرت ان سے بہ طریق شکایت بیان کی۔ نواب صاحب نے فرمایا مجھ سے چندے مدد خرچ نہ ہو سکے گی۔ ان کے منہ سے بیساختہ نکل گیا کہ میری زبان نہ رہ سکے گی۔ نواب صاحب نے حقِ استادی کو بالائے طاق رکھ کر امیری کو کام فرمایا۔''23

لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ مصحفی کی زبان اور قلم دونوں کبھی کھل نہ سکے۔ سعادت خاں ناصر نے ہوس کا حال بہت اختصار سے لکھا ہے:

''شاعرِ مسیحی نفس، نواب مرزا محمد تقی خاں تخلص ہوس، خلف الصدق نواب مرزا علی

خاں، زیورِ فضل وکمال سے آراستہ اور پیراستہ۔ حسب ونسب ان کا محتاج شرح
وبیان نہیں۔ چند شاعر ہمیشہ اس سرکار میں مثل میر حسن وطالب علی عیشی ومیاں
مصحفی نوکر رہے۔ قصہ کوتاہ مثنوی لیلا ومجنوں اور دیوان مع قصاید اس امیر نامدار
سے یادگار ہے۔"24

کسی شاعر کا ایک سے زائد امیروں کو اصلاح دینا، ان سے مشاہرہ پانا، ان کے یہاں حاضر ہونا، ان سے تحفے، ہدیے، انعامات وغیرہ قبول کرنا نہ تو ممنوع تھا اور نہ اس زمانے کے معمول کے خلاف تھا اس لیے ناصر کے اس بیان پر شبہ کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی ہے۔ ہوس کے بارے میں ابنِ امین اللہ طوفان نے بھی بس اتنا لکھا ہے کہ:

''ہوس، میر تقی، بہ لکھنو شخصے مشاق بود مضمونِ سوز وگدازی گفت۔ روزے چند
است کہ ازیں دار ہوس رفت۔"25

اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ہوسؔ نے 1250ھ (= 1834) میں یا شاید 1251ھ کے آغاز میں وفات پائی تھی۔

ہوس کے کلیات کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں ہے جو دو سو اُسّی اوراق پر محیط ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ ان کے مرثیے، مثنوی، مخمس وغیرہ بھی شامل ہیں۔ خاتمہ کا کلام یہ ہے ؎

اب تو خدا کے واسطے موقوف کر برق افگنی　　عاشق ہے تیرا یہ ہوس لازم ہے اس پر رحم بھی
ہو جا کبھی اس کشتۂ شمشیر حرماں کی طرف

دیوان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوسؔ طویل اور مختصر بحروں میں بھی اچھے شعر کہہ لیتے تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

صدمۂ عشق سے مجنوں کا جگر چاک ہوا　　کیا عجب پردۂ محمل بھی اگر چاک ہوا
کس کو اے یار شب ہجر تڑپتے گذری　　جس کی حالت پہ گریبانِ سحر چاک ہوا

شب ہجر میں دمِ واپسیں دلِ مضطرب کا یہ حال تھا
کہ جو سانس ہونٹوں تک آئی تھی سو نکلنا اس کا محال تھا

تدبیر کرو وصل کی جو ہو سکے تم سے　　کچھ ہم سے تو اے ہمنفساں ہو نہیں سکتا
نہیں ہوس وقت جوشِ مستی قدِ خمیدہ سے تک حیا کر　　بُتوں کا بندہ رہیگا کب تک خدا خدا کر خدا خدا کر
کہاں سلیماں، کہاں سکندر، کہاں ہے جم اور کہاں ہے دارا　　یہ سب کے سب خاک کے تھے پُتلے بگاڑ ڈالے بنا بنا کر
آندھیاں آئیں، گھٹائیں برسیں، اُٹھے گردباد　　فتنے کیا کیا برسرِ گورِ غریباں ہو گئے
تمہارا دھیان ہاں آٹھوں پہر ہے　　کہو یارانِ رفتہ کیا خبر ہے
فلک نازک مزاجوں کو نہ دے رنج　　انھیں صندل لگانا دردِ سر ہے
دلِ شیریں نہیں شورش سے خالی　　نہادِ سنگ میں پنہاں شرر ہے

ہوئے عازمِ ملکِ عدم جو ہوس تو خوشی یہ ہوئی تھی کہ غم سے چھٹے
یہ فراغ الم سے نہ واں بھی ملا وہاں غم یہ رہا کہ وہ ہم سے چھٹے

ہوس مشاق اور باصلاحیت شاعر تھے۔ لکھنؤ کے بعض نومشق ان سے اصلاحیں بھی لیتے تھے لیکن ناسخ اور آتش وغیرہ کے سامنے ان کی شاعری چمک نہیں سکی۔

12۔ سوزاں

یہ مرزا محمد تقی خاں ہوس کے بھائی تھے۔ شیخ مصحفی نے ان کے ذکر میں لکھا ہے:

"مرزا احمد علی خاں شوکت جنگ المتخلص بہ سوزاں خلف نواب مرزا علی خاں مرحوم۔ چوں بہ آداب و امتیاز است، طبعے رسا دارد۔"[27]

سوزاں کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

مت دل لگا بتوں سے، کہنے پہ جا کسی کے　　ہرگز ہوئے نہ ہوں گے، یہ آشنا کسی کے
فرقت میں اس کی سوزاں ناحق کو جان دی ہائے　　اس لاابالی کو غم مرنے سے کیا کسی کے

13۔ سرسبز

یہ بھی مرزا محمد تقی خاں ہوس کے بھائیوں میں تھے۔ مصحفی نے ان کے حال میں تحریر کیا ہے:

"مرزا زین العابدین خاں عُرف مرزا مینڈو، سرسبز تخلص، از فرزندانِ نواب سالار جنگ مرحوم، جوانے ست باعلم و حیا و صاحب فہم و ذکا۔ بخش اکثر اوقات بہ مطالعۂ کتب دینی و مسایل یقینی مصروف و برخلاف خاندانِ خود طبعش از غنا

دغیرہ مجتنب..... چوں مرزاے مذکوررا بہ سبب موزونی طبع عشق شعر ہندی
ازطفولیت دامنگیر حال بود، رفتہ رفتہ بہ سن ہفدہ سالگی رسیدہ، دیوانے ترتیب
دادہ۔ فقیر پیش ازیں مدت چار سال بہ صیغۂ شاعری ملازم ورفیق ایشاں ماندہ
بسیار بہ عزت دوست می داشتند ۔حق تعالیٰ سلامت دارد۔''28

ان کے چند شعر یہ ہیں۔

بیٹھا ہوں میں تو کب سے سرِ راہ یار پر ۔۔۔ کچھ نگاہ تک تو مرے انتظار پر
دید کو تیری ہم جو آتے ہیں ۔۔۔ سینکڑوں آفتیں اٹھاتے ہیں
بے تکلف تھے دل کے لینے تک ۔۔۔ ہم سے اب آپ منہ چھپاتے ہیں
خبر لائی بادِ بہاری کسی کی ۔۔۔ دوچنداں ہوئی بیقراری کسی کی

سرسبزااور سوزاں دغیرہ خود شاعر تھے اور شاعر نواز رئیس تھے لیکن ان کی شاعری کو اس زمانے کے لکھنؤ میں فروغ حاصل نہیں ہو سکا بلکہ یہ بات دیکھنے کی ہے کہ محسن کے تذکرے میں ان کا نام بھی نہیں آیا ہے۔ سعادت خاں ناصر نے ان کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن اس سے بہت پہلے جو کچھ مصحفی لکھ چکے تھے، اس پر اضافہ کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان رودسا اور امرا کا کلام اثر انگیز یا نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکا۔

(3)

نواب آصف الدولہ کے فیاضوں کے نتیجے میں ارباب علم وفن ملک کے گوشے گوشے سے کھنچ کھنچ کر ان کے شہر لکھنو میں آرہے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس شہر میں علمی فضا پیدا ہوگئی اور رفتہ رفتہ یہ شہر پایۂ تخت دہلی کی ہمسری کرنے لگا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ:

''پہلے جو صاحب کمال لکھنؤ میں تھے وہ دلّی کے خانہ برباد تھے۔ وہ یا ان کی اولاد اس وقت تک دلّی کو اپنا وطن سمجھتے تھے اور اہل لکھنؤ ان کی تقلید کو فخر سمجھتے تھے نہ کہ عیب، کیونکہ وہاں اب تک کوئی صاحب کمال اس درجہ کا پیدا نہ ہوا تھا۔ اب وہ زمانہ آتا ہے کہ انھیں خود صاحب زبانی کا دعوا ہوگا اور زیبا ہوگا اور جب ان کے اور دلّی کے محاورہ میں اختلاف ہوگا تو اپنے محاورے کی فصاحت اور دلّی کی عدم فصاحت پر دلائل قائم کریں گے بلکہ انھیں کے بعض بعض نکتوں کو دلّی کے اہل انصاف بھی تسلیم کریں گے۔''29

محمد تقی میر فخر سے کہتے تھے:

''میرے کلام کے لیے فقط محاورۂ اہلِ اردو ہے یا (دلّی کی) جامع مسجد کی سیڑھیاں۔''

شیخ مصحفی نے کہا تھا۔

دلّی بھی نہیں دیکھی زباں داں یہ کہاں ہیں؟

مرزا علی نقی محشر کا شعر ہے۔

گفتگو اردو زباں کی کوئی ہم سے سیکھ جائے　　　کیا ہوا محشر اگر دلّی کی پیدائش نہیں

اس طرح بتدریج نوبت یہاں تک پہنچی کہ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں شیخ ناسخ نے طرزِ قدیم پر خطِ نسخ کھینچ دیا۔

14۔ ناسخ

شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے شیخ ناسخ کے تعارف میں لکھا ہے کہ:

> ''شیخ امام بخش ناسخ تخلص خلف الرشید شیخ خدا بخش مرحوم، وطن بزرگانش دار السلطنت لاہور و خودش در فیض آباد تولد شدہ و بہ لکھنؤ بہ سنِ تمیز رسیدہ، جوان مسمین و سپاہی وضع حلیم الطبع و مہذب الاخلاق، و یدمش، عمرش سی و ہفت سالہ است۔ از سنِ بست سالگی بہ مقتضائے موزنی طبع فکر شعر ہندی میکند و در تلاشہائے معنی تازہ سعی نماید، اجدادش تجارت پیشہ بودہ اند و خودش نیز بہمین وتیرہ بسری برد۔''30

میر علی اوسط رشک نے اپنے استاد شیخ ناسخ کی عمر اور سال وفات کو ایک قطعہ میں نظم کیا ہے، اس طرح۔

ناسخ استادِ رشک حسرتِ عمر　　　مُرد اے ہے بہ سال شصت ونہم
رشک تاریخِ انتقال نوشت　　　مُرد اے ہے بسال شصت ونہم

1254ھ

یعنی 1254ھ (= 1838) میں جب ناسخ کا انتقال ہوا وہ عمر کے اُنہتر ویں سال میں تھے۔ اس حساب سے ان کا سالِ پیدائش 1186ھ (=1772) ہوا۔ مصحفی کے بیان کے مطابق ناسخ نے بیس برس کی عمر میں یعنی 1206ھ (=92-1791) میں شعر کہنا شروع کیا تھا لیکن ان کے دیوان میں سودا کی وفات کا قطعہ تاریخ بھی مندرج ہے۔ اس طرح:

تاریخ وفات مرزا رفیع تخلص سودا ۔

از وحشت آباد دنیا　　رفت بخلد رفیع سودا
گفتم سال وفاتش ناسخ　　شاعر ہندستان واویلا

1195ھ

اگر مصحفی کی تحریر پر اعتماد کرلیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ قطعۂ تاریخ ناسخ نے بعد میں کبھی کہہ لیا ہوگا لیکن اس قطعہ کے مضامین اس خیال کے موید نہیں ہیں۔

شیخ ناسخ کے والدین سُنیوں کے قبرستان میں دفن ہوئے تھے اور ان دونوں کی لوح مزار پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

پیکر اطہر اُم ناسخ　　گور پدر جلیل ناسخ

1199ھ (1785)　　1216ھ (1801-02)

انداز بتا رہا ہے کہ یہ دونوں تاریخیں ایک ہی زمانے کی کہی ہوئی ہیں۔ ویسے بھی پہلی تاریخ جس زمانے کی ہے اُس وقت ناسخ کی عمر تیرہ برس کی رہی ہوگی اور اس کمسنی میں ان کا فارسی زبان میں تاریخ کہنا خلافِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ البتہ باپ کے مرنے کا قطعہ تاریخ ناسخ کے دیوان میں اس طرح لکھا ہے:

تاریخ وفات والد مصنف ؎

والد من زیں جہاں رحلت نمود　　یا الہ العالمین مغفور باد
گشت ناسخ سال تاریخ وفات　　با رسولِ ہاشمی محشور باد

1216ھ

بہ حالتِ موجودہ شیخ ناسخ کا کہا ہوا قدیم ترین شعر وہ ہے جو نہال چند لاہوری نے اپنے قصہ گل بکاؤلی میں اس طرح تضمین کیا ہے ؎

مسی مل کر جب اس نے پان کھایا　　یہ مطلع پڑھ کے ناسخ کا سُنایا
مسی مالیدہ لب پر رنگ پاں ہے　　تماشا ہے تہِ آتش دُھواں ہے

یہ قصہ جس کا تاریخی نام مذہب عشق ہے 1217ھ (=03-1802) میں مکمل ہوا تھا۔ یہ بات یقینی ہے کہ یہ مطلع ناسخ نے اس سال سے پہلے کسی زمانے میں کہا ہوگا۔ نہال چند لاہوری نے

مناسب مقام پاکر اور ہم وطنی کے خیال سے اس کو اپنی کتاب میں داخل کرلیا ہوگا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ:

"حریف یہ بھی حرف رکھتے ہیں کہ شیخ ناسخ مخلوقِ فارسی کو تناسخ دے کر اردو کی زندگی دیتے ہیں۔ (بیدل کا مطلع یہ تھا) 32

مسی آلودہ برلب رنگِ پان است   تماشا کن تہِ آتش دُخان است

تو مشق کے زمانے میں اگر ناسخ نے فارسی کے بعض شعروں کا اردو میں ترجمہ کرلیا تھا تو اسے عیب نہیں سمجھنا چاہیے اس سے تو ناسخ کے شوقِ مطالعہ اور ترجمہ کر لینے کی لیاقت کا ثبوت ملتا ہے۔

شیخ ناسخ کے تین دیوان ہیں۔ ان کے ناموں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ:

"دیوان ناسخ یعنی عدد حرف زبر و بینا تش جمع کردہ تاریخ بر می آید و قاعدہ اش ایں است کہ از اسم ملفوظی ہر حرف حرف اولیش حرف زبر ست و باقی بینات مثلاً حرف د اسم ملفوظی آں دال ست، پس چہار عدد حرف زبر است و سی و یک عدد حروف بینات، پس دیگر عدد حروف ہم بریں قیاس باید فہمید۔ مجموع عدد حروف زبر از دیوان ناسخ ہفت صد و ہشتاد و دو شدند:

خ س ا ن   ن ا و ی د

782=600 60 1 50   50 1 6 10 4

مجموع عدد حروف بینات از دیوان ناسخ۔ چہار صد و پنجاہ

ے ین لف ن و   ن د لف و ا ی ل ا

450=10 60 110 50   50 6 110 6 1 10 3

6   1

ہر گاہ کہ عدد زبر و بینات ہر دو جمع کردیم مجموعش یک ہزار و دو صد و سی و دو شدند و ہمیں سال تاریخِ تصنیف دیوان اوّل ست۔

و نام تاریخی دیوان دوم از مصنف کہ در پریشانی آمد و رفت الہ آباد اسم با مسمّی نام کرد:

دفتر پریشاں

1247ھ

دفترِ شعر : نام تاریخی دیوان سوم از میر علی اوسط تخلص بہ رشک :
1254ھ

پہلے دیوان یعنی دیوان ناسخ میں ابتدائے مشق سخن سے غازی الدین حیدر کی نیابت بلکہ بادشاہت کے ابتدائی زمانے (=1234ھ) تک کا بھی کلام تھوڑا بہت شامل ہے، چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ ہے۔

ناسخ حضور شاہِ زمن حشر تک رہیں　　بندے ہزاروں حشمت و اقبال و جاہ سے

اس دور کی شاعری کے بارے میں خود شاعر کا کہنا ہے کہ۔

شام سے تا صبح ہے مجھ کو جو اَب سیرِ لغات　　سامنے رکھتا ہوں اپنے نسخہ فرہنگ و شمع

اس زمانے میں شاعر کی زندگی میں کسی قدر سکون و اطمینان کی صورت تھی اس لیے اس نے شعر گوئی پر بہت محنت کی تھی۔ ہر لفظ کی اصل، اس کے تلفظ، املا اور محلِ استعمال وغیرہ کے بارے میں خوب تحقیق کرتے تھے اور اسی کی اپنے شاگردوں کو بھی تلقین کرتے تھے۔ فائدہ یہ ہوا کہ کلام کو عموماً اغلاط اور اسقام سے پاک ہونے کی وجہ سے مستند سمجھا جانے لگا تھا۔

شاعری کی بنیاد کتابوں پر تھی۔ اس میں مشاہدات اور محسوسات کا بیان کم سے کم ہوتا تھا۔ بیشتر اساتذۂ قدیم کی اتباع اور ان کے کلام سے اخذ و اکتساب کیا جاتا تھا چنانچہ بعض مقطعوں میں اس کا اعتراف بھی موجود ہے مثلاً

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب　　ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اُس مغفور کا

پہلے اپنے عہد سے افسوس سودا اُٹھ گیا　　کس سے مانگیں جا کے ناسخ اس غزل کی داد ہم

اور۔

ہے ریاضِ فکرِ ناسخ کی جو شادابی یہی　　لکھنؤ میں آ گئی روحِ غنی کشمیر سے

محفلِ عشرت میں ناسخ یاد آیا ہے غنی　　شمع ساں ہنسنے میں یاروں کو رلایا چاہیے

غنی کے اشعار کے مضامین اور مطالب عموماً خیالی ہوتے تھے اور اس خیال آفرینی میں نزاکتیں اور لطافتیں پیدا کی جاتی تھیں۔ کیفیت یہ تھی کہ ناسخ خود بھی اپنے آپ کو "نازک خیال" کہنے لگے تھے۔

ایسے لکھو رنگیں مضامیں ناسخ نازک خیال　　　　یک قلم اوراق گل ہوں دفتر اشعار میں

نازک خیالی سے بحث کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ:

''جن لوگوں کی طبیعت میں ایسی خیال بندیوں کا انداز پیدا ہوا ہے، اس کے کئی سبب ہوئے ہیں اول یہ کہ بعض طبیعتیں ابتدا ہی سے پُر زور ہوتی ہیں۔ فکر ان کی تیز اور خیالات بلند ہوتے ہیں مگر استاد نہیں ہوتا جو اس ہونہار بچھڑے کو روک کر نکالے اور اصول کی باگوں پر لگائے۔ پھر اس خودسری کو ان کی آسودہ حالی اور بے احتیاطی زیادہ قوت دیتی ہے جو کسی جوہر شناس یا سخن فہم کی پرواہ نہیں رکھتی۔ وہ اپنی تصویریں آپ کھینچتے ہیں اور آپ ہی ان پر قربان ہوتے ہیں بلکہ شوقین، داد دینے والے جو کھوٹے کھرے کے پرکھنے والے ہیں اور حقیقت میں پسند عام کے دکیل بھی ہیں، ان نازک خیالوں کو ان کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ان کی دولتمندی اپنے گھر پر اپنا دربار الگ لگاتی ہے جس میں بعض اشخاص وقت پسندی اور باریک بینی میں ان کے ہم مزاج ہوتے ہیں۔ بعض فقط باتوں باتوں ہی میں خوش کر دینے کا شوق رکھتے ہیں۔ بعض کو اپنی گرہ کی عقل نہیں ہوتی۔ جس طرف لوگوں کو دوڑتے دیکھا آپ بھی دوڑنے لگتے ہیں غرض ایسے ایسے سبب ہوتے ہیں جو بھلے چنگے آدمی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر خود پسندی کے ناہموار میدانوں میں ڈھکیل دیتے ہیں۔''33

لکھنؤ کے اس ماحول میں جب نواب سعادت علی خاں آدھا ملک ہاتھ سے دے چکے تھے۔ شاہی کا خطاب لے کر غازی الدین حیدر اپنا اور اہلِ ملک کا دل خوش کر رہے تھے۔ خیال بندی سے زیادہ دلکش کوئی چیز نہیں ہوسکتی تھی۔ ناسخ نازک خیال کا کلام چمکا اور ایسا چمکا کہ دوسرے طرز کے کہنے والے بقول مصحفی:

''از خجالت دیگر قدم در مجلس مشاعرہ نہ نہادند واز گفتۂ سُست خود پشیماں شدہ
دسرِ خجالت بہ تہ انداختہ وجز خامشی چارہ نہ دیدند۔''34

جن سے ہو سکا، خجالت سے بچنے کے لیے انھوں نے طرزِ ناسخ میں شعر کہنا شروع کر دیا۔

مصحفی کا بیان نقل کیا جا چکا ہے۔ میاں رنگین نے بھی کہ جو بہت قدیم شاعر تھے اور جنھیں لکھنو سے برائے نام سا تعلق تھا، اپنی استادی منوانے کے لیے اس نئے طرز میں غزل کہی تھی:

غزل بہ طرز شیخ ناسخ

پھر خیال اپنا گریباں کی طرف آنے لگا | پھر جنوں کچھ کچھ مجھے تعلیم فرمانے لگا
پھر نگار نے تصور اس کا آنکھوں میں مری | پھر دل اپنا بات سے ناصح کی گھبرانے لگا
پھر لگا دل کو مرے بھانے اکیلا بیٹھنا | پھر میں چپ جوں بلبل تصویر رہ جانے لگا
پھر سرکنے پاس نے سے میرے لگا ناموس و ننگ | پھر نئے سر سے محبت کا مزا آنے لگا

پھر غزل کہنے لگا رنگیں میں اپنے حسب حال
پھر غزل کی رکھ کے تانیں آپ میں گانے لگا

(کُل تیرہ شعر)

اس طرح طرز ناسخ کو رواج حاصل ہوا اور طرز قدیم لکھنؤ میں عملاً منسوخ ہو گیا۔

ناسخ کے دوسرے دیوان کی بیشتر غزلیں دل کی پریشانی، سفر کی تگ و دو اور بے وطنی کے عالم میں لکھی گئی تھیں اسی لیے اس دیوان کو "دفترِ پریشان" کہا گیا ہے۔ پہلے دیوان میں سحبان وائل، سعدی اور فردوسی کا نام آیا تھا۔ دوسرے دیوان میں ان کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ اس میں سلمان ساوجی، بیدل اور علی حزیں کا ذکر آیا ہے۔ اس دوسرے دیوان میں ذیل کے اشعار بھی توجہ طلب ہیں ۔

گرچہ ہے نظم مگر نثر کا ہوتا ہے گماں | یہ غزل دال ہے ناسخ کی پریشانی پر
ہے گلشنِ سرِ قرطاس میں گلبانگ عنادل | میرے قلم قافیہ پرداز کی آواز
بہت کر کر کے گرمی غیر سے وہ سوخت دیتا ہے | جبھی واسوخت کے مضموں ہم اکثر بند کرتے ہیں
ہے جو اے ناسخ وظیفہ خلق کو | یہ غزل کیا ہے قصیدہ بردہ ہے

سفر کے زمانے میں لُغتوں اور اساتذہ کے دواوین کی ورق گردانی کا موقع کم سے کم تھا جو واقعات اور معاملات سامنے آ رہے تھے، دل و دماغ انھیں سے متاثر ہو رہے تھے اور وہی شعر بن کر زبان و قلم سے نکل رہے تھے چنانچہ "قاصد" کی ردیف میں مسلسل چار غزلیں کہی ہیں۔ ان

کے مطلعے یہ ہیں۔

آ مجھ سے ہو ہمکنار قاصد — کرلوں میں تجھ کو پیار قاصد

لے کے خط جاشتاب اے قاصد — جلد لے آجو اب اے قاصد

آیا نہیں پھر کے آہ قاصد — تکتا ہوں میں کب سے راہ قاصد

آنکھوں کو ہے انتظار قاصد — ہے جان امیدوار قاصد

اسی طرح ردیف ''لکھنؤ'' میں جو غزلیں کہی ہیں، ان کے مطلعے یہ ہیں۔

یاد ہیں سب گلعذارِ لکھنؤ — ہے تصور میں بہار لکھنؤ

ہمصفیر اپنا وطن ہے لکھنؤ — ہم تو بلبل ہیں چمن ہے لکھنؤ

مرے دم سے تھا بوستاں لکھنؤ — مگر ہوگیا اب خزاں لکھنؤ

آسماں کی کب ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ — لکھنو مجھ پر فدا ہے میں فدائے لکھنؤ

اس قسم کی غزلوں سے قطع نظر، ناسخ کے دیوان دوم میں ایسے شعروں کی بھی کمی نہیں ہے جو کسی خاص واقعہ یا وقتی تاثر کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً

دشت سے کب وطن کو پہنچوں گا — کہ چھٹا اب تو سال آپہنچا

نامہ بر ہے، نامۂ احباب ہے — ہاے بیداری ہے یا یہ خواب ہے

تین تربنی تو دو آنکھیں مری — اب الٰہ آباد بھی پنجاب ہے

رورہا ہوں کیا الٰہ آباد میں — دایرہ جو ہے یہاں گرداب ہے

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں خیال بندی کی طرف طبیعت کا میلان کسی قدر کم ہوگیا تھا اور قافیہ پیمائی سے دلچسپی زیادہ ہوگئی تھی۔ اس بُرے وقت میں دشمنوں اور حاسدوں وغیرہ کی زیادتیوں بلکہ ستم رانیوں کا خیال دل و دماغ میں گھر کیے ہوئے تھا اور اکثر شعروں میں انھیں خیالوں کا اظہار ہوتا تھا۔ اسی لیے خود ناسخ نے اپنی اس دور کی شاعری میں واسوخت کے انداز کی موجودگی کا اعتراف کیا ہے۔ اس حال میں ایسے اشعار بھی زبان قلم سے نکل گئے ہیں۔

تیرے جور و ستم اے عہد شکن بھول گئے — رنج غربت سے یہ پائے کہ وطن بھول گئے

آج تک یاد نہ جنت میں کیا ناسخ کو — اپنے مداح کو اے شاہِ زمن بھول گئے

اور ـ

خود ہنستے ہو، اغیار سے ہنسواتے ہو مجھ کو   یہ زور ہنسی ہے کہ رُلا جاتے ہو مجھ کو
میں خوب سمجھتا ہوں مگر دل سے ہوں ناچار   اے ناصحو بے فایدہ سمجھاتے ہو مجھ کو
جو بات تمھاری ہے سوالٹی ہے مری جاں
اغیار کو بٹھلاتے ہو، اُٹھواتے ہو مجھ کو

شیخ ناسخ کے تیسرے دیوان میں بیشتر کلام ان کے آخری زمانے کا ہے۔ کچھ متفرق کلام اور بھی جو مرتب یعنی میر علی اوسط رشک کو دستیاب ہو گیا تھا اس میں شامل ہے۔ اس کلام کا حال الٰہ آباد اور کانپور وغیرہ میں قیام کے سلسلے میں لکھا جائے گا۔ یہاں دیوان سوم کے محض چند شعر نمونہ کے طور پر لکھے جاتے ہیں ۔

مَل کے مِسّی رتبہ دانتوں کا بہت کم کردیا   کیا غضب تم نے کیا ہیرے کو نیلم کردیا
باغ دے، ابر وغنا، مہتاب ونہر ووصلِ دوست   ایک دل ہے اور حسرت ہے برابر سات کی
کی جو خیاطِ ازل نے تری پوشاک درست   بچ رہے قطع میں یہ شمس وقمر دو ٹکڑے
کرتے ہیں سالک ترقی سے تنزل اختیار   جب کہ منزل پر سوار آیا، پیادہ ہو گیا

آخر میں یہ ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیخ امام بخش ناسخ کی محنت اور احتیاط کے باوجود ان کے کلام پر بھی اعتراضات کیے گئے تھے۔ چنانچہ سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

''خواجہ بہادر حسین فراق نے...... شیخ صاحب سے کہا کہ منور خاں غافل ان کے شعر پر اعتراض کرتا ہے...... 35

دریافت ہوا، جس پر منور خاں (غافل) نے اعتراض کیا تھا (ناسخ کا) وہ شعر یہ ہے ـ

عجب حالت ہوئی طاری ترے آنے سے گلشن پر   کہ یوں بیتاب ہیں گل جس طرح دانے ہوں گلخن پر

اعتراض یہ کہ دانے ریگ پر بیتاب ہوتے ہیں نہ کہ گلخن پر (ناسخ نے) فرمایا کہ مشہور بھاڑ کا گرم ہوتا ہے یا ریگ کا؟ میں نے کہا سبحان اللہ کیا خوب جواب آپ نے دیا ہے........مرزا خانی صاحب سلمہٗ فرماتے تھے کہ مرزا محسن صاحب نے ایک شعر پر ناسخ کے دو اعتراض کیے ـ

سوز تا کم ہو نہ میرے سینے کے ناسور کا   یار نے مرہم بتایا شمع کے کافور کا

ایک تو یہ کہ شمع کافوری نہیں ہوتی۔ بہ سبب صفائی کے کافور سے اس کو نسبت دیتے ہیں۔
دوسرا اعتراض یہ کہ خاصہ معشوق کا ستم سازی ہے، نہ مرہم سازی۔ مرزا جعفر علی فصیح کہ شاگردان کے ہیں، وہ ایک شمع ساز کہن سال کو مرزا محسن کی خدمت میں لے گئے۔ اس نے کہا: میں شمع کافوری بناتا ہوں اور برادر مرزا جعفر علی فصیح کے غنی کاشمیری کا شعر واسطے سند کے پڑھتے آئے۔

سوز داغ دل مادفع نہ شد از مرہم   گرمی شمع زکافور نمی گردد کم

دوسرا جواب یہ کہ سبب مرہم سازی کا شعر میں ظاہر۔ جو وہ نہ سمجھیں تو اس کا جواب نہیں۔
غرض اس نقل سے یہ ہے کہ شہرہ اس کا اس کی استعداد قابلیت سے تھا اور۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسا شاعر بااقبال اور سخنور فارغ بال کمتر ہوا ہے۔ ایسے صاحب کمال کا دنیا سے اٹھ جانا صدمۂ عظیم اور حادثہ بزرگ ہے۔"

راقم سطور نے شیخ ناسخ کے شاگردوں کی جو فہرست مرتب کی ہے، اس کے مطابق ان کی تعداد سو سے بھی زیادہ تھی۔

15۔ آتش

ان کے استاد شیخ مصحفی نے ان کے حالات اس طرح قلم بند کیے ہیں:

"خواجہ حیدر علی ولد خواجہ علی بخش المتخلص بہ آتش جوان وجیہہ و مہذب الاخلاق است۔ سلسلہ نسبش بہ خواجہ عبداللہ احرار ختم می شود۔ بزرگانش در بغداد توطن داشتند۔ بعد از جلائے وطن قدیم در شاہجہاں آباد کہ بہ قلعہ کہنہ شہرت دارد استقامت گرفتند۔ موی الیہ از ابتدائے موزونی طبع کم کم خیال شعر فارسی و ہندی ہر دوی کرد ولما میلان طبعش بہ طرف فارسی بیشتر بود و آں روزہا کلام منظوم خود را بہ نظر فقیری گزرانید..... حالا کہ سن عمرش بہ بست وند سالگی رسیدہ دریائے طبعش بہ جوش و خروش۔ در زبان نظم ریختہ کہ آں ہم در متانت و رزانت از غزل فارسی کم نیست کہ بر معاصرینش سبقت بردجستن دشواری نماید۔ اگر عمرش وفا کردہ و چند سال بر ہمیں و تیرہ رفت بفکر تینش زمانے در پیش نیاید کہ از بینظیران

روزگار خواہد شد۔"36

شیخ مصحفی کے اس بیان کی روشنی میں خیال کیا جاسکتا ہے کہ حیدر علی آتش 1192ھ (1778) کے بعد کسی وقت پیدا ہوئے ہوں گے۔ان کے تخلص سے بھی ان کی طبیعت کی تیزی اور مزاج کی گرمی کا پتا چلتا ہے۔اس تخلص میں حرف تا مفتوح ہے چنانچہ مظفر علی اسیر نے ان کی وفات کے قطعہ تاریخ میں بھی اسی طرح نظم کیا ہے ۔

دلم از مرگِ آتش بود غم کش زآتش یافتم تاریخ آتش
زغم تا و الف خود را سہ تا ساخت تپش از دامنِ شین نقطہ انداخت

=1203 + 60 =1263ھ

1+400

یعنی تا اور الف کے اعداد کو جمع کر کے تین گنا کر دیں تو 1203 حاصل ہوں گے۔پھر حرف شین کے نقطے ہٹا دیں تو سین مہملہ باقی رہے گا۔اس کے عدد جمع کر دیں تو 1263 حاصل ہوں گے اور یہی خواجہ آتش کا سالِ وفات ہے۔

اس مقام پر یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ لفظ آتش تائے مفتوح کے ساتھ ہی رائج تھا چنانچہ انشا نے اپنی ایک غزل مہوش نے غش کیا، منقش نے غش کیا، میں یہ شعر کہا ہے ۔

مکھڑا ترا نشے میں دھواں دھار دیکھ کر ہر اک پری کے بھیس میں آتش نے غش کیا

اور شیخ محمد ابرہیم ذوق کے دیوان میں بھی ایک غزل کا مطلع یہ ہے ۔

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے گر اس میں زلفِ سرکش ہو
پھر زلف بنے وہ دستِ موسا جس میں اخگر آتش ہو

شاعری شروع کرنے سے پہلے آتش نے بہ گمانِ غالب فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی اور مصحفی کے بیان کے مطابق انھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں تقریباً ایک ساتھ شعر کہنا شروع کیا تھا لیکن فارسی کی طرف طبیعت کا میلان زیادہ تھا۔ابتدائی زمانے میں آتش کی طبیعت دہلی سے متعلق شاعروں کی طرف زیادہ مائل تھی چنانچہ اُس وقت وہ جن شاعروں کے کلام سے متاثر ہو رہے تھے ان میں ایک رقت بھی تھے چنانچہ خود کہتے ہیں ۔

مصرعِ رقت کو پڑھیے کپڑے آتش پھاڑیے　　　　ہے قبا میں عقرب اور زنبور پیراہن میں ہے

اس رقت کے بارے میں شیخ مصحفی نے لکھا ہے کہ:

''مرزا قاسم علی رقت، قوم مغل ملقب بہ عراقی، وطن اجدادش مشہد مقدس۔ اکثر بزرگانش در خطۂ کشمیر ہم اقامت داشتہ اند، اما مولدش شاہجہاں آباد ست و در فیض آباد بہ سن تمیز رسیدہ۔ طبعش از چارہ ساگی بہ طرف شعر میلان تمام داشت۔ آخر گفتہ گفتہ پُر گوشدہ و دراں ایام مشق سخن از میاں قلندر بخش جرأت کردہ لیکن بہ زبانش چنیں است کہ من از جعفر علی حسرت کہ استادِ جرأت است استفادہ کردہ ام۔ خیر ہر چہ باشد، بہ یک سلسلہ است۔ عمرش سی سالہ خواہد بود۔''37

رقت اور اس جیسے شاعروں کی طرف طبیعت کے میلان کا فائدہ یہ ہوا کہ آتش کی زبان میں دقت اور بیان میں پیچیدگی نہیں آئی ہے اور کسی نہ کسی حد تک ان کے کلام میں طرزِ دہلی کی جھلک معلوم ہوتی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی لکھا ہے کہ:

''جو کلام ان کا ہے حقیقت میں محاورۂ اردو کا دستور العمل ہے اور انشا پردازیِ ہند کا اعلا نمونہ۔ شرفائے لکھنو کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں اسی طرح انھوں نے شعر کہہ دیے ہیں۔''38 ع

خیال رہے کہ یہ وہی زمانہ ہے جب کہا جاتا تھا کہ

دلّی بھی نہیں دیکھی زباندان یہ کہاں ہیں

اپنی شاعری کے بارے میں خود آتش کا کہنا ہے کہ ـ

بے شعوروں نے نہ سمجھا تو نہ سمجھا آتش　　　　نکتہ سنجوں کو لطیفہ تھی، تری بات نہ تھی

سچ تو یہ ہے آتش نہیں تجھ سا کوئی شاعر　　　　شہروں میں، ترے جھوٹ کا افسانہ ہُوا ہے

واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں آتش نے شعور کی آنکھیں کھولیں، شیخ ناسخ کی خیال بندی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ آتش کے لیے بھی اسی روش کو اختیار کرنا ضروری ہوا۔ انھوں نے بھی اپنے طور پر مضامینِ خیالی نظم کرنے شروع کر دیے۔ ان مضامین کا حقیقت سے بس دور کا تعلق ہوتا تھا۔ اسی لیے آتش نے ان کو ''جھوٹ'' کہا ہے۔ یہ قابلِ ذکر بات ہے کہ اس زمانے میں ناسخ اور ان کے

تلامذہ کی بھی شاعری کے بارے میں یہی رائے تھی۔ چنانچہ میر علی اوسط رشک نے بھی ایک موقع پر کہا تھا ع:

کچھ شاعری اس میں ہے، نہ جھوٹ اس میں، نہ اغراق

شیخ ناسخ کی غزلوں پر آتش کے غزل کہنے کا ذکر آزاد نے بھی کیا ہے۔ لکھا ہے:

''خواجہ صاحب نے جب شیخ صاحب کی غزلوں پر متواتر غزلیں لکھیں تو انھوں نے کہا۔

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب بو مسیلم نے لکھا تھا جیسے قرآں کا جواب

خواجہ صاحب (نے کہا)۔

کیوں نہ دے ہر مومن اس ملحد کے دیواں کا جواب جس نے دیواں اپنا ٹھہرایا ہے قرآں کا جواب'' 39

''سعادت خاں ناصر نے اس واقعہ کو کسی قدر فرق کے ساتھ لکھا ہے لیکن اس نے بھی ناسخ کی غزلوں کا جواب لکھے جانے میں خواجہ آتش کے ''زورِ حمایت'' کو تسلیم کیا ہے۔'' 40

نجات حسین خاں عظیم آبادی نے خواجہ حیدر علی آتش سے 23/صفر 1258ھ (1842) کو لکھنؤ میں ملاقات کی تھی۔ اس کی کیفیت انھوں نے اس طرح قلمبند کی ہے:

''حاضر شدن بہ خدمت خواجہ حیدر علی صاحب آتش و ذکر خوبیِ اخلاق کمال شہرہ آفاق شاں مع غزل ہا کہ از زبان خود ارشاد نمودند۔

تاریخ بست سوم روز سہ شنبہ چہار گھڑی روز برآمدہ، ہمراہ نواب مرزا صاحب و مرزا افضل علی صاحب بخدمت عالی افضل شعرائے ریختہ گویان اکمل فصحائے طلاقت لسان جناب خواجہ حیدر علی آتش حاضر شدہ چہرہ نورانی باریش سفید و قامت کشیدہ دارند، سنِ شریف قریب ہفتاد، طبع مصفائش از قید ہوا و حرص آزاد، باوضع سادہ و طبع درویشانہ، پارچۂ کرتہ در بُر، فرش حصیر بر در گسترده نشستہ بودند، با کمال عزت و قدر، وحید عصر اند، نخوت و کبر گرد خاطر شریفش نگشتہ۔ حرارت ایمان و دلبستگی بیشتر و افکار قصاید مدح علی ابن ابی طالب اکثر دارند و تسلی طبع باستماع اخبار شہر و دیار بسیار از کار آں اخبار بہ تکرار زیب بیاں می فرمودند، چنانچہ بہ

دریافت سبب ورود راقم محض بہ زیارت کلاے ایں دیار خیلے متوجہ شدہ، حالات شہر عظیم آباد تا دیر مستفسر ماندند۔ ہر چند در اوایل ایام جوانی خیلے پیشہ شجاعت و وضع سپاہیانہ داشتند و افسر رسالہ داراں بودند و دراں ہنگام توجہ خاطر شریفش بہ شعر و سخن چنداں نبودہ مگر از زمانے کہ ازاں حال درگذشتہ درویشانہ درآمدند بہ اندک توجہ علم نام آوری در شعر و سخن افراشتند کہ صیت فضایل شاں بہ اکناف عالم رسیدہ و ظاہرا شاگرد احدے دریں فن نبودہ اند و پیوستہ در مشاعرہ مورد تحسین و آفرین ماندند......نواب معتمد الدولہ عرف آغا میر ہر چند ایشاں را چند بار طلب کردہ مگر ایشاں نہ رفتند۔ ہر چند ایں امر بر طبعِ نواب گراں آمد، صحبتِ مشاعرہ در مکانِ نو تعمیر خویش قرار دادہ، بہ جمیع شعراے حضار حکم داد کہ احدے لب بہ توصیفِ کلام آتش نہ کشائند۔ چوں ایں صحبت قرار یافت درعین صحبت آتش را طلب داشتہ مصرع طرح عنایت نمود کہ فوراً غزل گفتہ شریک صحبت شوند۔ چوں آتش مجلس بدیں گونہ دیدند و سامانِ توہین براے خود ملاحظہ کردند، برعایت وقت مطلع غزل در صفت مکان نو تعمیر گفتہ باتمام تجلت خود را بہ مشاعرہ رسانیدند۔ چوں نوبتِ خواندن بخواجہ صاحب رسید مخاطب نواب شدہ ایں مطلع خواندند ؎

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے   زمیں یاں کی چہارم آسماں ہے

نواب بسیار محظوظ شدہ بے اختیار آفریں گفت۔ پس ازاں از حاضرین شورِ آفریں برخاست۔ ازاں روز جناب خواجہ صاحب یک قلم ترکِ انجمن آرائی کردند و عزلت اختیار نمودند، چنانچہ فردوس منزل محمد علی شاہ در عہد سلطنت خود ہر چند طلب داشتند مگر بہ عذرات چند حاضر نہ شدند۔ با آنہمہ حضرت بادشاہ بہ مقتضاے قدر دانی دو روپیہ روزینہ براے مصارف خواجہ صاحب مقرر کردید کہ ہنوز جاریست۔"41

اس بیان میں بیشتر باتیں وہ ہیں جو نجات حسین نے آتش یا ان کے کسی عقیدت مند سے سُنی تھیں اور ان میں سے بعض غیر صحیح بھی ہیں مثلاً یہ غلط ہے کہ "شاگرد احدے نہ بودہ"۔ شیخ مصحفی

کے شاگرد تھے اور ان کے بارے میں مصحفی کی رائے نقل کی جا چکی ہے۔ آغا میر کے جس مشاعرہ کا اس اقتباس میں ذکر کیا گیا ہے، ظاہراً وہ غازی الدین حیدر بادشاہ اول کے زمانے کا ہوگا۔ آتش کی بے نیازی کے سلسلے میں ان کے یہ اشعار بھی لائق توجہ ہیں ۔

ہمت مردانہ نے آتش کیا ہے بے نیاز　　　جانتا ہوں میں گدا سلطان ہفت اقلیم کو
سائل صبر و سکونت ہوں خدا سے شب و روز　　　منصب فقر ہے مطلوب مجھے سلطان سے

نجات حسین کا بیان یہ بھی ہے کہ:

''حسب استدعائے راقم چند اشعار از قصیدہ کہ در مدح حضرت امیرالمومنین
فرمودہ اند و از قصیدۂ مدحیہ حضرت امجد علی شاہ بادشاہ سرودند و چند غزلہائے آبدار
کہ طبع وقادآں جناب جلوہ ظہور یافتہ بر زبان مبارک آوردند۔''

انھوں نے آتش کی جو غزلیں نقل کی ہیں، ان کے کچھ کچھ شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں ۔

باغباں انصاف پر بلبل کے آیا چاہیے　　　پہونچی اس کو زرِ گل کی پنھایا چاہیے
فرشِ گل بلبل کی نیت سے بچھایا چاہیے　　　شمع پروانوں کی خاطر سے جلایا چاہیے

خاطر آتش سے کہیے چند جو شعر اور بھی
بے نشاں کا نام باقی چھوڑ جایا چاہیے

بیت ہیں دوابرو زیبائے یار　　　مصرع برجستہ ہے بالائے یار
محو کر دیتا ہے سرتا پائے یار　　　کیا مناسب تن کے ہیں اعضائے یار
پڑ گئی آنکھ جو اُن چاند سے رخساروں پر　　　لوٹتے کبک نظر آگئے انگاروں پر
خورشید حشر سے ہے سینے کا داغ روشن　　　اندھیر ہے جو کہیے اس کو چراغ روشن
موسم گل ہے، جنوں ہے، شور وشر پر ان دنوں　　　جن چڑھا رہتا ہے دیوانوں کے سر پر ان دنوں

زبان کے بارے میں خواجہ آتش کا کہنا تھا کہ جیسا ہم بولتے ہیں وہی صحیح ہے۔ چنانچہ انھوں نے لفظ بیگم میں حرف گاف کو بجائے مضموم کے مفتوح باندھا اور لفظ پیشگی بھی نظم کیا ہے ۔

دخترِ رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے　　　میں جہانگیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے
پیشگی دل کو جو دے لے وہ اسے تحصیلے　　　ساری سرکاروں سے ہے عشق کی سرکار جدا

آتش کے دیوان دو ہیں۔ پہلا خود ان کی اصلاح کے ساتھ ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا۔ دوسرا دیوان ان کے مرنے کے بعد مرتب کیا گیا۔ آزاد نے اس سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''میر مہدی حسن فراغ سے ان (آتش) کے نہایت گرم و پسندیدہ اشعار ایسے بھی سنے گئے جو کلیاتِ مروجہ میں نہیں ہیں۔ سبب یہ معلوم ہوا کہ ایک صاحب اس زمانہ میں نہایت خوش مذاق اور صاحب فہم تھے جو خود شاعر تھے اور ان کے ہاں بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب بھی جاتے تھے او رمشاعرہ میں غزل پڑھ کر وہیں دے آتے تھے۔ بعد انتقال کے جب شاگرد دیوان مرتب کرنے لگے تو بہت سی غزلیں انھیں میر مشاعرہ سے حاصل ہوئیں۔ خدا جانے عمداً یا ان کے بے اعتنائی سے بعض اشعار دیوان میں نہ آئے۔ چونکہ وہ شاگرد شیخ ناسخ کے تھے، بدگمانی لوگوں کو گنہگار کرتی ہے۔'' 42

علمی استعداد اور طبیعتوں کی افتاد کے فرق کی وجہ سے ناسخ اور آتش کی شاعری کے رنگ بظاہر الگ الگ لگتے ہیں لیکن غور کریں تو معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت راہیں دونوں کی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھیں۔ دونوں کے نزدیک شاعری کا تعلق دماغ سے تھا خواجہ آتش نے کہا ہے۔

آتش خدا کے واسطے موقوف فکر شعر طاقت نہیں دماغ کو نظم کلام کی

ناسخ شعر گوئی کے لیے فرہنگوں کے مطالعے کو ضروری سمجھتے تھے اور خواجہ آتش خود کو ''مرصع ساز'' اور شاعری کو مرصع سازی کہتے تھے۔

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اور۔

لعل سے لب، دُر سے دنداں کے ہے مضمون باندھتا
مَردِ شاعر تو نہیں، آتش مرصع ساز ہے

دونوں اساتذہ خیال آرائی کے دلدادہ تھے اور شاعری کو ''مضمون تلاشی'' سمجھتے تھے۔ چنانچہ آتش کا ایک مقطع یہ ہے۔

نے فکرِ شعر ہے، نہ وہ مضموں تلاشیاں آتش سے تو نہیں کہیں خواجہ لڑے ہوئے

ناسخ اور آتش دونوں شاعری کو حقیقت سے مختلف بلکہ بعید خیال کرتے تھے۔شیخ مصحفی نے انھیں مطابقتوں اور موافقتوں کو نظر میں رکھ کر یہ کہا تھا کہ ۔

''ناسخ در عرصۂ قلیل خطِ نسخ کشیدہ واز قفایش بر قدمِ او آتش ہم در رسید۔''

16۔عیشی

یہ لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کے تیسرے اہم رکن تھے۔ان کے حالات میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے تحریر کیا ہے کہ:

''میاں طالب علی عیشی تخلص، خلف الرشید میاں علی بخش از متوسّلان الماس علی خاں مرحوم کہ کشت امید عالی از اقطارِ امطارِ سحاب کرمت سرسبز وشاداب می داشت، جوان صلاحیت شعار است۔شعر فارسی وہندی را بہ متانت ورزانت تمام می گوید ودر نثر نویسی ہم بطور منشیان سابق دستے تمام دارد۔بہ فقیر از ابتداے ملاقات تا الی الآن بہ وضع اتحاد پیش آمدہ، خوشہ چینی از فیض صحبت انشا اللہ خاں ومرزا قتیل وغیرہ ہمہ کردہ، اقرار بہ شاگردی یک کس نمی کند۔ بالفعل خود استاد وقتِ خود است۔عمرش تخمیناً از سی متجاوز خواہد بود۔''43

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے عیشی کے بارے میں قدرے مختلف بات لکھی ہے:

''عیشی تخلص طالب علی خاں لکھنوی۔ بر سر مشق غزل ہاے ریختہ وفارسی است۔ فکرش شایستۂ آفرین ونظمش دلاویز ودلنشیں۔ بہ پارسی استفادہ از قتیل ودر ریختہ از مصحفی نمودہ۔از اعزہ آں دیار بودہ۔صاحب دیوان بہ ہر دو زبان است۔''44

عیشی اساتذہ فارسی میں نظیری وغیرہ سے متاثر تھے۔خود کہتے ہیں ۔

عیشی ز نظیری دلِ ما نالہ بیا موخت   امروز بما منزلتِ عشق تمام است

ابتدائی زمانے کے عیشی کے اردو کلام کا نمونہ یہ ہے ۔

دل گرفتہ ہوں، کروں گا ہو کے میں آزاد کیا   مجھ کو یکساں ہے چمن کیا، خانہ کیا، صیاد کیا
نقش حیرت ہوں، مرا مشق خموشی کام ہے   بلبلِ تصویر جانے نالہ و فریاد کیا
تنہا میں اس جہان کی منزل میں رہ گیا   اور داغ ہمرہاں سفر دل میں رہ گیا

داغِ حسرت نے تماشائے چمن دکھلایا　　　رنجِ فرقت نے ہمیں لطفِ وطن دکھلایا
ہیں زلفِ تابدار کے زندانیوں میں ہم　　　رہتے ہیں الجھے اپنی پریشانیوں میں ہم
بہکا کدھر، کدھر کو پھرا، میں کہاں کہاں　　　افسوس مجھ کو چھوڑ گیا کارواں کہاں

سعادت خاں ناصر نے ان کی وفات کے بعد ان کے حالات اس طرح لکھے ہیں:

''شیر بیشۂ سخن گوئی، طالب علی خاں متخلص بہ عیشی پسر میاں علی بخش، خانہ زاد الماس علی خاں، خوش لہجہ، خوش بیان، استادِ دوزبان، نازشِ مرزا قتیل، مایۂ بساط میر انشاء اللہ خاں۔ اکثر امرا اس کی دولتِ سخن سے نام آور اور غربا صحبت سراسر افادت سے سخنور ہوئے۔ مرزا خانی صاحب نوازش سلمہٗ فرماتے تھے کہ مرزا قتیل کے مرض الموت میں شیخ ناسخ اور ہم واسطے عیادت کے گئے تھے۔ استفسار کیا کہ مرزا صاحب کا قایم مقام کس شخص کو زمرۂ تلامیذ میں سمجھا جائے؟ فرمایا کہ: طالب علی کو۔ ارشاد مرزا صاحب کا اس کے اچھے ہونے کی دلیل ہے۔ نواب عاشور علی خاں صاحب کی زبانی میں نے یہ سنا ہے کہ جو تاریخ فارسی شیخ ناسخ نے کہی ہے، مصرعے اس کے تصنیف کیے ہوئے عیشی کے ہیں اور شیخ کا یہ قول تھا کہ بہ سبب کم توجہی کے دیوان ہندی اس کا اغلاط سے مملو تھا۔ میں نے یہ پاس یکجہتی اسے درست کر دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ افسوس کہ عین موسم میں چراغ اس کی زیست کا بادِ صرصر ہیضۂ وبائی سے بجھ گیا۔ الٰہی ساتھ ائمۂ اطہار کے محشور ہو۔ تاریخ اس کی وفات کی شیخ ناسخ نے یہ کہی ہے ؎

آہ طالب علی عیشی رفت　　　ناگہاں زیں سرائے رنج و محن
مرضش ہیضۂ وبائی بود　　　کہ ازاں رفتہ جانِ او از تن
بود اے وائے طبعِ موزونش　　　بلبلِ نغمہ سنج باغِ سخن
از بہارِ کلامِ رنگینش　　　می شدی بزمِ شعر رشکِ چمن

گفت سالِ وفاتِ او ناسخ
<u>ہائے افسوس اے سخنورِ من</u>

1240ھ

دیگر ع:

بگو ہائے ہیہات طالب علی خاں''45

1240 ھ

ناسخ کے مذکورہ بیان اور پہلے قطعہ میں ''سخنور من'' سے ان کے اور عیشی کے مابین گہرے روابط کا پتا چلتا ہے۔

اقتباسِ بالا میں عاشور علی خاں کا یہ بیان کہ ناسخ کی فارسی تاریخوں کے مصرعے عیشی کے کہے ہوئے ہیں صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔ ناسخ نے خود عیشی کی وفات کی دو تاریخیں فارسی میں کہی تھیں چنانچہ وہ اوپر نقل کی گئی ہیں۔

عیشی کی وفات کے بعد ان کے بعض شاگردوں مثلاً لالا فتح چند شائق وغیرہ نے ناسخ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے عیشی کے بارے میں بعض مفید اطلاعات قلمبند کی ہیں:

> ''طالب علی خاں عیشی ولد علی بخش خاں لکھنوی، ایک عالم فاضل شخص تھے اور کمالات علمی کے ساتھ شعر بھی خوب کہا کرتے تھے مگر شاعری پیشہ نہ تھے۔ دیوان فارسی مع قصاید و دیوان ریختہ مجموعۂ نثر، مثنوی سرو چراغاں اور اکثر اقسام سخن ان سے یادگار ہیں۔ سعادت علی خاں جیسے نکتہ شناس کے سامنے بیٹھ کر انھوں نے فرمایش ہائے شاعرانہ کا سرانجام کیا تھا اور مورد تحسین و آفرین ہوئے تھے۔ خان موصوف خواجہ صاحب (آتش) کی شاعری کو خاطر میں نہ لاتے تھے، اس پر انھوں نے بگڑ کر ان کا ذاتی دھبہ دکھایا تھا اور یہ مطلع کہا تھا۔
>
> یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں   ہمارے گنجفہ میں بازیِ غلام نہیں
>
> بعض اشخاص کی روایت ہے کہ یہ مطلع آتش کے شاگرد کا ہے۔''46

اس مقام پر یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے کہ:

> ''پوشیدہ نہیں کہ لفظ ''میاں'' کا واسطے بزرگی اہل حرفہ اور تعظیم مجہول النسب اور نومسلم کے واسطے آتا ہے۔ اگر چہ بہ سبب استعمال کے ہر شاعر کو کہہ بیٹھتے ہیں مگر

مخصوص ان کے واسطے ہے کہ ان کو سوا 'میاں' کے میر صاحب اور میرزا صاحب
اور خاں صاحب اور شیخ صاحب اور لالا صاحب کوئی نہیں کہتا۔''47

عیشی کے والد کو ناصر نے اور ان کو اور خود عیشی کو بھی شیخ مصحفی نے 'میاں' لکھا ہے۔ اس سے خواجہ آتش سے منسوب مذکورہ مطلع کے مضمون کو کسی قدر تقویت حاصل ہوتی ہے۔ بہ وقت وفات عیشی کی عمر کے بارے میں ناصر نے جو تحریر کیا ہے اس کی تائید خود عیشی کے درج ذیل شعروں سے ہوتی ہے۔

مرحلہ پیری کا بھی طے ہونے آیا عیشی اب فکرِ منزل کر کہ آگے یاں سفر کھنچتا نہیں
نہ دیکھا نازنینانِ چمن کا ساتھ عیشی جہاں سے اٹھ گیا میں چھوڑ کر آباد گلشن کو

یعنی عیشی نے جوانی کی بہاریں پوری طرح نہیں دیکھی تھیں اور پیری کا مرحلہ بھی شروع نہیں ہوا تھا۔

عیشی کے تلمذ کے بارے میں ضمناً ناصر نے یہ لکھا ہے کہ:

''نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرے میں طالب علی خاں عیشی کو
شاگرد میاں مصحفی کا قرار دیا ہے۔ ان کو میر انشاء اللہ خاں سے تلمذ تھا۔''48

عیشی کو اس قطعیت کے ساتھ سید انشا کا شاگرد کہنا صحیح نہیں ہے صحیح وہی ہے جو اُن کے حال میں مصحفی نے لکھا ہے۔ عیشی کے بارے میں سعادت خاں ناصر نے یہ اطلاع بھی فراہم کی ہے کہ:

''ہوس' مرزا محمد تقی خاں...... چند شاعر ہمیشہ اس کی سرکار میں مثل میر حسن
و طالب علی خاں عیشی و میاں مصحفی نوکر رہے۔''49

اس سے بھی عیشی کی شاعرانہ حیثیت کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ عیشی چونکہ بقول آزاد ''شاعری پیشہ'' نہیں تھے ان کے شاگرد بھی زیادہ نہیں تھے۔ ان کے شاگردوں میں مرزا سرفراز علی قادر کو شہرت ملی تھی۔ ان کے علاوہ ایک گمنام شاعر فصیح کا ذکر بھی عیشی کے شاگرد کی حیثیت سے ملتا ہے۔ خود عیشی کے کلام کا نمونہ یہ ہے ۔

گل وہ کھاؤں کہ چمن محو تماشا ہووے امتحاں کا اسے کچھ شوق تو پیدا ہووے
پاک طینت میں نہ تاثیر کرے طبع خسیس دامن گل نہ کبھی گرد سے میلا ہووے
دم کی آمد و شد لیے پھرتی ہے مجھ کو جا بجا اس ہوا نے کر دیا تخت سلیمانی مجھے

یا سامنا تھا دیدۂ تر کا سحاب سے　　یا آنکھیں ہم چُراتے ہیں چشم حباب سے
یہ تصور نے ترے، جلوہ گری دکھلائی　　کہ مرے عکس میں دیتی ہے پَری دکھلائی
میں نے عیشی سے جو پوچھا دل خوں گشتہ کا حال　　اک صراحی سے گلگوں کی بھری دکھلائی
ہیں خون دل سے دیدۂ تریوں بھرے ہوئے　　ہوں جیسے ساغر ے گلگوں بھرے ہوئے
چھپاتے ہو عبث تم خون عیشی　　میاں یہ بات گھر گھر ہوگئی ہے

اس میں شک نہیں کہ عیشی کو زبان کے محاوروں وغیرہ پر پوری قدرت حاصل تھی۔ وہ صاحب علم وفضل تھے اس لیے ان کے کلام میں الفاظ کے تلفظ اور محل استعمال وغیرہ سے متعلق غلطیاں معلوم نہیں ہوتی ہیں۔ البتہ مضمون آفرینی اور خیال آرائی کا شوق انھیں بھی تھا اور بطور مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری کے لیے انھوں نے ناسخ ہی کی روش کو اختیار کیا تھا۔

علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں دیوانِ عیشی کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جس کی کتابت محمد احسن لکھنوی نے 1901 (20-1319ھ) میں باون اوراق پر کی تھی۔ اس میں غزلوں کے علاوہ قصیدے بھی شامل ہیں۔ آخری شعر یہ ہے ۔

سخن کو ختم ہے کرتا دعا پر اب عیشی　　کہ ہے یہ طولِ سخن سے فقط دعا منظور

(4)

17۔ خلیق

نواب آصف الدولہ بہادر نے فیض آباد کی سکونت ترک کر کے جب لکھنؤ میں اقامت اختیار کی تو وہ شہر ارباب علم وہنر سے بتدریج خالی ہونے لگا۔ مختلف علوم وفنون کے ماہروں کے علاوہ جتنے نام برآوردہ شاعر تھے، وہ بھی ایک ایک کر کے وہاں سے اس نوآباد دارالامارت میں منتقل ہو گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ "میرزایان ہند وفصیحان رند" کی قبیل سے غالباً وہاں کوئی شخص نہیں رہ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اجڑے شہر میں جسے نواب شجاع الدولہ کے وقت سے بنگلہ کہا جاتا تھا، مقصود جیسا شاعر زبان دانی بلکہ استادی کا دم بھرنے اور خود کو "سلطان الشعرا" سمجھنے لگا تھا۔

جب تک بہو بیگم صاحبہ زندہ رہیں، شہر فیض آباد میں غزل گوئی کا چرچا رہا اور ان کے زمانے میں وہاں پر اس صنف سخن میں میر مستحسن خلیق سے بہتر کوئی دوسرا شاعر نہیں تھا۔ وہاں کے باصلاحیت نومشق انھیں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے اور انھیں سے کسب فیض کرتے رہتے تھے۔

لکھنؤ کی رونقیں اس زمانے میں شباب پر تھیں۔ وہ ہر فن کے ارباب کمال کا مرجع اور مرکز تھا۔ کیفیت یہ تھی کہ وہ پایۂ تخت شاہجہاں آباد سے ہمسری کا دعویٰ کرنے لگا تھا۔ وہاں کے زبانداں دہلی کے مقابلے میں اپنی زبان کو فصیح تر مستند سمجھنے لگے تھے۔ ایسے میں میر خلیق بھی فیض آباد چھوڑ کر نکلے اور لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس شہر میں ان کا ذریعۂ معاش

کیا تھا۔ آزاد نے لکھا ہے کہ:

''اُن دنوں میں غزلیں بکا کرتی تھیں، میاں مصحفی تک اپنا کلام بیچتے تھے۔ یہ بھی غزلیں کہہ کر فروخت کرتے تھے۔'' 50

لکھنؤ کے ماحول پر ناسخ اور آتش وغیرہ چھائے ہوئے تھے۔ میر خلیق کا طرز سیدھا سادہ اور روایتی تھا اور وہ الگ پہچانا جاتا تھا۔ آزاد نے اس بات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ:

''ایک دن ایک خریدار آیا اور اپنا تخلص ڈلوا کر شیخ ناسخ کے پاس پہنچا کہ اصلاح دے دیجیے۔ شیخ صاحب نے غزل پڑھ کر اس کی طرف دیکھا اور بگڑ کر کہا: اے تیرا منہ ہے جو یہ غزل کہے گا۔ ہم زبان پہچانتے ہیں۔ یہ وہی پیر بخار اوالا خلیق ہے۔'' 51

میر خلیق کے پُر گو شاعر ہونے میں شبہ نہیں۔ غزلوں کا فروخت کرنا خود اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے لیکن وہ باشعور شخص تھے۔ انھوں نے حالات پر نظر کی اور غزل کی صنف میں خود کو نمایاں کرنے کا خیال چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کی اور اس میں وہ بخوبی کامیاب بھی ہوئے۔ اس سلسلے میں آزاد نے ان کے دو شعر اس طرح درج کیے ہیں:

''میر خلیق صاحب نے پیرانہ سالی کی تکلیف اٹھا کر دنیا سے انتقال کیا۔ میں ان دنوں خرد سال تھا مگر اچھی طرح یاد ہے، جب ان کا کلام دلّی میں پہنچا وہ سال اخیر کی تصنیف تھا۔ 52

مطلع:

مجرائی طبع کند ہے، لطف بیاں گیا دنداں گیے کہ جوہر تیغ زباں گیا

ایک دو شعر ضعف پیری کی شکایت میں اور بھی تھے اور مقطع تھا:

گذری بہار عمر خلیق اب کہیں گے سب باغ جہاں سے بلبل ہندوستاں گیا

شیفتہ نے اپنے تذکرے میں ان کا یہ شعر نقل کیا ہے ۔

کس کے خرام ناز کا پامال ہوں خلیق لگتی ہے چوٹ دل کو سرے ہر قدم کے ساتھ

اور محسن نے میر خلیق کو 'صاحب دیوان' بتایا ہے۔ محسن نے ان کی ایک غزل نمونہ کے طور پر

اپنے تذکرے میں نقل کی ہے۔اس کا مطلع یہ ہے ؎

مثلِ آئینہ ہے اُس رشکِ قمر کا پہلو　　صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے میر خلیق کی ایک غزل کے یہ چار شعر درج کیے ہیں ؎

مرغانِ قفس کرتے ہیں سب نغمہ سرائی　　کیا فصل بہاری کی چمن سے خبر آئی
مدت سے بہم رہتے تھے جس گھر میں ہم اور یار　　اب دیکھ کے خالی وہ مکاں، آنکھ بھر آئی
کیا پوچھتے ہو حال اسیرانِ قفس کا　　گلشن سے جو بے خود ہو نسیم سحر آئی
ایسا تو جہاں میں کوئی ہوئے گا نہ رسوا
آفت　　آئی

زبان ان شعروں کی قدیمانہ ہے۔ چنانچہ دیکھ بجائے دیکھ کر اور ہو بمعنی ہو کر نظم ہوا ہے۔ مقطع میں آفت کا ذکر کیا ہے اور اس کی کئی صورتیں ہیں ایک وہ بھی ہے جس کے نتیجہ میں رسوائی ہاتھ آسکتی ہے مگر اس کے لیے کسی قرینہ کا ظاہر یا موجود ہونا ضروری ہے۔اس غزل کے باقی چار شعر مجمع الاشعار میں اس طرح لکھے ہیں ؎

عاشق کو ہے نرگس نے کہیں آنکھ دکھائی　　گر چاک گریبان نسیم سحر آئی
اس یار کے ملنے کی جو امید مجھے تھی　　کیا راہ گئی بھول قضا تو کدھر آئی
بیمار کی لے جلد خبر اپنے مسیحا　　کیا فائدہ جو اس سے اجل کام کر آئی
گلشن میں یہ کس شخص کا ہے ڈھیر کہ بلبل
منقار میں لے جا کے کئی پھول دھر آئی

مجمع الاشعار (تالیف 1268ھ 1852ء) میں میر خلیق کی کئی غزلیں مندرج ہیں۔ یہاں ان کے صرف دو دو شعر نمونہ کے طور پر لکھے جاتے ہیں ؎

کوچۂ جاناں ہمارا اب تو مسکن ہو گیا　　خار و خس اس رہگذر کا فرش گلشن ہو گیا
کس کی گلگشتِ چمن ہے ان دنوں میں اے خلیق　　رشک سے جس کے گلوں کا چاک دامن ہو گیا
ہے حُسن ترا مہرِ درخشاں کے برابر　　دندانِ دُر و لب لعلِ بدخشاں کے برابر
اس دست حنائی کے تصور میں خلیق اب　　جی ڈوب چلا پنجۂ مرجاں کے برابر

گلرخوں میں وفا کا پاس نہیں　　جوں گلِ کاغذی ہیں، باس نہیں
صورت برق خیر ہو کہ خلیق　　مضطرب کیوں ہے اور حواس نہیں
تیرنگہ یار نے مارا مجھے　　اب تو نہیں جینے کا یارا مجھے
کس سے کہیے حالِ دل اپنا خلیق　　تجھ سوا اب کون ہے پیارا مجھے

لالا سری رام کے خمخانہ جاوید میں بھی میر خلیق کے بعض نئے اشعار منقول ہیں۔ وہ بھی یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

غفلت میں فرق اپنی تجھ بن کبھو نہ آیا　　ہم آپ میں نہ آئے جب تک کہ تو نہ آیا
کہا میں نے جو اے گل کچھ وفا کر　　تو وو ہیں ہنس پڑا وہ کھل کھلا کر
جس گھڑی تم کو نہیں پاتے ہیں ہم　　جی ہی جی میں اپنے گھبراتے ہیں ہم
دل میں تھا آتے ہی اس کے جائیں لگ آغوش سے ہم
جب وہ آیا سامنے تب رہ گئے خاموش سے ہم

سطور بالا سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ میر خلیق کی غزلیں نایاب نہیں تھیں، البتہ ان کا دیوان تاحال دستیاب نہیں ہو سکا ہے، ان کا جو کلام مختلف مآخذ میں بکھرا ہوا ملتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معمولاً وہ طویل بحروں اور سنگلاخ زمینوں میں شعر کہتے تھے۔ عموماً ان کے اشعار کی زبان صاف اور سلیس ہوتی تھی۔ عام طور سے وہ مرکّب ترکیبوں کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ مضامین میں کوئی خاص ندرت اور بیان میں وقت یا پیچیدگی نہیں ہوتی تھی۔

میر خلیق نے اپنی غزلوں کو رواج دینے کی کوشش نہیں کی تھی اور لکھنؤ میں پہنچ کر غالباً انھوں نے اپنے شاگرد بنانے کی طرف بھی توجہ نہیں کی تھی۔ (غزل کے خریداروں کی بات اور ہے) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شہر کے شعری ماحول پر ان کا کوئی خاص اثر معلوم نہیں ہوتا ہے۔ ان کے بھائی اور بیشتر اخلاف نے بھی غزل گوئی کو شہرت کا ذریعہ نہیں بنایا۔

(5)

شعر وسخن اور زبان وبیان کے ضابطے مدوّن کرنے کی فکر پہلے بھی کئی باکمالوں نے کی تھی لیکن شیخ امام بخش ناسخ کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اپنے شاگردوں میں اس کام کی اہمیت کے احساس کو بیدار کر کے ان کے اندر تحقیق وایجاد کے شوق اور سلیقہ کو عام کر دیا چنانچہ رشک، وزیر، بحر، اور برق وغیرہ نے اپنے استاد کے نام اور کام کو غیر معمولی طور پر شہرت دلائی۔ دوسرے شاگردوں نے بھی استاد کی نکالی ہوئی راہ پر ان کی روش کے مطابق چل کر اس کی ناہمواریوں کو دور کیا۔ جو اصول اور معیار وہ بنا اور بتا گئے تھے ان پر ہمیشہ بقدر استعداد نہ صرف خود عمل کرتے رہے بلکہ شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کی ترویج واشاعت کا ذریعہ بھی بنتے رہے۔ زبان وبیان کے رموز ونکات اور مسائل ومباحث شیخ ناسخ کے بعد جس طرح ابھر کر سامنے آئے اور شعر وفن کے حُسن وقبح کے اظہار کی کوششوں میں معیاروں کے تعین کی جو سعی کی گئی اس کی مثال ان سے پہلے نہیں ملتی۔

شیخ ناسخ کے شاگردوں کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصلاح دیتے وقت وہ اپنے فہم وشعور کے تمام دریچوں کو پوری طرح کھلا رکھتے تھے۔ اصلاحوں کے سلسلے میں جو مثبت امور اور نکات سامنے آجاتے تھے ان کو خود بھی قبول کرتے جاتے تھے۔ اس رویہ سے ان کے علم میں بھی

بتدریج اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ شیخ ناسخ جب تک پوری طرح اطمینان نہیں کر لیتے تھے کہ یہ شخص باصلاحیت ہے اور واقعی کسب فیض کا متمنی ہے، اس وقت تک اسے اپنی شاگردی میں نہیں لیتے تھے۔ اصلاح دیتے وقت وہ اس بات کو ضروری سمجھتے تھے کہ شاگرد پر اس کے شعر کی خامیاں اور کوتاہیاں ظاہر کر دی جائیں کہ اس کے بغیر بہتری کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

18۔ اثر

لکھنو کو جن امرا نے رونق عطا کر کے واقعی لکھنو بنا دیا، ان میں نواب حسین علی خاں اثر کے پدر والا قدر امیر الدولہ نواب حیدر بیگ خاں کو خصوصیت حاصل ہے۔ ان کے احوال میں مذکور ہے کہ:

> ''تقدیر کی کس کو خبر، حیدر بیگ خاں کہ نہایت افلاس زدہ تھا متوقع نوکری سو پچاس روپے کا ریذیڈنٹ صاحب بہادر کی خدمت میں جایا کرتا تھا، ان کی عنایت سے خلعت نیابت حاصل ہوا اور خطاب اس کا نواب امیر الدولہ بہادر ہوا...... عہد آصفی میں عزل ونصب ریذیڈنٹ کا حسب استدعا سے امیر الدولہ ظہور میں آتا تھا۔ اتفاق کلکتہ جانے کا ہوا۔ امیر الدولہ نے بیان کیا کہ آمدنی کی صورت قلت پر ہے اور خرچ بہ کثرت۔ تینتیس لاکھ روپیہ بابت چھ آنے کے سرکار کو بھی دینا پڑتا ہے اور انگریزی سوداگروں سے مال کا محصول نہیں لیا جاتا۔ چاروناچار مال ولایتی لینا پڑتا ہے اور قیمت بھی ان کی خاطر خواہ دینی پڑتی ہے۔ الختصر چھ آنے سے دو آنے معاف ہوئے اور انگریزی سوداگروں سے محصول لینے کی اجازت ہوئی اور یہ بھی حکم ریذیڈنٹ کا نافذ ہوا کہ کوئی انگریز بدوں واسطے ریذیڈنٹ کے ملاقات کو نواب آصف الدولہ کے پاس نہ جایا کرے۔ امیر الدولہ نے اس بات کی کامیابی کے عوض میں کلکتے میں ایسی زر افشانی کی کہ آج تک مشہور ہے۔''54

نواب حسین علی خاں اثر انھیں امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کے کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ لکھنو میں ان کی فیاضیاں بھی مشہور تھیں۔ چنانچہ مظہر علی خاں ولا نے بھی کہا ہے۔

جہاں میں صاحب حلم وحیا وجود وسخا وہ ہے حسین علی خاں امیر والا جاہ
اسے وہ بخشے مع جیغہ خلعت زریں بجائے رخت میسر نہ ہو جسے پرکاہ،

ولا نے حسین علی خاں اثر کے دو بیٹوں کی ولادت کی تاریخ کہی ہے۔ پہلا جو 1211ھ (97-1796ء) میں پیدا ہوا تھا اس کی تاریخ اس مصرع سے نکلتی ہے۔

ع: ہے ساعت تولد باطالع ہمایوں

1211ھ

اگر اس وقت حسین علی خاں کی عمر بیس برس کے قریب رہی ہو تو ان کا سال پیدائش 1191ھ (=1777) کے قریب خیال کیا جا سکتا ہے۔ شیخ مصحفی نے ان کے حال میں لکھا ہے:

> ''میرزا حسین علی خاں متخلص بہ اثر خلف الصدق نواب امیر الدولہ حیدر بیگ خان بہادر مرحوم نایب وزیر الممالک ہندوستان یعنی نواب آصف الدولہ بہادر جنت آرام گاہ، جوانیست خوش تقریر و مہذب الاخلاق۔ از ابتدائے عمر بسر بہ صاحب کمالان ایں فن داشت و دو سہ بار بر مکان ایشاں مجلس مشاعرہ ہم زیور انعقاد یافتہ، لہٰذا آخر جذب کامل شوقش بریں آورد کہ خود ہم چیزی موزوں کردن شروع نمود و آنرا از نظر شیخ امام بخش ناسخ کہ در معنی بندی تازہ علم استادی برافراشتہ اند و بہ فقیر ہم از تہہ دل دوستی دارند، گزرانید و چوں در آں ایام اعتقادش بہ جناب ایمۂ معصومین بیشتر بود و در شیعہ گری غلوئے تمام داشت، کلام شعر از قسم منقبت پسندیدہ خاطر بود، لہٰذا بعد مشق شعر نعتیہ و برگفتن مرثیہ وسلام سعادت ابدی پنداشتہ خود را مصروف ایں کار ساخت۔ عمرش از چہل متجاوز خواہد بود۔''55

مذہب کی طرف حسین علی خاں اثر کے میلان کا ذکر ولا نے بھی کیا ہے۔

کروں حضور میں اوصاف میں بیاں تیرے کہ جس کے سننے سے خوش دل ہوں سامعین تمام
تو وہ حسین علی خاں ہے افضل صلحا نماز میں ترا پھر کیوں نہ مقتدی ہو امام

اسی میلان کے سبب انھیں منقبت، مرثیہ اور سلام لکھنے کا شوق ہوا۔ یہاں تک کہ شیعہ گری میں ''غلوئے تمام'' کی صورت پیدا ہوئی۔ ان کے استاد شیخ ناسخ کا بھی معاملہ یہ تھا کہ وہ اپنے

دینِ آبائی کو ترک کر کے شیعہ ہو گئے تھے اور بقول آزاد ان کا بھی یہ حال تھا کہ:

''اکثر غزلوں میں مذہبی تعریضیں کرتے تھے اور یہ شاعر یا عام مصنف کے لیے نازیبا ہے۔ہاں کوئی اپنے تائید مذہب میں کتاب لکھے تو اس میں دلائل و براہین کی قبیل سے جو چاہے کہے مضائقہ نہیں۔''56

امکان اس بات کا بھی ہے کہ ناسخ نے حسین علی خاں کے زیر اثر رہ کر اپنا مذہب تبدیل کیا ہو۔

حُسین علی خاں محض بڑے باپ کے بیٹے نہیں تھے۔وہ خود بھی معزز اور باوقار رئیس تھے۔ غازی الدین حیدر کے پہلے سال جلوس میں انھیں بھی خلعت سے سرفرازی حاصل ہوئی تھی۔ناسخ نے اس موقع پر کہا تھا:

تاریخ تخلع شدنِ حسین علی خان بہادر

چوں جناب امیر ابنِ امیر　　یافت وقت سعید خلعت سعد
بہر تاریخ بانگ ہاتف غیب　　دوش ناسخ شنید خلعت سعد

1234

حُسین علی خاں شاعر نوازی کے راستے سے شعر گوئی کی منزل تک پہنچے تھے۔شاعر نوازی کے لیے فن شعر سے غایت دلچسپی، اس کے اصول وضوابط اور رموز ونکات سے کماحقہٗ آگاہی اور متعلق علوم کا مطالعہ بحۃً ضروری شرط ہے۔بعد کے تذکرہ نویسوں نے فن عروض سے نواب اثر کی واقفیت کا عموماً اعتراف کیا ہے:

حسین علی خاں اثر کی شاعری واتعاتی یا وارداتی نہیں ہے کتابی اور اکتسابی ہے۔شیخ ناسخ سے تلمذ نے اس اکتسابی فن کو ترقی دے کر جلا دی۔ان کی اصلاحوں کے فیض سے رفتہ رفتہ اثر کا کلام فکر و مطالعہ اور مشق و تمرین کا نمونہ بن گیا۔صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ اگر کسی واردات قلبی یا واقعہ و مشاہدہ کو بھی انھوں نے نظم کرنا چاہا ہے تو قواعد ولغت وغیرہ کے دخل وتصرف کی زیادتی سے حقیقی جذبہ یا کیفیت کا اثر کھو کر رہ گیا ہے۔شیخ مصحفی نے حسین علی خاں اثر کی چار غزلیں نقل کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے ۔

نزع کے دن سے کہیں ہجر کی شب بھاری ہے — نور مہتاب میں بھی گور کی اندھیاری ہے
نہ ہوے مر کے بھی آزاد ترے قیدی زلف — خاک کو موج ہوا دام گرفتاری ہے
جب لگی آنکھ، ہوئی دولت دیدار نصیب — عالم خواب میں یاں بخت کی بیداری ہے
ہوں میں وہ کشتۂ ہجر کہ میرے غم میں — دیدۂ جوہر شمشیر سے خوں جاری ہے
کاش ہوتے نہ جدا آدم و حوا باہم — یہ وہی رسم ہے جو آج تلک جاری ہے
ایک جا جلتے ہیں دونوں جو تری محفل میں — شمع و پروانہ میں اتنی ہی تو بس یاری ہے

اے اثر گور میں ہوتا ہے علیؑ کا دیدار
زیست سے موت مجھے اس لیے ہی پیاری ہے

قاعدہ ہے کہ کسی فقرے میں آنے والے لفظوں میں برابری کے تعلق کے اظہار کے لیے حرف عطف لاتے ہیں اور قبضہ وملکیت دکھانے کے واسطے اضافتوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اثر نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے کلام میں عموماً دوسری صورت اختیار کی ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ وہ عموماً ہلکی پھلکی یا مفرد اضافتوں کو کام میں لاتے ہیں۔ مرکب اضافتوں کا تناسب ان کے کلام میں بہت کم ہے۔ اس غزل میں بھی صرف ایک مرکب اضافت آئی ہے یعنی دیدۂ جوہر شمشیر، البتہ ایک دوسری غزل میں جو تذکرۂ سرور میں منقول ہے اور جس کا ایک مطلع یہ ہے:

رات بھر مجھ کو خیال عارض جانانہ تھا — آفتاب صبح محشر یاں چراغ خانہ تھا

مرکب ترکیبیں کچھ زیادہ ہیں لیکن ایک بھی ایسی نہیں ہے جو سامعہ پر گراں گذرتی ہو۔
پہلی غزل کے مطلع میں لفظ ''اندھیاری'' نظم ہوا ہے۔ اس کے بارے میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

> ''اگر چہ دلّی میں بچے سے بوڑھے تک اندھیری رات کہتے ہیں، لکھنو والوں کے ٹوکنے کا منہ نہیں، کیونکہ جس خاک سے ایسے ایسے صاحب کمال اٹھیں وہاں کی زبان خود سند ہے۔''57

آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے دور میں حسین علی خاں کے گھرانے کا براہ راست اور بالواسطہ طور پر گورکھپور اور اعظم گڑھ کے علاقے سے تعلق رہا ہے، چنانچہ لکھا ہے:

"چکلہ اعظم گڑھ کہ از مدت دہ دوازدہ سال بہ چکلہ داری مرزا عطا بیگ خاں
برادر حیدر بیگ خاں بسیار آباد شدہ بود در یک سال مبلغ ہجدہ لک روپیہ از اں
چکلہ تحصیل کردہ میں قسم از چکلہ گورکھپور تا ہشت لک روپیہ در بعضے سال گرفت..
در 1208 فصلی اکبر علی خاں پسر نواب حیدر بیگ خاں ناظم شد۔"58

ان علاقوں میں اب بھی عام طور سے "اندھیاری" بولا جاتا ہے۔ شیخ ناسخ کے اسلاف کا تعلق لاہور سے تھا۔ ان کے ابتدائی کلام میں یہ لفظ مشکل ہی سے ملے گا البتہ بعد کے زمانے میں اس لفظ کو وہ بے تکلف نظم کرنے لگے تھے چنانچہ ان کے دو مصرعے یہ ہیں:

ع: چاندنی نام ہے شبدیز کی اندھیاری کا

اور ع: نام سنتا ہوں جو میں گور کی اندھیاری کا

اسی طرح اور بھی بعض الفاظ ہیں جو غالباً انھیں علاقوں سے لکھنو میں پہنچے تھا مثلاً تماکو بجائے تمباکو وغیرہ۔

غور کریں تو اس غزل میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جس میں متضاد معنی کے الفاظ جمع نہ کیے گئے ہوں مثلاً:

دن، شب	نور، اندھیاری	آزاد، قیدی
خاک، ہوا	خواب، بیداری	آنکھ لگی، دیدار
کشتہ، جاری	جدا، باہم	ایک، دونوں
زیست، موت	جلنا، یاری	

اس کے ساتھ ہی کچھ شعروں میں ایسے لفظ بھی لائے گئے ہیں جن کے معنی میں موافقت کی صورت پائی جاتی ہے، جیسے:

شب، اندھیاری	آنکھ، دیدار	دن، نور
قیدی، گرفتاری	نصیب، بخت	موت، گور

بعض شعروں کے لفظوں میں مناسبت یا مطابقت کی دوسری صورتیں معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ

دیدار، بیدار	جو، تو	زلف، دام

آدم،حوا　　　　شمع،پروانہ

غزل کے کسی بھی شعر میں، کسی جذبے، کیفیت، قلبی واردات یا مشاہدہ کا بیان نہیں کیا گیا ہے۔ اپنے علم، خیال اور فکر کے زور سے ایسے مضامین و مطالب پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں سے بیشتر کا اس عالم آب وگل سے کچھ علاقہ نہیں ہے، چنانچہ نزع کے دن میں اس غزل کے مطلع کا کہنا شاعر کے لیے ممکن نہیں تھا۔ یہ بھی یقینی بات ہے کہ یہ مطلع کہنے سے پہلے اس نے خود اپنی گور کی اندھیاری کا مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ یہی معاملہ دیدۂ جوہر شمشیر سے خون کے جاری ہونے کا ہے کہ یہ منظر بھی کشتۂ ہجر نے ہرگز نہیں دیکھا تھا۔ کشتہ ہو جانے کے بعد اس کیفیت کا بیان کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ کم وبیش یہی معاملہ دوسرے شعروں کا بھی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس قسم کے مضامین تک شاعر کی فکر کی رہبری قافیے نے کی ہے جس کی مناسبت اور رعایت سے وہ بعض لفظوں کو پہلے سے منتخب کر لیتا ہے۔ پھر انھیں لفظوں میں ربط پیدا کر کے مضمون جیسی صورت بنا کر مقررہ اوزان میں ڈھال دیتا ہے۔ شعر کسی مضمون یا تاثر کو نظم کرنے کے لیے نہیں کہا جاتا ہے بلکہ قافیہ کی ہدایت پر بعض لفظوں کو عروضی سانچوں میں اس طرح ڈھالا جاتا ہے کہ وہ مضمون معلوم ہونے لگے۔ یہی قافیہ پیائی ہے اور اسی طور پر مضامین کی تخلیق کو معنی آفرینی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس معنی آفرینی کے عمل میں عام طور سے استعارہ اور مجاز مرسل زیادہ مفید اور معاون ثابت ہوتے ہیں۔ شعر گوئی کا یہ عمل پوری طرح سے شعوری اور فکری ہے چنانچہ اس طور پر جو مضامین نظم کیے جاتے ہیں وہ معمولاً مدلل بھی ہوتے ہیں۔ ایسے شعروں میں لفظوں کی شان وشوکت بھی زیادہ ہوتی ہے اور بیان کا زور اور لطف بھی نمایاں ہوتا ہے، اسی لیے ان غزلوں کو ''غزلہائے مدلل'' اور کبھی ''غزلہائے قصیدہ طور'' بھی کہا جاتا ہے۔ حسین علی خاں اثر اور ان کے استاد شیخ امام بخش ناسخ کی کوششوں سے یہی طرز اس زمانے میں مقبول ومروج ہوا تھا۔

عقیدے اور مذہب کے بڑھتے ہوئے اثر بلکہ غلبہ نے عموماً ایسے خیالات اور تلمیحات وغیرہ کو قبول عام کی سند عطا کی جن کا تعلق براہِ راست یا بالواسطہ ایسے بزرگوں سے تھا جو بہر حال گوشت پوست کے بنے ہوئے اور اسی خاکدان کے رہنے بسنے والے تھے، جن کی شکل وشباہت ہی نہیں، اعمال واطوار بھی معلوم ومتعین تھے۔ اس کے مختلف النوع فوائد ظاہر ہوئے۔ ایک یہ بھی

کہ ماورائیت کی جگہ بتدریج شاعری کا رجحان ارضیت کی طرف بڑھنے لگا لیکن اس ارضیت میں بھی غیبی امداد اور مافوق الفطرت قوتوں کی کارفرمائی موجود رہی ہے۔ مذکورہ غزل میں یہ سب باتیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

اس نہج پر یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ حسین علی خاں اثر ہوں یا ان کے استاد شیخ ناسخ یا ان کے ہم عصر دوسرے شعراء، ان سب کے لیے ''ائمہ دوازدہ'' سے زیادہ محبوب کوئی دوسری ذات نہیں تھی۔ وہ سب اپنے کلام میں ان کے معرکوں اور واقعوں سے ہی عموماً مطالب اور مضامین اخذ واستخراج کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایمہ سبھی مرد تھے اور عمدہ ترین مردانہ صفات سے متصف تھے۔ ان کے ہاتھ میں تیر و کمان یا تیغ و سپر، جسم پر زرہ اور جوشن اور زیرِ راں توسن در ہوار ہوتا تھا۔ اب اگر کوئی کج فہم امرد پرستی کا مارا ان کی شاعری پر معترض ہوتا ہے تو یہ اس کی بدبختی ہے۔ کوئی بھی ذی شعور ان محبوبانِ نیک ذات کے ذکر میں ان امور واشیا کو شامل کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا جو صنفِ نازک کے ساتھ مخصوص ہیں۔ سمجھنا چاہیے کہ لکھنو میں محبوب کا تصور بدل رہا ہے۔

دہلی میں محبوب خدائے مطلق کی ذات تھی۔ اس کے ذکر میں زیورات، ملبوسات اور دوسرے اسباب زندگی کا بیان شامل نہیں ہوسکتا تھا۔ عقیدہ ہے کہ خدا ہر لحظہ خود کو نئی شان سے ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ ایک شعر میں جو صورت بیان کی گئی تھی دوسرے میں اس سے مختلف کیفیت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یہی سبب رہا ہے کہ غزل کا ہر شعر دوسرے سے الگ ہوتا تھا۔ لکھنو میں اکابرِ مذہب (=ائمہ) کو محبوب کی حیثیت حاصل تھی جن کے اعمال واوصاف میں کوئی اختلاف نہیں، جن کے ملبوسات اور سامان زندگی بھی معلوم ومعروف تھے، جن کی شکل وشباہت بھی متعین تھی۔ ان سے متعلق جو غزلیں کہی گئیں، مطلع سے مقطع تک ان میں ایک مخصوص فضا اور کیفیت پائی جاتی تھی چنانچہ لکھنو کی غزل اپنی کیفیت کے اعتبار سے بھی دہلی کی غزل سے مختلف ہوتی تھی۔

عام ہے کہ کوئی شخص جب کسی نئے مسلک کو اختیار کرتا ہے تو کبھی شوق اور جوش میں اور کبھی ضرورت اور مصلحت سے شعوری طور پر اس کے اظہار واعلان کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں بسا اوقات غلو کی صورت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کے برخلاف جو شخص اپنے آباواجداد کے عقیدے پر قائم ہوتا ہے اسے اظہار واعلان کا خیال بھی نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی وہ اپنے عقیدے کے

برخلاف بھی لب کشائی کر جاتا ہے۔ لکھنو میں مذہب کا زوروشور اور جوش وخروش اسی نوعیت کا تھا۔ ابتدائی زمانہ میں منقبت، سلام اور مرثیے کا رواج بہت تھا۔ اس کے برخلاف آخری سلاطین کے زمانے میں ان کی مذہب پسندی کے باوجود کئی بہت اہم شاعروں کے دیوان ان اصناف سے بالکل خالی رہے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ناسخ کی غزلوں میں "مذہبی تعریضوں" کو نازیبا کہا ہے لیکن اس صورت حال کو رد کا نہیں جا سکتا تھا، البتہ بعد کے زمانے میں جب وہ مذہب عام ہو گیا تو بتدریج وہ "نازیبا" بات خود بخود کم ہوتی چلی گئی۔

حسین علی خاں اثر اور ان کے استاد ناسخ کی شاعری زمانے اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق تھی، اس لیے بہت تیزی سے مقبول ہوتی چلی گئی بلکہ اسی کے سانچے میں اس وقت کی شاعری ڈھلتی چلی گئی۔ وہ شعر گوئی پر محنت کرتے تھے۔ ایک ایک لفظ پر غور وفکر کرتے تھے۔ متانت بلکہ تمکنت اثر کے مزاج پر چھائی ہوئی تھی۔ ان کے کلام میں کوئی کلمہ غیر سنجیدہ یا کوئی بات غیر ثقہ اور معیار سے گری ہوئی جگہ نہیں پا سکتی تھی اور یہی امور ان کی "بلند نامی" کا سبب بنتے رہے۔ بقول احمد حسین سحر حال یہ تھا کہ:

"از بلند نامی کہ داشت محتاج بہ شرح نیست۔"59

سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

"امیر با کرم، رئیس با حشم، سخنور شعرا پرور، نواب حسین علی خاں تخلص اثر، پسر امیر الدولہ حیدر بیگ خاں، شاگرد شیخ ناسخ، کلام اس کا راسخ، کون سا ہفتہ تھا کہ شاعروں کی صحبت ان کے دولت خانے میں نہ ہوتی تھی۔ دولت اس عالی ظرف کی اس میں صَرف ہوئی...... افسوس کہ بیک چشم زدن میں گردش چرخ کہن نے اس مغتنم روزگار کو عدم کر دیا اور شوق شاعری کو کم......"60

ان کے مشاعرے اس زمانے میں شعر وسخن کی ٹکسال کا حکم رکھتے تھے جو کلام یہاں سرسبز ہو اُسی کو سکہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ مصحفی جیسا کہنہ مشق اور کہن سال استاد بھی ان مشاعروں میں دادخواہ ہوتا تھا۔

صاحب دولت وامارت ہونے کا فائدہ یہ تھا کہ حسین علی خاں اثر شاعروں کی سرپرستی

کر سکتے تھے اور کرتے تھے۔ ان کے پاس خود پسندی بلکہ خود ستائی کے لیے تمام مواقع موجود تھے۔ فکر و خیال کے زور سے جو مرقعے تیار کرتے تھے مشاعروں میں ان کے لیے خراج تحسین وصول کرتے تھے۔ ایسے میں اگر کبھی داد نہ ملتی تو طبیعت کا ملول ہونا واقعی تھا۔ اس نہج پر یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ درد اور میر اپنی شاعری کا مقصود اصلی دلی جذبات اور قلبی واردات کے کامیاب اظہار کو خیال کرتے تھے اور اسی مقصد کے حصول کی فکر میں کھوئے رہتے تھے۔ کسی کی تحسین دستائش کی ان کے فن کے سلسلے میں کچھ زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ اس کے برخلاف جب صنائی اور جدت کو شاعری کا جوہر اصلی تسلیم کر لیا گیا تو فنکاری کے مظاہر کی تحسین کے لیے قدر شناسوں کی جستجو بھی لازم ہوگئی اور جب قدر شناسوں کی تحسین نے اہمیت حاصل کر لی تو یہ بات بھی لازم ہوئی کہ فن پاروں کو بہتر سے بہتر انداز سے پیش کیا جائے۔ شیخ ذوق نے خوب کہا ہے۔

جوہر خوب کو درکار ہے آرایش خوب　　　　خوب تو آپ کی خوبی سے ہے ٹھہرا گوہر

اس صورت حال نے نہ صرف مشاعروں کو غیر معمولی حد تک رواج دیا بلکہ جوہر خوب کو بنانے سنوارنے کے لیے استاد کی ضرورت اور اہمیت کے احساس کو بھی عام کر دیا۔ اتنا ہی نہیں، آرائش وزیبائش نے نمود و اظہار کے لیے نئی نئی راہیں نکالنی شروع کر دیں۔ صفیر بلگرامی نے حسین علی خاں اثر کے حال میں لکھا ہے:

''اپنے دیوان کو خوشخط لکھوا کر مطلا اور مذہب کیا تھا اور شعرا کی دعوت کر کے اپنا دیوان تکیے پر رکھ کر سنایا کرتے تھے۔'' 61

بعد کے زمانے میں اپنے کلام کو اس طور پر پیش کرنے کی مثالیں خصوصاً لکھنو اور آس پاس کے علاقوں میں اور بھی مل سکتی ہیں۔ راقم کے پاس ایک شاعر کا دیوان لال، پیلے، نیلے، ہرے وغیرہ مختلف رنگوں کے نہایت عمدہ، دبیز کاغذ پر بہت خوبصورت چھپا ہوا موجود ہے۔ سعادت خاں ناصر نے حسین علی خاں اثر کے مزاج کی خود پسندی کا بیان اس طرح کیا ہے:

''اپنی ستائش سے مسرور، غیر کی تعریف سے نفور، آغا حسن شرر، اس نقل کو کس مزے سے بیان کرتے ہیں۔ حکایت 62

سید محمد خاں رند کے دولت خانے میں مشاعرہ مقرر تھا۔ مرزا محمد رضا برق کے پڑھنے پر تعریف بہت سی ہوئی۔ صاحب مشاعرہ نے کہا کہ: مرزا صاحب آپ سے کسی کو نسبت نہیں۔ حسین علی خاں صاحب کے اثر ملال اسی سخن سے ظاہر اور نہایت کشیدہ خاطر ہوئے۔ آغا حسن کو طلب فرما کر اس کلمے کی شکایت، نہایت سے نہایت کی۔ انھوں نے کہا: آپ ناحق مکدر ہوتے ہیں۔ یہ تو ان کی ہجو ملیح تھی۔ خاں صاحب نے کہا، کاش یہ ہجو ملیح ہماری کی ہوتی۔''

حسین علی خاں کچھ بچے نہ تھے کہ تعریف اور ہجو ملیح کے فرق کو بھی نہ سمجھتے۔ بات یہ ہے کہ ایک فقرہ جو عام سننے والے کے لیے محض سرسری ہے، کسی مخصوص پس منظر میں متعلق شخص کے واسطے نہایت بامعنی اور بلیغ ہو جاتا ہے۔ حقیقت حال سے واقف اور اشارے کو سمجھنے والے کے لیے کوئی جملہ کس حد تک دل آزاری کا باعث ہو سکتا ہے۔ ناواقف کے لیے اس کا اندازہ کر لینا ممکن نہیں ہے۔ شرر اور رند دونوں خواجہ آتش کے شاگرد تھے اور اثر شیخ ناسخ کے شاگرد ہی نہیں مربی بھی تھے۔ مذکورہ حکایت کے ناقل شرر ہیں اور وہ جملہ رند کا ہے۔ رند بھی صاحب حیثیت رئیس تھے اور شاعروں کے ساتھ وہ بھی سلوک کرتے تھے۔ اس لیے حسین علی خاں کے لیے ان کی بات زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ برق حسین علی خاں کے استاد بھائی لیکن عمر کے لحاظ سے چھوٹے تھے۔ وہ حسین علی خاں کے برخلاف ایک عالم کے بیٹے تھے۔ محض اس حکایت کی بنیاد پر یہ رائے قائم کرنا کہ وہ ''غیر کی تعریف سے نفور'' تھے صحیح نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ساری عمر وہ ناسخ کے ساتھ روابط کو نباہ نہیں سکتے تھے۔ میاں امداد علی بحر کی نازک مزاجی بھی مشہور ہے۔ باوجود یکہ وہ حسین علی خاں کی رفاقت میں رہے تھے، ان کے دیوان میں ان سے متعلق ایک بھی شعر موجود نہیں ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسین علی خاں اپنے متوسلین سے بھی تحسین و ستائش پر اصرار نہیں کرتے تھے البتہ اپنی ستائش سے مسرور ہونا کوئی بہت مذموم بات نہیں تھی۔

حسین علی خاں رئیس ابن رئیس تھے۔ اپنی شاعری میں بھی وہ معمولاً استاد کی اصلاحوں پر تکیہ کرتے رہے تھے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ فکر و بیان کے اعتبار سے باوجود یکہ ان کا ایک طرز خاص تھا۔ عمر کے آخری حصہ میں بھی زبان اور بیان کے نقطۂ نظر سے ان کے کسی کسی شعر میں سہو و سقم کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی ایک غزل کے کچھ شعر یہ ہیں ؎

سیر گلشن میں جو اس سے چار آنکھیں ہو گئیں — نرگس گلزار کی بیمار آنکھیں ہو گئیں

بے ترے جب مایل گلزار آنکھیں ہو گئیں — کچھ نہ سوجھا باغ کی دیوار آنکھیں ہو گئیں

دیکھتے ہیں رفعت بام فلک عینک سے ہم — شاید اب آئے نظر وہ، چار آنکھیں ہو گئیں

نشہ کا ڈورا ہے یا وہ باڑھ کا ڈورا صنم — بہر قتل عاشقاں تلوار آنکھیں ہو گئیں

جھونکتی ہیں شعلہ رخسار میں پروانہ ساں — اس قدر اعضا میں کیوں مختار آنکھیں ہو گئیں

ہیں ذُر دندان و لعل لب یہاں پیش نظر
بہر عاشق جوہری بازار آنکھیں ہو گئیں

اس غزل کی ردیف کی خوبی یہ ہے کہ اسے اس کا عنوان قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہر شعر بجائے خود منفرد اور مکمل ہونے کے باوجود اسی عنوان سے متعلق ہے اور اس طرح پوری غزل میں مطلع سے مقطع تک ایک خاص فضا پائی جاتی ہے۔

'' آنکھیں چار ہونا '' محاورہ کا مطلع کے پہلے مصرع میں صرف نہایت برمحل اور بے ساختہ ہے۔ دوسرے مصرع میں کلمہ ''گلزار'' کے جزوِ ثانی یعنی زار بمعنی نالاں کی رعایت دادطلب ہے۔ ایک مصرع میں گلشن اور دوسرے میں گلزار نظم کرنا فرہنگ ولغات کے مطالعے کا فیض ہے۔

باغ درختوں کا کنج ہے۔ اس کے پیچھے کی چیز بہ مشکل ہی نظر آ سکتی ہے۔ دیوار ہو جانا متحیر ہونے یا نابینا ہو جانے کے معنی میں آتا ہے۔ مائل (= میل کرنے والا) میں میل بمعنی سلائی کی طرف بھی اشارہ موجود ہے اور اس کا تعلق نابینا بنا دینے کے عمل سے ہے۔ غرض '' کچھ نہ سوجھا '' کے لیے کئی رعایتیں اور دلیلیں شعر میں موجود ہیں۔ '' بے ترے '' بھی اسی قبیل سے ہے۔

دو شعروں میں نہ سوجھنے کی بات کہہ چکنے کے بعد تیسرے شعر میں ''عینک'' سے فائدہ اٹھایا ہے۔ غالباً پیرانہ سالی میں حسین علی خاں عینک لگانے لگے تھے۔ اس عمر کے باوجود مزاج میں شگفتگی برقرار تھی۔ بلندی کی طرف نظر کرنی تھی اس لیے عینک کے ساتھ پہلے مصرع میں رفعت بام فلک کی مرکب ترکیب لائے ہیں۔

لفظ ''ڈورا'' دھاگے یا رشتہ کے علاوہ اور بھی کئی معنوں میں مستعمل ہے۔ چوتھے شعر میں اس کی دو صورتوں کو یکجا کر کے نیا مضمون پیدا کیا ہے۔ اس میں بھی مرکب ترکیب ''بہر عاشقاں'' نظم کی ہے۔

لفظ ''باڑھ'' بھی چند معنوں میں آتا ہے۔ شعر میں اس طرف بھی اشارہ موجود ہے۔

پانچویں شعر کا مضمون تو نیا ہے لیکن بڑی قباحت یہ ہے کہ پروانہ خود جلنے کے لیے جاتا ہے۔ کوئی دوسرا اُسے آگ میں نہیں جھونکتا ہے۔ جھونکنے کا عمل دہکتی ہوئی آگ، چولھے یا بھاڑ یا جہنم میں ہوتا ہے۔ محض ایک شعلے پر خواہ وہ کتنا ہی تیز کیوں نہ ہو جلنے کے لیے کسی چیز کو ڈالا تو جاسکتا ہے لیکن اس عمل کو جھونکنا نہیں کہا جائے گا۔ اس شعر میں لفظ ''مختار'' کا صرف بھی محل نظر ہے۔ یہ بھی ظاہر نہیں ہے کہ آنکھیں کس کو جھونکتی ہیں؟

آخری شعر میں ''پیش نظر'' کی ترکیب برمحل ہے۔ دُر دندان ولعلِ لب سے جوہری بازار بنالینا حسین علی خاں اثر کا کام ہے اور خوب ہے۔

ڈپٹی عبدالغفور خاں نساخ نے اپنے تذکرے میں حسین علی خاں اثر کے بارے میں لکھا ہے:

''شعر خوب کہتے ہیں۔ صاحب دیوان ومثنوی گذرے۔ کلکتہ بھی آئے تھے۔''63

آخری فقرے سے یہ خیال نہ ہو کہ نساخ کی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کے انتقال کے وقت نساخ کی عمر دس برس سے بھی کم تھی۔ حسین علی خاں صاحبانِ انگریز سے ذاتی مراسم کی بنا پر کسی ضرورت سے کلکتہ گئے ہوں گے۔ نساخ نے ان کی ایک غزل کے چند شعر اس طرح نقل کیے ہیں۔

نہیں چلتا صنم پر زور اپنی سینہ زوری کا
نہ ٹوٹا وصل کی شب ایک تار انگیا کی ڈوری کا

کسی کی گوری گوری چھاتیوں پر مرگیا ہوں میں
پیالہ ہو مرے پھولوں میں انگیا کی کٹوری کا

دلاسوتے میں قندِلب کا خاطر خواہ بوسہ لے
مثل مشہور ہے دنیا میں گڑ میٹھا ہے چوری کا

تعجب کا محل کیا ہے جو اُڑسکتی نہیں چڑیا
یہ طائر رشتہ برپا ہے تری انگیا کی کٹوری کا

کہا جاچکا کہ شاعر نے حُسن مطلق کی توصیف کو موضوع کلام نہیں بنایا ہے۔ اس کا محبوب پیکرِ حسن و جمال ہے۔ اس نے پیکر حسن کے اعضا، ان اعضا سے متعلق معاملات اور اسبابِ حسن

اور آرائش جمال وغیرہ کے بیان کو اپنی شاعری کے موضوع کی حیثیت سے اختیار کیا ہے۔

اس غزل کا ہر شعر صاف صاف دلالت کر رہا ہے کہ محبوب کوئی عورت ہے لیکن غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ اس محبوب کی ستائش شاعر کو مطلوب نہیں ہے۔ اس کے کسی عضو، لباس یا معاملہ کا بیان ہو، بنیادی طور پر اس سے مقصود خود اپنی شخصیت، امارت یا عمل کی تعریف و توصیف ہے۔ اس مقصد کے حصول میں سب سے زیادہ معاون مبالغے کی صنعت ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی غزلوں میں ادنا ادنا مطالب کو بڑھا چڑھا کر مدلل اور پُر شکوہ انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور اسی کو خوش فکری اور قادر الکلامی سے تعبیر کرتے تھے۔

محبوب کا جفا کار اور ظالم وسفاک ہونا مسلّم ہے اور ظلم وسفا کی کے لیے قوی بازو اور زبردست ہونا بھی شرط ہے۔ اس کے مقابلے میں عاشق مظلوم وناتواں مانا گیا ہے اور اس کے لیے کمزور ونحیف ہونا لازم ہے۔ اس قسم کے تصوّرات نے تضاد کی ایک دلچسپ، غیر معمولی اور بعض وقت فطری صورت بھی پیدا کر دی ہے۔ محبوب کے عورت ہونے کے باوجود، عاشق اس کے سامنے ناتواں اور بے بس ومجبور ہے۔ شب وصال میں بھی وہ بے حس وحرکت پڑا رہتا ہے۔ محبوب اپنے زور اور معاملات میں عملاً مردانہ شان دکھاتا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ شمشیر بدست اور خنجر بکف بھی ہوتا ہے۔ چوٹی، کنگھی، انگیا وغیرہ کے ساتھ یہ جنگجویانہ اور سپاہیانہ انداز ناممکن نہ سہی، معمولاً کمیاب اور عجیب ضرور ہے۔ عاشق کا حال برعکس ہے۔ ضعف کے سبب عالم بیداری میں اس کے قوا بالکل کام نہیں کرتے۔ انگیا کی ڈوری کا ایک تار بھی اس کے لیے توڑنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ عالم خواب میں اس کی قسمت اور قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ یہ صورت حال منطقی استدلال پر مبنی اور محض خیالی ہے۔ خیالی تو دہلی کی شاعری بھی تھی۔ عاشق وہاں بھی خاک وغبار کی حیثیت رکھتا ہے اور خاک ہو کر بھی محبوب سے دور بیٹھتا ہے لیکن اس دوری کا سبب حسن کا ''ادب واحترام تھا۔ لکھنو میں بات آداب واحترام کی نہیں ہے۔

مرزا محمد رضا خاں برق کے دیوان میں حسین علی خاں اثر کی وفات کا قطعہ تاریخ درج ہے۔ اس کا آخری شعر یہ ہے ؎

رقم نمود رضا سال فوت آں مغفور   بگو نماند اثر ہائے درمیان کلام

1258

1258ھ(= 1842) میں جب کہ ان کی عمر ستر،اڑسٹھ کے قریب تھی حسین علی خاں نے وفات پائی تھی۔

حسین علی خاں اثر اپنے وقت کے استادوں میں شمار ہوتے تھے۔محسن نے ان کے ایک شاگرد میر ہدایت علی اسیر کا ذکر کیا ہے جو پہلے مصحفی سے اصلاح لیتے تھے، پھر اثر کے شاگرد ہو گئے۔فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور اسیری تخلص کرتے تھے۔ 64

19۔فصیح

شیخ امام بخش ناسخ کے ابتدائی زمانے کے شاگردوں میں فصیح کو اہمیت حاصل ہے۔ان کے حالات شیخ مصحفی نے کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں،اور خاصی مفید اطلاعات قلم بند کی ہیں:

"میرزا جعفر علی فصیح تخلص،مولدش در فیض آباد در سنہ یک ہزار و یک صد و نود وشصت ہجری واقع شدہ۔درسن ہفدہ سالگی مع والدین واقربا بہ شاہجہاں آباد کہ وطن بزرگانش بود رفتہ،بعد چند سال بہ لکھنو باز آمدہ۔قوم قریش،از اولاد عقیل ابن ابی طالب علیہ السلام است۔چوں بزرگانش در بلاد ایران متوطن بودند،لہذا میرزا مشہور گردید و مادرش سیدہ بود و ہر چہ گفتہ از نظر شیخ امام بخش ناسخ گزرانیدہ بلکہ سر حلقۂ تلامذہ اوست و در مرثیہ گوئی نامے حاصل ساختہ۔از علم عروض وقافیہ دستگاہے دارد و حدیث و کتب دینیہ از جناب مستطاب میر دلدار علی ولد مولانا سید محمد دام ظلہ،استفادہ نمودہ یک بار برائے زیارت ایمۂ معصومین رفتہ بود و حالا باہمیں قصد بہ طرف کلکتہ رفتہ است۔" 65

یعنی مرزا جعفر علی کے اسلاف جو اصلاً قریشی تھے عرب سے ایران میں جا کر مقیم ہوئے۔ وہاں سے ہندوستان کی طرف آئے۔یہاں دارالسلطنت شاہجہاں آباد کو اپنا مسکن بنایا۔جعفر علی کے والد غالباً تلاشِ معاش میں فیض آباد میں پہنچے۔وہیں 1196ھ(1782) میں جعفر علی پیدا ہوئے۔سال پیدائش کی تحریر میں تذکرہ مصحفی کے کاتب سے سہو ہوا ہے۔بہر نوع وہ زمانہ

نواب آصف الدولہ کا تھا۔ جب نواب نے لکھنؤ کو مستقر بنایا تو کچھ مدت بعد یہ گھرانا بھی وہاں منتقل ہوگیا۔ 1212ھ (98-1797) میں نواب نے رحلت کی تو یہ خاندان پھر پریشانیوں سے دوچار ہوا اور مجبوراً دہلی کی طرف واپس چلا گیا لیکن سکون وہاں بھی نہ ملا۔ چند سال بعد بادشاہ شاہ عالم ثانی نے وفات پائی تو یہ لوگ وطن کو خیر باد کہہ کر پھر لکھنؤ پہنچے۔ وہاں نواب سعادت علی خاں حاکم تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں جعفر علی کے گھرانے کو اطمینان حاصل ہوا۔ ان کے والد نے جعفر علی کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کی۔

یہ غالباً ایران کی آب و ہوا کا فیض تھا کہ مرزا جعفر علی کا شروع سے مذہب کی طرف میلان رہا تھا۔ پھر والدین کی تربیت اور مولانا دلدار علی کی تعلیم نے طبیعت کو جلا دی۔ قسمت نے نواب معتمد الدولہ تک پہنچایا۔ چنانچہ چند بار حج و زیارت کے لیے گئے۔ معتمد الدولہ کی نوازشات کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا ہے ؎

ہند میں معتمد الدولہ ہے فیاضِ جہاں مجھ پہ کرتا ہے وہ غربت میں ہمیشہ احساں

مرزا جعفر علی نے دہلی اور لکھنؤ دونوں مراکز کا لطف اٹھایا تھا۔ جرأت اور میر کا بھی آخری زمانہ دیکھا تھا۔ علم عروض و قافیہ کی تحصیل کے بعد شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ طبیعت کی مناسبت سے فصیح تخلص کیا اور شیخ امام بخش ناسخ کی شاگردی اختیار کر کے بہت جلد ''سر حلقہ تلامذہ ناسخ'' کا درجہ حاصل کر لیا۔ مصحفی کے مطبوعہ تذکرے میں ان کا ایک شعر بھی مندرج نہیں ہے البتہ حاشیہ پر یہ عبارت تحریر ہے:

''نسخۂ رامپور میں ردیف ''ف'' کی ضمن میں دو شاعر فصیح اور فصاحت کا ذکر زیادہ ہے جو اس نسخہ میں نہیں۔'' 66

فصاحت کا حال اور نمونہ کلام تو مطبوعہ تذکرے میں شامل ہے لیکن دوسرے فصیح کا نام اور احوال وغیرہ نقل نہیں ہوا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ جعفر علی فصیح کے اشعار بھی سہواً لکھے جانے سے رہ گئے ہیں۔ بہر نوع یہ امر یقینی ہے کہ یہ غزلیں کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ ناسخ سے تلمذ اور ان کا قرب بھی اسی حقیقت کی غمازی کرتا ہے۔ مصطفا خاں شیفتہ نے بھی ان کا ذکر اسی طور پر کیا ہے اور ان کی غزل کے دو شعر نمونہ کے طور پر پیش کیے ہیں:

"فصیح تخلص، مرزا جعفر علی، از شعرائے لکھنو است۔ استفاضۂ سخن از خدمت ناسخ

نمودہ از دست۔" 67

یہ تو قسمت میں کہاں تھا کہ کروں کسب کمال — بے کمالی میں بھی افسوس کہ کامل نہ ہوا

مجھ میں اک عیب بڑا ہے کہ وفادار ہوں میں — تم میں دو وصف ہیں، بدخو بھی ہو، مغرور بھی ہو

پہلا شعر جس غزل کا ہے اس کا مطلع سعادت خاں ناصر نے اس تمہید کے ساتھ اپنے تذکرے میں لکھا ہے:

"مرثیہ گوئے حضرت حضرات، اس میں مصروف شغلِ اوّل (= غزل گوئی)

موقوف...... شاگرد شیخ امام بخش ناسخ۔ یہ دو اشعار عاشقانہ مشق اول سے یادگار۔

مصحف رو کی تلاوت کے میں قابل نہ ہوا — بات میرا کبھی گردن میں حمایل نہ ہوا" 68

ناصر نے دو نہیں، بلکہ یہ تینوں شعر لکھے ہیں۔ مطلع میں مصحف، حمائل، تلاوت وغیرہ الفاظ سے شاعر کے مذہب کی طرف میلان کا بخوبی اظہار ہو رہا ہے۔ خیال کریں تو یہ مطلع 'حمایل' کے قافیہ کی دین ہے کہ اسی نے فکر کو مصحف اور گردن دونوں کی طرف منتقل کیا ہے، اور حمائل کی بندش میں صنعتِ ایہام کا لطف بھی موجود ہے۔ شعر میں ہر لفظ اسی کی مناسبت سے لایا گیا ہے۔ ایک لطف کی بات یہ بھی ہے کہ دوسرے مصرع میں لفظ 'تیری' کے محذوف ہو جانے نے صاحب مصحف کی ذات مطلق سے مناسبت کی صورت بھی پیدا کر دی ہے۔

باقی دونوں شعر بھی صنعت گری اور رعایت لفظی کا نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔ دونوں میں اضافت اور عطف وغیرہ سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ مطلع میں بھی صرف ایک ترکیب 'مصحف رو' کی آئی ہے۔ یہ بات اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب شاعر کو زبان و بیان پر واقعی قدرت حاصل ہو۔ ان شعروں میں زبان کی سلاست اور روانی، بیان کی بے ساختگی اور برجستگی ایسی ہے کہ انھیں ضرب المثل کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ پہلے شعر میں لفظ 'کمال' کے مشتقات کو اس لطف کے ساتھ یکجا کیا ہے کہ اس میں 'قسمت' کے لغوی معنی (یعنی تقسیم) کا مفہوم بھی ظاہر ہے اور یہاں بھی ایہام کی صنعت کی کیفیت محسوس کی جا سکتی ہے۔ آخری شعر کی خوبیاں بھی سننے والے کو داد دینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

فصیح کو دہلی سے تعلق رہا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ لکھنو کے مخصوص ماحول میں رہ کر بھی وہ معمولاً حُسن اور حُسین کو موضوع بناتے رہے۔ اسبابِ حُسن مثلاً ملبوسات، زیورات وغیرہ کا تذکرہ کم سے کم کرتے تھے۔

محسن نے بھی فصیح کو اگرچہ مرثیہ گو کہا ہے۔ اپنے تذکرے میں ان کی ایک غزل نقل کی ہے جس کا مطلع یہ ہے ۔

دیکھے گا پھنس کے زلف میں جب پیچ و تاب دل پچھتائے گا بہت ہی یہ خانہ خراب دل

یہ غزل اپنی نوعیت میں ویسی ہی ہے جیسی کانپور کے مخصوص ماحول میں کہی جارہی تھیں۔ اپنے مطالب کے اعتبار سے یہ دلّی اور لکھنو کی درمیانی آخری یا ان دونوں مراکز کی کچھ کچھ خوبیوں کا سے مرکب ہے۔

محسن نے جعفر علی فصیح کے تعارف میں کئی مفید اطلاعات قلم بند کی ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

''مرثیہ گو مرزا جعفر علی مرحوم فصیح ولد مرزا ہادی لکھنوی، مقیم بیت اللہ شریف شاگرد شیخ امام بخش ناسخ ''69

اس سے ظاہر ہے کہ تذکرہ سراپا سخن کی تالیف 1269ھ (1853) سے پہلے فصیح کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں خواجہ عبدالرووف عشرت کا یہ بیان قابل توجہ ہے:

''مدت تک کربلائے معلا میں قیام کیا۔ آخر عمر میں لکھنو واپس آئے۔ گھاس کی بنیا میں دفن ہوئے۔''70

مرزا فصیح دلی عقیدت کے ساتھ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے گئے تھے۔ وہاں وہ زیادہ وقت مذہبی معاملات میں صَرف کرتے ہوں گے۔ کبھی اپنی قلبی واردات کو غزل کے شعروں میں بھی بیان کرتے ہونگے۔

فصیح جب لکھنو آتے ہوں گے تو استاد ناسخ اور ان کے تلامذہ وغیرہ کی صحبت میں کبھی محض شوق سے اور کبھی بہ ضرورت مشاعروں کے لیے بھی غزلیں کہہ لیتے ہوں گے۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ سعادت خاں ناصر نے ان کو صاحب دیوان کہا ہے۔ اس سے اُن کی پُر گوئی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ

مرثیوں وغیرہ کی طرف زیادہ توجہ کی تھی چنانچہ انھیں زیادہ شہرت اسی طور پر حاصل ہوئی تھی لکھنؤ کے شاعروں میں شرکت کے مواقع انھیں کم سے کم ملے تھے، اس لیے ان کی غزلوں کو کما حقہ، رواج نہیں ہو سکا تھا۔ وقت کے ساتھ ان کا دیوان نایاب ہو گیا اور غزلیں بھی کمیاب ہو گئی ہیں۔ ناصر نے ان سے متعلق جو واقعات نقل کیے ہیں ان سے یہ حقیقت بخوبی سامنے آتی ہے کہ ان کی فارسی، اردو کے غزل گو اساتذہ کے کلام پر اچھی نظر تھی۔

20۔طرب ودلگیر

میاں دلگیر اصلاً ہندو تھے اور شروع زمانے میں انھوں نے طرب تخلص اختیار کیا تھا۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

> ''جھنو لال طرب تخلص ولد منشی رسوارام، قوم کایتھ سکسینہ، وطنِ بزرگانش شمس آباد و بعضے از بزرگانش چندے در شاہجہاں آباد ہم استقامت داشتہ۔ خودش در لکھنؤ تولد شدہ وہم ایں جا نشوونما یافتہ و بہ سنِ تمیز رسیدہ، چوں از عالم کتب نشینی در صغر سن موزوں طبع داشت از مدت دہ سالگی چیزے موزوں می کرد، آں را از نظر نوازش حسین عرف مرزا خانی می گزراند، حالا چوں کلامش از فیضِ صحبتِ بزرگاں بہ پایۂ پختگی رسیدہ، از استادِ خود پائے کم نمی آرد۔ عمرش تخمیناً بست و سہ سالہ خواہد بود۔''71

تذکروں میں ان کا نام مختلف انداز سے لکھا ہوا ہے یعنی: جھنو، چھنو، جھبو وغیرہ۔ یہ سب بظاہر ایک ہی لفظ یعنی جھنو کی مختلف صورتیں ہیں۔ محسن کے تذکرے میں البتہ 'جھنگو' چھپا ہوا ہے۔ چونکہ اس کی تائید کسی ماٴخذ سے نہیں ہوتی، اسے نادرست سمجھنا چاہیے۔

نام کے دوسرے جزو لال کو بعض جگہوں پر لعل لکھا گیا ہے۔ چونکہ دیوناگری خط میں بڑی 'آ' (आ) کا بدل فارسی تحریر میں الف ہے، اس مقام پر 'ع' لکھنا بیجا ہے کہ یہ آواز ہندی میں غیر موجود ہے۔

جھنو لال کے والد کا نام رسوارام چھپ گیا ہے۔ اپنے مفہوم کے اعتبار سے یہ ترکیب ناپسندیدہ ہے اس لیے گمان غالب ہے کہ یہ نام نہ ہوگا۔ صحیح نام غالباً سیوارام ہوگا۔ دو نقطوں کو غلطی سے 'ر' خیال کرلیا گیا ہوگا۔

چھنو لال کایستھ گھرانے کے فرد تھے اور کایستھوں کے معمول کے مطابق ان کے بزرگ امرائے وقت کے یہاں ملازمت پر بسر کرتے تھے۔ ان کے خاندان کی شاخیں شاہجہاں آباد (دہلی) سے نکل کر مختلف مقامات مثلاً شمس آباد اور اس سے مضافات اور پھر فیض آباد اور لکھنو وغیرہ میں پھیل گئی تھیں۔ چھنو لال کے بزرگ آصف الدولہ کے عہد میں شمس آباد سے لکھنؤ پہنچے تھے۔ یہیں چھنو لال پیدا ہوئے تھے۔ مصحفی نے ان کی عمر کا جو تخمینہ بتایا ہے، اس کی روشنی میں ان کا سال ولادت 1198ھ (1784) کے قریب معلوم ہوتا ہے۔

مصحفی کا کہنا ہے کہ اپنے بزرگوں کے فیضِ صحبت نے چھنو لال نے اپنی شاعری کے معیار کو نوازش کی شاعری کے درجہ تک پہنچا لیا تھا۔ چھنو لال کے ان بزرگوں کا نام اور احوال کسی ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکا ہے البتہ اتنی بات یقینی ہے کہ چھنو لال نے ابتدائی تعلیم 'مکتب' میں پائی تھی وہ تعلیم اتنی موثر تھی کہ سترہ برس کی عمر میں ہی وہ شعر کہنے لگے تھے اور طرب تخلص اختیار کر کے نوازش جیسے استاد کے شاگرد ہو گئے تھے۔ ''فیضِ صحبتِ بزرگاں'' کو اگر خاندان کا ماحول سمجھا جائے تو وہ بھی اردو اور فارسی کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔

سعادت خاں ناصر چھنو لال سے براہ راست واقفیت رکھتے تھے اور انھوں نے اپنے تذکرے کے لیے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔ خود ان کے احوال میں ناصر نے لکھا تھا:

> ''غلام حسین، شاعر خوش تقریر، مرثیہ گوئے حضرت شبیر میاں دلگیر سابق میں ہنود (نام چھنو لال) قوم کایستھ سکینہ، برادری مہاراجا جھاؤلال اور افتخار الدولہ مہاراجا میوہ رام سے تھا۔ چہاردہ سالگی میں بہ سبب موزونی طبع کے شاگرد مرزا خانی نوازش کا ہوا اور طرب تخلص کیا۔''72

ظاہراً یہ حالات ناصر نے خود میاں دلگیر کے بیان کے مطابق لکھے ہیں اس لیے ان میں مبالغہ بھی معلوم ہوتا ہے مصحفی کے بیان کے برخلاف یہاں چودہ برس کی عمر میں شعر گوئی کی ابتدا بتائی گئی ہے مصحفی کا قول ترجیح کے لائق ہے۔

چھنو لال کے بزرگوں میں مہاراجا جھاؤلال کا نام لیا گیا ہے ان کے بارے میں مرزا ابو طالب اصفہانی نے بیان کیا ہے کہ:

''جھاؤلال کو کہ جو فیض آباد کے گمنام زادوں میں سے تھے (آصف الدولہ
نے) محلوں کے انتظام کے لیے مقرر کیا۔ اسے ایک عمدہ رسالہ دیا اور دربار کی
بعض خدمات سپرد کر کے محمد بشیر خاں کا قائم مقام کیا۔''73

معلوم ہوتا ہے کہ جھاؤلال بھی شمس آباد کے اطراف سے فیض آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے تھے۔ ان کے اخلاف میں سے بعض اورئی ضلع جالون میں مقیم تھے اور بانگر مئو کے رہنے والے تھے۔ ایک فارسی رسالہ ''در پخت و پز از ناشناس'' کے ترقیمہ کی یہ عبارت لائق توجہ ہے:

''گیا پرشاد بن گنگا پرشاد ساکن بانگر مئو دارالسلطنت 3/ جمادی الثانیہ
1239ھ (= 1824) بہ مقام اورئی از روئے کتاب تحو جھاؤلعل نقل کردہ
است۔''74

چھنولال طرب کے دوسرے عزیز مہاراجا میوہ لال غالباً نواب معتمد الدولہ آغا میر کے مقربین میں تھے نصیر الدین حیدر کے پہلے جشن جلوس کے ذکر میں حکیم نجم الغنی خاں نے معتمد الدولہ کے خطاب کے ساتھ ہی لکھا ہے کہ:

''میوہ رام پسر نول کرشن بن دیا کرشن کو مہاراجا افتخار الدولہ خطاب دیا۔''

میوہ رام 1246ھ (=1830) میں معزول ہوئے تھے۔75

الناس علیٰ دین ملوکھم مشہور ہے۔ ویسے بھی وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ میں شیعہ گری کا زور تھا۔ اس کا مذکور حسین علی خاں اثر کے احوال میں آچکا ہے۔ نواب معتمد الدولہ بھی مذہب پسندی کے لیے مشہور تھے۔ ان کے اثر سے کئی غزل گو مرثیہ کہنے لگے تھے۔ علاوہ بھی شیعہ گری میں کچھ پیچھے نہیں تھے۔ تذکروں اور تاریخوں میں صرف معتبر اور نام برآوردہ شخصیتوں کا مذکور ہوتا ہے۔ چھنولال کے اعزہ میں میوہ رام اپنا قدیمی مذہب چھوڑ کر شیعہ ہو گئے تھے اور بڑے جوش و خروش سے اپنے دولت کدے پر مجلسوں کا اہتمام کرتے تھے۔ میر ضمیر اور مرزا دبیر وغیرہ ان کے یہاں اپنے مرثیے پڑھتے تھے۔ ان کی وفات پر منیر شکوہ آبادی نے جو قطعہ کہا تھا، اس میں کئی قابل توجہ اطلاعات نظم کی تھیں اس لیے وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''قطعہ تاریخ رحلت افتخار الدولہ ہدایت علی خان بہادر عرف مہراج میوارام اصلہ اللہ والسلام''

افتخارالدولہ میوارام مہراج زمن — والہٗ نام علی وتابع شرع نبیؐ
مسند آرائے امارت مہر برج احتشام — ابر جودو قلزم فیاضی ودریا دلی
آبروئے زہد وتقوا گوہر بحر ورع — صایم ہر روز وشب زندہ دار دایمی
گنجہائے شایگاں صرف عزا داری نمود — کس ندیدم ہمچو او درلکھنؤ داورجی
شہرہ شداوصاف وے درہندوایران وعرب — ذکر خیرش بر زبانہا ہم خفی وہم جلی
درثبات وصبر وتسلیم ورضا واحتیاط — ازمیان اہل ایماں بُردہ گوئے فرخی
اکتساب دولت حج وزیارتہا نمود — شد مقیم کربلا درخدمت سبط نبیؐ
حالیا رخت سفر بربست درکرب وبلا — ساکن گلزار جنت گشت چوں سروسہی

سال مرگ اندر صفاتش نظم کردم اے منیر
دیں پناہ وصالح وزوّار امیر ومتقی

1284ھ

یہ معلوم نہ ہوسکا کہ میوارام نے کس سنہ میں اسلام قبول کر لینے کا اظہار کیا تھا۔ بہ گمان غالب یہ واقعہ غازی الدین حیدر کی مسند نشینی کے فوراً بعد (شاید 1230ھ/1815) کا ہوگا۔ ان کے ساتھ ممکن ہے کہ ان کے بعض اوراعزہ بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے ہوں۔ سعادت خاں ناصر نے چھنولال کے حال میں لکھا ہے کہ:

"سال یک ہزارودوصد دی ہجری میں شرف اسلام سے مشرف اور شیعہ امیرالمومنین سے ہم طرف ہوا۔"

قیاس کہتا ہے کہ قبول اسلام کا یہ سال ناصر کو خود چھنولال معروف بہ میاں دلگیر نے بتایا ہوگا۔ شیخ مصحفی نے چھنولال کے مسلمان ہونے سے پہلے تک کے کلام کا جو انتخاب اپنے تذکرے میں درج کیا ہے وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے ۔

کس کو دکھاؤں میں یہ بھلا ماجرائے چشم — ناسور پڑگئے ہیں عزیزو بجائے چشم
ان دونوں پر ہے عشق میں اک حادثہ پڑا — روتی ہے چشم بہردل ودل برائے چشم

مجھ کو کسی سے خلق میں چشم وفا نہیں　　رویا نہ میرے حال پہ کوئی سوائے چشم
باتیں تری سُنا کریں اور دیکھیں تیری شکل　　وہ مدعائے گوش ہے، یہ مدعائے چشم

آوے طرب جو تیرا وہ خوش چشم باغ میں
نرگس کے دستے کیجیو تو بھی فدائے چشم

کام اپنا خیال رخ جاناں سے نکالا　　کارشب عشرت شب ہجراں سے نکالا
یہ ساری پریشانیاں کیں ہم نے گوارا　　لیکن نہ دل اس زلف پریشاں سے نکالا
ہم سہ نہ سکے طعنۂ ابنائے زمانہ　　غیرت نے ہمیں محفلِ یاراں سے نکالا
یہ طالب ایذا ہیں کہ جو پائیں لگا خار　　ہم نے جو نکالا اسے پیکاں سے نکالا

دل کو شطِ الفت میں طرب آپ ڈبایا
دانستہ اسے ہم نے نہ طوفاں سے نکالا

سدا شبنم کو اپنی چشم تر پر رشک آتا ہے　　گل تر کو گل زخم جگر پر رشک آتا ہے
ہماری آہ نے ایسا اثر پیدا کیا ہے اب　　دعائے خلق کو جس کے اثر پر رشک آتا ہے
قدم بوسی جاناں ہر گھڑی اس کو میسر ہے　　مرے ہونٹوں کو اس کے سنگ در پر رشک آتا ہے
یہ رخسار صنم پر کیا ہی گستاخانہ پھرتی ہے　　ہمیں تو ہر گھڑی اپنی نظر پر رشک آتا ہے

نہ جس کو دین کی خواہش ہے، نے کچھ کام دنیا سے
طرب ہم کو بس ایسے بشر پر رشک آتا ہے

یہ کس کی جستجو میں اس قدر بیتاب پھرتا ہے　　جو یوں آٹھوں پہر خورشید عالمتاب پھرتا ہے

زبس میں گرد پھرنے کی ہوس میں اس کے روتا ہوں
تو اشک آنکھوں سے گر کر صورت گرداب پھرتا ہے

یہ میاں دلگیر کی نوعمری کا کلام ہے۔ معمولاً ترکیبوں کا استعمال زیادہ نہیں ہوا ہے۔ بیشتر مفرد ترکیبیں آئی ہیں۔ عربی فارسی کے ادق اور نامانوس الفاظ کا صرف کم سے کم کیا گیا ہے۔ بیان میں بھی کوئی پیچیدگی معلوم نہیں ہوتی ہے۔ مضامین بھی عموماً سامنے کے ہیں۔

شاعر نے قدرتِ کلام اور مشاقی کے اظہار کے لیے اکثر مشکل ردیف اور قافیوں کا انتخاب

کیا ہے۔ کبھی کبھی تو ردیف تین بلکہ چار لفظوں پر مشتمل ہوتی ہے اور بعض بعض شعر ردیف اور قافیہ ہی کی دین معلوم ہوتے ہیں۔ اس نوعمری میں شاعر کو صنائع بدائع سے اپنے کلام کو آراستہ کرنے کا شوق زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ پہلی غزل کے مطلع میں 'بھلا اور 'بجائے' دونوں کلموں میں ذو معنیین کا لطف ظاہر ہے۔ دوسری غزل کے پہلے شعر میں پریشانی اور پریشاں کو مختلف مفہوم میں صرف کر کے زباندانی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ یہی صورت اکثر شعروں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

چھنو لال طرب لکھنو میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے جرأت اور میر وغیرہ کی آنکھیں بھی دیکھی تھیں۔ انشا اور مصحفی کے معرکے بھی ان کی نظروں کے سامنے گذرے تھے۔ ان سب کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ابتدائی کلام میں اہلِ دہلی کی فکر کا کچھ اثر معلوم ہوتا ہے۔ چھنو لال طرب کے شعروں میں حُسن ہی نہیں، حَسین کا بھی ذکر موجود ہے۔ چنانچہ اعضا مثلاً چشم و گوش، زلف و رخ، دست و پا، دل و جگر وغیرہ سے متعلق ان کی غزلوں میں اشعار موجود ہیں لیکن اسبابِ حُسن یعنی زیورات اور ملبوسات وغیرہ کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

چھنو لال کے اکثر شعر ان کے حسب حال معلوم ہوتے ہیں۔ بیشتر شعروں میں اپنے ماحول اور معاشرے سے بیزاری کا اظہار ملتا ہے۔ یہاں تک کہ طعنۂ ابنائے زمانہ کے ناقابل برداشت ہوجانے کی وجہ سے ''محفلِ یاراں'' کو چھوڑ کر اس سے نکل جانے کا بھی ایک شعر میں ذکر موجود ہے۔ ایک مطلع میں خورشید عالم تاب کی گردش کے پردے میں انھوں نے خود اپنی بیتابی اور جستجو کا بڑی خوبی سے ذکر کیا ہے۔

چھنو لال لکھنو کے جس ماحول میں بسر کر رہے تھے اس کا اثر اس طرح ظاہر ہوا کہ انھوں نے مرثیہ گوئی شروع کردی اور اس صنفِ شاعری کے تقاضے کے مطابق انھوں نے اپنا تخلص دلگیر بھی مقرر کرلیا۔ اس مرثیہ گوئی نے ان کے دل کی بیتابی کا حل پیش کردیا یعنی ائمہ کی عقیدت دل میں گھر کر گئی اور اسی عقیدت کے نتیجہ میں انھوں نے قبول اسلام کا بالآخر اظہار بھی کردیا۔ اس واقعہ کو شہرت حاصل ہوئی چنانچہ دہلوی تذکرہ نویس نواب مصطفا خاں شیفتہ نے بھی اپنے تذکرے میں لکھا:

> ''طرب تخلص چھنولعل کایستھ از اہل لکھنو شاگرد نوازش حسین خاں نوازش است۔ بیشتر بہ فکر مراثی مایل و دراں نظر بہ مناسبت دلگیر تخلص دارد و مرثیہ ہائیش

در افواہ مشہور و برالسنہ مذکور وفرط اعتقادش بہ ایمہ علیہ السلام باعث بر تغیر کیش

شدہ کہ دین آبائی را گذاشتہ بہ شرف اسلام مشرف گشتہ۔''76

خانگی معاملات ومسائل کے سبب نومسلم لوگ عموماً ایک مدت تک اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ پھر حالات اور معاملات پر قابو حاصل کر لینے کے بعد اپنے اسلام کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہی چھنو لال نے بھی کیا ہوگا۔ سعادت خاں ناصر نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ:

'' آخر شوق مرثیہ گوئی اسے پیدا ہوا اور وسیلۂ نجات کے شیدا ہوا۔ تاثرِ غم امام حسین علیہ السلام سے طرب سے کنارہ کر کے دلگیر اپنا تخلص قرار دیا۔ سال یک ہزار دوصدوی ہجری میں شرفِ اسلام سے مشرف اور شیعۂ امیرالمومنین سے ہم طرف ہوا۔ جب مرزا خانی صاحب نے سکونت کانپور کی اختیار کی حسب الارشاد اپنے استاد کے وہ شیخ ناسخ سے مستفید رہا۔''

اس اقتباس میں یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ انھوں نے طرب تخلص کو مستقلاً ترک کر دیا تھا۔ بظاہر صحیح یہ ہے کہ وہ مرثیہ میں دلگیر تخلص کرتے تھے اور غزل میں پرانے تخلص طرب کو بھی لاتے رہے۔ محسن نے اس بارے میں لکھا ہے کہ:

''شاعر معروف میاں دلگیر مرثیہ گو، چھنولال نام، پہلے طرب تخلص تھا۔ کاسہ

سکینہ، مشرف بہ اسلام ہوے۔ دیوان اپنا موتی جھیل میں ڈبو دیا اور مرثیہ گوی

اختیار کی۔ پہلے شاگرد مرزا خانی نوازش کے، بعدۂ ناسخ کے۔''77

دیوان کو ڈبو دینے والی بات محسن سے پہلے کسی نے نہیں لکھی تھی۔ اس عمل کا اگر مرثیہ گوئی شروع کرنے سے پہلے کوئی تعلق ہوتا تو شیفتہ اور ناصر وغیرہ بھی اس کا ذکر کر سکتے تھے۔ بعد کے زمانے میں اگر یہ واقعہ پیش آیا تھا تو اس کا سبب کچھ اور ہوا ہوگا۔ پھر دیوان کے ایک مسودہ کو ڈبو دینے سے اس کا ناپید ہو جانا لازم نہیں آتا ہے۔ اس کی اور نقلیں بھی موجود ہو سکتی تھیں۔ پنڈت کیفی نے لکھا ہے کہ:

''طرب لالا چھنولال۔ ان کا دیوان نایاب ہے۔ مولف تذکرہ (لالا سری رام)

کے کتب خانے میں ایک قلمی نسخہ ملا جس میں سے مندرجہ ذیل اشعار ہدیۂ

ناظرین ہیں۔''78

طرب کے دیوان کے وجود کا پتا تو خود محسن کے مذکورہ بیان سے بھی ملتا ہے۔ کیفی نے جس قلمی نسخہ کا ذکر کیا ہے بہ گمان غالب وہی بنارس ہندو یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ کیٹلاگ کے مرتب نے اس کو: "دیوانِ طرب ودلگیر چھنولال"

کہا ہے۔ کیفی نے جو لکھا ہے اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ دیوان نہیں تھا، محض انتخاب کلام تھا۔ بہ ظاہر اس میں ایسا کلام ضرور تھا جس میں دلگیر تخلص آیا ہے جو کلام کیفی نے نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر غزلوں میں طرب تخلص نظم کیا گیا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ کیفی نے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ تذکرۂ مصحفی میں مندرج کلام کے علاوہ ہیں۔ اس امکان سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا کہ دیوان میں بالکل ابتدائی مشق کا کلام شامل نہ ہو سکا ہو۔

کیفی کے انتخاب میں سے طرب ودلگیر کے چند شعر نمونہ کے طور پر ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

عالم دیوانگی میں اپنا سر ہے اور سنگ ہے ہجومِ کودکاں، اک شور وشر ہے اور سنگ
جب دیکھی اس نے تیری کلائی کی نازکی مانی کو ساری بھول گئیں دستکاریاں
ہردم تڑپ رہا ہے، بسمل نہیں تو کیا ہے تیغ نگہ کا کشتہ یہ دل نہیں تو کیا ہے
اس کی طلب ہے جس کا ملنا نہیں ہے ممکن ہم کو اگر خیالِ باطل نہیں تو کیا ہے
اس کی غفلت اور بھی ہشیار کرتی ہے مجھے واں فراموشی ہے جتنی اتنی ہی یاں یاد ہے
بوقتِ نزع زباں بند جب ہوئی اپنی تب اس نے پوچھا کہ کہہ کیا ہے آرزو دل کی

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے تذکرے میں بھی ذیل کے دو شعر ایسے ملتے ہیں جو مصحفی کے تذکرے میں نقل نہیں ہوئے ہیں۔ شاید یہ بھی بعد میں کہے ہوں گے۔

معطّر ابر کے نہانے سے بسکہ آب ہوا حباب بحر ہر اک شیشۂ گلاب ہوا
گیے جاں سے گذر ہم جو نہ وعدہ پر وہ بت آیا بہانہ اس کا گویا موت کا اپنی بہانہ تھا

چھنو لال مشکل اور طویل ردیفوں میں بھی غزلیں کہہ لینے پر قدرت رکھتے تھے لیکن کلام میں پختگی آ گئی تو قدرت کے اظہار کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی اور معمولاً وہ شگفتہ زمینوں اور آسان ردیفوں اور قافیوں میں شعر کہنے لگے تھے بلکہ ان کے یہاں غیر مردّف غزل بھی مل جاتی ہیں۔

چھنو لال طرب کے کلام میں بعض لفظ قدیمی وضع کے نظم ہوئے ہیں مثلاً نازکی اور کچھ لفظوں

کا استعمال پورب والوں کے روزمرّہ کے مطابق بھی ہوا ہے جیسے ہردم۔ ایک دو لفظ ایسے بھی ہیں جو ناسخ کے تلامذہ کی اصلاح کے مطابق ہیں چنانچہ نہانا (نہ کہ نھانا بہ ہائے مخلوط)

یہ بات کہ چھنولال طرب بعد تک غزلیں کہتے رہے تھے کئی طرح سے ظاہر ہے جس زمانے میں مرزا نوازش کانپور چلے گئے تھے انھوں نے شیخ ناسخ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا۔ سعادت خاں ناصر نے اپنے تذکرے میں بعض ایسے واقعات نقل کیے ہیں جن سے غزل سے طرب کی دلچسپیوں کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔

اس مقام پر اس افسوس ناک واقعہ کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک فتنہ پرداز نے محض بر بنائے تعصب میاں دلگیر کے اسلام قبول کرنے کے واقعہ کا انکار کر کے چار سوال پیش کیے ہیں۔

الف۔ وہ کس کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے؟

ب۔ مسلمان ہونے کے بعد ان کا نام کیا رکھا گیا تھا؟

ج۔ ان کے جنازے کی نماز کس نے پڑھائی تھی؟

د۔ ان کی قبر کہاں ہے؟

اس سلسلے میں الٹ کر اس سے بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ:

الف۔ کیا ثبوت ہے کہ اس شخص (چھنولال) نے مرنے سے پہلے کلمۂ اسلام نہیں پڑھ لیا تھا؟ مسلمان ہونے کے لیے متعلق شخص کا دل سے کلمہ پڑھ لینا کافی ہوتا ہے۔ کسی کے ہاتھ پر بیعت اسلام کے لیے شرط لازم نہیں ہے۔

ب۔ چھنولال اگر ہندو ہی مرا تو اس کی ارتھی کو کس گھاٹ پر آگ دکھائی گئی تھی؟ اور

ج۔ کس پنڈت نے اس سلسلے کی آخری رسوم ادا کی تھیں؟ وغیرہ

حقائق کو نظر انداز کر کے اس قسم کے سوال خود سائل کی بدنیتی اور خبثِ باطن کے مظہر ہوتے ہیں۔

میاں دلگیر کے مشرف بہ اسلام ہونے کا ذکر بہ تواتر سبھی تذکروں میں ہوا ہے۔ باطن نے بھی، جن کو شیفتہ کی بات بات پر گرفت کرنے کی گویا عادت ہی تھی، لکھا ہے کہ:

> ''یہ صاحب (دلگیر) کا یستھ لکھنوی تھے۔ چونکہ اعتقاد طرف مشرب اہل اسلام از بس رکھتے تھے، خدائے مطلق نے تاریکی کفر کو ان کے ضمیر دلگیر سے دور کیا۔''79

ہندو تذکرہ نویسوں نے بھی اس بات کو مانا ہے چنانچہ لالا سری رام نے بھی لکھا ہے:

''دلگیر منشی چھنولال، اوایل شباب میں بڑے رندانہ منش اور رنگین مزاج تھے، چنانچہ اس لا ابالی عالم میں مذہب آبائی کو ترک کر کے مسلمان ہوئے اور غزلگوی کے بجائے مرثیہ کہنا شروع کیا۔''80

سری رام سے پہلے کسی بھی تذکرہ نویس نے چھنولال کے لاابالی پن کا ذکر نہیں کیا تھا، خود ان کا کلام بھی لاابالی پن کا مظہر نہیں ہے۔ یہ بات اغلب ہے کہ سری رام نے تبدیلی مذہب کے لیے جواز پیدا کرنے کے لیے کہی تھی۔

تذکرہ خوش معرکہ زیبا کے مرتب نے حاشیہ پر یہ اطلاع درج کی ہے کہ:

''نسخہ پٹنہ کے حاشیے پر یہ عبارت اضافہ کی گئی ہے: سابق میں جب میاں دلگیر ہندو تھے ان کا نام چھنولال تھا۔ جب سے مسلمان ہوے اپنا نام غلام حسین مقرر کیا۔''

یہ تحریر بتا رہی ہے کہ وہ خود اپنی مرضی سے مسلمان ہوے تھے۔ اپنا اسلامی نام بھی انھوں نے اپنی پسند سے مقرر کیا تھا۔ سعادت خاں ناصر نے دلگیر سے براہِ راست بعض باتیں معلوم کر کے قلم بند کی تھیں اس لیے اس کی تحریر پر شبہ کی کوی وجہ نہیں ہے۔ حاشیہ نگار بھی کوی بہت باخبر شخص ہے چنانچہ بعض حواشی میں اس نے اپنے باخبر ہونے کا بہت واضح ثبوت دیا ہے۔ دلگیر سے متعلق حاشیے کو بھی تا وقتِ کہ کوئی قطعی ثبوت اس کے خلاف نہ مل جاے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

''علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں میاں دلگیر کا ایک مرثیہ (قلمی) موجود ہے۔ جس پر ان کا نام غلام حسین دلگیر لکھا ہوا ہے اس کا پہلا مصرع یہ ہے ع:

یوں روایت ہے سکینہ کو امیر شام نے 81

شعرا عام طور سے اپنے تخلص سے معروف ہوتے ہیں۔ چھنولال بھی غلام حسین ہو جانے کے باوجود ''میاں دلگیر'' ہی کہلاتے رہے۔ لفظ ''میاں'' آج بھی مسلمانوں ہی کے لیے آتا ہے۔ دلگیر کے زمانے میں اس کلمہ کے لکھنو میں محلِ استعمال کا بیان ناصر نے اس طرح کیا ہے:

''پوشیدہ نہیں کہ لفظ میاں کا واسطے بزرگی اہل حرفہ اور تعظیم مجہول النسب اور نومسلم کے واسطے آتا ہے اگر چہ بہ سبب استعمال کے ہر شاعر کو کہہ بیٹھتے ہیں مگر

مخصوص ان کے واسطے ہے کہ ان کو سوا میاں کے میر صاحب اور میرزا صاحب
اور خان صاحب اور شیخ صاحب اور لالا صاحب کوئی نہیں کہتا۔"82

دہلی میں بعض لوگ اس کلمہ کو ہر مخاطب کے لیے بول جاتے تھے۔ چنانچہ آفتاب رائے رسوا کے حال میں جو خود نو مسلم تھا میر حسن نے لکھا ہے کہ:

"زبانش بہ لفظ میاں بسیار آشنا بود، باہر کہ سخن می گفت میاں می گفت۔"83

یہ کلمہ کبھی چھوٹے مثلاً شاگرد اور بیٹے کے لیے اور کبھی تحقیر کے واسطے کلمۂ خطابیہ کے طور پر لاتے ہیں لیکن نام کے جزو کی حیثیت سے کسی غیر مسلم خصوصاً ہندو کے لیے کوئی نہیں بولتا چنانچہ باوجودیکہ وہ اہل حرفہ اور مجہول النسب ہوں ان کو کوئی میاں گیان چند یا میاں کالیداس نہیں کہتا۔ اگر کہے گا تو بھی یہ نام کا جز و نہ ہوگا۔ تحقیر یا تصغیر کے لیے ضرور ایسا کہا جا سکتا ہے۔

قبروں کے نشان محفوظ رکھنے کا چلن عام نہیں ہے بلکہ اکثر مسلمان اس کے خلاف ہیں۔ خواجہ عبدالروف عشرت نے "شعراء کے مزار" کی بہت تلاش کی لیکن کتنے ہی لوگوں کے بارے میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ خود لکھتے ہیں:

"آتش کی قبر کا نشان نہیں رہا۔ مظلوم کی قبر کا نشان نہیں معلوم۔ محشر نہ معلوم کہاں انتقال ہوا...... عیسا خان تنہا کی قبر کا نشان نہیں ملتا۔ سرفراز حسین قمر کا نشان نہیں معلوم ہوا وغیرہ وغیرہ۔"84

میاں دلگیر تو پھر نو مسلم تھے اور "بے استطاعت" رہ کر مرے تھے۔ ان کی قبر کا نشان کون محفوظ کرتا۔ پھر بھی عشرت نے لکھا ہے کہ:

"سنا جاتا ہے کہ لکھنؤ کی کسی کربلا میں ان کی قبر موجود ہے۔"85

میاں دلگیر کے بہ کثرت اشعار ان کے مسلمان ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ چند یہ ہیں:

قدرت حق سے یہ کچھ دور نہیں ہے واللہ	دفن دلگیر ہو قبر شہدا کے نزدیک
دلگیر کو بلایئے روضے پہ اب شہا	سب عمر گذری جاتی ہے گھر میں پڑے ہوئے
دلگیر کربلا کی طرف جلد کوچ کر	ناداں قریب اب تری رحلت کا وقت ہے
عرض دلگیر ہے سرداب میں جا دو یا شاہ	قابلِ ہند کسی طور مری خاک نہیں

آخری شعر خاص طور سے توجہ طلب ہے۔کون ہندو ہوگا جو اپنی خاک کو ''قابل ہند'' نہ مانتا ہو،اور کربلا میں جا کر مرنے کا متمنی ہو؟

میاں دلگیر نے وفات پائی تو ان کے استاد بھائی میر علی اوسط رشک نے چار قطعے کہے،اس طرح:

وفات میاں دلگیر مرثیہ گو

درگلشنِ خلد با جمیع شہدا — گشتہ پابوس مرثیہ گو دلگیر
تاریخ وفاتِ او نوشتم اے رشک — آہ و افسوس مرثیہ گو دلگیر

1264ھ

باز تصنیف فرمودہ بودند

در بست وچہارم ذی قعدہ — اے وائے چہ شد ایں مرثیہ گو
تاریخ اے رشک چنیں گفتم — صدہائے چہ شد ایں مرثیہ گو

24 ذیقعدہ 1264 (=1848)

سہ مرتبہ تصنیف شد

تا حیات خویشتن دلگیر داشت — جستجوئے کربلا لاریب رفت
رشک تاریخش چہ خاطر خواہ گفت — واہ سوئے کربلا لاریب رفت

1264ھ

چہار تاریخ نوشتند

ارادہ کربلا کا تھا مگر بے استطاعت تھے — موئے وہ فکرِ زادِرہ کے مارے آہ و واویلا
مہ ذیقعدہ کی چوبیسویں روز دوشنبہ تھا — گئے جب حوض کوثر کے کنارے آہ و واویلا
کہا یہ رشک نے مصراع تاریخ اس مصیبت کا
میاں دلگیر جنت میں سدھارے آہ و واویلا

دوشنبہ 24 ذیقعدہ 1264

راقم نے تیسرے قطعے کے آخری مصرع کو دیکھ کر قطعہ منتخب کے صفحہ 15 کے حاشیہ پر لکھ دیا تھا:
''متوفی 1264ھ مطابق 1848 در راہ کربلا''

اب چاروں قطعے سامنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میاں دلگیر راہِ کربلا میں نہیں جستجوے کربلا میں فکرِ زادِ رہ میں بے استطاعت رہ کر مرے تھے۔

ذہین

میاں دلگیر کو شعر گوئی کی صلاحیت خداداد تھی۔ چند سال کی مشق کے بعد ہی وہ نومشقوں کو اصلاح دینے لگے تھے۔ شیخ مصحفی نے ان کے ایک شاگرد کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''ذہین تخلص قوم کاستھ بطفلِ نو رسیدہ، شاگردِ چھنو لال طرب کہ حالا دلگیر تخلص می گزارد و مرثیہ وسلام می گوید و نامے در مرثیہ گوی پیدا کردہ، عمرش تخمیناً شانزدہ سالہ خواہد بود۔''86

مصحفی نے اس ذہین کا نام نہیں بتایا اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی نومشق تھا جس کی شاعری بس برائے نام ہی تھی۔ اس کی غزل کا ایک مطلع یہ ہے۔

کوئی ناز و ادا پر غش ہے کوئی اس کی چتون پر ذہین اک ہم فقط پستے ہیں اس کے ذہنی پن پر

مصحفی کی اس تحریر کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے میاں دلگیر کے ابتدائی زمانے کے حالات اس طرح سامنے آتے ہیں کہ:

(الف) چھنو لال شروع میں طرب تخلص کرتے تھے اور غزل کہتے تھے۔

(ب) پھر انھوں نے مرثیہ اور سلام کہنا شروع کیا اور اس صنف کی مناسبت سے دلگیر تخلص اختیار کیا۔

(ج) انھوں نے مرثیہ کہنے کے لیے نام پیدا کر لیا تھا لیکن اس زمانے میں بھی غزل کی صنف سے کما حقہ دلچسپی لیتے اور نومشقوں کی غزلوں پر اصلاح دیتے رہے۔

مرثیہ گوئی کے اسی ابتدائی زمانے میں میاں دلگیر نے کتب مذہب کی تعلیم حاصل کر لی ہوگی اور پھر چند سال میں اپنے گھریلو معاملات پر قابو پا لینے کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لینے کا اظہار کر دیا۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ضمناً دلگیر کے ایک اور شاگرد کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''میاں دلگیر شیخ ناسخ کے شاگرد تھے۔ مرزا فصیح میاں دلگیر سے اور شیخ ناسخ سے

اصلاح لیتے تھے۔''87

فصیح کے حالات لکھے جا چکے ہیں۔انھوں نے شاید ابتدا میں دلگیر سے مشورہ کیا ہو لیکن اس کا بھی حال یہ تھا کہ کسی معاصر تذکرہ نویس نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔یہ ممکن ہے کہ مرثیہ گوئی میں دونوں کا ساتھ رہا ہو۔

21۔وزیر

خواجہ وزیر کے شاگرد سید ہادی علی رضوی بیخود تخلص نے ان کے دیوان ''دفتر فصاحت'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

'' جو کمالات ظاہری و باطنی اور جو صفات صوری و معنوی جناب اقدس الٰہی نے ذات مجمع البرکات جناب......مولانا و استاذ نا خواجہ محمد وزیر خلف الصدق جناب خواجہ محمد فقیر میں جمع فرمائے تھے کسی طرح حصر میں نہیں آسکتے.....سلسلہ نسب پاک کا خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ سے ملتا ہے۔بیشتر بزرگوں نے ان کے نقش فقر اور عمل جہاد نفس سے اقلیم سلوک کو تسخیر کیا ہے۔مرزا سیف اللہ بیگ خاں مبرور برادر حقیقی امیر الدولہ حیدر بیگ خاں مغفور نانا ئے حقیقی جناب غفران مآب تھے۔عالی وقاران وقت میں چیدہ و انتخاب تھے۔فنون شاعری اور تہذیب اخلاق اور فروتنی میں خواجہ صاحب مرحوم شہرۂ آفاق تھے استغنا اور توکل اور سخاوت اور وضعداری میں طاق تھے۔جناب شیخ صاحب اپنی زندگی میں انھیں کو حاصل تلامیذ جانتے تھے۔ذی فہم رتبہ شناس اب بھی ان کی یکتائی کے مقر ہیں اور جب بھی مانتے تھے۔اعمال فتوح اور علم تسخیر وغیرہ میں بھی ایسی مشق بہم پہنچائی تھی کہ لکھنو سے شہر میں انتخاب بے مثل اور لاجواب تھے۔توسن طبع شریف کو بہ مقتضائے شوق نقش کی چال کی عادت ہو گئی تھی۔شاعری سے بالکل نفرت ہو گئی تھی۔انتظام ہائے نقوش سے فرصت نہ ہوتی تھی۔مہینوں کسی شاگرد کی اصلاح پر رغبت نہ ہوتی تھی مگر جس روز ہندسہ طبع کو ضرب ادھر دیتے تھے لاکھوں مضامین زر آگین بے کسر کم مشقوں کی غزلوں میں بھر دیتے تھے۔عالی

ہمت بھی ایسے تھے کہ اپنی ضرورت پر حاجت روائی سایل کو مقدم جانتے تھے۔
ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین کے حقوق پہچانتے تھے۔ دوبار حضرت سلطان
عالم والیِ ملک اودھ نے کمال سرفرازی سے یاد فرمایا مگر جناب موصوف نے بہ
عذر علالت پائے قناعت کو اپنی جگہ سے نہ اٹھایا۔ فقیر کے اندازے میں سو روپے
ماہواری سے ان کا خرچ کم نہ تھا مگر کبھی یہ نہیں کھلا کہ کہاں سے آیا اور کون دے
گیا۔ اکثر لوگ دستِ غیب کا احتمال کرتے تھے۔"

بیخود کے اس بیان میں وزیر کے نانا کو امیر الدولہ کا حقیقی بھائی کہا گیا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ شیخ مصحفی نے ان کو امیر الدولہ کا قریب در فیق بتایا ہے اور ان کا بیان قابل ترجیح ہے۔ مصحفی کے الفاظ یہ ہیں:

"وزیر تخلص خواجہ وزیر فرزند خواجہ فقیر د نواسہ مرزا اسیف اللہ بیگ خاں کہ از اقربا
درفقاے نواب امیر الدولہ مرحوم بود، از تلامذۂ ناسخ است۔ غزل وقصیدہ می گوید
در نظم شعرا اکثر معنی بیگانہ ای جوید۔ استاد را نیز بر دفتر است۔"88

مطبوعہ تذکرہ میں "از دست" تو لکھا ہے لیکن وزیر کا ایک شعر بھی درج نہیں کیا ہے۔ یہ بظاہر سہو کاتب ہے اور افسوس ناک ہے۔

اکثر اہل تذکرہ کی روش کے مطابق مصحفی نے بھی اس اقتباس میں باپ اور بیٹے کے ناموں کو مخفف کر لیا ہے۔ نقشبندی سلسلے کے لوگ بہ لحاظ عقیدہ سُنّی ہوتے ہیں چنانچہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وزیر کے اسلاف بھی سُنّی تھے اور وہ لوگ علائق سے آزاد، فقیرانہ بسر کرتے تھے۔ خواجہ وزیر بھی اپنے بزرگوں کے مسلک پر قائم تھے اور بیشتر اوقات وظائف و اوراد میں مصروف رہتے تھے۔

خواجہ محمد فقیر کے حالات کسی ذریعہ سے معلوم نہ ہو سکے، بجز اس کے کہ انھوں نے اپنی ایک بیٹی کی شادی خواجہ مرزا جان اکی کے بیٹے خواجہ بہادر حسین فراق سے کی تھی۔ آفتاب الدولہ قلق انھیں کے بیٹے تھے چنانچہ محسن نے لکھا ہے:

"مصاحب خاص حضرت سلطان عالم، آفتاب الدولہ خواجہ اسد علی خان بہادر

قلق ولد خواجہ بہادر حسین فراق بن خواجہ مرزا جان انگی، باشندہ لکھنو صاحب
دیوان شاگرد رشید اور ہمشیرزادہ خواجہ وزیر وزیر کے۔''89

اس مقام پر یہ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لکھنو کے مخصوص حالات میں سُنّی گھرانوں کے بھی بعض لوگ خود کو شیعہ ظاہر کرنے لگے تھے۔ چنانچہ قلق کا بھی یہی معاملہ تھا۔ انھوں نے واجد علی شاہ کے دور میں ایک مثنوی ''طلسم الفت'' لکھی تھی جس کے سالِ تصنیف نے پروفیسر گیان چند کو بہت پریشان کیا ہے۔ موصوف نے اس سلسلے میں جو محققانہ بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''اس کی لوح پر چند اشعار درج ہیں۔ ایک یہ ہے۔

صاف گنجینہ محبت ہے   مثنوی طلسم الفت ہے

سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ مثنوی طلسم الفت سے 1266 نہیں 1256 آتا ہے جب کہ واجد علی شاہ کا عہد شروع ہی نہیں ہوا........دوسری صورت یہ ہے کہ پورا مصرع مادۂ تاریخ ہو (اس سے 1271 نکلتے ہیں) 1271 میں واجد علی شاہ فرمارواہی تھے۔''90

پروفیسر موصوف محقق ہی نہیں شاعر بھی تھے تعجب ہے کہ انھوں نے مصرع کو موزوں پڑھنے کی زحمت نہیں کی یعنی

ع   مثنویِ طلسم الفت ہے

مثنوی کی 'ی' کے نیچے اضافت ہے چنانچہ دو ''ی'' کے عدد شمار کیے جائیں گے۔ اس طرح ''مثنویِ طلسم الفت سے صحیح سالِ تصنیف 1266 نکل آئے گا۔

آفتاب الدولہ قلق نے اپنی اس مثنوی کے 1292ھ کے ایڈیشن میں یہ ذکر کیا ہے کہ وہ ہمیشہ سُنّی ہی رہے۔ ایک دوسری مثنوی مولد شریف میں بھی جس کی طباعت 1292ھ (= 1875) میں عمل آئی تھی، یہ اشعار ان کے عقیدے کے مظہر ہیں۔

بہت راستی کیش تھا وہ جناب   کہ صدیقِ اکبر تھا اس کا خطاب

اور۔

اسی شیر کے باب میں بارہا　یہ فرماتے تھے سرورِ انبیاؑ
مرے بعد ہوتا پیمبر اگر　تو ہوتا بلاشبہ وشک عمرؓ

خواجہ قلق جب تک سلطان عالم کی خدمت میں رہے اپنے عقیدہ کو مخفی رکھے رہے۔ اس واقعہ سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ گھرانہ اپنے عقیدے پر کس حد تک ثابت قدم تھا۔ خواجہ وزیر درباروں کے معاملات سے واقف تھے۔ سلطان عالم کے مکرر طلب کرنے کے باوجود حاضر نہ ہوئے۔ زندہ رہنے کے لیے انسان کو وسیلہ کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے فقیر محمد خان گویا کے متوسلوں میں شامل ہو گئے کہ ان کی سرکار اس اطراف میں سُنّیوں کی پناہ گاہ تھی۔ مشاعروں میں زک اٹھانے اور پھر شاعری سے متنفر ہو کر خود کو اعمالِ فتوح وغیرہ میں مصروف کر لینے کا سبب بھی بظاہر عقیدے کا اختلاف ہی تھا۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مرثیہ اور سلام وغیرہ سے ان کے دلچسپی لینے کا بھی کسی معاصر نے ذکر نہیں کیا ہے۔ بعض قطعات تاریخ سے البتہ گمان ہوتا ہے کہ ان کی تدفین شیعی طریق کے مطابق عمل میں آئی تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ ان کی اولاد نے لکھنو کے اس ماحول میں مذہب اثنا عشری اختیار کر لیا ہوگا۔

شاعر کی حیثیت سے خواجہ وزیر کا ذکر سب سے پہلے میر محمد خاں سرور کے تذکرے میں آیا ہے۔ اس طرح:

''وزیر تخلص، خواجہ وزیر نام، شاعر یست ساکن لکھنو۔

ایک عالم نے جبہ سائی کی　اے بتو تم نے بھی خدائی کی
ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے　فتنہ تو سورہاہے درفتنہ باز ہے
بعد رنجش کے مزا ملنے سے کچھ حاصل نہیں　کہ تمھیں الفت نہیں، اپنا بھی اب وہ دل نہیں 91

اگر چہ تذکرہ نویس نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے۔ اس اندراج سے یہ بات ثابت ہے کہ اس زمانے میں خواجہ وزیر کا جو کلام دہلی تک پہنچ رہا تھا، دہلی کے سخن شناس اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ واقعہ یہ بھی ہے کہ کلام قدر کے لائق ہوتا تھا۔ سرور نے جو شعر نقل کیے ہیں وہ محض خیالی مضامین پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ بالواسطہ ہی سہی ان کا تعلق واقعات، مشاہدات اور عالمِ محسوسات سے بھی ہے۔ دوسرے شعر کے بارے میں مولانا محمد حسین آزاد نے ایک حکایت اس طرح نقل کی ہے:

''ایک دن (شیخ ناسخ) کسی سوداگر کی کوٹھی میں گیے۔ سوداگر بچہ کہ دولتِ حُسن کا
بھی سرمایہ دار تھا سامنے لیٹا تھا مگر کچھ سوتا کچھ جاگتا تھا آپ نے دیکھ کر فرمایا

ع ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے 92

یہ مصرع تو ہو گیا مگر دوسرا مصرع جیسا جی چاہتا تھا ویسا نہ ہوتا تھا۔ گھر آئے۔ اسی فکر میں غرق تھے کہ خواجہ وزیر وزیر آ گئے۔ انھوں نے خاموشی کا سبب پوچھا۔ شیخ صاحب نے بیان فرمایا۔ اتفاق ہے کہ ان کی طبیعت لڑ گئی۔

ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے

شیخ صاحب بہت خوش ہوئے۔''

لطیفہ تو لطیفہ ہے۔ اسے واقعہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ اس سے معاملات کا بخوبی اظہار ہو جاتا ہے۔

خواجہ وزیر کا سال ولادت تو معلوم نہیں، البتہ مولوی کریم الدین نے ان کی عمر کے بارے میں تخمینہ لکھا ہے کہ:

''عمر ان کی قریب پچپن برس کے 1847 (1263ھ) میں ہے۔''93

اور مرزا قادر بخش صابر نے ان کے تعارف میں تحریر کیا ہے کہ:

''وزیر مرد کبیر السن اور ریختہ گویان قدیم سے ہے۔''94

ان دونوں بیانوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا سال ولادت 1208ھ (=1793) کے آس پاس ہوگا۔ اس حساب سے خیال کیا جاتا ہے کہ جس وقت مصحفی نے ان کا احوال اپنے تذکرے میں درج کیا تھا ان کی عمر ستائیس، اٹھائیس برس کے قریب رہی ہوگی۔

ابن امین اللہ طوفان نے بہت اختصار سے وزیر کا ذکر کیا ہے لیکن بعض بہت مفید اطلاعات قلم بند کر دی ہیں۔ لکھا ہے:

''خواجہ وزیر وزیر تخلص، وطن مبارکش لکھنو است، شاگرد رشید ناسخ واستاد فقیر محمد خاں رسالہ دار گویا تخلص، غزلہائش دیدہ ام، سراپا مرصع، چند شعر کہ بیاد است، می نویسم۔''95

یعنی اس وقت تک خواجہ وزیر فقیر محمد خاں گویا کے استاد کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے اور ان کے کلام کے بارے میں بہت اچھی رائیں دی جانے لگی تھیں۔ ابنِ طوفان نے ان کے جو اشعار اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں، یہ ہیں۔

جانور جو ترے صدقے میں رہا ہوتا ہے   اے شہِ حُسن وہ چھٹتے ہی ہما ہوتا ہے
چومتا ہوں لب شیریں وہ خفا ہوتا ہے   کیا شکر رنجی جاناں میں مزا ہوتا ہے
کیا کہوں حال صنم اپنی سیہ بختی کا   میں وہ سرمہ ہوں جو نظروں سے گرا ہوتا ہے

پوچھ لے اب دہنِ زخم سے میرے اک دن
پھل میں تلوار کے قاتل جو مزا ہوتا ہے

وہ زلف لیتی ہے تاب ودل وتواں اپنا   اندھیری رات میں لٹتا ہے کارواں اپنا
کسی کو دیکھ کے ساقی جو بیحواس ہوا   شراب تیغ پہ ڈالی، کباب شیشے میں

اس آخری شعر کا پہلا مصرع وزیر کے دیوان میں اس طرح چھپا ہے۔

کسی کے آتے ہی ساقی کے یہ حواس گئے

لیکن زبانوں پر یہ مختلف طور سے جاری رہا ہے چنانچہ سعادت خاں ناصر کے تذکرے میں بھی ہے......ع   کسی کے جانے سے ساقی کے یہ حواس گئے

واقعہ یہ ہے کہ دیوان کے متن میں آنے جانے میں جو لطف ہے وہ دوسری صورتوں میں نہیں معلوم ہوتا ہے۔

وزیر کی پہلی غزل بھی خوب مشہور ہوئی تھی۔ ناصر نے ان کے کئی اور شعر نقل کیے ہیں۔ پہلے شعر کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے کہ:

"نواب حامد علی خاں کے خسر نواب فضل علی خاں سے اور شیخ (ذوق) مرحوم سے سابقۂ محبت بھی تھا اس لیے نواب حامد علی خاں مرحوم بھی محبت واخلاق سے ملا کرتے تھے۔ ایک دن دیوان خاص میں کھڑے ہوئے شعر سنتے سناتے تھے نواب موصوف نے خواجہ وزیر کا مطلع پڑھا۔

جانور جو ترے صدقے میں رہا ہوتا ہے   اے شہِ حُسن وہ چھٹتے ہی ہما ہوتا ہے

استاد (ذوق) مرحوم نے کہا کہ صدقہ میں اکثر کو اتھروا تے ہیں اس لیے زیادہ تر مناسب ہے ۔

زاغ بھی گر ترے صدقے میں رہا ہوتا ہے　　اے شہِ حُسن وہ جھٹتے ہی ہما ہوتا ہے

ایسی بہت سی اصلاحیں روز ہو جاتی تھیں۔ لکھی جائیں تو ایک کتاب بن جائے۔ ''96

یہ خواجہ وزیر کی ابتدائی مشق کا کلام ہے۔ اس زمانے میں ان کی توجہ مضمون آفرینی کی طرف زیادہ تھی۔ ہر شعر میں قافیہ کی رعایت سے ایک نیا مضمون پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس سے مطلوب اپنی طبیعت کی تیزی اور فکر کی خوبی کا اظہار ہوتا تھا۔ شاعر کو رعایت لفظی کے ساتھ ساتھ صنعتِ ایہام و ذو معنیین سے دلچسپی زیادہ تھی چنانچہ مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے۔ مطلعِ مذکور پر ذوق کی اصلاح واقعی قابل ستائش ہے۔ ہما محض ایک خیالی پرندہ ہے۔ اس کی رعایت کا تقاضا ہے کہ پہلے مصرع میں بھی جانور کے بجائے پرند (= زاغ) ہو۔ علاوہ ازیں لفظ ''گر'' لا کر شیخ ذوق نے دعوے کو مشروط بنا دیا ہے اور اس طرح شعر کی معنویت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

دوسری غزل کے مطلع سے متعلق بھی آزاد نے ایک اور حکایت سنائی ہے:

''ایک دن وزیر اپنے شاہ سخن (ناسخ) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مزاج پرسی فرما کر عنایت و محبت کی باتیں کرنے لگے اور کہا کہ ''آج کل کچھ فکر کیا؟'' عرض کی کہ درود وظیفہ سے فرصت نہیں ہوئی۔'' آپ نے پھر ارشاد فرمایا۔ انھوں نے مطلع پڑھا۔

وہ زلف لیتی ہے تاب و دل و تواں اپنا　　اندھیری رات میں لٹتا ہے کارواں اپنا

بہت خوش ہوئے۔ اس وقت ایک عمدہ تسبیح عقیق البحر کی ہاتھ میں تھی۔ وہ عنایت فرمائی۔ خواجہ وزیر پر بڑی عنایت تھی اور قدر و منزلت فرماتے تھے۔ سب شاگردوں میں ان کا نمبر اول تھا۔''97

اس حکایت سے راوی کی جو رائیں سامنے آتی ہیں، اس طرح سے ہیں:

(1) وزیر کا یہ مطلع ابتدائی کاوشوں میں سے ہونے کے باوجود انعام کے لائق تھا۔

(2) ناسخ خواجہ وزیر کی عزت کرتے تھے۔ شفقت سے پیش آتے تھے اور پورے اعتماد کے

ساتھ ان سے اچھے شعر کی توقع کرتے تھے۔

(3) کسی سے خواہ وہ کتنا ہی محترم شخص ہو ملتے ہی شعر سنانے کے لیے آمادہ ہو جانا وزیر کے مزاج کے خلاف تھا۔ معمولاً ایک دو بار کی فرمائش کے بغیر وہ شعر نہیں سناتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ ان کے کلام میں عامیانہ پن کی صورت عموماً پیدا نہیں ہو سکی ہے۔

(4) ناسخ اپنے شاگردوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور خوش ہو جاتے تھے تو ان کو انعام سے سرفراز فرماتے تھے۔

اس مطلع میں ہر لفظ اپنے معنی کے مختلف پہلوؤں اور مناسبتوں کے ساتھ دوسرے کلمہ سے بخوبی مربوط و متعلق ہے۔ شاعر کی توجہ مناسبت لفظی کی طرف زیادہ سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اسے زبان پر پوری قدرت حاصل ہے اور اکثر شعروں میں الفاظ ذو معنیین لا کر اس نے صنعت ایہام کا لطف بھی پیدا کر دیا ہے۔

خواجہ وزیر کے کلام میں روانی اور سلاست کا وصف بطور احسن پایا جاتا ہے۔ بسا اوقات ان کے شعروں میں آمد کا جیسا لطف بھی آ جاتا ہے بیساختگی کا عالم یہ ہے کہ بیشتر شعر سخن شناسوں کی زبانوں پر جاری ہو کر گویا ضرب المثل بن گئے ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے لکھا ہے:

"وزیر تخلص خواجہ وزیر، از اہالی بلدۂ لکھنو واز تلامذہ متعین شیخ ناسخ است۔
عزیزے ایں ابیات بہ نامش خواندہ بود۔"98

شیفتہ نے جو شعر نقل کیے ہیں وہ تذکرۂ سرور میں بھی لکھے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اشعار اہل دہلی کی زبانوں پر جاری تھے۔

سعادت خاں ناصر نے خواجہ وزیر کا احوال اس طرح تحریر کیا ہے:

"ترقی میں ماہ منیر، شہرت میں آفتاب عالمگیر، شاعر خوش تقریر، خواجہ وزیر ولد خواجہ فقیر۔ شیخ امام بخش ناسخ کے تلامذہ میں نامی اور گرامی۔ ایک دن بہ حسب اتفاق یہ بندہ ہمراہ لالا فتح چند صاحب ان کے دولت خانے پر گیا۔ بر سبیل ذکر فخر و مباہات فرمانے لگے کہ اکثر مجھے شیخ صاحب سے بہتر اور بعض برابر جانتے ہیں۔ میرا دیوان جو دلّی میں گیا وہاں کے صاحب تمیزوں نے شیخ کے دیوان کو

دھوڑالا۔ سبحان اللہ کیا نفسانیت ہے کہ اپنی نمود کے واسطے استاد کو مٹاتے ہیں اور

ایسے سخن زبان پر لاتے ہیں۔"99

وزیر کا دیوان تو ان کی زندگی میں بہ گمان غالب دہلی نہیں گیا تھا۔ ان کا کلام گیا تھا اور بلاشبہ وہ مقبول ہوا تھا۔ وزیر نے اہل دہلی کی جو رائے نقل کی ہے، ناصر نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ اپنی بات کہنے اور دوسرے کی رائے پر اپنے تاثرات ظاہر کرنے کا حق ہر شخص کو ہے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ وزیر نے اپنے جس قدر شناس کے عمل کا بیان کیا ہے، اس نے بلاشبہ مبالغہ سے کام لیا تھا۔

خواجہ وزیر کے دیوان کے مرتب ہونے کی روداد ہادی علی بیخود نے اس طرح سے قلم بند کی ہے:

"زمانۂ شیخ (ناسخ) صاحب میں ایک کلیات ضخیم نتائج طبع سلیم سے مرتب ہو کر ضائع ہوا۔ جب سے پھر کبھی ویسا شوق شاعری نہ چمکا۔ اگر کبھی کسی دوست کی فرمائش سے یا تلامیذ کے اصرار و خواہش سے کچھ موزوں فرمایا وہ مسودہ گم ہوا یا صاحب فرمائش لے گیا۔ بیشتر غزلوں کے مسودوں کو بے پروائی سے رائگاں فرمایا، یہاں تک کہ اکثر زمینوں میں چار چار مرتبہ غزلیں موزوں کیں، جو ہر طبع عالی دکھایا۔ جب محمد عبدالواحد خاں مہتمم مطبع مصطفائی دمصر اجتماع تصنیفات ہوئے (تو وزیر نے) حال بربادی دیوان مفصل نقل فرمایا۔ ایک پرچہ بھی پاس نہ تھا۔ خان صاحب ممدوح کو بہت حیرت ہوئی۔ اسی روز سے فراہمی کلام خواجہ صاحب کی تاکیدیں ہوئیں۔ معہذ دسادی کتابیں مشق فکر سخن کے لیے (وزیر کو) دے آئے۔ اکثر زمینیں تجویز کر کے شعر کہلوائے، یہاں تک کہ ایک دیوان مختصر صاف اور مرتب فرما کر نذر خواجہ (وزیر) صاحب کیا...... جب کبھی خان صاحب عزم طبع دیوان کا ذکر زبان پر لاتے تھے، بے تکلف ارشاد فرماتے تھے کہ کلام سابق بالکل ناپسند طبیعت ہے۔ ابتدائی مشق کے شعروں سے مجھ کو نفرت ہے۔ اگر مکارمِ زمانہ نے فرصت دی، عوارض لاحقہ سے مہلت ہوئی تو دو مہینے کی توجہ میں جیسا جی چاہتا ہے بہت کچھ موزوں ہو جائے گا مگر اجل نے

فرصت نہ دی۔ بائیسویں تاریخ شب آدینہ ذیقعدہ کو1270ھ (1854)
میں جہان گذراں ترک فرمایا.........خان صاحب نے اہتمام تصحیح وترتیب
کلام بلاغت نظام کا عہد اس نالائق (بیخود) کے سپرد کیا.........دو برس کی
کوشش سے یہ نسخۂ دلپذیر مرتب ہو کر مع الخیر انجام کو پہنچا۔"100

بیخود نے یہ نہیں بتایا کہ تاریخ کی زندگی میں وزیر کا جو کلیات ضخیم مرتب ہوا تھا اس میں کن کن اصناف میں کلام شامل تھا۔ بعد میں جو مختصر مجموعہ خواجہ وزیر کی نذر کیا گیا اس کے بارے میں بھی تفصیلات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ ابتدائی مشق کے کلام سے بعض تلخ یادیں وابستہ تھیں اس لیے اس سے متنفر ہو جانا بجا تھا۔ متنفر ہونے کا سبب یہ گمانِ غالب اُس کلام کا غیر معیاری ہونا نہیں تھا۔

بیخود نے "تاریخ ترتیب دیوان بلاغت عنوان " کے قطعہ میں بھی بعض مفید اطلاعات نظم کی ہیں۔اس کے چار شعر یہ ہیں۔

میر صاحب نے مرے ساتھ بہت محنت کی　　لاے ہر ست سے اشعار فصاحت بنیاد
پھر تو جوہر نے بھی کچھ ہاتھ بٹایا میرا　　کہ حقیقت میں ہیں وہ جوہر مرآت وداد
الغرض محنتِ یکسالہ میں اے بیخودِ زار　　جمع دیوان ہوا، دل دوستوں کا ہو گیا شاد
سال ترتیب یہ رو رو کے لکھا پھر میں نے
آج دیوان مرتب ہوا بعد استاد

1271ھ

میر صاحب سے مراد سید محمد محسن علی محسن موسوی مولف تذکرہ سراپا سخن ہیں اور جوہر کا نام جواہر سنگھ تھا اور وہ بھی خواجہ وزیر کا شاگرد تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مسودہ بیخود نے ایک برس میں تیار کر لیا تھا، پھر اس کی تصحیح وغیرہ کا کام کیا اور دو برس کی محنت کے بعد اسے طباعت کے لیے دے دیا، اور پھر یہ:

"انتیسویں تاریخ ذی الحجہ 1272ھ کو مطبع مصطفائی واقع شہر لکھنو محلہ محمود نگر میں
زیور طبع زیب فرما کر یوسف بازار شہرت ہوا۔ از بسکہ خاتمہ طبع دیوان موصوف
الصدر کا آخر 1272ھ میں ظہور میں آیا، بعض احباب نزدیک دو در نے

قطعات تاریخ کو 1273ھ میں موزوں فرمایا۔"

سرورق پر دیوان کا تاریخی نام "دفتر فصاحت" تحریر ہے جس سے 1263 کے عدد برآمد ہوتے ہیں۔ یہ سال غالباً اس ترتیب کا ہوگا جو ضائع ہوگئی۔ ناصر نے اس سے ایک برس پہلے اپنا تذکرہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے بڑی محنت اور کوشش سے خواجہ وزیر کی کئی غزلیں فراہم کر کے اس میں لکھی تھیں۔ ان کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ وزیر عموماً مختصر غزلیں نہیں کہتے تھے اور انھیں قافیہ پیمائی کا شوق تھا۔ ناصر کے تذکرے سے چند شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

تصور یہ رہا آنکھوں میں اس شیریں شمائل کا — کہ اپنی آنکھ کا پردہ بنا ہے پردہ محمل کا
بدن میں میرے جتنے زخم ہیں پانی چواتے ہیں — نہ پوچھو کس قدر پیاسا ہوں آب تیغ قاتل کا
رنج و راحت سے ہم کو کار رہا — ہاتھ میں گل تو پا میں خار رہا
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو — کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کرلو تیر کو
زاہد جہاد کرتا ہوں میں زرد رنگ سے — آنکھیں لڑا رہا ہوں بتان فرنگ سے
ہر صید کو ہے عشق مرے خانہ جنگ سے — اُڑتا نہیں ہے دیکھ تو تا تفنگ سے
ساقی ہوا ہے عشق کسی خانہ جنگ سے — مانگوں گا میکشی کو پیالہ تفنگ سے

خواجہ وزیر نے خاصی لمبی عمر پائی تھی۔ پورب کے علاقے کے اکثر الفاظ ان کی زبان پر جاری تھے اور وہی اشعار میں بھی جگہ پاتے تھے مثلاً چُوانا بمعنی ٹپکانا وغیرہ

اسی طرح ان کی زبان پر فارسی کا اثر بھی بہت تھا چنانچہ کام رہنا کے موقع پر انھوں نے کار رہنا نظم کیا ہے۔

خواجہ وزیر کو لفظی اور معنوی صنعتوں کے استعمال کا بھی بہت شوق تھا۔ شاید ہی کوئی شعر ایسا ہوگا جس میں کسی صنعت سے کام نہ لیا گیا ہو۔ ایک غزل کے بیشتر قوافی میں ایہام کا لطف موجود ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں۔

جان پڑ جاتی ہے زیور میں پہننے سے ترے — کہیں اُڑ جائے نہ جگنی تری جگنو ہوکر
تم نہا کر جو چلے، غم سے سٹ کر دریا — آگیا دیدۂ گرداب میں آنسو ہوکر
ہم بھی بت خانے سے جانکلیں کبھی بہر طواف — حضرت کعبہ کشش کیجیے ابرو ہوکر

ان میں آنسو (= اشک)، آں (= وہ) + سو (= سمت) اور ابرو (= بھوں)، اب (= حالا) + رو (= چہرہ) وغیرہ۔ ہر دو کی رعایت موجود ہے۔

محسن جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس نے اپنے تذکرے میں خواجہ وزیر وزیر کے بارے میں لکھا ہے:

"علم تکسیر میں یکتا، افصح الفصحا، خواجہ وزیر مغفور وزیر، خلف خواجہ فقیر، اولاد میں حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس سرہٗ کی باشندۂ لکھنو صاحب دیوان ارشد تلامذۂ شیخ امام بخش ناسخ کے۔ نصیر دہلوی جب لکھنو آئے تھے تو انھوں نے یہ طرح کی۔ اول غزل خواجہ صاحب نے فرمائی۔ وہ غزل تلف ہوئی۔ یہ غزل دوبارہ فرمائی۔

گر الٹ کر دیکھیے تصویر پشتِ آئینہ سیدھی ہوجائے ابھی تقدیر پشتِ آئینہ" 101

محسن کی اس تحریر سے بیخود کے بیان کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ مذکورہ غزل کے علاوہ محسن نے وزیر کی اور بھی کئی غزلوں کے اشعار نقل کیے ہیں۔ یہاں ان کے صرف مطلعے درج کیے جاتے ہیں۔

کرتے ہو باتیں رکھ کے جو شمشیر دوش پر سیکھی زبان تیغ نے تقریر دوش پر
پار گذریں دل کے جب رکھ دیں جگر پر انگلیاں تیر دستی بن گئی ہیں اے ستمگر انگلیاں
عاشق زلف ورخ دیدار آنکھیں ہوگئیں مبتلائے کافر ودیندار آنکھیں ہوگئیں
تیغ عریاں پہ تمھاری جو پڑی میری آنکھ چشم جوہر سے اُجی خوب لڑی میری آنکھ
ہر عضو مسافر ہے، نہیں کچھ سفری آنکھ ہے آخرِ شب عمر چراغ سحری آنکھ
شوخی تو دیکھو کہتے ہیں اپنے چھپا کے ہاتھ ہیں آج دستِ غیب ترے آشنا کے ہاتھ

ان غزلوں میں ردیفیں عموماً بہت طویل نہیں ہیں۔ قافیے بھی ایسے نہیں ہیں جن کو مشکل کہا جائے لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ تقریباً سب میں کسی نظم کا عنوان بن جانے کی لیاقت موجود ہے۔

خواجہ وزیر نے بیشتر شعروں میں عشقیہ مضامین نظم کیے ہیں لیکن ان میں حُسن مطلق کے مقابلے میں حَسین کا اور حَسین کے مقابلے میں اسبابِ حُسن کا مثلاً زیورات، ملبوسات اور دوسری

کار آمد اشیا کا تذکرہ وزیادہ معلوم ہوتا ہے۔ توجہ طلب یہ بات بھی ہے کہ اکثر شعروں میں تیر وشمشیر اور جنگ وتفنگ کا ذکر آیا ہے۔ اسے اس زمانے کے حالات کا عکس خیال کرنا چاہیے۔ کہا جا سکتا ہے کہ قافیہ پیمائی معنی آفرینی اور نازک خیالی کے باوجود خواجہ وزیر اور ان کے ہم عصروں کے کلام میں ان کے علاقے کی افراتفری کی جھلک موجود ہے اور اس اعتبار سے ان کے کلام کے مطالعے اور تجزیے کی ضرورت ہے۔

محسن نے اپنے تذکرے میں خواجہ وزیر کے نام کے ساتھ "مغفور" لکھا ہے اس کلمہ کا اضافہ بعد میں شاید تذکرہ کی طباعت کے دوران کیا گیا ہوگا۔

مولانا محمد حسین آزاد نے وزیر کے بارے میں ضمناً لکھ دیا ہے کہ:

> "خواجہ وزیر کہ آتش کے شاگرد تھے، پھر ناسخ کے شاگرد ہوئے اور اسی پر فخر کرتے کرتے مرگئے۔ جیسے نازک خیال تھے ویسی ہی زبان پر قدرت رکھتے تھے۔ شیخ (ناسخ) بھی ان کی بڑی خاطر کرتے اور اول درجہ کی شفقت مبذول فرماتے تھے۔"102

آتش سے تلمذ کا ذکر معاصر تذکرہ نویسوں نے نہیں کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شروع میں چند روز وزیر نے ان سے اصلاح لی ہو اور یہ ذکر آزاد نے کسی سے سنا ہوگا لیکن اس تلمذ کا اثر وزیر کے کلام میں معلوم نہیں ہوتا اس لیے اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ مولوی کریم الدین نے آتش کے تعلق سے ایک اور واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

> "ابتدا میں شعر کہتے تھے۔ بارہ برس سے نہ کہا۔ بعد ازاں پھر کہنے لگے۔ کہتے ہیں کہ بہ سبب زک دینے آتش کے چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے بارہ برس شعر نہ کہا۔ صاحب دیوان کلاں ہیں۔ ایک دیوان ان کا بہت بڑا اول میں جو انھوں نے تیار کیا تھا کسی شاعر نے چرا لیا تھا۔ اب انھوں نے ایک اور دیوان طیار کیا ہے۔ کسی کو غزل اپنی نہیں دیتے جب تک کہ وہ چھپ کر مشہور نہ ہو جائے اور وہ شخص ان کا شاگرد یا دوست تھا جس نے وہ چرایا تھا۔"103

> "آداب مجلس سے بےخبر جواہر سنگھ تخلص جوہر۔ یہ روداد عجیب اور افسانہ غریب

ہے۔خواجہ حیدر علی آتش کی اس غزل کا۔

مضمون حسن وعشق نہیں کس غزل میں ہے سُنیے اگر تو لطف ہماری زٹل میں ہے" 104

تتبع کیا اور سراج الدولہ (پدر رند) کے مشاعرے میں کہ مدار المہام وہاں کے خواجہ (آتش) صاحب ہیں، غزل کو پڑھا چونکہ صحبت گذشتہ سے تلامیذ خواجہ صاحب کے خواجہ وزیر کی لاف وگزاف سے دل کو پُر آبلہ رکھتے تھے، اس غزل پر ریش خند کیا اور راوراپنے پھپھولوں کو پھوڑا۔ جب اس نے خلاف قاعدہ حرکت ان کی مشاہدہ کی تیز تند و تیز ہو کر کہا:

'کیا چیں چین کرتے ہو۔معلوم ہوتا ہے کہ جہلا جمع ہوئے ہیں'

ہر چند اس کے طعن انھیں دو چار پر تھے، اس بات سے رنجش عام ہوئی۔مرزا حیدر صاحب فیض آبادی (پسر ترقی) نے زجر و توبیخ فرمایا اور اشارے سے کہا کہ اُٹھ جاؤ۔وہ نادان نہ سمجھا اور بعد تمام کرنے غزل کے جو وہ اٹھا چند شاگرد آتش کے کسی بہانے سے اس تلک پہنچے اور آبرو ریز ہوئے۔خواجہ وزیر صاحب کی خاطر اس واقعے سے نہایت پریشان ہوئی اور اس کے تدارک سے حیران ہوئی۔"

جوہر کی غزل کے کچھ شعر یہ ہیں۔

مضمون غزال چشم کا ہر اک غزل میں ہے وحشی ہیں عین لطف ہماری زٹل میں ہے

مستی بھری ہوئی یہ ہماری زٹل میں ہے مینائے مے ہے بیت جو اپنی غزل میں ہے

جو بُت وہاں ہے رشک بتانِ فرنگ ہے کیا لطف کو چہ ہائے فرنگی محل میں ہے

رتبہ ہمارا آج سلیماں سے کم نہیں وہ غیرت پری جو ہماری بغل میں ہے

ہیں بادشاہ ملک سخن حضرت وزیر
جوہر زمین شعر انھیں کے عمل میں ہے

اس میں شک نہیں کہ اس واقعے سے خواجہ وزیر بہت پریشان ہوئے ہوں گے لیکن شعر گوئی سے متنفر ہو کر کنارہ کشی اختیار کر لینے کے لیے یہ کافی وجہ نہیں معلوم ہوتی ہے۔

شیخ ناسخ کے ساتھ خواجہ وزیر کے اچھے روابط تھے چنانچہ دیوان ناسخ میں ان سے متعلق ایک قطعہ یہ بھی ہے:

''تاریخ کدخدائی خواجہ وزیر صاحب

للہ لحمد کہ خدا گردید مونس دلپذیر من امروز
گفت سال عروسیش ناسخ شدہ نوشہ وزیر من امروز

1237ھ

اس میں ''وزیر من '' کی ترکیب بہت خوب آئی ہے۔ بعد میں ناسخ کے ایک شاگرد مہدی علی خاں قبول نے وزیر کی وفات سے متعلق قطعہ تاریخ میں اس ترکیب کا فایدہ اٹھایا۔ اس قطعہ کے تین شعر یہ ہیں۔

بہ نظم بود تلمذ ز ناسخ مرحوم کہ یک بہ زمرۂ شاگردیش نظامی بود
وزیر بود چو سلطانِ مُلکِ معنی را بہ مُلکِ نظم زفکرش خوش انتظامی بود
گذاشت او چو جہاں را نوشت سال قبول
وزیر پادشہِ شاعرانِ نامی بود

1270ھ

اور پھر آزاد نے بھی اس ترکیب کا اپنے طور پر استعمال کیا تھا۔

''ناسخ کے دیوان میں ایک اور قطعۂ تاریخ ہے، جس کا پہلا مصرع یہ ہے ع

مولدِ پورمہین پو روزیر

قاضی عبدالودود صاحب نے مذکورہ ترکیب کا خیال کر کے اس قطعہ کے بارے میں بھی لکھ دیا ہے کہ:

''کلیاتِ ناسخ میں (خواجہ وزیر) کے بڑے بیٹے کی تاریخِ ولادت بھی ہے۔''105

صحیح یہ ہے کہ یہ قطعہ وزیر (= معتمد الدولہ آغا میر) کے مہین پور (= امین الدولہ مہر) کے بیٹے یعنی آغا میر کے پوتے کی ولادت کا ہے اور اس کا خواجہ وزیر سے مطلق کچھ تعلق نہیں ہے۔

خواجہ وزیر کے استاد شیخ ناسخ کے کلام کے بارے میں بقولِ آزاد لوگ کہتے ہیں کہ شیخ صاحب کی اکثر نازک خیالیاں ایسی ہیں کہ کوہ کندن وکاہ برآوردن''106 اور مصحفی نے خواجہ وزیر

کے بارے میں لکھا ہے کہ ''معنی بیگانہ می جوید۔'' خواجہ وزیر کے تلامذہ ناسخ اور وزیر کے درجے کو تو نہیں پاتے تھے لیکن کوشش ضرور کرتے تھے۔ سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

''خواجہ وزیر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے شاگردوں میں جو شخص شعر مہمل کہہ کے لاتا، اس کے بارے میں مرزا جعفر صاحب فرماتے تھے کہ اب تم نے مسلکِ بقا مہمل گوئی اختیار کی ہے۔''107

وہ زمانہ تھا جب شعر گوئی کو ''فنِ شریف'' کہتے تھے چنانچہ خواجہ وزیر کے ایک شاگرد نظر علی بیگ خطا کے حال میں ناصر نے یہ ذکر کیا ہے:

''اگر چہ خواجہ وزیر تبع اور شاگرد شیخ ناسخ کے ہیں مگر باب ارزانی شاعری میں قدم بقدم میاں مصحفی کے پائے جاتے ہیں۔ یہ فنِ شریف واسطے اشرافوں کے ہے نہ اجلافوں کے۔''108

ظاہراً ناصر نے خطا کے ساتھ ساتھ مصحفی اور وزیر کو بھی ''اجلافوں'' میں شمار کیا ہے۔ اس سے وزیر کی شاعری کے بارے میں بھی اس رائے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی قسم کے معاملات نے وزیر کو شاعری سے متنفر کر دیا تھا۔ اُس زمانے کے معیار و مزاج کے بارے میں حکم لگاتے وقت اہلِ لکھنو کے ان معاملات کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔

22۔ رشک

مولانا محمد حسین آزاد نے رشک کا نام اس طرح تحریر کیا ہے:

''والا جاہ میر علی اوسط رشک''109

اور ان کے دیوان کے آخر میں جو ''صحیح نامہ'' شامل کیا گیا ہے اس میں ان کا نام اس طرح درج ہے:

''تاج الشعرا میر علی اوسط رشک''

''والا جاہ اور ''تاج الشعرا'' کا خطاب بادشاہ یا شاید معتمد الدولہ یا ان کے بڑے صاحبزادے نواب امین الدولہ مہر نے ان کو عطا کیا ہوگا۔ کلمہ ''میر'' سیادت کے اظہار کے لیے ہے۔ علی اوسط ان کا نام اور تخلص رشک ہے۔ ان کے مطبوعہ دیوان میں جو قطعاتِ تاریخ لکھے ہیں، ان میں سے بعض کے مصرع تاریخ درج ذیل ہیں:

وفات مادرِ مادرِ رشک	لیل جمعہ رجب بیست وچارم حیف آہ	1221ھ
رحلت خواہرِ مادرِ رشک	اربعا بستم ماہِ صفر بدے بے	1238ھ
ایضاً ایضاً	اربعا بست ودوم ماہ صفرائے ہائے وائے	1252ھ
انتقال مادرِ رشک	در یازدہم صفر باثنین	1254ھ
وفات عمہ کہ رشک را پرورش کرد	شنبہ ششم جمادی الاول صد آہ	1233ھ

میر علی اوسط رشک نے اپنے والد کی وفات سے متعلق دو قطعاتِ تاریخ کہے ہیں، اس طرح:

''تاریخ انتقالِ والد مرحوم''

درسالِ ہزار و دوصد و نوز دہم　　خوں شد زغم بے پدری دل ہے ہے
آں سیدِ واسطی وحلی وفقیہ　　در علم وعمل رشید وکامل ہے ہے
یعنی پدرِ ماجدِ من طابَ ثراہ　　شد بارِ اجل را متحمل ہے ہے
شوال و چہار شنبہ و بیست ویکم　　چوں شد بریاضِ خلد داخل ہے ہے

ایں صوری ومعنوی نوشتم تاریخ
<u>سیدِ سلماں وائے وفاضل ہے ہے</u>

1219ھ

دیگر ع

والدِ ماجدِ من سید سلمان فقیہ　　عزمِ فردوس نمودند چواز شوقِ کمال
چہ فقیہ وچہ محدث چہ امیر وچہ فقیر　　جمع بودند بصد گونہ پریشانیِ حال
بود ازیں ماتمِ بیحد بجہاتِ دنیا　　گریہ ونوحہ ورنج وغم واندوہ وملال

دردل اے رشک ہمیں مصرعِ تاریخ آمد
<u>اربعا بست و یکم بودہ زماہِ شوال</u>

1219 ھ

ان قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ رشک نے جو کچھ بزرگوں سے سُنا تھا یہ تھا کہ ان کے اسلاف عراقِ عرب میں شہر واسط کے رہنے والے تھے۔ پھر یہ خاندان وہاں سے ہجرت کر کے

ہندوستان آ گیا تھا۔ یہاں معمول کے مطابق یہ لوگ بھی پہلے دارالخلافہ شاہجہاں آباد میں رہے ہوں گے، پھر وہاں سے قنوج میں جا کر سکونت پذیر ہو گئے۔ وہاں کے حالات بگڑے تو یہ خاندان فیض آباد میں منتقل ہو گیا لیکن قنوج سے تعلق کو کسی نہ کسی طور پر باقی رکھا تھا۔

میر رشک فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان کی پیدائش کے چند سال کے بعد ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ میر رشک نے اپنے والد کے بارے میں سنا تھا کہ وہ عالم اور فقیہ تھے اور ان کی وفات پر فیض آباد کے مذہبی حلقوں میں زبردست ماتم مچ گیا تھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ تذکروں وغیرہ میں سید سلمان کا حال بالکل نہیں ملتا ہے۔ سید سلمان کے بعد میر رشک کی پرورش ان کی ایک چچی نے کی تھی۔ رشک نے اپنے اس چچا کا ذکر نہیں کیا ہے اس لیے خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ بھی بیوہ رہی ہوگی۔ رشک کی اس چچی کا ایک بیٹا امانت علی تھا جو قنوج میں رہتا تھا۔ اسی نے رشک اور ان کے گھرانے کی بھی سرپرستی کی تھی چنانچہ اس کی وفات کے موقع پر انھوں نے جو قطعۂ تاریخ کہا یہ ہے۔

اے فلک آں عمہ زادم بود وزوج خواہرم — چوں نہ گویم بہر مرگش از تعب افسوس وائے
میر امانت بود نامِ نامیِ او با علی — شیعی و پُر جرأت و عالی نسب افسوس وائے
مولدش قنوج و مدفن خاکِ فیض آباد شد — ورد دارم نالہ باشور و شغب افسوس وائے
بعد مرگِ والدِ من تربیت کرد او مرا — چو نیارم در غمِ او تا بلب افسوس وائے

یافتم تاریخ مرگ اے رشک از ہاتف چنیں
آں چہارم بود از شہر رجب افسوس وائے

1254ھ

میر امانت علی نے میر رشک کی مثنوی حدیثِ رجعت کو غالباً قنوج میں صاف کیا تھا، البتہ آخر وقت میں وہ بھی فیض آباد آ گئے تھے اور وہیں وفات پائی تھی۔ ان کے تعلق سے میر رشک بھی قنوج آتے جاتے رہتے تھے۔ ظاہراً میر رشک کی پہلی شادی بھی انھیں کی سرپرستی اور اہتمام میں ہوئی تھی۔ اپنی پہلی بیوی سے متعلق ایک قطعہ تاریخ میں میر رشک نے کہا ہے۔

مولدش بُد فیض آباد و مکانش لکھنؤ — مدفنش شد کانپور از حکمِ تقدیرِ الٰہ

رشک تاریخِ نکاح و وصل و عمر و مرگ گفت   عقد سال ہژدہم شد، سال چہلم موت آہ

1251ھ

اس سے پتا چلتا ہے کہ میر رشک کی پہلی بیوی کا سال ولادت 1211ھ (97-1796) تھا اور نکاح کے وقت یعنی 1249ھ (=1814) میں اس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ رواجِ زمانہ کے مطابق اگر میر رشک اس سے چند سال بڑے ہوں تو ان کا سال ولادت 1205ھ کے آس پاس خیال کیا جا سکتا ہے یعنی اپنے والد کی وفات کے وقت ان کی عمر کوئی تیرہ چودہ برس کی ہوگی۔ اس عمر میں انھوں نے اپنے باپ کے بارے میں جو سُنا یا دیکھا تھا وہ بعد کے زمانے میں مختصراً دونوں قطعوں میں نظم کر دیا تھا۔ ظاہراً شعر گوئی باپ کی وفات کے چند سال بعد شروع کی ہوگی۔ رشک کی نانی اور ماں وغیرہ کے سالِ وفات پر نظر کریں تو خیال ہوتا ہے کہ ان کے باپ نے جوانی میں وفات پائی ہوگی۔

میر رشک نے اپنے بھائیوں اور مختلف اعزا سے متعلق جو قطعات تاریخ کہے تھے ان کے مصرعِ آخر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

وفات میر سید علی اخی کلاں   بیست و پنجم ششم اے وا   25 جمادی الآخر 1231ھ

وفات فضل النسا بیگم اخت کلاں   شب آدینہ دو ذی الحجہ وا حیف   26 ذالحجہ 1240ھ

وفات بانوئے برادر کلاں   ہے ہے افسوس و حیف حاجر خانم   ربیع الاول 1244ھ

وفات حضرت بیگم بنت برادر رشک مُرد یوم اول از شہر صفر اے ہائے آہ یکم صفر 1253ھ

وفات بیگمی صاحب بنت خواہر رشک جمعہ و سیزدہم شہر صفر ہے ہے حیف   13 صفر 1253ھ

مذکور ہے کہ حضرت بیگم اور بیگمی صاحبہ کی وفات ہیضہ کی وبا میں ہوئی تھی۔

وفات بھابھی بیگم   افسوس بشہر صفر و لیل نہم   9 صفر 1255ھ

وفات شہر بانو زوجہ سید علی امجد برادر رشک   ہاں یازدہم خمیس شعبان   11 شعبان 1256ھ

وفات مرزا ابو جعفر خاں خال رشک   زر جب بود ششم لیل جمعہ افسوس   6 رجب 1259ھ

مر گیا میرے بڑے بھائی کا جب بیٹا بڑا   تیرھویں ہے حیف وا ویلا مہ شوال کی   13 شوال 1260ھ

وفات خوش دامن رشک   بُد بست و نہم از مہ شوال صد افسوس   29 شوال 1260ھ

میر رشک کے دو بھائیوں کا نام اوپر آیا ہے۔ان کے علاوہ ان کا ایک بھائی اور تھا جس کا نام سید اکبر علی تھا اور تخلص اس کا قبل تھا۔ وہ غالباً صرف مرثیے اور سلام کہتا تھا، اسی لیے اہل تذکرہ نے اس کا حال نہیں لکھا ہے۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں مرثیوں اور سلام کے کئی ایسے مجموعے موجود ہیں جن میں دوسرے شعرا کے ساتھ ساتھ اس کا کلام بھی مندرج ہے۔ گمان غالب ہے کہ علی امجد اور اکبر علی دونوں میر علی اوسط رشک سے چھوٹے تھے۔

اپنے خاندان میں شاید میر علی اوسط پہلے شخص تھے جنھوں نے شعر گوئی اختیار کی تھی۔ اس فن کی طرف مائل ہونے کی قطعی وجہ تو معلوم نہیں البتہ قیاس کہتا ہے کہ میر امانت علی قنوجی کی سرپرستی اس کی محرک ہوئی ہوگی۔

فیض آباد کے زمانۂ قیام میں میر علی اوسط رشک نے میر مستحسن خلیق کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ سعادت علی خاں ناصر نے اس کا ذکر کیا ہے، اس طرح:

> ''شاعر سترگ، ممدوح خرد و بزرگ، زیور علم و فضل سے آراستہ و پیراستہ، نظم میں اک نظام، کلام میں متانت تمام، شعروں میں سلاست اشک، میر علی اوسط تخلص رشک، کلام اس کا منظور ضمائر، خواطر کے مرغوب، شاگرد رشید شیخ امام بخش ناسخ بلکہ ان کے برابر محسوب۔ مسکن اور مولد فیض آباد، بہ دسن سے شعر گوئی پر طبع رواں۔ طبیعت ہنر کی کاسب، دل مشاعرے پر راغب۔ اس نقل کا ان کی زبانی بیان کہ اس آوان میں مرزا محمد تقی خاں ترقی کے دولت خانے میں صحبت مشاعرہ مقرر اور روز مقررہ وہاں ازدحام اہل فضل و ہنر ہوتا تھا۔ چار و ناچار میر مستحسن خلیق کو کہ فیض آباد میں ان سے کوئی بہتر نہ تھا غزل دکھلائی اور ہنر مندوں کی زبان سے واہ واہ پائی۔ چندے زمانہ اسی طور سے گذرا۔ 1231ھ میں کہ جناب عالیہ نے انتقال کیا اور سررشتہ روزگار کا برہم ہوا، عزم بالجزم سکونت لکھنو کا ٹھہرا۔''110

فیض آباد میں میر رشک کا ذریعۂ معاش کیا تھا، اس بارے میں وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ اقتباس بالا کی روشنی میں محض قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ وہ بہو بیگم صاحبہ کی سرکار میں ملازم رہے ہوں

گے اور مرزا اتر قی کی انھیں سرپرستی حاصل رہی ہوگی۔ بہو بیگم نے بقول خواجہ عبدالروف عشرت

"نوے برس کی عمر میں 25 محرم 1231ھ (1816) پنجشنبہ سہ پہر کو فیض آباد میں انتقال فرمایا اور اپنے امام باڑہ میں مدفون ہوئیں۔"[111]

اتنا معلوم ہے کہ لکھنو میں میر رشک کی سسرال تھی لیکن اس سسرال سے متعلق کوئی بات معلوم نہیں۔ اس زمانے تک فیض آباد کے پریشان حالوں کے لیے لکھنو امیدگاہ اور جائے پناہ تھا اس لیے میر رشک نے بھی وہیں کا عزم کیا۔ وہاں پہنچنے کے کچھ ہی مدت کے بعد 25 جمادی الآخر 1233ھ (1818) کو میر رشک کے بڑے بھائی میر سید علی نے رحلت کی۔ پھر کوئی دو برس گذرے تھے کہ میر امانت علی کی والدہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ میر رشک نے اس غم جانکاہ کی تاریخ اس طرح کہی۔

آں عمۂ من کہ پرورش کرد مرا   زیں دارِ فنا گذشت انا للہ
ایں صوری و معنی ست تاریخ وفات   شنبہ ششم جمادی الاوّل صد آہ

1233ھ

ان اموات کے بعد میر رشک بہت پریشان ہوگئے۔

لکھنؤ میں میر رشک کی ایک خالہ بھی تھیں۔ ان کی وفات کی تاریخ انھوں نے اس طرح کہی ہے۔

خواہرِ مادرِ من والدۂ میر اسد   زجہانِ گذراں رو بہ جناں شد ہے ہے
گفتم ایں مصرع تاریخ وفاتش اے رشک   اربعا بیستم ماہ صفر ئد ہے ہے

1238ھ

یہ میر اسد معتمد الدولہ آغا میر کے متوسلین میں تھے۔ غالباً انھیں کے توسط سے میر رشک نے آغا میر تک رسائی حاصل کی ہوگی اور ان کے بڑے بیٹے امین الدولہ آغا علی خاں کے یہاں ملازم ہوگئے، پھر ان سے محبت کا رشتہ ایسا استوار ہوا کہ آخر تک انھیں کے ساتھ رہے۔

لکھنؤ پہنچنے کے بعد میر رشک نے شیخ ناسخ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ اس کی کیفیت سعادت خاں ناصر نے اس طرح قلم بند کی ہے:

''اس وقت بہ سبب اپنی اجنبیت کے (رشک نے) دریافت حال شعرائے لکھنؤ میر (خلیق) صاحب مرحوم سے کیا اور سفارش چاہی۔ میر صاحب نے بعد تامّل کے فرمایا کہ میرے دوستوں میں شیخ امام بخش ناسخ ہیں کہ طبیعت ان کی بہت متین اور فی زمانہ ایسا اور کوئی شاعر نہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر رہنا۔ میں نے خط سفارش کا طلب کیا۔ کہا: اس کی احتیاج نہیں۔ میرا سلام کہنا اور اپنا کلام پڑھنا۔ القصہ فیض آباد سے لکھنؤ آیا اور میر امجد علی ہشیار کی معرفت شیخ صاحب کی خدمت میں باریاب ہوا۔ بطریق نذر بعد سلام و پیام ایک غزل پیش کش کی۔ فرمایا: اسے چھوڑ جاؤ کہ اصلاح کی جائے گی۔ جب دو چار دن کے بعد میں حاضر ہوا فرمایا کہ وہ مسودہ گم ہوگیا۔ اگر تمھیں نے کہی تھی اور کہہ سکتے ہو۔ میں نے اسی زمین میں اور شعر کہے اور شیخ صاحب نے اُسے زیورِ اصلاح سے آراستہ فرمایا۔ وہ ربیع الاول 1231ھ تھا کہ ابتدائے زمانۂ شاگردی ہوا۔ اب جو میں نے فکر کی کہ تاریخ اپنے شاگرد ہونے کی کہوں کہ یادگار رہے، لفظ <u>ناسخ</u> اور لفظ <u>رشک</u> کے وہی سنہ ہوئے

520 + 711

یعنی دو تخلص مل کے تاریخ شاگردی کی حاصل ہوئی۔ یہ عجیب قصہ اتفاقیہ ہے۔''112

''سید امجد علی ہشیار تخلص ولد سید غلام حسین، تولدش در الہ آباد است، وطن بزرگانش شاہجہاں آباد۔ خود بود و باش از چندے در لکھنؤ دارد۔ مشارٌ الیہ داماد میاں تجلی است۔ عمرش تخمیناً چہل و پنج خواہد بود۔ باوصف بے علمی و ناخواندگی چیزے کہ موزوں میکند از زبانش درست ہی برآید۔ ایں فیض خاندان میر محمد تقی مرحوم است۔ سرے بہ گفتن ہجو ہم دارد۔ ہر چہ می گوید از نظر ناسخ می گزراند۔''113

اسی تذکرے میں مصحفی نے ناسخ کی عمر ''سی و ہفت سالہ'' لکھی ہے چنانچہ یہ خیال، غلط نہیں معلوم ہوتا کہ شاگرد ہونے کے باوجود ہشیار اپنے استاد ناسخ سے کافی بڑے تھے۔

ناسخ اپنے بزرگوں کے مذہب کو چھوڑ کر شیعہ ہوئے تھے۔ وہ ان لوگوں کے مقابلے میں جو

خاندانی شیعہ تھے، خصوصاً جو سادات میں سے تھے، ایک حد تک کمتری کے احساس میں مبتلا تھے۔ میر رشک کے بیٹے علی ضامن کی شادی کے موقع پر انھوں نے جو قطعۂ تاریخ کہا تھا اس میں یہ دو شعر بھی تھے:

صد و بست سالہ شود والد تو　　ز وضعِ تو راضی شود والد تو

جناب معلّائے او قبلۂ من　　تو ہم ہستی اے نیک خو قبلۂ من

اس میں چوتھا مصرع خصوصیت سے توجہ طلب ہے۔ ایک اور قطعہ میں ناسخ نے ایک غیر سید کے لیے بھی کہا ہے۔

چو حُبِّ نبیؐ وآلِ نبی ست　　فرض شد برہمہ محبت او

میر رشک خود سید تھے اور وہ ایک سید میر ہشیار کے ساتھ شیخ ناسخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ بے شک ناسخ نے میر رشک کی صلاحیت کا امتحان کیا تھا، لیکن وہ اس سیدزادہ کے ساتھ جس احترام و عقیدت سے پیش آئے ہوں گے اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ میر رشک ان کے شاگرد ہو گئے اور تا حیات دونوں کے مابین پُر خلوص روابط قائم رہے۔

ناسخ کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد میر رشک عملاً اپنے پہلے استاد میر خلیق کو بھول گئے۔ رشک کے کلام میں بجز ان کی وفات کے قطعۂ تاریخ کے ان کا کہیں نام نہیں آیا ہے۔ پُرانے کلام کو میر رشک نے یا تو ضائع کر دیا یا پھر ناسخ کی اصلاح سے اسے نیا بنا لیا تھا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان کے موجودہ کلام میں میر خلیق سے تلمذ کا اثر بالکل باقی نہیں ہے۔

میر علی اوسط رشک ایک مذہبی عالم کے بیٹے تھے اور خود بھی راسخ العقیدہ اور مذہب پسند شخص تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو بھی اسی سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ چنانچہ ذیل کے شعروں میں کہتے ہیں۔

رحیق ساغر توحید کا ہے نام شراب　　نہ یہ شراب جو پیتے ہیں خاص و عام شراب

بجائے آب عناصر میں ہے شرابِ طہور　　سڑی نہیں جو پیوں یہ نجس حرام شراب

وہ مست ہوں کہ مرا میکدہ ہے بیت اللہ　　طوافِ کعبہ ہے دور اور حج کا نام شراب

درود آل محمدؐ ہیں نشہ کی باتیں　　یہاں صلوٰۃ ہے صہبا، یہاں سلام شراب

محبِّ ساقیِ کوثر کے حق میں ہے اے رشک　　گزک فواکہِ جنت، ہے طہور شراب

ہمارے خانۂ دل میں وہی پیدا و پنہاں ہے　　یہاں پیدا ہوا اے رشک جو اللہ کے گھر میں

تیری باتیں خدا کی باتیں ہیں　　کلمۂ حق میں کچھ کلام نہیں

ان شعروں سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ شراب، عشق اور ان کے متعلقات کو میر رشک نے مختلف لیکن مثبت مذہبی اصطلاحی معنوں میں استعمال کیا تھا اور اپنے اس عمل پر وہ فخر کرتے تھے۔ ان کے دیوان میں بعض غزلیں مطلع سے مقطع تک اسی انداز کی ہیں چنانچہ ان کی صرف دو غزلوں کے مطلع اور مقطعے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

ترے جلال میں ہے اے صنم کسے شبہ　　خدا کا بندۂ مقبول تو ہے بے شبہ

کھلا مدائح وتوصیفِ یا رہا سے یہی　　کہ رشک شیعی اثنا عشر ہے بے شبہ

مدح حیدر میں کہہ غزل اے رشک　　تو اگر طالب شفاعت ہے

قمر برج عزّ و رفعت ہے　　موجۂ لجۂ سخاوت ہے

جس کو کہتے ہیں لوگ ظلِّ ہما

وہ ترا سایۂ عنایت ہے

زندگی میں پیش آنے والے معاملات اور واقعات کے علاوہ میر رشک کے کلام میں اردو شاعری کی روایتوں کی بھی بخوبی عکاسی ہوئی ہے۔ ذیل میں ان کے دو شعر نمونہ کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں۔

بُتِ رقاصہ کا گانا سُنا تھا، نا چنا دیکھا　　بنائے کام بندے کے خدا کی کارسازی نے

معشوقہ ہے کون سی جو اے حور　　عاشق ترے نام کی نہیں ہے

لیکن جس معاشرے میں عورت کو "عورت" (= مستور) تسلیم کیا گیا ہو وہاں یہ صورت عام نہیں ہو سکتی تھی۔ تانیث کے صیغوں کا استعمال اور جنس کا اظہار اسے بے پردہ کر دینے کا مرادف خیال کیا جاتا تھا چنانچہ بات کو اس طرح کہتے تھے۔

کبھی دھوپ دو گے جو سادے دوپٹے　　تو مہر فلک سے کرن چھین لیں گے

میر رشک کے کلام کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے مندرجہ بالا نکات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

میر رشک نے عموماً طویل ردیفوں اور سنگلاخ زمینوں میں غزلیں کہنے سے احتراز کیا ہے۔ ان کے پہلے دیوان میں صرف ایک غزل کی ردیف چار لفظوں پر مشتمل ہے اور اس کا مطلع یہ ہے۔

ملالِ راہ اٹھانے کو کون کہتا ہے　　مجھے بُلا تجھے آنے کو کون کہتا ہے

اس چار لفظی ردیف کو بھی دقت طلب نہیں کہا جا سکتا ہے۔ عام طور سے انھوں نے ایک یا دو لفظی ردیفیں اختیار کی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے دیوان میں غیر مردّف غزل بھی موجود ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے۔

جو غیر کی بزم میں جاتے تو مستیاں ساری بھول جاتے　　کباب آسا اگر جلاتے تو ہم بھی تم کو مزا چکھاتے

اس زمانے میں جب کہ دہلی اور دوسرے مراکز پر شاہ نصیر اور ان کے متبعین کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی، میر رشک کا یہ اقدام قابلِ توجہ ہے۔

میر رشک نے اپنی مختصر ردیفوں میں بھی زبان دانی اور قافیہ بندی کے کرشمے دکھائے ہیں۔ ان کی ایک غزل کا مطلع درج ذیل ہے۔

کہاں یہ لطف چیتے نے کمر پائی اگر پتلی　　تمھارے ہونٹ پتلے، انگلیاں پتلی، کمر پتلی

اس غزل میں یہ شعر بھی کہا ہے۔

جسے بَر کی لگائی کھیل میں، نیزہ اسے مارا　　سروہی بن گئی جب ہاتھ میں قاتل نے مرپت لی

اسی طرح ایک غزل ہے بادِ فنا کے جھونکے، تند ہوا کے جھونکے، اس میں مقطع یہ ہے۔

رشک بیمار ہے ان زہر بھری آنکھوں کا　　زہر تھوڑا کوئی کاسوں میں دوا کے جھونکے

اس سلسلے میں میر رشک کا کہنا ہے کہ۔

مجھ کو بھاتے ہیں وہ الفاظ جو ہوں پہلودار　　تازہ مضموں ہے وہ نکلے اگر بات میں بات

واقعہ یہ ہے کہ وہ "تحقیقِ الفاظ" کو شاعری کے لیے لازم وملزوم سمجھتے تھے اور اسی لیے کہتے تھے کہ۔

اے رشک حالِ غفلت اہلِ سخن یہ ہے　　افسانوں کی تلاش ہے فرہنگ کے عوض

ان کے خیال میں شاعر کا کام یہ تھا کہ وہ کسی بھی مضمون کو مناسب ترین لفظوں میں ان کی صحت، اصل، اور محل استعمال وغیرہ کے اہتمام کے ساتھ نظم کر دے۔ مضامین ومطالب (=

افسانوں) کی تلاش کو وہ شاعر کے فرائض میں داخل نہیں سمجھتے تھے۔شعر کے مطالب کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ع:

ممنوع ہے الحق سخن کذب کا الحاق

یہی وہ بات ہے جو ایک مدت کے بعد حالی نے اس طرح کہی تھی۔

وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری　　قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کچھ نماز تو

اور اسی نقطۂ نظر سے اپنی شاعری کے بارے میں میر رشک نے کہا تھا کہ۔

جو اہل زہد ہیں کیفیتیں اٹھاتے ہیں　　مری زبان ہے ساغر، مرا کلام شراب

نواب معتمد الدولہ آغا میر معزول ہو کر شہر بدر کیے گئے تو وہ اپنے متعلقین اور متوسلین کے ساتھ لکھنؤ سے کانپور پہنچے۔میر رشک بھی اس قافلے میں شامل تھے۔چند سال کے بعد جب ان کی لکھنؤ کی املاک واگذاشت ہوئی تو آمدورفت کا سلسلہ شروع ہوا۔ابن امین اللہ طوفان کے تذکرے میں ہے:

''میر علی اوسط رشک تخلص، از شاگردان معتمد حضرت شیخ عبداللہ ناسخ و(خلیق) از پسران میر حسن دہلوی صاحب مثنوی، کلامش لطیف و مضمونش تازہ، بالفعل درکانپور تشریف می دارد۔اکثر شریک مشاعرۂ مرزا برق می شد، چوں کارکن واستاد امین الدولہ مہر تخلص پسر مہین نواب معتمد الدولہ مرحوم است۔درلکھنؤ گہگاہ رونق افروز می شود۔دو شعر از غزلش یاد است۔

مہندی لگا کے باندھے جو پتے ارنڈ کے　　ہم بدگمان سمجھے کہ ہے ہاتھ ہاتھ میں

منظور ہووے گر ید قدرت کا پشت خار　　سکھلا کے رکھے آپ مرے ہاتھ ہاتھ میں

لکھنؤ میں مرزا برق کے مشاعروں کی دھوم تھی۔ان مشاعروں کا ذکر سعادت خاں ناصر کے تذکرے کے علاوہ مرزا رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عجائب میں بھی آیا ہے۔میر رشک بھی ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ 1251ھ (36-1835) میں مرزا برق بیمار ہوئے۔ شفا پائی تو میر رشک نے تاریخ کہی۔

جناب برق کو حاصل ہوئی صحت خداوندا ۔۔۔ دعا مقبول کی تو نے ہمارا درد دل جانا
مٹے امراض تینوں، رشک نے تاریخ یہ پائی ۔۔۔ گئی بارے کی تپ، دل کی طپش، کاندھے کا بل جانا

1251ھ

امین الدولہ مہر کے کارکن کی حیثیت سے میر رشک کانپور سے لکھنؤ میں آتے رہتے تھے۔ ابن طوفان نے ان کے جو دو شعر نقل کیے ہیں وہ میر رشک نے غالباً کسی مشاعرے میں سنائے ہوں گے۔ وہ دونوں شعر ان کے کسی دیوان میں داخل نہیں ہیں۔

میر رشک کے مطبوعہ دیوان کے سرورق کی عبارت حسب ذیل ہے۔

'' ثنائے رنگیں نویس مطلع مہر تاباں موزوں فرمائے مصرع سروروان کہ دو عروس زیبائے نظم سخن و دو شاہد رعنائے ایں گرامی فن فرقدان اوج بلند نامی نظم مبارک و نظم گرامی کہ ہر دو دیوان حوض
1261 1253
طلیق اللسان سیر علی اوسط رشک سلمہ الرحمٰن است بفیض اہتمام حاجی حرمین مولوی محمد حسین بزیور طبع محلی و مزین کردید۔''

یعنی دونوں دواوین کے نام تاریخی ہیں اور یہ نام خود مصنف کے رکھے ہوئے ہیں چنانچہ نظم مبارک کے آخری مقطع میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔

مرتب ہو چکا اے رشک یہ نظم مبارک جب ۔۔۔ محشیٰ ہوگیا ترتیب میں نظم گرامی سے
1253 ۔۔۔ 1261

یہ مقطع بدیہی طور پر 1261ھ سے پہلے نہیں کہا گیا تھا۔ اس کی پہلے دیوان میں شمولیت قابل توجہ ہے۔

اور ایک غزل میں جو نظم مبارک میں شامل ہے یہ شعر ہے۔

گلشن جنت میں ناسخ جا کے پیشی لے گئے ۔۔۔ کچھ نہ کچھ فرق ہو شاگرد میں استاد میں

ناسخ نے 24 جمادی الاوّل 1254ھ (اگست 1838ء) کو وفات پائی تھی۔ یہ شعر بلکہ بہ گمان غالب پوری غزل اس تاریخ کے بعد کسی وقت کہی گئی ہوگی۔ ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ نظم مبارک میں بلاشبہ کچھ کلام 1253ھ (1837ء) کے بعد کا بھی شامل ہے۔

کسی بھی قدیم تذکرے میں (بہ شمول خوش معرکۂ زیبا) نظم مبارک کے 1253ھ میں مرتب کیے جانے کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ اس کا کوئی قلمی نسخہ بھی اس زمانے کا لکھا ہوا دستیاب نہیں ہے، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ اس دیوان کی ترتیب فی الواقع 1253ھ میں عمل میں نہیں آئی تھی۔

میر رشک نے 1261ھ میں اپنے دواوین کی ترتیب کی فکر کی تھی۔ اس کام سے فرصت ملی تو انھوں نے یہ مقطع کہا ۔

فرصت اس نظم گرامی سے جو پائی اے رشک   بہر تاریخ یہی نام سزا وار ہوا

1261

انھوں نے غالبًا یادداشت سے اپنے پرانے کلام کو الگ کیا اور اس کے لیے نظم گرامی کی مناسبت سے تاریخی نام کی تلاش کی۔ نظم مبارک ہاتھ آیا۔ یہی نام رکھ دیا۔ طباعت کے لیے ایک کو حوض میں اور دوسرے کو حاشیے پر لکھوایا۔ کلام کی تقسیم اس طرح کی کہ دونوں میں ہر ردیف کا کلام قریب قریب ایک ہی صفحہ پر تمام ہو۔ دونوں دیوان صفحہ 391 پر مکمل ہو گئے۔ رباعیات 392، 393 صفحوں پر لکھی گئیں۔ اور قطعات تاریخ دونوں میں صفحہ 403 تک لکھے گئے۔ حاشیہ پر جہاں نظم گرامی کی کتابت تمام ہوئی ہے، پہلا قطعہ تاریخ لکھا گیا ہے جو 1219ھ سے متعلق ہے۔

دونوں دیوان 1261ھ میں چھپ گئے۔ اس کے بعد ان پر نظر ثانی کی اور بعض شعروں کو درست کیا۔ اس کے لیے ''صحیح نامہ'' مرتب کرنے کے علاوہ بعض صفحوں کو دوبارہ چھپوا کر شامل کیا۔ اس کام میں دو برس لگے۔ ان کے ایک شاگرد مرزا علی تخلص بہار نے ایک قطعہ میں اس کی روداد نظم کی ہے۔ اس طرح ۔

مرے استاد کی زہے تحقیق   صحت لفظ کا ہے شغل مدام
نظرِ ثانی آپ کی اس پر   دوستوں نے بھی کی عنایت تام
ہوگئے جب کئی ورق مشکوک   سر نو منطبع ہوئے وہ تمام
اس کی تاریخ اے بہار ہوئی
غلطی سے جدا کیا ہے کلام

1263ھ

اس مصرع کے سامنے اگر چہ 1263ھ چھپا ہوا ہے اس سے 1264 کے عدد برآمد ہوتے ہیں۔ غالباً شاعر نے مصرع کی بے ساختگی پر نظر کر کے اس فرق کو گوارا کر لیا ہوگا۔

دوستوں کی عنایت کی صورت جس کا اس قطعہ میں مذکور ہے غالباً یہ ہوئی ہوگی کہ ان سے رشک کو قطعات تاریخ مل گئے ہوں گے۔ پہلی اشاعت میں صرف ایک قطعہ 1253ھ کا ہے اور نظر ثانی کے بعد اس میں 1263ھ مطابق 1255 فصلی مطابق 1847ء تک کے قطعات تاریخ کے علاوہ اس کی طباعت سے متعلق شاگردوں کے کہے ہوئے قطعات تاریخ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اور اس طرح بہ ظاہر دیوان مکمل ہو گیا ہے لیکن جیسا کہ اوپر تذکرۂ ابن طوفان کے حوالے سے کہا جا چکا ہے، میر رشک کا کچھ کلام ایسا بھی تھا جو اس دیوان میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا۔

نظم مبارک میں میر رشک نے بحدِ امکان اپنے قدیمی کلام کو شامل کیا ہے۔ ابتدائی زمانے میں وہ معمولاً اپنے استاد ناسخ کی اقتدا اور اتباع کی کوشش کرتے رہے تھے چنانچہ اس دیوان میں اس کا مختلف انداز سے مذکور ملتا ہے مثلاً ایک شعر یہ ہے ۔

مرے کلام کا استاد و مقتدا اے رشک   کلام ناسخ معجز کلام ہوتا ہے

اس دیوان میں وہ کوتاہیاں، خامیاں اور فروگذاشتیں بھی ہیں جو نو عمری میں متوقع تھیں اور وہ بھی ہیں جو استاد کے کلام میں دیکھی اور پائی تھیں مثلاً استاد نے رنگِ پاں کی ترکیب نظم کی تھی۔ شاگرد کے کلام میں ناؤ عمر، ناؤ خانی، تصویرِ کٹاری، تصویرِ چھری اور بیلِ ترنج وغیرہ کی قسم کی ترکیبیں آئی ہیں، چنانچہ ذیل کے شعروں میں ہیں۔

جھوٹ سے سچ ہے کہ بیڑا پار ہوتا ہی نہیں   کثرتِ بہتاں سے ناؤ عمر طوفانی ہوئی

باندھ اے قاتل خلق اس کمر نازک پر   کوئی تصویرِ کٹاری، کوئی تصویرِ چھری

مقامی بول چال اور روزمرہ کا اثر بھی اس مجموعے میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے مثلاً

شاہِ خیبر گیر سے مرحب کو نسبت کون تھی   در ہلانا اور تھا، مگدر ہلانا اور تھا

جس نے منعم کو کیا منعم، اسے کمتی نہیں   مانگنا بندے سے ہے بیجا، خدا سے مانگیے

بات بنتی نہیں جز گریہ وجز خاموشی   بگڑی معلوم پڑی تیری نظر، تیری بات

ان کے کلام میں بدلی، بوندی، امٹ، کون حقیقت اور بتوں کو ہوتیں (= بتوں کے ہوتیں)

وغیرہ کا صرف بھی اسی قبیل سے ہے۔ بعد کے زمانے میں انھوں نے ان سب کو ترک کر دیا چنانچہ دیوان کے صحیح نام سے ظاہر ہے۔ زبان و بیان کے دوسرے مختلف مسائل مثلاً املا، تلفظ، تذکیر و تانیث وغیرہ کا معاملہ بھی یہی ہے۔

23۔ عرش

محمد تقی میر کے بیٹے تھے اور اسی لیے فخر سے کہتے تھے۔

مری اے عرش گھٹی میں پڑی ہے ریختہ گوئی　　　مری اردو زباں ہے، ہوں خلف میر سخن داں کا

شروع میں زار تخلص کرتے تھے چنانچہ شیخ مصحفی نے ان کا ذکر اسی تخلص سے کیا ہے۔ لکھا ہے:

> ''میر حسن عسکری زار تخلص پسر میر، بمقتضائے موروثی موزون الطبع برآمدہ، چیزے کہ موزوں می کند آنرا بہ نظر امام بخش ناسخ می گزارند، ایشاں گفتہ می دہند وآں کودکاں را در حداثت سن بلوغ ایں فصاحت و بلاغت کے حاصل میشود۔ روئیہ پدرش دیگر بود و او بہ روئیہ دیگر افتادہ۔ عرش قریب سی خواہد بود۔''114

مصحفی کے اس بیان کی موجودگی میں ان کا شاگردِ ناسخ ہونا یقینی ہے بلکہ یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ شروع زمانے میں بعض لوگوں کا یہ خیال بھی تھا کہ ناسخ خود شعر کہہ کر ان کو دے دیتے تھے۔ ناسخ اور ان کے بیشتر تلامذہ معتقدِ میر'' تھے چنانچہ ان کے بیٹے کے ساتھ ناسخ کا مربیانہ معاملہ خلافِ قیاس نہیں معلوم ہوتا ہے۔ شعر کے روئیہ کی جو بات مصحفی نے کہی ہے وہ بھی غلط نہیں ہے چنانچہ ابتدائی زمانے میں حسن عسکری زار سے منسوب کلام کا نمونہ یہ ہے۔

وصل منظور ہے، فرقت سے کنارہ کب ہے　　　وہ بھی اولیٰ ہے تجھے، یہ بھی مجھے انسب ہے
میرے مرنے سے جو تو خوش ہے تو میں بھی راضی　　　جو کہ مطلب ہے ترا، یہاں بھی وہی مطلب ہے
گرچہ درویش ہوں پر زر نہ لیا سلطاں سے　　　دامنِ حرص رہا دور کفِ احساں سے
رنگ سو بدلے یہاں، پر نہیں ممکن اے زار　　　وصل کا روز مبدل ہو شبِ ہجراں سے

مزاج میں خود پسندی بہت تھی، اسی لیے کچھ مدت کے بعد اپنا تخلص بدل کر عرش مقرر کیا۔ سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

''شاعر نامی، بخنور باغلو، میر حسن عسکری عرف میر کلو، تخلص عرش خلف الرشید میر
محمد تقی میر، پہلے تخلص میر موصوف کا زار تھا۔ اب اگر تخلص کو بازگشت ہوگی
تو سوالا مکاں کے ممکن ہونا معلوم۔ شاگرد امام بخش ناسخ۔ جب اپنے شعر کسی
کے سامنے پڑھتے ہیں تو اس نقل کو بیان کرتے ہیں کہ میر لنگر باز نے میرے شعر
سُن کر زیر فلک سر برہنہ بہ خضوع و خشوع یہ دعا مانگی:

'بارالٰہا میر کلو کو مرتبہ میر عطا فرما'

میں نے ان کا بلبلانا دیکھ کر کہا: آپ عنایت کی راہ سے یہ فرماتے ہیں، میں تو میر
تقی سے بہتر ہوں:''115

عرش کے دیوان میں اشعار ذیل کی موجودگی میں اس روایت کی صحت کو تسلیم کرنے کے لیے
ذہن آمادہ نہیں ہوتا ہے۔

لاکھ تقلید کیجیے اے عرش پر کب اندازِ میر آتا ہے
میرے دم تک عرش ہے روشن چراغ دودماں   پھر نہیں کوئی جناب میر کی اولاد میں

میر نے جس کسم پرسی میں وفات پائی تھی، اس کی طرف اشارہ کر کے عرش نے خود اپنے
حالات کا بیان اس شعر میں کیا ہے۔

اے عرش ہے یہ حال زمانے کا مثل میر   گر مر بھی جایئے تو کسی کو خبر نہ ہو

میر نے اپنی شاعری کے بارے میں کہا تھا کہ ع درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا
لیکن عرش نے اپنی شاعری کے ذریعے سے کلام کے محاسن و معائب کی تعلیم دینے کی کوشش
کی تھی اور یہ وہ بات ہے جو انھیں شیخ ناسخ کے تلمذ سے ہاتھ آئی تھی۔ عرش کے دیوان میں ایک غزل
ایسی ہے جس میں ہر شعر مطلع ہے۔ اس کے مقطع میں انھوں نے فخریہ کہا ہے۔

تیرا ایجاد ہے اے عرش مطالع کی غزل   غزل اشعار کی اک اور سُنائی ہوتی

دوسری غزل میں طرح طرح کے قوافی نظم کر کے اس کے مقطع میں ایک اصولی نکتہ نظم کیا ہے۔

حرف وصلی کے ہوں اے عرش قوافی جن میں   انھیں بیتوں میں ہے ایطا کی بُرائی ہوتی

معلوم ہوتا ہے کہ عرش نے سب سے زیادہ زور ایطا کے عیب کی تعلیم پر دیا ہے اور اس مقصد

کے لیے انھوں نے چند غزلیں ایسی کہی ہیں جن میں کوئی شعر بھی اس عیب سے خالی نہیں ہے چنانچہ ان مقطعوں سے ظاہر ہے۔

ایطا سے کوئی بیت بھی خالی نہیں ہے عرش ساری غزل کہی ہے تعلیم سنگ سے
کہہ کے معیوب قوافی میں یہ اے عرش غزل ہم کو ابیات کا ایطا بھی بتایا تو نے

مسئلہ چونکہ قافیے کے حُسن اور عیب کا تھا عرش نے ایک غیر مردّف چوغزلہ تصنیف کیا۔ دلی جذبات اور قلبی واردات کو حاصلِ شاعری کہنے والے اس قسم کے کلام کی داد نہیں دے سکتے تھے اس لیے مذکورہ چوغزلہ کے آخری مقطع میں عرش نے کہا۔

نہیں گو قدرداں دنیا میں اے عرش خدا کرتا ہے اپنی قدردانی

لیکن اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ عرش معمولاً سہ غزلے، چہار غزلے کہتے رہے ہیں۔ بے شک انھوں نے دوغزلے کئی کہے ہیں لیکن سہ غزلوں وغیرہ کی تعداد ایک دو سے زیادہ نہیں ہے۔ اس مقام پر یہ ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دوغزلے وغیرہ کہنے کے لیے بھی مشق ومہارت ضروری ہے۔ عرش نے اس سلسلے میں خوب کہا ہے۔

گوہر مضموں نکلتے عرش ہیں ہر بحر سے صورتِ دریا طبیعت میں روانی چاہیے

بعض کم اندیش اہل لکھنؤ کی شاعری پر یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ وہ خیال آرائی اور قافیہ پیائی میں منہمک رہتے تھے اور ان کے کلام میں حوادثِ زمانہ کا اثر تک معلوم نہیں ہوتا۔ یہ اعتراض شاعری ہی نہیں، شاعر کے مزاج کی طرف سے بھی آنکھیں بند کر لینے بلکہ خود ایک زندہ شخص کو سنگ وخشت خیال کر لینے کے مرادف ہے۔ فرنگیوں کے جور و استبداد سے خصوصیت کے ساتھ اہل لکھنؤ کے دل بھی چھلنی ہو رہے تھے۔ ان کا کلام ان معاملات کے ذکر سے خالی کیونکر رہ سکتا تھا۔ عرش کی ایک غزل کے جس کا مقطع اوپر نقل کیا جا چکا ہے چند شعر یہ ہیں۔

یہ سوجھتی ہے نشۂ سرشارِ بنگ سے کچھ کھا کے مریے لڑ کے کسی سبزہ رنگ سے
ہنستے ہیں تیر پر لب سوفار رات دن بھاگے کوئی جوان نہ میدانِ جنگ سے
زاہد خدا بھی خوش رہے، دل بھی خفا نہ ہو جزیہ میں لے شراب بتانِ فرنگ سے
مرنا قبول، قیدِ محبت نہیں قبول بہتر ہے گورِ تنگ بھی زندانِ تنگ سے

ساغر میں بادہ آئے تو جان آئے جسم میں　　شیشہ بھی ہے کو کم نہیں قیدِ فرنگ سے
لڑیے نہ اک اشارۂ ابرو ہی کیجیے　　تلوار ماریے مجھے ہر دم کی جنگ سے
غربال ہوگا پردۂ گردوں میں آفتاب　　سینے میں دل بچا نہ نگہ کی خدنگ سے
ہر دل میں مثلِ شیشۂ ساعت غبار ہے　　اک آئینہ بھی صاف نہیں داغِ زنگ سے

لایا ہے شوقِ بادہ تو مُلکِ فرنگ عرش
ایماں خدا بچائے بُتانِ فرنگ سے

(5)

24-نوازش

یہ بھی لکھنؤ میں اپنے وقت کے مسلم الثبوت استادوں میں سے تھے۔ شیخ مصحفی نے ان کے تعارف میں لکھا ہے کہ:

"نوازش حسین خاں نوازش تخلص عرف مرزا خانی ولدِ حسین علی خاں ابن نواب ناصر خاں صوبہ دار کابل وپشاور وغزنی قوم مُغل چغتی، وطن بزرگانش (افغانستان) خود دراکبرآباد تولّد شدہ و در لکھنؤ نشو و نما یافتہ، جوان مہذب الاخلاق وخود بیں و خوش اختلاط است۔ از سنِ ہنیر دہ سالگی شوقِ موزونیٔ شعر بہم رسانیدہ، در وضعِ گفتن و خواندنِ شعر متتبع میر سوز است و خود را شاگرد ایشاں می گوید۔ دیوان اول بطور ایشاں گفتہ و حالا یک دیوان دیگر ہم جمع نمودہ"116۔

مصحفی نے تحریرِ حالات کے وقت ان کی عمر نہیں بتائی البتہ دوسرے دیوان کے مرتب ہوجانے سے ظاہر ہے کہ اُس وقت مرزا نوازش کہنہ مشق تھے۔ اس زمانے کے ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

بلبل کو رگِ گل ہی ہے دامِ گرفتاری — صیاد نہ لے سر پر الزامِ گرفتاری
او بلبلِ شوریدہ کیا پھول کے بیٹھی ہے — پھر نکہتِ گل لائی پیغامِ گرفتاری

جی دیگی ابھی اپنا بلبل قفسِ تن میں　　صیاد تو لیتا ہے کیوں نامِ گرفتاری
پھر بعد کبھی دن کے ہاتھوں پہ لگا رکھتے　　آغاز سے بہتر تھا انجامِ گرفتاری
تاریکیِ گور اس دم یاد آئی نوازش کو
اس زلف نے دکھلائی جب شامِ گرفتاری

عکس کس کا یہ مرے پیش نظر رہتا ہے　　جو در دیدہ کھلا آٹھ پہر رہتا ہے
کس کی آمد کا تصور یہ بندھا ہے مجھ کو　　جو مرا دھیان سدا جانب در رہتا ہے
شب کو میں نے جو کہا آج تو رہتا ہوں کہ میاں　　روز کاہیکو کسی کے کوئی گھر رہتا ہے
مُنہ سے یہ شوخ کے چھوٹا نہ ذرا، بل بے بخیل
کہ یہ گھر ہے ترا رہ جانہ اگر رہتا ہے

وہ زمانہ تھا جب لفظوں کی تذکیر وتانیث متعین نہیں ہوئی تھی۔ خود شیخ ناسخ کے کلام میں بھی لفظ بلبل دونوں طرح یعنی مذکر اور مونث نظم ہوا تھا۔ آغا نوازش اس کی تانیث کے قائل تھے۔ بعد میں میر رشک نے بھی اسی کو اختیار کیا۔

آغا نوازش کے کلام میں اکثر قدیم الفاظ کا صَرف ہوا ہے مثلاً بل بے، کاہیکو، اور میاں وغیرہ۔

مرزا رجب علی بیگ سروران کے نامور شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے ''فسانۂ عجائب'' میں آغا نوازش کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> ''بندۂ کمترین تلامذہ اور خوشہ چین خرمن سخن جناب قبلہ وکعبہ استاد شاگرد نواز، معزز وممتاز، مجمع فضل وکمال نیک سیرت فرخندہ خصال خرد آگاہ دانش آموز ویادگار جناب میر سوز......نوازش حسین خاں صاحب عُرف مرزا خانی تخلص نوازش کا ہے۔ حقیقتِ حال یہ مقام ہے طرز ریختہ اور روز مرہ اردو کا ان پر اختتام ہے۔ شعر ان کے واسطے، وہ شعر کی خاطر موضوع ہیں۔ کہنے کے علاوہ پڑھنے کا یہ رنگ ڈھنگ ہے، اگر طفل مکتب کا شعر زبان معجز بیان سے ارشاد

کریں فیض دہان تاثیر بیان سے پسند طبع سحبان وایل ہو۔ فی زمانناتو کیا سابقین جو موجد کلام کو بس لسن الملکی بجاتے تھے، ان کے دیوانوں میں دس پانچ شعر تناسب لفظی یا صنایع بدایع کے ہوں گے وہ ان پر نازاں تھے اور متاخرین فخریہ سند گردانتے ہیں، لہٰذا جس شخص کو فہم کامل یا اس فن میں مرتبہ کمال حاصل ہو اور طبع بھی عالی ہو، آپ کا دیوان بچشم انصاف و نظر غور سے دیکھے کوئی غزل نہ ہوگی جو ان کیفیتوں سے خالی ہو۔ ہر مصرع گواہ ہزار صنعت، ہر شعر شاہد لاکھ صفت مطلع سے مقطع تک ہر غزل مرقع کی صورت، اکثر اشعار آپ کے تبرکاً و تیمناً بہ طریق یادگار بندے نے لکھے ہیں۔"117

فسانہ عجائب میں منقول نوازش کے دو چار شعر یہ ہیں۔

یوں وصلی کے بھی کاغذ چسپاں بہم نہ ہوں گے	ایام وصل میں ہم لپٹے ہیں جیسے اس سے
الٰہی کوئی کسی کا امیدوار نہ ہو	حرام نیند کی، اقرار وصل جاناں نے
ہجر میں جو آجاوے، عین مہربانی ہے	کب تلک جیوں گا میں، موت اک دن آنی ہے
خدا کی سوں کوئی تم سا بھی بدلگام نہیں	زباں سنبھالو، یہ منہ زوریاں غریبوں پر
کیا بھروسہ مرا، رہا نہ رہا	میں مسافر ہوں مجھ سے دل نہ لگا

نواب مصطفا خاں شیفتہ کو نوازش کا دیوان نہیں مل سکا تھا، اس کے باوجود انھوں نے ان کے چھ اشعار اپنے تذکرہ میں لکھے ہیں۔ دو یہ ہیں۔

رنگا چاہے گر ارغوانی دو پٹا	مری چشم خونبار کے کر حوالے
تجھے بھی طظنہ کتنا ہے اتنی سی کناری پر	یہ بل کرتا ہے تو نوک مژہ کی آبداری پر

ان چند شعروں پر نظر کریں تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ لکھنو کے جن اساتذہ نے شاعری کو صنائی بنا دیا تھا ان میں آغا نوازش کو بھی امتیازی حیثیت حاصل تھی لیکن ان کی بکاوشیں شہر لکھنو میں کچھ موثر ثابت نہیں ہوسکیں۔ وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں انھیں کانپور میں جا کر اقامت اختیار کرنی پڑی تھی۔ سعادت خاں ناصر نے ان کے

حالات میں لکھا ہے کہ:

''خدیو ملکِ سخن رانی، نوازش حسین خاں عرف مرزا خانی، شخصِ باتجمل، خلف الصدق حسین علی خاں ابن نواب ناصر خاں صوبہ دار کابل، تخلص نوازش، شاعری کو اس پر نازش، شاگرد بلکہ قایم مقام میر سوز۔ بندہ ان کی ملاقات سے گاہے گاہے بہرہ اندوز۔ ادابندی کا انتقام، نزاکت شعر خوانی ان پر تمام، اس کے نیز خاص و عام، خود فرماتے تھے کہ میں نے ایک دن شیخ ناسخ سے اپنے باب میں پوچھا کہ آیا میں کیسا کہتا ہوں؟ شیخ صاحب نے کہا: میں قسم کھاتا ہوں اس پر کہ معاملات کے شعر جیسے تم کہتے ہو۔ دوسرا نہیں کہہ سکتا۔ ایک دن مولف سے کہنے لگے کہ ایک خدمت گار کہ ذرا صورت دار ہو نوکر رکھوا دو۔ میں نے گستاخانہ کہا کہ غرور اپنی صورت کا اسے کاروبار سے باز رکھے گا۔ حضرت سلامت کو دوستوں کے واسطے حقہ اپنے ہاتھ سے بھرنا پڑے گا۔ فرمایا یہ قبول ہے۔ سوہانِ روح تو نہ ہوگا۔ چند روز سے بہ سبب خرید کرنے دیہات نیلام کے کانپور میں تشریف رکھتے ہیں۔ گاہے گاہے لکھنو میں بھی آجاتے ہیں۔ ''118

اس زمانے میں کانپور میں بقول رجب علی بیگ سرور ''اشراف عنقا صفت ناپید تھے۔'' وہاں شعر وسخن کے لیے ماحول بھی سازگار نہیں تھا۔ ایسے میں نوازشؔ نے نہ کہنے کے برابر ہی شعر کہے ہوں گے۔

نوازش کے دیوان کا جو مخطوطہ پٹنہ میں ہے، اس میں مشکل سے دو دو سہ غزلے اور دوغزلے ہیں۔ چہار غزلہ کوئی نہیں ہے۔ ردیفیں عموماً مختصر ہیں۔ صرف چند غزلوں کی ردیفیں تین لفظی ہیں۔ ایسی صرف دو غزلوں کے مطلعے نمونہ کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔

کل سے خلوت میں جو وہ یاد کیا کرتے ہیں ۔۔۔ کچھ کہے گا یہی ارشاد کیا کرتے ہیں

زخمِ تیغِ ادا کا قایل ہوں ۔۔۔ اس اچانک قضا کا قائل ہوں

ان کی شاعری کے بارے میں قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے کہ:

''دیوانِ نوازش میں سوز کے خاص رنگ کے علاوہ دردآمیز اشعار بھی ملتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ طرزِ ناسخ کے اشعار اگر ہیں تو بہت کم۔ ان کے دیوان میں بہت سے ایسے الفاظ اور طرقِ استعمال ملتے ہیں جو ناسخ اور ان کے تلامذہ کے یہاں نہیں ملتے۔ ایک عیب، اور یہ سوز میں بھی ہے، یہ ہے کہ غزل میں ایسے الفاظ کھپانا چاہتے ہیں جو غزل کے مزاج کے خلاف ہیں۔''119

25۔ غافل

منور خاں نام، غافل تخلص، شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد تھے چنانچہ انھوں نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

''منور خاں غافل تخلص، ولد صلابت خاں افغان یوسف زئی، بزرگانش سکنۂ فیض آباد بودند و بہ سرکار فیض آباد نواب شجاع الدولہ بہادر بہ فرقہ سواران عز و امتیاز داشتند، خودش در لکھنو تولد یافتہ نشو ونمائے پیدا کردہ، جوان صلاحیت شعار ومہذب الاخلاق است۔ از ابتدائے موزونی طبع در عالم کتب نشنی چیزے بجائے خود موزوں می کرد و آخر شاہ مظہر حق عشاق تخلص کہ ذکرِ ایشاں در حرف العین است تحریر یافتہ بہ حلقۂ شاگردانِ جدید در آمد، چندے رنگ طرحِ مجلسِ مشاعرہ ہم ریختہ بود۔ شعر بطور سادہ و پُرکاری گوید و معنی تازہ نیز اگری خواہدی یابد و در غزل سلامت کلامش مثل سلک گوہر است و ہر روز برائے استفادہ دریافتِ اصلاحِ شعر از حضارانِ مجلسِ فقیری باشد و بہ فقیر نسبت دیگر شاگردان بسیار اعتقاد داشتہ بودہ است۔ عمرش بست و پنج سالہ خواہد بود۔''120

اور عشاق جن کا ذکر اس اقتباس میں آیا ہے۔ مصحفی ہی کے شاگرد تھے چنانچہ ان کے بارے میں مصحفی کا بیان ہے:

''شاہ مظہر حق کہ عشاق تخلص می کند با وصف درویشی سرے بہ حسیناں دارد، ازیں جہت بہ حلقۂ شاگردی فقیر بے ترغیب غیرے در آمدہ، آموختن شعر ہندی را انچہ

می دانست زیادہ براں قصد کردہ۔ قریب سہ چہار سال گذشتہ باشد کہ شعر گفتن
ریختہ را بمرتبہ غزلیت رسانیدہ از حسب و نسبش اطلاع نہ دارم مگر ایں قدر دانم کہ
از ملازمان قدیم آصف الدولہ بہادر مرحوم برادر کلانش بود و ہست۔ مشارٌ الیہ تغیر
لباس کردہ عزلت اختیار نمودہ، عمرش تخمیناً سی سالہ خواہد بود۔''121

معلوم ہوتا ہے کہ عشاق نے نوجوانی میں ہی عزلت اختیار کر لی تھی، اس لیے غافل نے شیخ مصحفی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا اور اسی پر تمام عمر فخر کرتے رہے چنانچہ ذیل کے شعروں میں بھی ہے۔

باشاعران پیشیں غافل مرا چہ کار است   خوش کردہ ایم طرز اشعار مصحفی را
یہ قربت مصحفی کی تو غنیمت جان اے غافل   کہ قسمت ہی سے ہاتھ آتی ہے صحبت ایسے کامل کی

غافل یوسف زئی پٹھان تھے، مرد سپاہی تھے اور اسی پر فخر کرتے تھے۔ کہتے ہیں۔

شاعر نہیں جو فخر کرے شاعری پہ وہ   غافل سپاہی ہے اسے کیا شاعری سے کام
مرد سپاہی رکھتے ہیں غافل خواص شیر   ماریں اسی کو لاکھ میں، جس پر ارادہ ہو
چھپے نہ ہے صورت اشراف بھی کہیں غافل   زمانہ لاکھ ملائے ہمیں کمینوں میں

فقیر محمد خاں گویا سے برادری کا تعلق تھا۔ انھیں کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ محسن نے لکھا ہے:

''داروغۂ سرکار فقیر محمد خاں رسالدار منور خاں مغفور غافل ولد صلابت خاں باشندۂ
لکھنو صاحب دیوان شاگرد رشید غلام ہمدانی مصحفی۔''122

بظاہر اسی ملازمت کی طرف خود غافل نے ذیل کے مقطع میں اشارہ کیا ہے۔

عیب کیا غافل اگر ہم بھی امیروں سے ملے   ملتجی ہوتا ہے ہر اک صاحب مقدور سے

اپنے ماضی کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا ہے۔

یہ وہی غافل ہے جو تھا کل تلک مسند نشیں   آج کو اس در پہ با حالِ خراب استادہ ہے
عرش پروازوں میں تھے ہم بھی کبھی اے غافل   اب تو بے بال و پری ٹھوکریں کھلواتی ہے

ان شعروں میں غافل نے جن حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے ان کی تفصیل معلوم

نہیں ہو سکی۔

فقیر محمد خاں گویا شیخ ناسخ کے شاگرد اور نواب معتمد الدولہ کے معتمد مقربین میں سے تھے۔ ان سے اپنی وابستگی کا ذکر غافل نے اس طرح کیا ہے۔

نمود اتنی کہاں تھی شاعری میں میری اے غافل میں اس شہرت کو فیض صحبت گویا سمجھتا ہوں

خودستائی اور تعلی شاعروں میں عام ہے۔ غافل کچھ مستثنا نہیں تھے۔ ان کے دیوان میں بھی بعض مقطعوں میں ایسے مضامین نظم ہوئے ہیں مثلاً۔

ہر کوئی اٹھاتا نہیں آگے مرے غافل بیٹھا ہے عمل جب سے مرا ملک سخن میں

ڈرتا نہیں کسی کی میں حرف گیریوں سے جائے سخن کسے ہے غافل مرے سخن میں

یہ ذکر آ چکا ہے کہ اُس زمانے کے پٹھان عموماً مذہب پسند ہوتے تھے۔ خود غافل کے یہاں بھی خدا پرستی کا رجحان خاصی حد تک نمایاں ہے۔ ایک مقطع میں کہتے ہیں۔

ہے جناب کبریا میں یہ ہی غافل کی دعا جو کہوں میں شعر وہ مقبول خاص و عام ہو

اور واقعہ یہ ہے کہ اپنے حلقہ احباب میں وہ خاصے مقبول تھے چنانچہ ان کا ایک مقطع یہ ہے۔

گر نہیں دشمن مقر میرا تو اے غافل نہ ہو جانتے ہیں دوست میرے بہتر از سودا مجھے

سعادت خاں ناصر نے شیخ ناسخ کے حال میں ضمناً غافل کا بھی ذکر کیا ہے، اس طرح:

''خواجہ بہادر حسین فراق ان (شیخ ناسخ) کی خدمت میں تشریف لائے اور شیخ صاحب سے کہا کہ منور خاں غافل ان کے شعروں پر اعتراض کرتا ہے۔ بے تامل فرمایا کہ وہ غافل ہے اور غافل بیشتر کلام اللہ پر بھی اعتراض کرتے تھے۔ مجھے یہ تشبیہ ناقص تمام تر ناگوار گزری۔ آخر دریافت ہوا کہ جس پر منور خاں نے اعتراض کیا تھا۔ وہ شعر یہ ہے۔

عجب حالت ہوئی طاری ترے آنے سے گلشن پر کہ یوں بیتاب ہیں گل جس طرح دانے ہوں گلخن پر

اعتراض یہ ہے کہ دانے ریگ پر بیتاب ہوتے ہیں نہ کہ گلخن پر۔ فرمایا کہ مشہور بھاڑ کا گرم ہونا ہے یا ریگ کا۔ میں نے کہا کہ سبحان اللہ کیا خوب جواب آپ

نے دیا ہے۔"[123]

غافل کے حال میں ناصر نے ایک عجیب حکایت نقل کی ہے:

"شاعر ناعاقل منور خاں متخلص بہ غافل، قوم افغان، پسر صلابت خاں، خیل یوسف زئی، نحوست اور شومی اس کے تخلص کی تا مرگ ساتھ رہی۔ یا خدا یہ موت کسی کافر کو بھی نصیب نہ ہو۔ حکایت:

ایک عورت مومنہ اس کے عقد میں تھی۔ محرم کی چاند رات کو اس نے کہا: مجھے اجازت دے تو میں اپنے باپ کے یہاں جاؤں اور تعزیہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا لوں۔ اس نے کہا، یہاں کون تعزیہ داری سے مانع ہے؟ قصہ کوتاہ تعزیہ اس نے رکھا اور رسم تعزیت میں مصروف ہوئی۔ شب ہشتم اس غافل ازلی نے خوب شراب زہر مار کر کے اس مومنہ کو واسطے گزک بوس و کنار کے طلب کیا۔ اس نے اجابت کے عوض ناسزا کہا۔ وہ نہایت تہدید سے ایک چوب اٹھا کر اس کے پیچھے دوڑا۔ وہ بے پناہ دامن تعزیہ میں چھپی۔ غافل بے دین نے چوب دستی تعزیہ پر بلند کی۔ ناگاہ ایک تمانچہ اس کے روئے نجس پر پڑا کہ لقوہ زدہ کی طرح گردن اس کی پھر گئی اور ہیئت اس کی اور ہو گئی۔ وہ ممسوخ صبح ہوتے ہوتے داخل شام تحقین ہوا۔ یا آل نبی ہر کہ دعا فتادبر افتاد۔"[124]

حقیقت یہ ہے کہ غافل نبیؐ اور آل نبیؐ سے پوری عقیدت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کے چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

خوف محشر ہے کیا ہمیں غافل — پیرو آل مصطفیٰ ہیں ہم

مجھ کو اولاد علیؑ سے ہے محبت غافل — حشر ہوئے گا مرا حیدر کرار کے ساتھ

کب ہے اے غافل ہمیں اندیشۂ روز جزا — جانتے ہیں اپنا حامی حیدر کرار کو

اس خاکداں میں ہے مجھے غافل یہ آرزو — گر ہوں غبار بھی تو در بو تراب کا

اس شخص کی خدا پرستی کا اندازہ اس کے ان شعروں سے کیا جا سکتا ہے۔

کٹی ہے یادِ الٰہی میں عمرِ رفتہ مری　　نہ جانا مجھے غافل کہ ہوشیار ہوں میں
عمر باقی ماندہ گذرے یاد میں اللہ کی　　اب یہ ہے ارمان غافل اور کچھ ارماں نہیں
خالق کو رحم آئے جو غافل کے حال پر　　سارے گناہ نامۂ عصیاں سے دور ہوں

غافل صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کے بیٹے میاں جھتو خاں مطبع نول کشور میں ''ملازم باوقار اور اپنی صناعی میں یکتائے روزگار تھے۔'' انھوں نے مالک مطبع سے اپنے حسب نسب کا ذکر کیا تو انھوں نے غافل کا دیوان تلاش کروا کر اپنے مطبع سے چھپوا دیا۔ اس کے آخر میں غافل کا احوال اس طرح لکھا ہے:

> ''شعرائے متقدمین میں جناب استاد الاستاد میاں غلام ہمدانی مصحفی فن شاعری میں بڑے مشاق تھے، شہرہ آفاق تھے۔ نہایت کامل تھے۔ سب چھوٹے بڑے ان کی استادی کے قایل تھے۔ ان کے زمرۂ تلامذہ میں سے مسمی منور خاں ابن صلابت خاں متخلص بہ غافل احاطہ فقیر محمد خاں گویا واقع لکھنؤ میں رہتے تھے، واقعی خوب شعر کہتے تھے۔ طبیعت ان کی نہایت عالی تھی۔ ان کی ادنا کنیز نازک خیالی تھی اگرچہ وہ اس فن میں کامل تھے لیکن اکثر اشخاص ان کے کلام سے بے خبر و غافل تھے۔''

نیاز احمد ہوش بریلوی نے ان کے دیوان کے چھپنے کی تاریخ اس مصرع سے نکالی تھی ع:

<u>چھپ گیا ہے کلام غافل کا</u>

1289ھ

اقتباس بالا میں غافل کی نازک خیالی کا ذکر ہے لیکن خود غافل نے اپنی شاعری کے بارے میں جو کہا ہے، اس طرح ہے۔

سادہ گوئی کی مری قدر ہے ان کو غافل　　جن کو ہے کچھ بھی خبر ریختہ کی اردو سے
سحر کاری تو مری دیکھ کہ کیا کیا غافل　　قافیے میں نے بٹھائے ہیں بہ افسوں خم میں

کیالطف ہے غافل جوغزل کر کیجے موزوں　　　کوئی بھی تومضمون الگ باندھیے سب سے
دعوائے فن شعر مرتب ہے اسی کو　　　جو کوئی کہ غافل ہمہ گو ہو ہمہ داں ہو

غافل کا دیوان مختصر ہے اور اس اختصار کی وجہ بقول غافل یہ ہے ۔

غافل ہے مختصر مرا دیوان اس لیے　　　کم ہو گئے ہیں شعر غزل انتخاب سے

اپنے کلام کا انتخاب کر کے دیوان مختصر تیار کرنے کی روایت شاہ حاتم کے وقت سے چلی آرہی تھی ۔ غافل نے اسی روایت کے مطابق عمل کیا تھا ۔ بعد میں دہلی میں مرزا اسد اللہ خان غالب نے بھی انھیں شعرا کی اتباع کی البتہ انھوں نے شعروں کے انتخاب میں اپنے سخن فہم احباب سے مدد لے کر گویا جدت طبع کا ثبوت فراہم کیا تھا ۔

غافل کے اس دیوان میں صرف ایک سہ غزلہ اور محض دو ایک دوغزلے ہیں ۔ غالباً غافل بہت پُرگو شاعر نہیں تھے لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا دیوان قابل قدر ہے ۔ اس میں اچھے شعروں کی کمی نہیں ہے ۔ کچھ یہ ہیں ۔

مرغ اسیر ہو کے رہا کیا کرے گا تب　　　پرواز ہی کے کام سے جب بال و پر گئے
خنداں ہے لب زخم جو مذبوح کا تیرے　　　کیا اس کو تہ تیغ اذیت نہ ہوئی تھی
تھا دشمن جاں کوئی، کوئی درپے ذلت　　　کس کس کو مرے ساتھ عداوت نہ ہوئی تھی
سینکڑوں فصل بہار آئیں، گئیں گلشن میں　　　نہ ہوئے غنچۂ تصویر سے خنداں ہم تو
خوف صیاد سے بھی ہو نہ سکے ضبط آنسو　　　دیکھ کر رونے لگے حال اسیراں ہم تو
کوئی دنیا میں نہ مجھ سا مورد الزام ہو　　　اور سے بھی گر خطا ہووے تو میرا نام ہو
لطف کیا رہنے کا اس گلشن میں اے بلبل جہاں　　　باغباں صیاد ہو اور موج سبزہ دام ہو

رہی قدر شرافت کیا زمانے کا چلن بگڑا
رزالے اینٹھتے پھرتے ہیں ایسا بانکپن بگڑا

منور خاں غافل نے تو اپنے زمانے کے حالات میں یہ شعر کہے تھے لیکن غور کیجیے تو ان میں سے اکثر میں آج کے معاملات کا عکس بخوبی جھلکتا معلوم ہوتا ہے ۔

(6)

خواجہ حیدر علی آتش بذات خود تو آزاد طبع اور صوفی منش تھے لیکن ان کے حلقۂ تلامذہ میں ہر طبقہ اور مزاج کے لوگ شامل تھے۔ ان میں سے بیشتر نے خود کو مذہب پسندی کے لیے نمایاں کرلیا تھا اور ان کی شاعری بھی عموماً اسی نوعیت کی تھی۔ غزل کے میدان میں ان میں صرف بعض کو شہرت ملی تھی۔ لالا سری رام نے لکھا ہے:

''آتش کے تلامذہ علاوہ رند کے خلیل، صبا، اور نسیم نے بہت شہرت پائی اور استاد کا نام خوب روشن کیا لیکن باغ خلیل پر قبل از وقت خزاں آگئی۔ صبا کا کیا ٹھکانا۔ نکتہ چیں کہتے ہیں کہ ہوا کا ایک جھونکا تھا جو ادھر آیا اُدھر گیا۔ نسیم نے البتہ بقائے دوام کا خلعت پایا مگر وہ صرف گلزار کی بدولت۔ لکھنو کے بعض سن رسیدہ بزرگوں سے سنا کہ خلیل جناب صبا و رند سے بہتر اور افضل تھے۔'' 124

معاصرانہ چشمک کے باوجود شیخ ناسخ کے ساتھ خواجہ آتش کے معاملات محبت اور عزت کے تھے۔ ان کے شاگرد بھی عموماً شیخ صاحب کا احترام کرتے تھے بلکہ واقعات تو اس بات کی بھی شہادت دیتے ہیں کہ ان میں سے بعض کی طبیعت کا میلان انھیں کی طرف تھا اور اس صورت حال کا اثر ان کے کلام پر کم وبیش مرتب ہونا ناگزیر تھا لیکن بطور مجموعی تلامذہ آتش کے کلام کا جوہر

روزمرّہ اور محاورہ کی کمک سے فصاحت وسادگی کے ساتھ معاملات راز و نیاز اور مضامین عاشقانہ ورندانہ کو سمجھا جانا چاہیے۔ شیخ ناسخ نے اپنے شاگردوں کو تحقیق الفاظ اور اصلاح زبان کی طرف مائل کیا تھا لیکن یہ شوق تلامذۂ آتش میں کم سے کم تھا، غالبًا یہی سبب ہے کہ دبستان لکھنو کی علمی حیثیت سے متعلق بحثوں میں ان کا نام کمتر آتا ہے۔

26۔ناصر

خواجہ حیدر علی آتش کے شروع زمانے کے شاگردوں میں سے تھے۔ شیخ مصحفی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"میرزا میر ناصر تخلص شاگرد خواجہ حیدر علی آتش جوان........ وسپاہی وضع بود۔ شعر را بطور یکہ دریں زمانہ کم کم رواج یافتہ ،میگفت وبرخودی پیچید۔ قضاے کار روز مشاعرہ ارادۂ آمدنِ مشاعرہ کردہ از خانۂ خود رواں شدہ بود کہ در اثناے راہ بابت کود کے حسین بہ پیادہ ہاے چوکی مناظرہ درمیاں آمد حتیٰ کہ نوبت بہ کشت وخوں رسید۔ آخر بہ زخم شمشیر زندگانی را جواب دادہ۔ شہادتش در سنہ یک ہزار و دوصد دی (1818) است۔ عمرش از بی متجاوز خواہد بود۔"125

اس کے بارے میں سعادت خاں ناصر کا بیان توجہ کے لائق ہے:

"فکر نادر، طبیعت حاضر، میرزا میر تخلص ناصر، شیعۂ غالی تبرّ داس کا شعار، مقتول بیداد پیادہ ہاے سرکار، شاگرد خواجہ حیدر علی آتش۔"126

امام باڑہ کو عملاً اودھ کی ریاست کی علامت کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں شیعوں کے بیشتر فرقے موجود تھے غالی شیعوں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ میر علی اوسط رشک نے البتہ اپنے بارے میں کہا تھا کہ ۔

حیدرِ صفدر کو گنتا ہے وصیِ مصطفےٰ　　رشک فضلِ ایزدی سے شیعی غالی نہیں

لیکن غالی اور غیر غالی دونوں تبرّہ کے قائل تھے چنانچہ میر رشک نے بھی مثنوی تبرّہ لکھی تھی۔ لکھنو میں تبرّہ پر مشتمل نظم ونثر کا سرمایہ خاصا تھا۔ میرزا میر ناصر نے اس باب میں خود کو نمایاں کر لیا تھا۔ باوجود اس کے وہ غزل بھی کہہ لیتے تھے۔ خواجہ میر درد کی زمین میں بھی انھوں نے ایک

غزل کہی تھی جس کے تین شعر یہ ہیں:

چشم و گردن کا تری شب بزم میں افسانہ تھا | تھی تہی قالب صراحی، سرنگوں پیمانہ تھا
ہم سے وہ آئینہ رو کس طرح ہوتا صاف دل | دود آہ اپنا غبارِ خاطرِ جاناں نہ تھا
قبرِ ناصر سے بقولِ درد آتی تھی صدا | خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ان کی بعض غزلیں حسب حال بھی تھیں چنانچہ اشعار ذیل توجہ طلب ہیں۔

دہانِ ہرزہ گوئی بند کرنا خوب ہے ناصر | غبار آنے لگے آئینہ نازک خیالاں پر
تیغ کا احساں مری گردن پہ ہے | سینکڑوں مطلب تھے ادا ہوگیے
رویئے احوال پہ ناصر کے کیا | ہم بھی گرفتار بلا ہوگیے

شاعر کی حیثیت سے ناصر کو شہرت نہیں ملی چنانچہ اکثر تذکرے اس کے ذکر سے خالی ہیں۔

27۔رند

نواب سید محمد خاں جو اودھ کے حکمراں خاندان سے تعلق رکھتے تھے، فیض آباد میں رہتے تھے، باصلاحیت شخص تھے۔ شعر کہتے تھے اور وفا تخلص کرتے تھے۔ اپنے دیوان گلدستۂ عشق میں انھوں نے فارسی میں اپنے حالات مختصراً قلم بند کیے تھے۔ ترجمہ اس طرح ہے:

"میں میر مستحسن خلیق سے مشورہ کرتا تھا۔ بعد چندے میر موصوف روانۂ فرخ آباد ہوئے اور راقم آثم بھی بتاریخ ہفتم رجب 1240ھ (25-1824) فیض آباد سے چل کر وارد دارالخلافہ لکھنو ہوا۔ وہاں حسن اتفاق سے حیدر علی آتش سے ملاقات ہوئی اور میں ان کا شاگرد ہوگیا۔ ان کے ارشاد کے مطابق اپنا تخلص رند مقرر کیا اور پہلے کا سارا کلام سب کے سامنے کنویں میں ڈال دیا۔"[127]

یہ بات توجہ طلب ہے کہ رشک ہوں یا رند (یا ممکن ہے کوئی اور بھی) فیض آباد میں چونکہ ان سے بہتر استاد کوئی نہ تھا، یہ نومشق وہاں پر میر خلیق سے اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ پہنچ کر گویا ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایک نے ناسخ کی شاگردی اختیار کی۔ دوسرے نے آتش کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور دونوں نے اپنے پرانے کلام کو پوری طرح ضائع کر دیا۔ نئے ماحول میں رہ کر نئے انداز سے شعر کی فکر کی اور وقت آنے پر اپنی کاوشوں کو دیوان کی صورت میں مرتب کر کے شائع بھی

کیا۔ لالا سری رام نے رند کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''رند نواب سید محمد خاں خلف الرشید نواب سراج الدولہ غیاث محمد خاں نیشاپوری جو نواب سعادت خاں برہان الملک صوبہ دار اودھ کے حقیقی بھانجے تھے بہ عہد آصف الدولہ بہادر ۱۱ ربیع الاول 1212ھ (98-1797) کو جمعہ کے دن بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ چونکہ ان کی دادی نواب سعادت خاں برہان الملک کی حقیقی بہن تھیں خاندانِ شاہی سے قریبی تعلق تھا اور اٹھائیس سال تک زیرِ نگرانی جناب مہد علیا الزہرا بیگم عرف بہو بیگم زوجہ نواب شجاع الدولہ مرحوم محلاتِ شاہی میں بہ ناز و نعمت پرورش پائی۔'' 128

اس اقتباس میں ایک سے زائد مقاموں پر فرق ہے پہلے میں رند کو سعادت خاں کا بھانجا کہا ہے، پھر رند کی دادی کو سعادت خاں کی بہن بتایا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ سعادت خاں کی چھوٹی بہن کی شادی رند کے پردادا کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس طرح رند کا تعلق خاندانِ شاہی سے نہیں، بلکہ اودھ کے نوابوں کے خاندان سے بالواسطہ تھا۔ بہو بیگم نے 1231ھ میں وفات پائی تھی اور اس حساب سے اس وقت رند کی عمر 19 برس کی تھی۔ اپنے تولد کی تاریخ خود رند نے اس طرح نظم کی تھی۔

میں روز و ماہ و سال اپنے تولّد کا بتاتا ہوں وہ رکھیں یاد، تحقیقات جن لوگوں کی عادت ہے
سن ہجری پہ تھے بارہ سو بارہ جمعہ کا دن تھا ربیع اوّلیں کی گیارھویں روز ولادت ہے

اس بیان کی روشنی میں رند 28 برس کی عمر میں فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے تھے اور وہ غازی الدین حیدر کی بادشاہت کا آخری زمانہ تھا۔

مولانا محمد حسین آزاد نے رند سے متعلق ایک واقعہ اس طرح نقل کیا ہے:

''ایک دفعہ سید محمد خاں رند کی اپنے استاد خواجہ حیدر علی آتش سے شکر رنجی ہوگئی۔ چاہا کہ ناسخ کی شاگردی سے استاد سابق کے تعلق کو فسخ کریں۔ مرزا محمد رضا برق کے ساتھ شیخ صاحب کے پاس آئے۔ مرزا صاحب نے اظہار مطلب کیا۔ شیخ صاحب نے تامّل کے بعد کہا کہ: نواب صاحب دس برس سے خواجہ صاحب سے اصلاح لیتے ہیں۔ آج ان سے یہ حال ہے تو کل مجھے ان سے کیا امید ہے؟

علاوہ برآں آپ خواجہ صاحب سے کچھ سلوک بھی کرتے ہیں۔ وہ سلسلہ قطع
ہوجائے گا۔ اس کا وبال کدھر پڑے گا؟ اور مجھے ان سے تمنا نہیں۔ میری
دانست میں بہتر ہے کہ آپ ہی دونوں صاحبوں کی صلح کروادیں اور اس امر میں
اس قدر تاکید کی کہ پھر آپس میں صفائی ہوگئی۔"129

رند کے اس مقطع میں مذکورہ واقعہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

شاعری کا رند نے کس دن کیا لاف وگزاف　　طبع اقدس پر ہے کیوں یا حضرت آتش ملال

ذیل کے مقطعے بھی اسی زمانے میں کہے گئے ہوں گے۔

دس برس دیکھی ہو آتش سے جب استاد کی آنکھ　　کس طرح سے نہ فن شعر میں کامل ہو رند

شعر میں بڑھ کے نہ چمکے کبھی استاد سے ہم　　فرق ہے ذرہ و خورشید کا اے رند صریح

سعادت خاں ناصر نے اپنے تذکرے میں رند کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

"خلاصہ خاندان عالیشان، مجمع دودمان امیران ہند، نبیرہ نواب نجف خان
بہادر اعنی نواب سید محمد خان بہادر تخلص رند شاگرد خواجہ حیدر علی آتش، کلام ان کا
لائق تحسین وعش عش۔"130

اور محسن نے ان کے حال میں تحریر کیا ہے:

"نواب سید محمد خاں مرحوم رند خلف نواب سراج الدولہ مرزا غیاث الدین محمد
خان بہادر نصرت جنگ نیشاپوری، نواسے نواب نجف خاں مرحوم کے باشندۂ
فیض آباد، مقیم لکھنو، صاحب دیوان، شاگرد رشید خواجہ حیدر علی آتش"131

ان اقتباسوں سے ظاہر ہے کہ اپنی ماں کی طرف سے بھی رند عالی خاندان شخص تھے۔ محسن نے ان کو مرحوم لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رند نے 1269ھ (1852) میں یا اس سے کچھ پہلے وفات پائی تھی۔

رند پرگو شاعر تھے باوجود یہ کہ ان کی شاعری کی عمر بہت زیادہ نہیں تھی۔ انھوں نے دو دیوان یادگار چھوڑے۔ پہلا دیوان آخر رجب 1258ھ (1842) میں مرتب کیا تھا۔ دونوں دیوان ان کی زندگی میں چھپ گئے تھے۔ اس طرح کہ پہلا دیوان مطبع مصطفائی محلّہ پٹکاپور کانپور سے

12 ربیع الاول 1268ھ (5= جنوری 1852) کو ایک سو اڑسٹھ صفحوں پر چھپا۔ پھر اسی کے ساتھ اسی مطبع سے دوسرا دیوان 25 ربیع الاول 1268ھ (18= جنوری 1852) کو چھپا۔ ان کے چھپنے کے کچھ ہی عرصہ کے بعد رند کا تو انتقال ہو گیا لیکن ان کے یہ دواوین ایسے مقبول ہوئے کہ بار بار چھپتے رہے۔ ان کا مطبع منشی نولکشور کانپور سے ساتواں ایڈیشن ذیقعدہ 1304ھ (= جولائی 1887) میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ رند کے درج ذیل مقطع سے گمان ہوتا ہے کہ آخر عمر میں انھوں نے مشاعروں میں جانا بند کر دیا تھا۔

کیا شاعران حال کے جلسے میں جائیے　　اے رند شاعری نہ رہی، یا وہ گوئی ہے

رند نے سعادت خاں، نجف خاں وغیرہ کے زمانے کے واقعات سنے تھے۔ غازی الدین حیدر کا دور بچشم خود دیکھا تھا۔ اودھ کی ریاست کے بتدریج زوال سے ان کا متاثر بلکہ ملول ہونا قدرتی تھا۔ شاعری کا بھی یہی معاملہ تھا۔ انھوں نے ناسخ اور آتش کی صحبتیں اٹھائی تھیں، جرأت، میر اور انشا، مصحفی کے واقعات اس طرح سنے تھے گویا انھیں بھی دیکھا تھا۔ بعد کے زمانے میں ان کے شاگرد رہ گئے تھے جو اپنے استادوں کی تقلید اور اتباع پر نازاں تھے۔ ان حالات میں رند نے شعرائے متقدمین کی روش اختیار کی۔ لالا سری رام نے ان کی شاعری کے بارے میں جو مفصل رائے دی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"محاورات روزمرہ، شوخی و طراری، فصاحت و سادگی، تاثیر اور معنی آفرینی کے جوہر کو قسام ازل نے رند میں خاص طور سے ودیعت رکھا تھا۔ معاملات راز و نیاز میں کوئی جگ بیتی کہتا ہو گا مگر رند آپ بیتی کہتا ہے۔ ان کا مجموعۂ غزلیات ان تمام رندانہ، عاشقانہ مضامین کا گنجینہ ہے جو ایک مہذب زبان کے دلکش لفظوں میں ہونا چاہیے۔ بایں ہمہ تصوف و معرفت، اخلاق حکیمانہ و فلسفیانہ رنگ کی چاشنی ان کے کلام میں موجود ہے۔ وہ کبھی میر و سودا کے مقابل ہوتے ہیں کبھی بہ انداز جرأت و مصحفی مترنم ہوتے ہیں........ وہ نیچر کے ہر ایک حسن اور دلکشی سے بہرہ اندوز ہوتا اور اس سے ایک مفید سبق حاصل کرتا اور دوسروں کو مستفیض کرتا ہے۔"132

قدامت کی طرف میلان کا نتیجہ یہ ہے کہ رند کے کلام میں قدیمی اور متروک الفاظ مثلاً: میاں، ہلوہ، بجگ، جُدی، مجھ پاس، مانیاں (= مانیں)، دیاں (= دیں) وغیرہ کا بے تکلف استعمال ملتا ہے۔ ایسا شاید اس لیے بھی ہو کہ وہ فیض آباد کے رہنے والے تھے اور وطن عزیز کی محبت نے وہاں کے روزمرہ کو ترک نہ کرنے دیا ہو۔ رند کے چند شعر نمونہ کے طور پر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

مطلب میں صفا ہو یہ تکلف ہے زباں کا
دقت ہوئی معنی میں تو کیا لطف بیاں کا

ٹوٹے بت، مسجد بنی، مسمار بت خانہ ہوا
جب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ ہوا

زلفیں چھوڑی ہیں کہ چھوڑا اس نے جوڑا سانپ کا
دیکھیے کس کس کو ڈستا ہے یہ جوڑا سانپ کا

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

سیر کی، خوب پھرے، پھول چُنے، شاد رہے
باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے

کیا کہتا ہے ہر بار تجھے قتل کروں گا
اک جان ہے میری، اسے تو لے کہ خدا لے

میں بھلا کیونکر کہوں تم کو بُرا
آپ نے جو کچھ کیا اچھا کیا

گلے لگائیں، بلائیں لیں تم کو پیار کریں
جو بات مانو تو منت ہزار بار کریں

بس اب آپ تشریف لے جایئے
جو گذرے گی مجھ پر گذر جائے گی

رند نے لکھنو پہنچنے کے بعد اپنی صلاحیتوں کو غزل کہنے کے لیے پوری طرح وقف کر دیا تھا۔ اگر چہ ان کے دیوان میں قصیدہ بھی موجود ہے، غور کریں تو اس میں بھی غزل ہی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ رند کی غزلیں ان کی مشاقی اور قادرالکلامی کی مظہر ہیں۔ اکثر شعروں کی فصاحت، سلاست اور روانی لائق ستائش ہے بلکہ بعض شعر تو زبانوں پر جاری ہو کر ضرب المثل کا درجہ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ پرانے اور متروک الفاظ کے معاملے میں اگر انھوں نے محتاط روش اختیار کی ہوتی تو یقیناً اردو کے غزل گویوں میں ان کا مرتبہ بلند تر ہوتا۔

آخر عمر میں رند نے حج و زیارات کا ارادہ کیا تھا لیکن قسمت میں یہ سعادت نہیں تھی۔ بمبئی پہنچ کر بیمار ہوئے اور وہیں سے ملک عدم کو راہی ہوئے۔

28۔ صبا

میر وزیر علی نام تھا۔ بظاہر لکھنو کے ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ماموں

نے گود لے لیا تھا اور انھوں نے ہی ان کی پرورش کی تھی چنانچہ محسن نے لکھا ہے:

''میر وزیر صبا ولد میر بندہ علی پسر خواندہ اور خواہر زادۂ میر اشرف علی باشندۂ لکھنو صاحب دیوان، ارشد تلامذہ خواجہ حیدر علی آتش''133۔

حالات نے ان کی تعلیم کو مکمل نہ ہونے دیا۔ سعادت خاں ناصر نے اس سلسلے میں ایک حکایت نقل کی ہے، اس طرح ہے:

''صاحب فکر رسا خوش مذاق و نازک ادا، میر وزیر متخلص بہ صبا سادہ گو بے معنی بند اور اردوے خاص عام پسند، شاگرد رشید خواجہ حیدر علی آتش۔ نقل ایک حکایت کی ضرور ہے کہ میں نے ایک دوست سے بر سبیل ذکر پوچھا کہ میر وزیر صاحب علم عروض میں بھی کچھ دخل رکھتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ ایک شخص نے اپنی غزل روبرو میر وزیر صبا کے پڑھی۔ اس میں ایک شعر تھا کہ تقطیع اس کی معلوم نہ ہوتی تھی۔ میر صاحب نے کہا کہ یہ شعر ظاہر اً ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔ اس میں اس نے کہا کہ شعر موزوں ہے چنانچہ میر علی اوسط صاحب کو یہ شعر سنایا تھا میں نے۔ اگر ناموزوں ہوتا تو وہ اطلاع کر دیتے۔ اس میں کہنے لگے کہ اگر میر علی اوسط صاحب سُن چکے ہیں تو موزوں ہے۔ واللہ اعلم''134۔

عروض کے مسائل سے قطع نظر، صبا نے نکتہ رس طبیعت پائی تھی چنانچہ محسن نے لکھا ہے کہ ایک موقع پر مصرع طرح کے لیے یہ فقرہ سامنے آیا: ''روح اعضا میں نہیں'' اس کو سنتے ہی:

''جناب میر وزیر صبا نے فرمایا کہ بغیر روح قالب بیکار ہوتا ہے۔ یہ لطیفہ مولف کو نہایت پسند ہوا۔ فصل روح (تذکرہ سراپا سخن میں) زیادہ کی۔ صبا کی غزل کا مطلع یہ ہے۔

نہ کس طرح سے ہوا ہو، ہوائے یار میں روح ۔۔۔ برنگ بوئے رگ گل ہے جسم زار میں روح 135''

آغا حسین شرف نے ان کی خوبیوں وغیرہ کا بیان اس طرح کیا ہے۔

جو سیّد وزیرِ علی تھے صبا فرشتہ وہ تھے ان کو بخشے خدا
جہاں آشنا، باوفا، خوش چلن خوش اوقات وخوش باش، خوش پیرہن
ہوے بارہ سو پر اکہتر جو سال گرے گھوڑے پر سے کیا انتقال
وہ آتش کے شاگرد تھے بے مثال زباں آور وشاعر خوش خیال
نہ کیونکر کہیں ہم انھیں لاجواب کہ ان کا تو ہر شعر ہے انتخاب
یہ حیدر حسین ان کے جو ہیں پسر سمجھتا ہوں میں ان کو جان وجگر
یہ اقبال وشوکت ہویدا کریں جہاں میں بڑا نام پیدا کریں
نمود ان کی شیریں کلامی سے ہو کلام ان کا بڑھ چڑھ کے جامی سے ہو

صبا کے بیٹے حیدر حسین کے بارے میں مزید کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ صبا کی ایک بیٹی بھی تھی جس کی شادی میر رضا حسین سہا کے ساتھ ہوئی تھی۔ لالا سری رام نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"انھیں دعویٰ تھا کہ خواجہ آتش کے رنگ میں ان سے بہتر کوئی نہ کہہ سکا مگر ان کے کلام پر بجائے توارد کے سرقہ کا گمان ہوتا ہے۔"136

ان دو کے علاوہ صبا کی اور کسی اولاد کا پتا نہیں چل سکا ہے۔

لالا سری رام نے صبا کے حالات میں جو لکھا ہے اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

"تلامذہ آتش میں جتنے شاگرد صبا کے ہیں اتنے کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوے۔ ان میں سے اکثر صاحب دیوان اور استاد مانے جاتے تھے۔ 27 رمضان المبارک 1271ھ(1855) میں صبا کی شاعری بہ حیثیت مجموعی اس وقت کی غزل گوئی کا اعلیٰ نمونہ ہے یعنی لطف زبان انداز بیان، تلاش مضامین، رنگینی اور سلاست ان کے ہاں موجود ہے۔ چھوٹی بحروں میں صبا نے سلاست اور روانی کے دریا بہاے ہیں۔"137

صبا کی وفات کے بعد 1272ھ میں ان کا دیوان مرتب ہو کر مطبع صدر مجلس لکھنو میں چھپا۔ اس کا تاریخی نام غنچہ آرزو مقرر ہوا۔ اس میں غزلوں کے علاوہ کچھ قطعات تاریخ بھی شامل ہیں۔

آخر میں دوستوں اور شاگردوں کے کہے ہوئے صبا کی وفات اور ترتیب دیوان سے متعلق قطعے بھی شامل کردیے گئے ہیں۔ اس کے باوجود ضخامت دوسو صفحوں سے زیادہ نہیں ہوسکی ہے۔ صبا کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

نہایت جوش پر دریا ہے اپنی طبع موزوں کا — جہاں میں شور ہے طوفان آب درِ مضموں کا

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے — بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

جو بات ہے ہر مذہب وملت سے جدا ہے — دیکھا جز صبا سب سے الگ تو نظر آیا

اللہ رے گردشِ زمانہ — ہر روز نئی مصیبتیں ہیں

آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں — ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

ہوگیا بے چین تو اچھا ہوا — اور سن نالے دلِ غمگین کے

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے — خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

معلوم ہوتا ہے کہ آخر عمر میں صبا کی قدر زیادہ ہوئی تھی۔ لالا سری رام نے لکھا ہے کہ:

''حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کی سرکار سے دوسو روپیہ مقرر تھا۔ تیس روپیہ نواب محسن الدولہ بہادر نبیرۂ غازی الدین حیدر کے ہاں سے ملتے تھے۔ علاوہ بریں کئی باغ اور کچھ پرامیسری نوٹ بھی ان کی ملک سے تھے جن کا منافع مسٹر جوزف کی معرفت وصول ہوا کرتا تھا۔''138

29۔ خلیل

میر دوست علی خلیل خواجہ حیدر علی آتش کے ان شاگردوں میں سے جنھوں نے آزاد کی نقل کردہ بعض حکایتوں کے مطابق مذہب کے معاملے میں استاد کی رہنمائی کی تھی۔ مثال کے طور پر انھوں نے آتش کے حال میں لکھا ہے:

''میر انیس مرحوم نے فرمایا کہ ایک دن آپ (آتش) کو نماز کا خیال آگیا۔ کسی شاگرد سے کہا کہ بھئی ہمیں نماز تو سکھاؤ۔ وہ اتفاقاً فرقہ سنت جماعت سے تھا۔ اس نے ویسی ہی نماز سکھادی اور یہ کہہ دیا کہ استاد عبادت الٰہی جتنی پوشیدہ ہو اتنی ہی اچھی ہوتی ہے۔ جب نماز کا وقت ہوتا یہ حجرہ میں جاتے یا گھر کا دروازہ بند

کر کے اسی طرح نماز پڑھا کرتے۔ میر دوست علی خلیل ان کے شاگرد خاص اور
خلوت وجلوت کے حاضر باش تھے۔ ایک دن انھوں نے بھی دیکھ لیا۔ بہت
حیران ہوئے۔ یہ نماز پڑھ چکے تو انھوں نے کہا کہ استاد آپ کا مذہب کیا ہے؟
فرمایا: شیعہ۔ انھوں نے کہا کہ نماز سُنیوں کی؟ فرمایا کہ بھئی میں کیا جانوں فلاں
شخص سے میں نے کہا تھا۔ اُس نے جو سکھا دی سو پڑھتا ہوں۔ مجھے کیا خبر کہ
ایک خدا کی دو دو نمازیں ہیں۔ اس دن سے شیعوں کی طرح نماز پڑھنے
لگے۔''139

آتش کی وفات کے ذکر میں بھی آزاد نے تحریر کیا ہے:

''آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہوتا تھا۔ میر دوست علی خلیل نے
تجہیز و تکفین کی اور رسوم ماتم بھی بہت اچھی طرح ادا کیں۔ بی بی اور ایک لڑکا اور
لڑکی خرد سال تھے۔ ان کی بھی سرپرستی وہی کرتے رہے۔''140

ایسے ہی معاملات تھے جن کی وجہ سے ابن طوفان نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''دوست علی نام، خلیل تخلص، از شاگردان رشید آتش است۔ فی الجملہ مقرب
ومعتبر است۔

سامنا کرتا ہے تیغ ابرو خمدار کا آئینہ پہنے ہے کیا چار آئینہ فولاد کا''141

محسن نے ان کے بارے میں مفید اطلاعات فراہم کی ہیں:

''میر دوست علی خلیل ولد سید جمال علی باشندہ قصبہ بذولی متعلقہ بارہ مقیم لکھنو رفیق
نادر مرزا نیشاپوری کے، صاحب دیوان شاگرد رشید خواجہ حیدر علی آتش۔''142

سعادت خاں ناصر نے ان کو ''شاعر بے عدیل صاحب تحصیل'' اور ان کے کلام کو ''مطبوع
اور دلکش'' بتایا ہے 143۔ لالا سری رام نے لکھا ہے کہ:

''سخنور خوش فکر میر دوست علی خلیل، خواجہ آتش کے شاگردوں میں نامور تھے۔
ان کی خوش کلامی کا بڑا شہرہ تھا۔ 1279ھ میں کلکتے بھی گئے تھے۔ ان کا اردو
دیوان مطبع نامی لکھنو میں چھپا تھا مگر مصروں سے سنا کہ اچھا کلام بیشتر ضائع

ہوگیا۔ کلام میں اجنبی اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار ہے۔ تشبیہ و استعارہ کا شوق حدِ اعتدال سے متجاوز ہے۔ بعض اشعار بالکل فحش کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ زلف، کنگھی، مانگ، چوٹی، خط و خال کے مضامین کثرت سے نظم کیے ہیں۔ کلام میں دلکشی نہیں ہے۔ عموماً جو ایک مصرع میں زور ہوتا ہے دوسرے میں قائم نہیں رہتا۔ سلطان عالم واجد علی شاہ کے عہد میں نظامت اور چکلہ داری کے عہدہ پر ممتاز رہے۔ تاحیات کمال عیش و عشرت سے بسر کرتے رہے۔"144

ان کے چند اچھے شعر نمونہ کے طور پر درج ذیل ہیں:

جب عرضِ حال کرتا ہوں کہتا ہے وہ صنم　　کچھ اور کہیے یہ تو ہے قصہ سنا ہوا
وہ رنگ ہے تیرا کہ ترے رنگ کے آگے　　جس رنگ کو دیکھا ہے وہ پھیکا نظر آیا
کبھی دیکھا جو اُبلتے ہوئے مے کو خم سے　　جوش اپنی بھی جوانی کا ہمیں یاد آیا
جس نے پوچھا یہی جواب ملا　　آدمی با وفا نہیں ملتا
پاؤں پر خم رہی جبینِ نیاز　　زندگی یوں بسر ہوئی میری
کیونکر ڈروں نہ ان کے خطِ مشک فام سے　　پہنچے ہیں سیدوں کو بہت رنج شام سے
یہ بھی معلوم وصل میں نہ ہوا　　کب ہوئی صبح، رات کب گذری
نظارہ معشوق سے سیری نہیں ہوتی　　ہو وصل بھی تو وصل کی حسرت نہیں ہوتی

(ب) قصیدہ

محمد تقی میر کے حالات میں احد علی یکتا نے ایک واقعہ اس طرح لکھا ہے:

"نقل است کہ روزے میر صاحب قصیدۂ تازہ گفتہ بہ دربار آوردند۔ نواب وزیر (آصف الدولہ) کہ از چاشت فراغت کردہ متوجہ شنیدن شد۔ میر صاحب شروع بخواندن کردند وطول دادند۔ اتفاقاً آں روز ملا محمد مغلی زا کہ تازہ از ولایت آمدہ وشاعر ہم بودہ، برائے ملازمت آوردہ، می خواست کہ آنہم چیزے در مدح حضور بخواند وتطویل قصیدۂ میر وقت نہ گذاشت۔ ملا محمد تنگ آمدہ گفت کہ: میر صاحب قصیدہ خوب است لیکن طولانی۔ اگر دماغ نواب صاحب وفائی کرد کہ می شنید؟ میر بمجرد استماع بیاض از دست انداختہ ومتغیض شدہ گفت کہ: اگر دماغ نواب وفائی کرد دماغ من کجا وفائی نماید؟ مطلق پاسِ حضور نہ نمود۔ نواب کہ خود خلق مجسم بودہ استمالۂ مزاج میر، بہ کمال مہربانی ومنتجا نمودہ بقیہ قصیدہ ہم تمام شنید وخاطرِ ملا ہیچ نہ کرد باوصف اینکہ او با نواب صیغۂ اخوت داشت۔"1

میر صاحب ہی تھے جنھوں نے اس ڈھٹائی سے پورا قصیدہ پڑھ ڈالا اور وہ آصف الدولہ ہی تھے کہ انھوں نے بہر نوع اس قصیدہ کو شروع سے آخر تک سن لیا لیکن یہ صورت حال عام نہیں ہو سکتی

تھی۔ نواب آصف الدولہ کے بعد لکھنؤ میں طویل قصیدوں کے لکھنے اور سننے کا رواج بتدریج کم ہوتا چلا گیا۔ طوالت اور اختصار کا تعلق خیال سے ہے۔ دونوں کی حدیں کچھ مقرر نہیں ہیں۔ قصیدے نے مختصر ہوتے ہوتے لکھنؤ میں بالآخر قطعہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔

یہ بھی ہوا کہ مرثیوں کے خاتمہ میں متعلق رئیس کی مدح میں کبھی ایک، اور کبھی زیادہ بند کہہ کر مدّاحی کے تقاضے کو پورا کر دیا گیا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی مرثیہ کو قصیدے کے بدل کی حیثیت دے دی گئی۔ انیس اور ان کے متعلقین کے بیان میں وہی شان و شوکت ہوتی تھی جو مدح میں ہوتی ہے۔ مرثیے کے لیے بھی اصطلاحوں کے فرق کے ساتھ وہی اجزا مقرر کیے گیے جو قصیدے میں ہوتے ہیں۔

لکھنو میں شیخ ناسخ اور ان کے متبعین کی غزلوں کا بھی انداز کم و بیش وہی ہوتا تھا چنانچہ ان کی غزلوں کو "غزلہائے قصیدہ طور" کہا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض وقت غزلوں سے قصیدے کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ خود شیخ ناسخ کا عمل بھی یہی تھا۔ مثال کے طور پر ان کی ایک غزل کے کچھ شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

رفتار میں اور رنگ سلیماں ہے یہ گھوڑا	پر سیرت و خلقت میں تو انساں ہے یہ گھوڑا
سلطان جہاں کی یہ سواری کا اثر ہے	ہے ابلق ایام بدن، جاں ہے یہ گھوڑا
تابع ہے یوں ہی رخش فلک شاہ جہاں کا	جس طرح سدا تابع فرماں ہے یہ گھوڑا
کافی ہے فقط ظل الٰہی کا اشارہ	ناسخ کا طرح تابع فرماں ہے یہ گھوڑا

اس قسم کی غزلیں ناسخ اور ان کے متبعین کے دواوین میں کمیاب نہیں ہیں۔

مذکورہ صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ میں امرا کی مدح میں قصیدوں کے لکھے جانے کا چلن کم سے کم ہوتا چلا گیا۔ بیشتر معروف شعرا کے دواوین قصیدوں سے خالی ہیں:

جرأت اور میر وفات پا گئے۔ انشاء اللہ خاں زندہ تھے مگر ایسے حال میں تھے کہ ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ نواب کے نصف ملک پر فرنگی قابض ہو گئے تھے۔ باقی نصف پر بظاہر غازی الدین حیدر حاکم تھے لیکن سرکار انگریزی کی سرپرستی میں تاج شاہی زیب سر کر کے عملاً انھوں نے خود کو بھی اسی کی تحویل میں دے دیا تھا۔ مرزا سلیمان شکوہ لکھنؤ کو خیر باد کہہ گئے۔ غازی الدین حیدر عشرت کے

مزے لوٹنے لگے۔ معتمد الدولہ مرزا حاجی کو شہر بدر کروا کر عملاً خود مختار حاکم ہو گئے تھے۔ شہر لکھنؤ میں ان کا مقابل کوئی بھی نہیں رہ گیا تھا۔

معتمد الدولہ کو اپنے دربار کی رونق کی فکر ہوئی۔ انھوں نے خواجہ آتش کو طلب کیا۔ چنانچہ نجات حسین خاں عظیم آبادی نے لکھا ہے:

''در اوایل ایام جوانی (خواجہ آتش) طبلے پیشہ شجاعت وضع سپاہیانہ داشتند و انسر رسالہ داراں بودند و دراں ہنگام توجہ خاطر شریفش بہ شعر و سخن چنداں نبودہ مگر از زمانے کہ از اں حال درگذشتہ، درویشانہ در آمدند بہ اندک توجہ علم نام آوری در شعر و سخن افراشتند .... باستماع ایں حال نواب معتمد الدولہ عرف آغا میر ہر چند ایشاں را چند بار طلب کردہ مگر ایشاں نہ رفتند۔''2

اور پھر انھوں نے شیخ ناسخ کو مدعو کیا، بقول نجات حسین خاں:

''حضرت شیخ بسیار قانع و متوکل و باوضع خاص مبذول بودند چنانچہ معتمد الدولہ کہ با شیخ بسیار ارادت و نسبت داشت ہر چند التماس قبول مشاہرہ سہ صد و چہار صد روپیہ نمودہ لیکن قبول نہ فرمودہ، محض بہ نظر امتثال امر و تصور دلشکنی نواب مشاہرہ پانزدہ روپیہ برائے خویشتن مقرر گرفتہ و تمام روز در خانہ بند داشتند۔ پاسی از روز ماندہ وا میکردند، دراں وقت اذن باریابی شاگرداں و دیگراں بود...... شخصے چند بار خلاف وقت حاضر شدہ، از سخنان لاطایل سمع خراشی ہا نمودہ تا دیر نشستہ۔ چوں اوقات شان تنگ شد آتش در پردہ ہا زدند۔ چوں مشتعل شد آں شخص متحیر شدہ سبب آں پرسید۔ فرمودند حالا کہ مکان سوختہ شد چگونہ خواہید نشست۔ آں شخص نادم شد۔''3

مکان کو آگ لگا دینے کے لطیفے کو کسی قدر فرق کے ساتھ اپنے مخصوص دلچسپ انداز سے محمد حسین آزاد نے بھی نقل کیا ہے۔4

نواب معتمد الدولہ نے نام بر آوردہ شاعروں کو مدعو کرنے کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے دوسرے درجے کے شاعروں کی بھی کما حقہ، سرپرستی اور پذیرائی کی تھی۔ میاں جرأت کے ایک شاگرد مرزا

علی اکبر مضطرب کے بارے میں شیخ مصحفی نے لکھا ہے کہ:

''پیش ازیں مضطرب تخلص وحالا کہ بہ خدمت نواب معتمد الدولہ بہادر مستفید گشتہ بہ ارشاد نواب مذکور عشرتی تخلص گذاشتہ۔''5

مضطرب کے مفصل حالات تو معلوم نہیں البتہ نواب نے اپنے مذاح کے اضطراب کو دور کرنے کے لیے اُسے عشرتی بنا دیا تھا۔ ظاہراً اس شاعر نے بھی قصیدہ کہا ہوگا۔

نواب معتمد الدولہ کی مدح میں اس زمانے میں مختلف شاعروں نے قصیدے لکھے تھے۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں ایک قصیدہ محفوظ ہے جو چھبیس اوراق پر اس طرح لکھا گیا ہے کہ ہر صفحہ پر صرف چار سطریں ہیں۔ زمانۂ کتابت 1834 (1250=ھ) سے قبل معلوم ہوتا ہے۔ اس کا عنوان اس طرح ہے:

''قصیدہ در مدح نواب معتمد الدولہ بہادر ''6

اس کا مطلع یہ ہے۔

عالم خواب میں شب میں جو ہوا سیر کناں　　طرفہ اک غیرتِ جنت نظر آیا بُستاں

یہ قصیدہ اس شعر پر ختم ہوا ہے۔

شکل گل خرم و خنداں ہوں محبان حضور　　ابر ساں دیدۂ بدخواہ رہے گر یہ کناں

اس قصیدے کے شاعر کا نام اور احوال تو معلوم نہیں ہو سکا البتہ اس کا تخلص عاشق آیا ہے۔ مصحفی کے تذکرے میں اس تخلص کے ایک شاعر کا مذکور اس طرح ہے:

''میرزا حجوی عاشق تخلص برادر آغا تقی صاحب جوان موزوں طبع وخوش گفتار است۔ غزلے کہ در اجماع مشاعرۂ مرزا تقی ہوس خواندہ شدہ بود، او ہم دراں فکر کردہ بیشتر طبعش مایل مرثیہ وسلام است، نثر وتش معروف، عمرش تخمیناً چہل سالہ خواہد بود۔''7

ہوسکتا ہے کہ مذکورہ قصیدہ اسی عاشق نے لکھا ہو۔ واللہ اعلم

آزاد لائبریری میں غضنفر تخلص کے کسی شاعر کے دو قصیدوں کے ایک مجموعہ کے آٹھ ورق موجود ہیں۔ ہر صفحہ پر صرف چھ سطریں ہیں۔ پہلے قصیدہ کا عنوان ہے:

''قصیدہ در مدح نواب معتمد الدولہ بہادر''[8]

اور اس کا مطلع یہ ہے۔

حامی کوئی جس کا ہوا سے کیا وسواس　　کیا دخل ہے دیکھے جو وہ روئے افلاس

یہ قصیدہ عید الفطر کی مبارکباد میں ہے۔ دوسرا قصیدہ میمیہ ہے اور اس کا آخری شعر یہ ہے۔

جو ہوں ملازم ان کو ہو عیش و طرب نصیب　　بد خواہ جو ہیں وہ رہیں پابند درد و غم

بظاہر یہ غضنفر وہی شاعر ہے جس کے تعارف میں سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

''شاعر خوش منظر، غضنفر علی خاں تخلص، غضنفر ابن غلام حسین خاں کررہ، اصل ان کی ہنود، قوم کھتری، بقول میاں مصحفی شاگرد جرأت۔''[9]

نواب معتمد الدولہ کی مدح میں ان چند کے علاوہ اور بھی شاعروں نے قصیدہ لکھے تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ نواب کے دربار میں کبھی کبھی ہجو بھی گائی اور سنائی گئی تھیں چنانچہ یہ ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔

1۔ مصحفی

شیخ غلام ہمدانی مصحفی استاد اساتذہ تھے۔ شاعری کی ہر صنف میں نام برآوردہ تھے۔ معتمد الدولہ کی شان میں انھوں نے بھی قصیدے لکھے اور خوب لکھے۔ شاہ عالم بادشاہ کی مدح میں مرزا رفیع سودا کا مشہور قصیدہ ہے۔

ہے اشتہار تجھ سے مرا اے فلک جناب　　رخشندگی ذرہ ہے از فیض آفتاب

مصحفی نے لفظ ''آفتاب'' کو ردیف بنا کر قصیدہ لکھا۔ اس میں کہتے ہیں۔

آتا ہے ہو کے کاسہ بکف بھیک مانگنے　　مشرق سے ہر سحر بہ در داور آفتاب

یعنی جناب معتمد الدولہ آں کہ ہست　　از ذرہ پیش طلعت او کمتر آفتاب

سرمائے سرد مہری ایام کے لیے　　دست سخاوت اس کا ہے جاں پرور آفتاب

دنیا میں اس کی بخشش کامل سے روز و شب　　مہ طشت سیم پائے ہے، طشت زر آفتاب

اس قصیدے میں نواب کی شیر افگنی اور عدل وغیرہ کے علاوہ فیل، رائے منیر، مطبخ اور گھوڑے وغیرہ کی تعریف کی گئی ہے اور آخر میں تاریخ اس طرح نظم کی ہے۔

علی اکبر مضطرب کے بارے میں شیخ مصحفی نے لکھا ہے کہ:

"پیش ازیں مضطرب تخلص و حالا کہ بہ خدمت نواب معتمد الدولہ بہادر مستفید گشتہ بہ ارشاد نواب مذکور عشرتی تخلص گذاشتہ۔"5

مضطرب کے مفصل حالات تو معلوم نہیں البتہ نواب نے اپنے مداح کے اضطراب کو دور کرنے کے لیے اُسے عشرتی بنا دیا تھا۔ ظاہراً اس شاعر نے بھی قصیدہ کہا ہوگا۔

نواب معتمد الدولہ کی مدح میں اس زمانے میں مختلف شاعروں نے قصیدے لکھے تھے۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں ایک قصیدہ محفوظ ہے جو چھبیس اوراق پر اس طرح لکھا گیا ہے کہ ہر صفحہ پر صرف چار سطریں ہیں۔ زمانہ کتابت 1834 (1250=ھ) سے قبل معلوم ہوتا ہے۔ اس کا عنوان اس طرح ہے:

"قصیدہ در مدح نواب معتمد الدولہ بہادر "6

اس کا مطلع یہ ہے۔

عالم خواب میں شب میں جو ہوا سیر کناں ‏ ‏ ‏ ‏ طرفہ اک غیرتِ جنت نظر آیا بُستاں

یہ قصیدہ اس شعر پر ختم ہوا ہے۔

شکل گل خرم و خنداں ہوں محبان حضور ‏ ‏ ‏ ‏ ابر ساں دیدۂ بدخواہ رہے گر یہ کناں

اس قصیدے کے شاعر کا نام اور احوال تو معلوم نہیں ہو سکا البتہ اس کا تخلص عاشق آیا ہے۔ مصحفی کے تذکرے میں اس تخلص کے ایک شاعر کا مذکور اس طرح ہے:

"میرزا محمد ی عاشق تخلص برادر آغا تقی صاحب جوان موزوں طبع و خوش گفتار است۔ غزلے کہ در اجماع مشاعرۂ مرزا تقی ہوس خواندہ شدہ بود، او ہم دراں فکر کردہ بیشتر طبعش مایل مرثیہ و سلام است، شرذتش معروف، عمرش تخمیناً چہل سالہ خواہد بود۔"7

ہو سکتا ہے کہ مذکورہ قصیدہ اسی عاشق نے لکھا ہو۔ واللہ اعلم

آزاد لائبریری میں غضنفر تخلص کے کسی شاعر کے دو قصیدوں کے ایک مجموعہ کے آٹھ ورق موجود ہیں۔ ہر صفحہ پر صرف چھ سطریں ہیں۔ پہلے قصیدہ کا عنوان ہے:

"قصیدہ در مدح نواب معتمد الدولہ بہادر"[8]

اور اس کا مطلع یہ ہے۔

حامی کوئی جس کا ہوا سے کیا وسواس کیا دخل ہے دیکھے جو وہ روئے افلاس

یہ قصیدہ عید الفطر کی مبارکباد میں ہے۔ دوسرا قصیدہ میمیہ ہے اور اس کا آخری شعر یہ ہے۔

جو ہوں ملازم ان کو ہو عیش و طرب نصیب بد خواہ جو ہیں وہ رہیں پابند درد و غم

بظاہر یہ غضنفر وہی شاعر ہے جس کے تعارف میں سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

"شاعر خوش منظر، غضنفر علی خاں تخلص، غضنفر ابن غلام حسین خاں کردہ، اصل ان کی ہنود بقوم کھتری، بقول میاں مصحفی شاگرد جرأت۔"[9]

نواب معتمد الدولہ کی مدح میں ان چند کے علاوہ اور بھی شاعروں نے قصیدہ لکھے تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ نواب کے دربار میں کبھی کبھی ہجو بھی گائی اور سنائی گئی تھیں چنانچہ یہ ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔

1۔ مصحفی

شیخ غلام ہمدانی مصحفی استاد اساتذہ تھے۔ شاعری کی ہر صنف میں نام برآوردہ تھے۔ معتمد الدولہ کی شان میں انھوں نے بھی قصیدے لکھے اور خوب لکھے۔ شاہ عالم بادشاہ کی مدح میں مرزا رفیع سودا کا مشہور قصیدہ ہے۔

ہے اشتہار تجھ سے مرا اے فلک جناب رخشندگی ذرہ ہے از فیض آفتاب

مصحفی نے لفظ "آفتاب" کو ردیف بنا کر قصیدہ لکھا۔ اس میں کہتے ہیں۔

آتا ہے ہو کے کاسہ بکف بھیک مانگنے مشرق سے ہر سحر بہ در داور آفتاب

یعنی جناب معتمد الدولہ آں کہ ہست از ذرہ پیش طلعتِ او کمتر آفتاب

سرمائے سرد مہرئ ایام کے لیے دستِ سخاوت اس کا ہے جاں پرور آفتاب

دنیا میں اس کی بخششِ کامل سے روز و شب مہ طشتِ سیم پائے ہے، طشتِ زر آفتاب

اس قصیدے میں نواب کی شیر افگنی اور عدل وغیرہ کے علاوہ فیل، رائے منیر، مطبخ اور گھوڑے وغیرہ کی تعریف کی گئی ہے اور آخر میں تاریخ اس طرح نظم کی ہے۔

ہے یہ قصیدہ بارہ سے سن تیس کا نظم　　تائے قلم سے نکلا ہے جو بنگر آفتاب
تسخیر یک جہاں نہ کرے کیونکہ مصحفی　　ہر دایرہ ہے اس کا ضیا گستر آفتاب

ایک اور قصیدہ مصحفی نے رنگ، سنگ وغیرہ کے قافیوں میں لکھا ہے۔ اس کے چند اشعار ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

رہ فرار تو کوئی نظر نہیں آتی　　عیاں ہیں رُخ سے مرے معنیٔ شکستن رنگ
جناب معتمدالدولہٗ وحید زماں　　مگر ہو دادرس اس دم، کہ ہوں اناپٹ میں تنگ
ملی ہے اس کو نیابت وزیر کے گھر سے　　گیا ہے شہرۂ جو داس کا تابہ چین وفرنگ
مزاج اس کا گر آجائے رفع بدعت پر　　تو ے کا نام نہ باقی رہے، نہ نغمۂ چنگ
جو سخت ونرم کو باہم وہ آشتی دیوے　　تو کچھ عجب بھی نہیں اختلاط شیشہ وسنگ

قصیدے کی روایت کے مطابق مصحفی نے اس میں بھی تلوار، گھوڑے اور ہاتھی وغیرہ کی خوب تعریف کی ہے۔

یہ دونوں قصیدے اس زمانے کے ہیں جب نواب غازی الدین حیدر نے مسند نشین ہونے کے بعد معتمدالدولہ کو اپنی نیابت کے خلعت سے سرفراز کیا تھا۔ ان قصیدوں سے ان کی بعض خوبیوں کو پتا چلتا ہے۔

مصحفی نے صرف مدحیہ قصیدے لکھے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ۔

ہجو کے کہنے میں زباں میری ہے قاصر　　ورنہ جو قصیدہ ہے مرا کوہ گراں ہے

اور ان کی کوئی ہجو ہمیں نہیں مل سکی ہے۔

2۔ ناسخ

شیخ امام بخش ناسخ کے بارے میں مولانا محمد حسین آزاد نے غالباً ان کے مطبوعہ دیوان کو دیکھ کر یہ رائے قائم کر لی تھی کہ:

> ''قصاید کا شوق نہ تھا۔ چنانچہ نواب لکھنؤ کی تاریخ وتہنیت میں بھی کچھ کہا ہے تو بطور قطعہ کہا ہے۔ ہجو کے کانٹوں سے ان کا باغ پاک ہے۔''10۔

اور اسی خیال کے مطابق انھوں نے یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ:

''لکھنؤ سے نکلنے کا سبب یہ ہوا تھا کہ غازی الدین حیدر کے عہد میں جب ان کی تعریفوں کی آوازیں بہت بلند ہوئیں تو انھوں نے نواب معتمد الدولہ آغا میر اپنے وزیر سے کہا کہ اگر شیخ ناسخ ہمارے دربار میں آئیں اور قصیدہ سنائیں تو ہم انھیں ملک الشعرا خطاب دیں۔ معتمد الدولہ ان کے بااخلاص شاگرد تھے۔ جب یہ پیغام پہنچایا تو انھوں نے بگڑ کر جواب دیا کہ مرزا سلیمان شکوہ بادشاہ ہو جائیں تو وہ خطاب دیں یا گورنمنٹ انگلشیہ خطاب دے۔ ان کا خطاب لے کر میں کیا کروں گا۔ نواب کے مزاج میں کچھ وحشت بھی تھی۔ حسب الحکم شیخ صاحب کو نکلنا پڑا اور چند روز الہ آباد میں جا کر رہے۔ نواب مر گیے تو پھر لکھنؤ میں آئے۔''11

ان اقتباسوں میں بیشتر باتیں صحیح نہیں ہیں۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ ناسخ غازی الدین حیدر کے گھوڑے کے بارے میں یہ کہہ سکتے تھے ع: ناسخ کی طرح تاج فرماں ہے یہ گھوڑا
وہ براہ راست غازی الدین حیدر کی شان میں قصیدہ کیوں نہیں لکھ سکتے تھے۔ اسی طرح جو ناسخ یہ کہتا ہو۔

دل ملکِ انگریزی میں جینے سے تنگ ہے   رہنا بدن میں روح کو قیدِ فرنگ ہے

وہ ''گورنمنٹ انگلشیہ'' سے خطاب کا بھلا کیا طالب ہوتا۔ اتنی بات البتہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ انھیں قصائد کا شوق نہیں تھا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے قصیدے کہے ہی نہیں تھے۔ یہ دعوا بھی درست نہیں کہ ان کا دامن ہجو کے کانٹوں سے پاک ہے۔ سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

''در عہد معتمد الدولہ شیخ ناسخ صاحب نے برائے خوشنودی نواب معتمد الدولہ مختار الملک سید محمد خاں بہادر ضیغم جنگ عرف آغا میر، حکیم مہدی علی خاں کی ہجو بھی کہی تھی چنانچہ ایک شعر اس ہجو کا یہ ہے۔

رو بہ صفت ز بیت ضیغم گریختہ   کا شو برائے بیختن شلغم گریختہ''12

افسوس ہے کہ یہ پوری ہجو ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی اس لیے اس کے بارے میں کوئی رائے

دینا مناسب نہیں، البتہ کہتے ہیں کہ محمد خاں قوال نے اس کو نواب معتمد الدولہ کے سامنے گایا تھا اور ہزار رو پے کا انعام پایا تھا۔

شیخ ناسخ ہر معاملہ میں نواب کے معتمد، معاون اور موید ہو تے تھے، چنانچہ نواب کے مخالفوں نے ان کے لیے بھی بہت کہا۔ میر حسین علی تاسف کے اس قطعہ کو شہرت ملی تھی:

"قطعہ در تاریخ گریختن ناسخ از خوف آمد منتظم الدولہ (مہدی علی خاں)"

خود بُلایا شہ نے اس نواب کو با کرّ وفر
دبدبہ ہے جس کی آمد کا کئی فرسنگ سے

بحر غرق کشتیِ اعداوہ اب طوفان ہے
بحرِ لشکر موجزن ہے بیشتر جو گنگ سے

تیغ زن کیا کیا بہادر افسرانِ جیش ہیں
رستمِ دوراں نہ لاوے تاب ان کی جنگ سے

قتل وغارت، قید وذلّ کے جواں ساماں ہوے
رنگِ رویاں سرکشوں کا فق ہوا ہر رنگ سے

خوفِ جاں سے خونیوں کا زہرہ پانی ہو گیا
لشکرِ جرار جس دم پار آیا گنگ سے

لکھنؤ سے آج بھاگا شیخ ناسخ بے حیا
ہے دبنگی جس کا جامہ خالی عار و ننگ سے

اُس کے بس چڑھتے ہی اترا سب حکومت کا نشہ
دل میں جو بیساختہ سرشار تھے اس بھنگ سے

سر اٹھایا تھا جنھوں نے فوقِ عرش اقبال کا
وہ گیے تحت الثرا کو صدمۂ سرجنگ سے

دار پر اس دار میں تھے مجرمانِ سلطنت
بےادب خائف تھے اس کی دانش و فرہنگ سے

اس بھگوڑے کی تاسف کہہ یہ تاریخِ گریز
دُم کٹا بھینسا مگر یہ بچ گیا چو رنگ سے

1253ھ

ان مثالوں سے اُس زمانے کی ہجو گوئی کے معیار و مزاج کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہجو کہنے والے نے عموماً واقعات و حقائق سے تعلق رکھا ہے اور فحش سے اپنی زبان و قلم کو آلودہ نہیں کیا ہے۔

شیخ ناسخ نے مدحیہ قصیدے بھی لکھے تھے۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے ان کے بعض قصائد کی نشاندہی کی تھی۔ لکھتے ہیں:

"میرے کتب خانے کے قلمی نسخوں میں...... ایک نسخے کے آخر میں نواب معتمد الدولہ آغا میر کی مدح میں ناسخ کا ایک فارسی قصیدہ درج ہے۔ یہ ترکیب نما

شعر کا قصیدہ صنعت توشیح میں ہے۔ اس کے ہر مصرعے کا پہلا حرف لے لینے
سے اس کے عنوان کی عبارت بن جاتی ہے جو حسب ذیل ہے:
مدار المہام، عمدۃ الامرا، فرزندِ ارجمند، یار وفادار، سپہ سالار نواب معتمد الدولہ،
مختار الملک، سید محمد خان بہادر، ضیغم جنگ، فدوی شاہ زمن بادشاہ غازی خلد اللہ
ملکہ، "13

اس میں نواب کے خطابوں کی ترتیب کسی قدر بدل گئی ہے اور "وزیر المما لک وزیر اعظم" شامل نہیں ہیں۔

قصیدہ مذکور کے چند شعر یہ ہیں:

مدحِ زبدۂ اولادِ حیدرِ کرّار — دلا وسیلۂ خیر و صلاح خود پندار
اگر اطاعتِ حکم مودت قرباست — رہ نجات زاغوائے این و آں مگذار
ازیں عمل عملے نیست خوب تر کہ خدا — لب و دہان و زباں داد بہرایں گفتار
مرا گلے ست بہار حدیقۂ عالم — ہزار بار بگویم بباغ پیش ہزار
ازاں گل است ہمہ قبض وسط غنچہ و گل — معطر است ببویش مشام ہر گلزار

پروفیسر ادیب مرحوم نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"ایک دوسرے قلمی نسخے میں آغا میر کی مدح میں ناسخ کے دو فارسی قصیدے اور بھی
ہیں۔ ایک کی ردیف معتمد الدولہ بہادر اور دوسرے کی ضیغم جنگ ہے۔"14

ان تین کے علاوہ پروفیسر مرحوم ہی کے قلمی نسخوں میں ایک قصیدہ اور بھی موجود ہے لیکن ان سب کے مطالعہ سے جو تاثر ابھرتا ہے یہ ہے شاعر کو مداحی سے زیادہ تعلقِ خاطر کا اظہار مطلوب ہے مثال کے طور پر ایک قصیدہ کا آخری شعر یہ ہے۔

زکینۂ سگِ دنیا تراچہ غم ناسخ — ہمیشہ ورد زباں دار نامِ ضیغم جنگ

ضیغم جنگ نواب آغا میر کا خطاب تھا اور ان کا نام "محمد" تھا۔ یہ نام وہ ہے جس پر ہر مسلمان کا ایمان ہے اور اُس ذات گرامیؐ کو قرآن پاک میں "رحمۃ اللعالمین" کہا ہے۔ شاعر نے بطور معما اس اسم پاک کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس مقام پر دو امور تعجب خیز ہیں۔ اول یہ کہ شاعر نے قصیدہ گوئی کے لیے فارسی زبان اختیار کی ہے۔ اردو میں اس کا کوئی قصیدہ تا حال دستیاب نہیں ہوا ہے۔ دوم یہ کہ اس کے چاروں قصیدے وزیر اعظم کی مدح میں ہیں۔ بادشاہ کی مدح میں ایک بھی نہیں ہے۔ ان امور کے علاوہ ناسخ کے دریافت شدہ قصیدوں کی تعداد بھی توجہ طلب ہے۔

3۔ گویا

محمد مرتضا خاں وصل ہمشیرزادۂ فقیر محمد خاں صاحب بہادر گویا تخلص نے ان کے صاحبزادہ محمد احمد خان بہادر احمد تخلص کے دیوان ''مخزنِ آلام'' کی تقریظ میں ان کے حالات اس طرح قلم بند کیے ہیں:

''عہد محمد شاہ بادشاہ ہندوستان میں جہاں خاں نامی افغان آفریدی وارد ہندوستان ہوئے اور حضور شاہی سے مع اخلاف منصب دار ہوے۔ بعدہٗ نواب قایم خاں بخش باون ہزاری کی سرکار میں کہ یہ صاحب تین صوبہ کے تھے نواب محمود خاں خلف اکبر جہاں خاں بخشی ہو کر بالکل نایب و مدار المہام ان کی ریاست کے ہو گئے اور انتہائے ثروت کو پہنچے۔ چنانچہ نواب محمود خاں نے یار بیگ خاں افغان آفریدی، علی خیل کہ جدِ مصنف ممدوح ہیں بہ وجہ اخوت کہ بنی عم تھے ولایت خیبر سے طلب کیا اور (وہ ہندوستان میں آ کر) سرکار باون ہزاری میں بہت اعزاز سے رہنے لگے۔ بعد چندے فی مابین یار بیگ خاں و نواب محمود خاں رنجش واقع ہوی لہٰذا نواب صفدر جنگ بہادر کی سرکار میں نوکر ہوے۔ نامدار خاں خلف اکبر یار بیگ کو پانچ سو سوار کی افسری مرحمت ہوی۔ جب صفدر جنگ بادشاہ سے جدا ہو کر ملک اودھ میں تشریف لائے میاں خاں آفریدی رسالدار سترہ سو سوار زرہ پوش کہ وہ بھی عزیز یار بیگ خاں کے تھے ہمراہ صفدر جنگ کے اودھ آئے۔ اس وقت مصنف ممدوح کے بزرگوں کے پانچ رسالے تھے اور مقام کولہار میں کہ متصل قصبہ فرخ آباد کے ہے سکونت اختیار کی۔ یار بیگ خاں کے خلف اصغر بلند خاں کے فرزند فقیر محمد خاں نے

عہد سعادت علی خان بہادر میں بہ سبب کمی مشاہرہ وضبط جاگیرات وغیرہ کے قصد ملک دکن کا کیا۔ اوّل ملازم ہلکر بہادر و بعد چندروز بہ سبب یکجہتی واتحاد قومیت رفیق نواب امیر الدولہ نواب محمد امیر خان بہادر ہوے۔ بعد چند سال نواب غازی الدین حیدر مسند آرائے مملکت اودھ ہوئے۔ خان ممدوح نے بہ ذریعہ نواب معتمد الدولہ ملازمت حاصل کی۔ اس وقت سے اس سرکار میں ان کا اقتدار شروع ہوا حتّی کہ دو ہزار سوار ان کے پاینام ہوے اور مخاطب بہ حسام الدولہ فقیر محمد خان بہادر تہور جنگ ہوے۔ مرزا گنج پر بہ خرید قبضہ کرکے مسمّی علی گنج کیا اور عمارت عالیشان تعمیر کی اور دیہات وباغات واملاک حاصل کی۔ اکثر تمیں پینتیس لاکھ روپیہ کی مالگواری انھوں نے کی اور وقتاً فوقتاً کل اودھ کی نظامت ان سے متعلق ہوئی۔ 1268ھ (1852) میں انتقال فرمایا۔''15

فقیر محمد خاں گویا کے تعارف میں سعادت خاں ناصر نے تحریر کیا ہے:

''بلبلِ دستاں، طوطیِ بیاں، پیر باتدبیر، مرد رسا، حسام الدولہ فقیر محمد خان بہادر تخلص گویا، انجام اس کا آغاز سے خوشتر، جب دولت مند تھا، اب شیفتۂ امیر المومنین حیدر، مدتوں اس کی سرکار میں یہ چند سخنور مثل خواجہ وزیر و مرزا فرخ و منور خاں غافل نوکر رہے۔ مشورہ شعر کا اس وحید روزگار کو شیخ امام بخش ناسخ سے۔''16

مولوی کریم الدین نے ان کے عقیدے کے بارے میں بالکل مختلف بات کہی ہے:

''گویا تخلص حسام الدولہ نواب فقیر محمد خان بہادر کا، وہ امرائے نامی لکھنو سے ہے۔ بالفعل عہدہ رسالداری نواب اودھ کی سرکار میں رکھتا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ علما اور شعرائے زمانہ سے اس کو بہت محبت ہے خصوصاً ہر ایک شاعر کی قدر کرتا ہے اور ہمیشہ شیعوں سے لکھنو میں اس کے ہمراہ محرم شریف میں ہنگامہ رہتا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ یہ شاعر بہت متعصب سنّی ہے۔ اکثر مباحثہ شیعوں سے اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ شجاع اور دلاور بھی ہے۔ شیخ امام بخش ناسخ کے شاگردوں میں ہے۔ اس کا دیوان چھپ گیا ہے۔ شعر بہت اچھا کہتا ہے۔

پرگو اور فصیح شاعر ہے۔ شعر اس کا مذاق سے خالی نہیں۔"17

اور مرزا قادر بخش صابر نے بھی لکھا ہے کہ:

"گویا تخلص فقیر محمد خاں، شاگرد شیخ امام بخش ناسخ لکھنو میں زبدۂ امرائے نامی اور قدوۂ کبرائے گرامی سے شمار کیا جاتا ہے۔ اس سواد میں مومنین پاک کی کثرت اور حضرات شیعہ کی افراط پر اس سنّی عالی مرتبہ کا وجود نادر بل مغتنمات سے ہے۔ سخن اس کا الفاظ فصیح اور معانی غریب اور نکات برجستہ اور اشارات دلچسپ سے مملو ہے۔"18

گویا کے حالات میں دھنیا مہری کا واقعہ بھی مشہور ہے جو مختصراً اس طرح نقل کیا گیا ہے:

"دھنیا مہری مخاطب بہ افضل النسا خانم نے گویا سے اپنے امام باڑے کے باورچی خانے کے لیے تھوڑی زمین مانگی۔ یہ ٹال گیے۔ اس نے بادشاہ سے شکایت کی کہ انکار تعصب مذہب کی بنا پر ہے۔ بادشاہ نے بہ جبر زمین دلوادی لیکن جب مہری پر عتاب نازل ہوا تو گویا نے اس کے یہ کہنے کے باوجود کہ دی ہوی چیز واپس لینا آپ کے شایان شان نہیں، اپنی زمین پر قبضہ کرلیا۔"19

فقیر محمد خاں گویا کے عقیدے کے سلسلے میں ایک اہم واقعہ یہ بھی ہے کہ مولانا حیدر علی فیض آبادی ابن شیخ محمد حسن ابن شیخ محمد ذاکر ابن شیخ عبدالقادر دہلوی نے "ردِّ عقائد شیعہ" ایک کتاب ایک مقدمہ اور چند مسلکوں پر مشتمل "منتہی الکلام" کے نام سے 1252ھ (=1834) میں لکھی تھی۔ دیباچے میں اس کا مکمل نام اس طرح آیا ہے:

"منتہی الکلام ذالمتقلب بہ شبہات اہل الخوض بلا عتراضہم علی حدیث الحوض"20

اور مصنف نے اس کو "بنام حسام الدولہ فقیر محمد خاں بہادر تہور جنگ" معنون کیا ہے۔ کتاب کی زبان عربی آمیز فارسی ہے۔ یہ پہلی مرتبہ لکھنو میں بہ فرمائش فقیر محمد خاں مطبع ناصری سے 814 صفحوں پر چھپی تھی۔ سال طباعت 1250ھ=1834) درج ہے جو بدیہی طور پر غلط ہے۔

یہی کتاب دوسری مرتبہ دہلی میں محمد عبدالغفور کی فرمائش سے مطبع حکیم غلام رضا خاں میں 21 ربیع الاول 1282ھ (=1865) کو ایک دیباچے کے اضافے کے ساتھ چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ اس کے خاتمہ میں یہ مذکور ہے کہ:

"این کتاب پیش از این بہ فرمائش فقیر محمد خاں در 1250ھ در لکھنؤ چاپ شدہ بود اما آں چاپ از ترسِ اہلِ تشیع کامل نبودہ و ایک بہ صورت کامل منتشری شود"

اس اندراج سے ظاہر ہے کہ لکھنؤ میں شاہی کے زمانے میں سنّی مسلمان "از ترس اہل تشیع" اپنے عقیدے کو مخفی رکھنے پر مجبور تھے چنانچہ آفتاب الدولہ قلق کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ انھوں نے انگریزوں کے تسلّط کے بعد ہی یہ ظاہر کرنے کی جرأت کی تھی کہ وہ سنّی ہیں۔ کتاب منتہی الکلام پر غلط سال طباعت کا اندراج بھی ظاہراً کسی خاص مصلحت سے ہوگا۔ شیخ ناسخ کی بھی ایک سے زائد مثنویاں جو ان کی وفات کے بعد سامنے آئیں شیعی عقیدے کے خلاف ہیں۔ چنانچہ ان کا ذکر ان کے موقع پر کیا جائے گا۔

فقیر محمد خاں "علی خیل" سے تھے۔ قدرتی طور پر ان کی طبیعت کا میلان چوتھے خلیفہ کی طرف زیادہ تھا، لیکن محض اتنی بات سے ان کا شیعہ ہو جانا ثابت نہیں ہوتا۔ ان کی ڈیوڑھی کے داروغہ منور خاں غافل تھے جن کے راسخ العقیدہ سنّی مسلمان ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ سعادت خاں ناصر کی تحریر بھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔ ان کے کلام میں بھی حضرت علیؓ اور ان کے اولاد کے ساتھ غیر معمولی عقیدت اور محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

فقیر محمد خاں گویا نے کئی قصیدے لکھے تھے۔ ان میں سے ایک حضرت علیؓ کی مدح میں بتایا گیا ہے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ اول نے گویا کی قدر کی تھی اور انھیں اپنی سرکار میں عزت عطا کی تھی۔ گویا نے ان کی شان میں بھی قصیدہ لکھا تھا۔ شروع کے دو شعر یہ ہیں۔

خیال نرگس میگوں جو تھا دمِ تحریر　　ہوئی ہے قلقلِ مینائے مے، قلم کی صریر
وہ مست ہوں کہ مری خاک کا ہے مے سے خمیر　　پلایا ہے مجھے طفلی میں دخترِ رز نے شیر

اس قصیدے کے ایک سے زائد شعروں میں گویا نے اپنے ممدوح کو "آفتاب عالمگیر" کہا ہے۔

لکھے گا منشیِ گردوں کچھ اپنا حال تجھے　　ترا وہ رتبہ ہے اے آفتاب عالمگیر

اور

الٰہی شرق سے تا غرب تیرا حکم رہے　　کہا کریں تجھے سب آفتاب عالمگیر

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ مرزا رفیع سودا کے اس قصیدے کی زمین میں ہے جو انھوں نے شاہ عالم آفتاب کے والد عزیز الدین عالمگیر کے وزیر غازی الدین خاں عماد الملک کی مدح میں لکھا تھا۔ گویا نے اپنے قصیدے میں کئی مناسبتوں سے لطف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس قصیدے کے آخر میں انھوں نے کہا ہے۔

اٹھاؤں بہر دعا ہاتھ اپنے اے مولا کہ تو ہے شاہِ زمن، میں ہوں تیرے در کا فقیر

اس شعر میں لفظ فقیر اور شاہ زمن کی ترکیب دونوں اپنے اصل معنی کے علاوہ شاعر کے نام اور اس کے ممدوح کے لقب کے طور پر بھی آئے ہیں۔

قصیدے کے ان چند متفرق شعروں پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ شاعر نے اپنے ممدوح کی تعریف میں بدرجہ اتم مبالغہ کی کوشش کی ہے اور اسے وہ کچھ ظاہر کیا ہے جو وہ ہرگز نہیں تھا لیکن یہی تعلّی کے مضامین اس کے ممدوح کو مطلوب اور پسند بھی تھے۔

نواب معتمد الدولہ کے معزول ہو جانے کے بعد گویا کو بادشاہ دوم نصیر الدین حیدر کی سرکار میں بھی حاضر ہونا پڑا اور انھوں نے ان کی مدح میں کئی قصیدے کہے۔ ایک قصیدے میں کہتے ہیں۔

ہر ایک شعر مرا بن گیا ہے سلک گہر کہ کلکِ شہ دمِ اصلاح گوہر افشاں ہے

وہ کس طرح نہ بھلا شاعروں میں ہو ممتاز کہ جس کے شعر میں اصلاح شاہ دوراں ہے

نصیر الدین حیدر سے کچھ شعر ضرور منسوب ہیں لیکن یہ بات کسی نے بھی نہیں کہی ہے کہ وہ کسی شاعر کے کلام پر اصلاح دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ گویا کے کسی شعر میں انھوں نے کوئی ترمیم تجویز کر دی ہو اور اسی کا ذکر ان شعروں میں انھوں نے فخریہ کر دیا ہو، ورنہ گویا کے تلمذ کا حال تو وہی ہے جو تذکروں میں منقول ہے۔ مذکورہ قصیدہ کا آغاز ان شعروں سے ہوتا ہے۔

برنگ گل جسے اب دیکھیے وہ خنداں ہے بہار عیش سے ہندوستاں گلستاں ہے

بنایا ہند کو گلشن، بہار نے ایسا کہ شوق سیر میں سرو چمن خراماں ہے

یہ بات سامنے کی ہے کہ لکھنؤ یا زیادہ سے زیادہ اودھ کو ہندوستان نہیں کہتے ہیں اور نصیر الدین حیدر نہ ہندوستان کے بادشاہ تھے اور نہ خود مختار فرمانروا کی حیثیت ہی رکھتے تھے۔ بہر نوع اس قصیدے کی تشبیب کے دو شعر یہ بھی ہیں۔

نہالِ گلشنِ تصویر بھی ثمر لائیں بہار کا چمن دہر میں یہ فرماں ہے
ہے شوقِ گل میں عجب رنگ آج گلچیں کا جو دیکھیے تو گریباں بھی شکل داماں ہے

اس میں شبہ نہیں کہ فقیر محمد خاں گویا نے اپنے قصیدوں کی تشبیب میں اچھے اچھے مضامین نکالے ہیں اور قصیدہ گوئی کے باب میں انھوں نے عمدہ صلاحیت کا اظہار کیا ہے۔

4۔ املا

یہ بھی اسی زمانے کے کوئی شاعر تھے۔ احسان علی نام تھا۔ دربارِ شاہی میں رسائی کے باوجود انھیں شہرت نہیں ملی۔ ان کے حالات کسی طرح معلوم نہ ہو سکے۔

احسان علی املا تخلص نے اپنے بادشاہ نصیر الدین حیدر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ اس کی ایک نقل جو گیارہ صفحوں پر محیط ہے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ ہر صفحہ پر تیرہ سطریں ہیں اور پہلے صفحہ پر ایک مہر:

''مہدی علی خاں ضیغم جنگ اقتدار الدولہ محتشم الملک''21؎

کی 1266ھ (1850) کی ثبت ہے۔ قصیدے کا مطلع یہ ہے۔

صبح دم بیک صبا نے یہ کہا مجھ سے پکار سوتا ہے غافل پڑا کیوں ہو ذرا تو ہوشیار

اور آخری شعر یہ ہے۔

یہ نصیر الدین حیدر بادشہ قایم رہے سب کہو آمیں بحقِ حیدرِ دُلدُل سوار

اس قصیدے میں بادشاہ کی مدح میں اس کے جلوس، بحری شکار، اس کے لوازمات، انگریزی باجوں کے نام، حسینوں کے جمگھٹ اور حضرت عباس کی درگاہ کی زیارت کے لیے جانے کا بیان کیا گیا ہے۔ اپنے مطالب کے اعتبار سے یہ قصیدہ منفرد اور بہت اہمیت کا حامل ہے۔

(5)۔ غالب

مرزا اسد اللہ خاں غالب کے دیوان میں چودہ شعروں کی ایک غزل ہے، اس میں سے قابلِ توجہ اشعار ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

واں پہنچ کر جو غش آتا ہے پے ہم ہے ہم کو صدرہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو
ضعف سے نقش پے مور ہے طوقِ گردن تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ، ولیکن ناچار پاس بے رونقی دیدہ، اہم ہے ہم کو
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ہوس سیر وتماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر عزم سیر نجف وطوف حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو
طاقت رنج سفر بھی نہیں پاتے اتنی ہجر یاران وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

مفتی انتظام اللہ شہابی نے اس غزل سے متعلق جو لطیفہ قلمبند کیا ہے اس طرح ہے:

''آغا میر معتمد الدولہ غازی الدین حیدر کے نایب السلطنت تھے، ان کا بڑا شہرہ تھا، مرزا کلکتے جاتے ہوئے گیارہ ماہ لکھنؤ میں رہے تھے، غازی الدین حیدر اور آغا میر سے ملنے کے عرصے تک متمنی رہے، آغا میر تھا بڑا رافضی اور کنجوس، اس نے مرزا کو اپنے ملنے کا موقع ہی نہیں دیا، اس زمانے میں لکھنؤ میں ایک مشاعرہ تھا، طرح پر غزل کہی، مرزا اس خیال میں تھے کہ شاید مشاعرے میں آغا میر آئے مگر وہاں بھی وہ شامل نہیں ہوا''۔

اس لطیفے میں حقائق کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے، معتمد الدولہ اگر رافضی تھے تھے تو غالب بھی بقول خود نصیری تھے۔

ع منصور فرقۂ علی اللّٰہیاے منم

معتمد الدولہ محض وزیر اعظم نہیں تھے، بادشاہ گر بھی تھے، وہ لکھنؤ کے ہر مشاعرے میں شریک نہیں ہو سکتے تھے، غالب نے اگر ایسا خیال کیا تھا تو یہ ان کی غلطی تھی، صحیح یہ ہے کہ غالب نے معتمد الدولہ کی سرکار میں رسائی کی صورت پیدا کر لی تھی، لکھتے ہیں:

''مہربانان گرد آمدند بزرگان انجمن شدند ورفتہ رفتہ ذکر خاکسار بپاے سراپہ بزم آغا میر نامی از سادات عاملۂ آن دیار کہ دراں روز ہا بہ آہنگ معتمد الدولگی بلند آوازہ بودو بہ تر خانی فرمانروائے آں کشور و مدار المہامی آں سلطنت اشتہار

داشت رسانیدند تا ازاں جانب ایماء کششے رفت، ازیں سو نیز آشوب ہوسے
گل کرد، چوں ملازمت قرار یافت خواستم دستمایۂ عقیدتے سرانجام داون....
دسواد عبارتے ہم در صنعت تعطیل روشن ساخت"۔23

بظاہر یہ ہے کہ غالب قصیدہ نہیں لکھ سکے لیکن صحیح یہ نہیں ہے، جو واقعات گذرے تھے وہ غالب نے نہیں لکھے اور یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ:

"آں چہ در باب ملازمت قرار یافت خلاف آئین خویشتن داری ونگ شیوۂ
خاکساری بود، تفصیل ایں اجمال وتوضیح ایں ابہام مجو بہ تقریر ادا نتواں کرد"۔

البتہ حالی نے یہ لکھ دیا ہے کہ:

"غالب نے ملاقات کی دو شرطیں پیش کی تھیں جو منظور نہ ہوئیں، اول یہ کہ
نایب السلطنت غالب کو تعظیم دیں، دوم نذر پیش کرنے سے انھیں معاف رکھا
جائے"۔24

دوسری بات تو ممکن ہے کیونکہ غالب سفر میں تھے اور ان کے پاس نذر پیش کرنے کے لیے کوئی مناسب شے نہ رہی ہوگی، لیکن پہلی بات خلاف قیاس ہے۔ اگر وہ صحیح ہوتی تو غالب جیسا شخص اس کا ذکر بار بار کرتا، غالب کی خاموشی اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ جو بھی واقعہ پیش آیا وہ غالب کے لیے خفت اور شرمندگی کا سبب تھا۔ چنانچہ انھوں نے معتمد الدولہ کی خوب ملامت کی ہے اور رائے چھج مل کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

ہر چہ دراں بلاد از کرم پیشگی وفیض رسانی ایں گدا طبع سلطان صورت یعنی معتمد
الدولہ آغا میر شنیدہ می شد بخدا کہ حال برعکس ست، در ابتدائے دولت ہر کہ را
آلت حصول مدعائے خود دید بروے پیچید، لاجرم یک دو کس بہر رنگ متمتع گشتند
واکنوں کہ از استحکام اساس دولت خود خاطرش جمع است در بند جمع زر افتادہ
است، جملہ خاندان ہائے قدیم لکھنؤ از بیداد ایں بے رحم بہ سیلاب فنا رسید و ناز
پروردگان ایں دیار آوارۂ جہات گیتی گردید، و او خود از تردستی واز اسراف خود
پشیماں شدہ واز یں شیوہ برگشتہ، بالجملہ بازار بیداد گرم است، مہاجنان

وساہوکاران وتاجران پنہاں پنہاں زرومال خود بہ کانپوری رسانندوایمن نشیند، ہر
کہ بودگریختہ وہرکہ است دربندگریختن است، چوں حال ایں دیار بدیں رنگ
است آں خوشتر کہ سخن ازخود نہ گویم، بتاریخ بست وششم شہرذیقعدہ روز جمعہ ازاں
ستم آباد برآمدم وبتاریخ بست ونہم درداراالسرور کانپور رسیدم''۔

کانپور کا علاقہ نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں ہی انگریزوں کی عملداری میں آگیا تھا۔ وہاں اودھ کے حکمرانوں کو مطلق دخل نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لکھنؤ کے مجرموں اور جرائم پیشہ لوگوں کی پناہ گاہ بن گیا تھا، غازی الدین حیدر کے وقت سے ہی کانپور کے چور مشہور تھے۔ چنانچہ میر رشک نے بھی کہا تھا ؎

سینے سے دل چرا کے چراتے نہیں نظر ۔۔۔ یہ بُت بھی کانپور کے چوروں سے کم نہیں

مرزا غالب کے اس بیان سے بھی ظاہر ہے کہ لکھنؤ کے مہاجن اور ساہوکار وہاں سے زرومال چوری چوری سے کانپور بھیج کر مالدار ہورہے تھے۔ اس چور بازاری کی بھی وہاں کے حکّام چشم پوشی کر کے بالواسطہ طور پر سرپرستی کررہے تھے۔ غالب کے انگریزوں کے ساتھ روابط تھے۔ اس لیے ان معاملات کے باوجود وہ کانپور کو ''دارالسرور'' کہتے تھے اور اس معتمد الدولہ کی جو چور بازاری کرنے والوں کے لیے مجسم خوف تھا مذمت کررہے تھے۔

غالب نے جو قصیدہ معتمد الدولہ کی مدح میں لکھا تھا، اس کا تعارف کراتے ہوئے قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے:

''دراصل یہ قصیدہ معتمد الدولہ کی مدح میں تھا، غالب نے یہ بات کہ قصیدہ نہ کہہ سکا مصلحتاً لکھی تھی، فی الحال اس قصیدے کے ایک سو چار اشعار ہیں، ابتدا میں ایک سو دس تھے، معتمد الدولہ سے ملاقات نہ ہوئی اور یہ قصیدہ پیش نہ ہوا تو وہ اسے نواب مرشد آباد کے نام سے شہرت دینا چاہتے تھے، لیکن یہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آسکا، غالب ایک غیر مطبوعہ خط میں محمد علی خاں (باندہ) کو لکھتے ہیں کہ میں نے معتمد الدولہ کی مدح میں جو قصیدہ کہا تھا وہ جب تک ترمیم نہ ہو کسی کو دکھایا نہ جائے!

قصیدہ کو در مدح آغا میر گفتہ ام خدا می داند کہ برائے خاندان من طرفہ داغ بدنامی است ولطف اینکہ یک صد ودہ شعر را از صفحہ حک ساختن نمی توانم...نواب مرشدآباد نیز سیدزادہ است، ایں قصیدہ را بنام دے شہرت دہم، گو بہ ملازمتش نا رسیدہ....لیکن مداح بودن من ہمایوں جاہ (نواب مرشدآباد) را برمن ناگوار نیست، توقع تازمانے کہ اشعار موضع اسم ممدوح...قصیدہ را بہ کس نہ نمایند وعیب خرداں را چوں بزرگاں بپوشند"۔26

وجہ جو بھی ہوئی ہو، مرزا غالب اس قصیدے کو نواب مرشدآباد کے نام سے نہ کرسکے البتہ ان کی قسمت سے جلد ہی معتمد الدولہ کو زوال ہوا اور انھیں لکھنؤ ہی میں اس قصیدے کے لیے ممدوح مل گیا، غالب کا بیان نقل کرنے کے بعد قاضی عبدالودود صاحب نے تحریر کیا ہے کہ:

"بعد کو اس قصیدے کے لیے ممدوح نصیرالدین حیدر قرار پائے، ان کی ردیف رفتم ہے، اور قوانی عنوان، گریبان وغیرہ ہیں۔"

قابل توجہ بات یہ ہے کہ حقائق پر پردہ ڈالتے رہنا عیب نہیں تھا، عیب غالب کے خیال میں یہ تھا کہ حقیقت لوگوں کے سامنے آجائے، وہ قصیدہ اتنی محنت سے لکھا گیا تھا کہ وہ اسے ضائع نہیں کرسکتے تھے، باوجود اس کے وہ انھیں کے لیے نہیں۔ ان کے خاندان کے واسطے بھی در مدح معتمد الدولہ ہونے کی وجہ سے "طرفہ داغ بدنامی" بن گیا تھا۔ لیکن معتمد الدولہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے آغا علی خاں کی خدمت میں انھوں نے جو خطوط لکھے ہیں وہ نہ غالب کے لیے اور نہ ان کے خاندان کے واسطے بدنامی کا سبب بنے ؎

ناطقہ سر بہ گریباں ہے، اسے کیا کہیے

ان مختلف النوع واقعات پر نظر کریں تو اور کچھ ثابت ہو یا نہ ہو، معتمد الدولہ کی مردم شناسی کا ثبوت ضرور مل جاتا ہے۔

گذشتہ اوراق میں جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں ان سے یہ حقیقت بخوبی سامنے آجاتی ہے کہ لکھنؤ کے درباروں میں بادشاہت کے قیام کے بعد بھی قصیدہ گوئی کی روایت جاری تھی۔ وہاں اردو ہی نہیں فارسی میں بھی قصیدے پڑھے اور سنے جاتے تھے۔ بلکہ شاید فارسی کی طرف توجہ کچھ

زیادہ تھی، شیخ ناسخ کے علاوہ خواجہ آتش کے بعض تلامذہ نے بھی قصیدے لکھے تھے۔ چنانچہ سید محمد خاں رند کے دیوان میں بھی قصیدے موجود ہیں۔ البتہ مداحی کا کام وہاں چونکہ بعض دوسری اصناف سے بھی لیا جاتا رہا تھا قصیدے کی صنف اردو میں زیادہ نمایاں نہیں ہو سکی اور رفتہ رفتہ یہ غلط خیال جڑ پکڑتا گیا کہ اس صنف شاعری کی لکھنؤ میں کما حقہ پذیرائی نہیں ہوئی۔

نعت

یوں تو پوری کائنات ہی رب قدیر کی جلوہ گاہ ہے، اس لیے یہاں جو بھی خیال یا کلام کیا جاتا ہے براہ راست یا بالواسطہ اسی ذات مطلق سے متعلق ہوتا ہے۔ البتہ جو کلام بدیہی طور پر اس مالک حقیقی کے معاملات اور صفات پر مشتمل ہوتا ہے اسے حمد کہتے ہیں اور جس میں صراحت اور قطعیت کے ساتھ اس کے رسول پاک ﷺ کے اوصاف و کمالات کا بیان ہوتا ہے نعت کہلاتا ہے۔ شروع زمانے سے ہی یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ نظم ہو یا نثر، اس کی ابتدا حمد سے کی جاتی ہے پھر نعت لکھتے ہیں، پھر عموماً حضرت رسول اکرم ﷺ کے چاروں خلفا کا، پھر اپنے بادشاہ کا ذکر کرتے ہیں، موقع اور ضرورت کے مطابق ان مضامین میں کمی و بیشی اور تغیر و تبدل بھی کر لیتے ہیں۔

کبھی جوش عقیدت میں، کبھی موقع اور محل کی رعایت سے حمد اور نعت کو علاحدہ بھی لکھ لیتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کا تعلق ذات مطلق اور اس کائنات کی بزرگ ترین ہستی سے ہوتا ہے، اس کلام پر ہیئت وغیرہ کی پابندی عائد نہیں ہوتی یعنی حمد اور نعت وغیرہ کبھی غزل کی صورت میں لکھتے ہیں اور کبھی دوسری مختلف شعری ہیئتوں میں بھی کہہ لیتے ہیں۔

اودھ کے علاقے میں نعت گوئی کی طرف بادشاہت کے قیام کے بعد عموماً توجہ کی گئی تھی۔ لیکن بوجوہ اس کا رواج قدرے بعد میں ہوا تھا، یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہاں پر ابتدائی زمانہ میں

مضامین، زبان اور بیان کے اعتبار سے عموماً محتاط روش اختیار کی گئی تھی۔

1 - وزیر

خواجہ محمد وزیر نام، وزیر تخلص تھا، شیخ امام بخش ناسخ کے شاگردوں میں ممتاز اور استاذ فقیر محمد خاں رسالدار گویا تخلص کی حیثیت سے معروف تھے۔ ان کا ایک قطعہ اس طرح ہے۔

الٰہی تجھ کو غفور الرحیم کہتے ہیں   نہ کر عوض مرے جرم وگناہ بے حد کا
یہ اس کے بندے ہیں جس کو کریم کہتے ہیں   کہیں کہیں نہ عدو دیکھ کر مجھے محتاج

اس قطعہ کی کیفیت کو اہل دل ہی محسوس کر سکتے ہیں، ہر مصرع دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

خواجہ وزیر نے نعت بھی لکھی ہے اور خوب لکھی ہے۔ اس کے کچھ شعر درج ذیل ہیں۔

اللہ رے حُسن رُخ نیکوے محمدؐ   ہے چشم خداوند جہاں سوے محمدؐ
نظروں میں شفاعت نے عمل تول لیے ہیں   پلّے یہ ہیں اُمت کے ترازوے محمدؐ
بخشش میں وہ مصروف یہ سرگرم شفاعت   اللہ سے ملتی ہوئی ہے خوے محمدؐ
کرتی ہے گنہ خلق، خدا کچھ نہیں کہتا   واقف ہے کہ نازک ہے بہت خوے محمدؐ

پاس مراتب کے باوجود مضامین تازہ کی تلاش اور پھر موقع اور محل کے مطابق ایک ایک لفظ گویا موتی کی طرح جڑ دیا ہے۔

2 - گویا

فقیر محمد خاں نام، گویا تخلص، پہلے وزیر کے، پھر شیخ ناسخ کے شاگرد ہوئے، ابن امین اللہ طوفان نے ان کو "صاحب دیوان" کہا ہے۔ ان کے دیوان کی ترتیب کی تاریخ شیخ ناسخ نے کہی تھی،

سال اتمام و سَن تحسین   گفت دل <u>ہست کتاب دلکش</u>

1242ھ

گویا نے مروجہ طریقے کے مطابق اپنے دیوان کو مرتب کیا تھا۔ چنانچہ ردیف الف کی غزل کے یہ اشعار لائق توجہ ہیں۔

بخشا ہے مجھ فقیر کو رتبہ امیر کا   کیا کروں میں شکر خدائے قدیر کا

روشن ہو تیری یاد سے دل مثل آفتاب   عالم جبیں میں سجدے سے ماہ منیر کا
بیدار ہوں نصیب جو آنکھیں ہوں خواب میں   دیکھوں جمال تیرے بشیر ونذیرؐ کا
یارب میں تیری راہ میں ثابت قدم رہوں   چھوٹے نہ مجھ سے ہاتھ مرے دستگیر کا
سلطان مرسلینؐ کی گویا صفت کروں   کیا منہ بھلا ہے مجھ سے فقیر حقیر کا

گویا کی ایک نعت کو بہت شہرت ملی اسی کے ذیل کے اشعار تو زبانوں پر جاری ہیں۔

فلک ہے زیر فرمان محمدؐ   بڑی ہے عرش سے شان محمدؐ
محمدؐ سے صفت پوچھو خدا کی   خدا سے پوچھیے شان محمدؐ
خدا سے کم، زیادہ سب سے کہیے   یہی کلمہ ہے شایان محمدؐ

وزیر اور گویا کے علاوہ لکھنؤ کے اور بھی کئی شاعروں نے نعتیں اور حمد لکھی ہیں، علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں مولوی ظہور علی، محمد غضنفر اور بعض دوسرے شاعروں کا ایک مختصر ''مجموعۂ قصائد نعتیہ و مدحیہ'' موجود ہے، جس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

مرحبا رحمۃ للعالمین   مرحبا سید المرسلین

اور خاتمہ کا شعر یہ ہے۔

یہ آرزو ہے دل میں قمر کے شب و روز   اللہ مہیا کرے سامان مدینہ

1

مثنوی

شاہی کے زمانے میں لکھنؤ کے اکثر شاعروں نے مثنویاں لکھی تھیں۔ ان میں زیادہ تعداد ان کی تھی جن کا تعلق مذہب سے تھا۔ ان میں سے بعض تعلیم و تعلم کے مقصد سے لکھی گئی تھیں اور مذہبی روایتوں حکایتوں اور مسائل و مباحث پر مبنی ہوتی تھیں اور کچھ عقائد و رسوم سے متعلق محفلوں اور مجلسوں میں پڑھی جانے کے لیے ہوتی تھیں۔ مذہب سے متعلق ہونے کی وجہ سے ان سب کو ایک حد تک مقدس اور محترم خیال کرتے تھے۔ اس لیے زبان و بیان اور فن کے نقطۂ نظر سے ان کو دیکھنے اور کسی طور سے ان پر حرف گیری کرنے کو معیوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ علمی اور ادبی اعتبار سے ان کا معیار عموماً کچھ بلند نہیں ہوتا تھا۔ ان کی افادیت بھی محدود ہوتی تھی اور ان کے پڑھنے والے بھی کسی خاص طبقے اور عقیدے کے لوگ ہوتے تھے۔

کچھ شاعروں نے عشقیہ مثنویاں بھی لکھی تھیں۔ اگرچہ اہل مذہب خواہ ان کا تعلق کسی بھی مرکز و مقام سے رہا ہو ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً شیخ ابراہیم ذوق نے بھی کہا تھا کہ ؎

ہوا ہے مدرسہ یہ بزمگاہ عیش و نشاط　　کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدر منیر

لیکن عشق کے موضوع کی آفاقیت ان مثنویوں کو خاص و عام میں مقبول بنا دیتی تھی۔ ایسی.

مثنویاں لکھنے کے لیے عمدہ شاعرانہ صلاحیتوں کا ہونا ضروری تھا کیونکہ انھیں مذہبی تقدس حاصل نہیں تھا اور ان کی ایک ایک بات اور ایک ایک لفظ پر گرفت کی جا سکتی تھی۔ محنت اور احتیاط سے لکھی جانے کی وجہ سے ان مثنویوں کا معیار بہت بہتر ہوتا تھا۔

1- ناسخ

مولانا محمد حسین آزاد نے شیخ امام بخش ناسخ کے عقیدے کے بارے میں اطلاع دی ہے کہ:

"شیخ صاحب کا مذہب پہلے سنت و جماعت تھا، پھر مذہب شیعہ اختیار کیا"۔

معاصر تذکروں میں مذہب کی اس تبدیلی کا مذکور نہیں ہے۔ ان سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا ہے کہ مذہب کیوں اور کب بدلا تھا، اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی توجہ طلب ہے کہ نواب معتمد الدولہ کی وفات کے بعد کانپور میں ان کے بیٹے نواب امین الدولہ مہر موجود تھے، جو ناسخ کے شاگرد بھی تھے۔ اور اپنے والد کے طریقوں پر چل رہے تھے لیکن شیخ ناسخ کو جب لکھنؤ سے پریشان ہو کر بلکہ جان بچا کر نکلنا پڑا تو انھوں نے الہ آباد جا کر شاہ اجمل کے دائرے میں پناہ لینے کو ترجیح دی تھی، لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں بھی کسی نہ کسی طور پر شیخ صاحب نے فرنگی محل سے رابطہ رکھا تھا۔

ناسخ کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے مخصوص حالات میں وہ اپنے نئے عقیدے کا شعوری طور پر اظہار و اعلان کرتے تھے اور بقول آزاد کیفیت یہ تھی کہ:

"وہ اکثر غزلوں میں مذہبی تعریضیں کرتے تھے، اور یہ شاعر یا عام مصنف کے لیے نازیبا ہیں، ہاں کوئی اپنے تائید مذہب میں کتاب لکھے تو دلائل و براہین کی قبیل سے جو چاہے کہے مضائقہ نہیں"۔1

شیخ ناسخ کی وفات کے بعد ان کا جو کلام شائع ہوا ہے اس میں شیعی عقائد پر مشتمل دو مثنویاں بھی ہیں۔ پہلی کا کوئی نام مقرر نہیں ہے اور دوسری کا تاریخی نام "سراج نظم" ہے، ناسخ کی زندگی میں کسی نے بھی ان کے مثنوی لکھنے کا ذکر نہیں کیا ہے البتہ دونوں کی اشاعت کے چند سال بعد محسن نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے:

"تین دیوان، ایک ترجمہ حدیث مفضل، ایک رسالہ مولد شریف رسول مختارؐ، ایک رسالہ شہادت جناب سید الشہدا اور ایک رسالہ ولادت جناب علی مرتضی

امیر علیہ السلام ان سے یادگار ہیں"۔2

شیعی عقیدے سے متعلق شیخ ناسخ کی پہلی مثنوی کلیات ناسخ کی پہلی اشاعت میں شامل ہو کر شائع ہوئی تھی، یہ مثنوی دیوان کے آخر میں حاشیہ پر لکھی گئی تھی اور اس کا اختتام ان شعروں پر ہوا تھا۔

فقط خاک پر کیوں نہ سوتا علی　　نہ تھا شیر قالی وہ شیر جری
علیک السّلام اے علیِ ولی　　علیک السّلام اے وصیِ نبی

تمت

اس مثنوی کو 1931 میں حبیب اللہ خان غضنفر نے چھپوا کر کتابستان الہ آباد کی طرف سے شائع کروایا تھا انھوں نے اس کے مقدمہ میں لکھا تھا:

"نظم سراج 1254ھ میں تمام ہوئی مگر اس (مثنوی ناسخ) کی تصنیف میں کم سے کم تین سال صرف ہوئے ہوں گے لہٰذا اس کا سال آغاز 1251ھ ہے اور یہ مثنوی اس سے مقدم ہے، لہٰذا 1250ھ کے لگ بھگ تصنیف ہوئی"۔3

غضنفر کو تعجب اس پر ہے کہ اس مثنوی کا نہ تاریخی نام ہے، نہ کوئی قطعہ تاریخ ہے۔ اس مثنوی کے زمانۂ تصنیف سے متعلق ان کا قیاس عجیب ہے اور اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خیال کہ ناسخ اپنی منظومات کا تاریخی نام رکھتے تھے۔ غالباً صحیح نہیں۔ یہ دعویٰ بھی کہ انھوں نے اپنے دواوین اور مثنویوں کے نام خود رکھے تھے محتاج ثبوت ہے۔ ان کی بعض تصنیفوں کے نام ان کے شاگرد رشید میر علی اوسط رشک نے رکھے تھے چنانچہ حسب موقع کیفیت درج کی جائے گی۔

شیخ ناسخ کی اس (مثنوی ناسخ) کے بارے میں غضنفر نے جو رائے تحریر کی ہے وہ مختصراً اس طرح ہے:

"جنھوں نے مثنوی کے لیے مدح شاہ اور تعریف سخن کو ضروری قرار دیا ہے ان کو یہ مثنوی ناتمام معلوم ہو گی مگر صرف یہ اشعار کے حُسن و قبح پر نظر کرنے والے اس کو اعلیٰ قسم کی نظم ماننے پر مجبور ہیں، جو لوگ وجہ تالیف کو اوّل میں پڑھنے کے عادی ہیں وہ اس کو غیر مرتب کہہ سکتے ہیں، ناسخ نے حسب عادت اس مثنوی میں بھی

عربی کے ثقیل الفاظ استعمال کیے ہیں، جن سے اجتناب لازم تھا، روایات کا ترجمہ بہت صاف اور صحیح ہے، مثنوی میں چوالیس عنوان ہیں، شروع نمبر ایک ودو میں حمد و نعت ہے"۔4

بعض عنوان اور ان کے تحت ایک ایک شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

نمبر20- روایت از محمد بن ابی بکر

محمد جو ابن ابو بکر ہے　　وہ بے عذر ہے اور بے مکر ہے

نمبر27- روایت از حضرت عائشہ

یہ ہے حضرت عائشہ سے خبر　　کہ فرماتے تھے شاہ جن وبشر

نمبر29- روایت از ام سلمہؓ

یہ ہے ام سلمہؓ سے قول نبیؐ　　جہاں کوئی کرتا ہے ذکر علیؑ

نمبر33- روایت از حضرت عائشہ صدیقہ

یہ ہے حضرت عائشہؓ سے کلام　　کہ فرماتے تھے مجھ سے خیر الانام

نمبر34- روایت از صحیح ترمذی

عزیزو جو ہے ترمذی کی صحیح　　یہ وارد ہے اس میں صریح

یہ عنوان قابل غور ہیں، ان کی موجودگی اس حقیقت کی غماز ہے کہ اس مثنوی کی تالیف کے وقت تک شیخ ناسخ دل سے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عائشہؓ وغیرہ کا احترام کرتے تھے، اس کے وجوہ بظاہر یہ ہو سکتے ہیں:

الف- یہ مثنوی اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب شیخ ناسخ نے شیعہ مذہب قبول تو کر لیا تھا لیکن پہلے عقیدے سے ان کا دل پوری طرح سے منحرف نہیں ہو سکا تھا، یا

ب- اس وقت تک ناسخ واقعۃً شیعہ نہیں ہوئے تھے، لکھنؤ کے مخصوص حالات کے تقاضوں سے انھوں نے یہ مثنوی لکھی تھی۔

یہ مثنوی ناسخ کی ظاہراً کوئی مربوط اور باضابطہ تصنیف نہیں ہے۔ اس میں شیخ ناسخ نے حضرت علی کے فضائل میں شیعی عقائد کے مطابق معتد حدیثوں اور روایتوں کو جمع کر دیا ہے۔

چنانچہ بعض کے آخر میں اس قسم کے اشعار بھی لکھے ہیں۔

نمبر13

یہی لکھ گئے مجھ سے پہلے ثقات کہ کعبہ میں گذریں یہ سب واردات
کروں اور ذکر حدیث صحیح کرے ترجمہ نظم طبع فصیح

نمبر22

دلا ختم کر یہ حدیث اب یہیں کہ سُن کر کوئی تا نہ ہو خشمگیں

اس دوسرے شعر سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ ناسخ کو پہلے عقیدے کے لوگوں کی خاطر کا پاس تھا اور اپنے نئے عقیدے کے مطابق روایتوں کا بیان کرتے وقت وہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ ان کا بیان کسی کی دل آزاری کا سبب نہ بنے۔

سراج نظم

ان کے نئے عقیدے کے مطابق شیخ ناسخ کی یہ دوسری مثنوی ہے۔ میر رشک کی تصحیح کے ساتھ مطبع محمد حسین لکھنؤ میں 1265ھ (1849) میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ سرورق کے اندراج اس زمانے کے چلن کے مطابق منظوم ہیں اور بظاہر یہ سب اشعار میر رشک ہی کے ہیں۔

یمن فضل خدائے سُبحاں سے عونِ خلاق جن وانساں سے
مثنوی جناب کامل فن ناسخ استاد اہل شعروسخن
نام پھیلا ہے جس کے مضموں کا نام جس کا سراج نظم ہوا
1254ھ
نظم ہے ترجمہ حدیثوں کا یعنی جو کچھ امام دیں نے کہا
باتیں اس کی جو ہیں بہت مطبوع کی محمد حسین نے مطبوع
نافع خلق بے گماں ہے یہ سخن حق ہی کا بیاں ہے یہ

اس مثنوی کے آخر میں میر رشک نے اس کی تکمیل کے سال اور نام وغیرہ کا بیان اس طرح کیا ہے۔

جب کہ اے رشک ناسخ ذیشاں رشک حسان وغیرتِ سحباں

میرے استاد، شہر کے استاد　　شہر کیا، اہل دہر کے استاد
پا چکے نظم مثنوی سے فراغ　　کھل گیا گلبنِ سخن کا باغ
تھے جو مجھ سے بجان ودل راضی　　نام وتاریخ کی اشارت کی
حکم استاد میں بجا لایا　　سب وہ ارشاد میں بجالایا

ان شعروں سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔اول یہ کہ مثنوی کا یہ تاریخی نام خود ناسخ نے نہیں رکھا تھا۔ان کے ارشاد کے تعمیل میں رشک نے رکھا تھا۔دوم یہ کہ جس وقت میر رشک یہ اشعار موزوں کررہے تھے، ناسخ موجود نہیں تھے۔قیاس کہتا ہے کہ اس وقت وہ انتقال کر چکے تھے۔میر رشک نے ان کی وفات کے بعد اس مثنوی کو اپنے شعروں کے ساتھ مرتّب کیا تھا۔حکم استاد کی تعمیل میں رشک نے بہت سے شعر لکھے تھے، کچھ یہ ہیں ۔

نام رکھا سراج نظم اس کا　　اس سے تاریخ نظم ہے پیدا
دل میں آیا کہ ایسی ہو تاریخ　　صوری ومعنوی ہو جو تاریخ
سُن کے جس کو مؤرخان جہاں　　کھولیں شاباش میں زبان بیاں
مادہ باصواب موزوں ہوا　　مصرع لا جواب موزوں ہوا
ہوئی تاریخ رشک نظم گہر　　شرح اقوال صادق ورہبر

1254ھ

ناسخ نے یہ مثنوی چند مجلسوں اور ایک خاتمہ میں مکمل کی تھی۔اس میں جتنے عنوان ہیں سب موزوں اور ایک مصرع کی صورت میں ہیں۔مثنوی حمد ونعت اور منقبت سے شروع کی ہے۔پہلا شعر یہ ہے۔

ہے سزاوار حمد ذاتِ خدا　　قابلِ شکر ہے صفاتِ خدا

یہ مثنوی کاظم علی کی فرمائش اور مدد سے لکھی گئی ہے، شاعر نے ان کی ستائش میں بہت سے شعر کہے ہیں، ان میں سے بعض یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

پیرو مظہر العجائب ہیں　　جیسے حاضر ہیں ویسے غائب ہیں

کوئی ہمدم نہیں سوائے کتاب   کھویا نور بصر برائے کتاب
صاحب علم، صاحب توفیق   صاحب حلم، صاحب تحقیق
ان کا فرمان واجب الاذعان   دل سے ہوں ان کا تابع فرمان
علم فقہ وحدیث سے واقف   غامضات علوم کے کاشف
ایک ان کا ہے ظاہر وباطن   نیک ان کا ظاہر وباطن
طبع باجودت ولطیف وظریف   نام کاظم علی نجیب وشریف
ان کے ارشاد سے ہوئی یہ نظم   ان کی امداد سے ہوئی یہ نظم
حضرت مجتہد کے ہیں تلمیذ   داغ استاد دل میں ہیں تعویذ
کوئی زاہد نہیں سُنا ایسا   کوئی عابد نہیں سُنا ایسا
تابع اے ناسخ ان کا ہو تو بھی   خاک شو پیش از آنکہ خاک شوی

قاضی عبدالودود صاحب نے اس مثنوی کے بارے میں جو لکھا ہے اس کا خلاصہ اس طرح ہے:

''کاظم علی جن کی فرمائش سے یہ مثنوی لکھی گئی ہے غالباً مرزا کاظم علی خاں (پدر برق) ہیں جن کی وفات سے متعلق حصۂ نظمیں دیوان ناسخ میں موجود ہیں، اور جن کا انتقال 1249ھ (1833-34) میں ہوا ہے، جو اوصاف بیان کیے ہیں وہ نہایت مشابہ ہیں، مثنوی میں کاظم علی خاں کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ وہم بھی نہیں ہوتا کہ وہ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، اگر کاظم علی اور مرزا کاظم علی خاں ایک ہیں تو ناسخ نے مثنوی ان کی زندگی میں تمام کرلی ہوگی، بالکل آخر کے کچھ اشعار 1254ھ میں کہے ہوں گے، اور اسی زمانے میں نظر ثانی بھی کی ہوگی، اس مثنوی میں وہ زبان ملتی ہے جو ناسخ کے آخری دور کی ہے، یہ مثنوی ادبی نقطۂ نظر سے کتنی ہی ناقابل اعتنا کیوں نہ ہو، لکھنؤ کی زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے''۔5

سرورق پر اس مثنوی کو ''ترجمہ حدیثوں'' کا بتایا گیا ہے اور خود شاعر نے بھی کہا ہے کہ

ع :ترجمے کا جو قصد کرتا ہوں

لیکن اس میں ایک شعر یہ ہے۔

گو حدیث اپنے آگے دھرتا ہوں پر میں حاصل بیان کرتا ہوں

اور دوسرے موقع پر یہ شعر آیا ہے۔

باقرِ مجلسی کی ہے تقریر اس محل میں ہوا ہے یوں تحریر

ایک اور مقام پر شاعر نے صاف کہا ہے ع:

یہ بعینہٖ نہیں، خلاصہ ہے

ان شعروں سے ظاہر ہے کہ یہ مثنوی براہ راست حدیثِ مفضل کا ترجمہ نہیں ہے شاعر نے ملا باقر مجلسی کے کیے ہوئے فارسی ترجمے کو پیش نظر رکھا تھا اور اس نے اسی فارسی ترجمے کے خلاصے کو اپنی زبان میں نظم کر دیا ہے۔ مثنوی کے آخر کے اشعار یہ ہیں۔

فضل پیدا کنندہ مہ وسال جب ہوا میرے شامل احوال

دل میں آیا لکھوں کوئی تاریخ کہ رہے ختم نظم کی تاریخ

ہوتا ہے سال ختم نظم بیاں

بے خزاں مل گیا جو باغ سخن اور حاصل ہوا فراغ سخن

مصرع صاف عیب سے پایا ترجمہ ہے حدیث امجد کا

یہ مثنوی شیخ ناسخ کی وفات کے کئی سال کے بعد میر علی اوسط رشک کی تصحیح کے ساتھ شائع ہوئی تھی اس کی تصحیح کی کیفیت سے اگلے حصے میں بحث کی جائے گی۔

ناسخ کے دیوان میں مثنوی کی ہیئت میں بعض قطعے بھی ہیں۔ یہاں محض مثال کے طور پر ایک کا ذکر کیا جاتا ہے، عنوان

''قطعہ دعائیہ''

اس میں کل اُنیس شعر ہیں، مطلع یہ ہے۔

ظلِ سبحاں غیرت نوشیرواں بادشاہ بادشاہاں جہاں

ممدوح کا نام شاعر نے اس شعر میں نظم کیا ہے۔

یہ ابو الفتح معین الدین لقب   ہو صدوی سال بائیش وطرب

قطعہ کے آخر کے اشعار یہ ہیں۔

اس کا حامی ہے محمدؐ مصطفیٰ   س کا ناصر ہے علیؑ مرتضا

یار ہے اس کا حُسن، یاور حُسین   حضرت خیر النسا کے نور عین

چتر اس کا سایۂ فضل خدا   شہپر جبریل ہے جاے ہما

تا ابد یہ بادشہ ہے تندرست   تا ابد یہ کج کلہ ہے تندرست

خیال کریں کہ مثنوی کی ہیئت میں شاعر نے یہ ایک مختصر لیکن کامیاب قصیدہ لکھا ہے۔ زبان، بیان اور مطالب کے اعتبار سے بھی اسے مثنوی کے زمرے میں شامل کرنا غالباً مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے۔

اسے محض اتفاق کہیں یا کچھ اور کہ میر اوسط رشک کے واسطے سے مثنوی کی ہیئت میں شیخ ناسخ کا جو کچھ کلام ہم تک پہنچا ہے، وہ شیعی عقائد پر مشتمل اور مبنی ہے، اس کے برخلاف دوسرے ذرائع سے جو مثنویاں سامنے آئی ہیں ان میں اس عقیدے کی نمائندگی نہیں ہوتی ہے، بعض لوگوں نے ان مثنویوں کو ناسخ کے ابتدائی زمانے کا کلام کہا ہے لیکن زبان اور طرز بیان وغیرہ اس خیال کے موید نہیں معلوم ہوتے ہیں۔

معراج نامہ

شیخ امام بخش ناسخ کی اس مثنوی کا تعارف پہلی مرتبہ جناب رشید حسن خاں نے کرایا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اس کا جو قلمی نسخہ انھیں دستیاب ہوا ہے وہ ناقص الاول ہے شروع کا صرف ایک ورق کم ہوگا۔ اشعار کی تعداد 345 ہے۔ اکتیس عنوانات ہیں۔ کاتب کا خط صاف اور پختہ ہے، ترقیمے کی عبارت یہ ہے:

> ''تمام شد رسالہ معراج نامہ من تصنیف شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی از دست فقیر محمد عبد الجامع عفی اللہ عنہ ساکن فرنگی محل من محلات بیت السلطنت لکھنؤ در عہد شاہ باشوکت وحشمت حضرت امجد علی بادشاہ خلد اللہ ملکہ، بتاریخ بست و ہفتم ذیقعدہ یوم چہار شنبہ 1259ھ قدسی قریب یک پاس روز برآمدہ ہر کہ دعوی کند باطل است''۔

یہ وہی زمانہ ہے جب میر رشک کلیات ناسخ کی "تصحیح اغلاط" کے کام سے فرصت پا چکے تھے۔ اس زمانے میں یہ مثنوی اگر انھیں دستیاب ہو جاتی تو بھی اسے کلیات میں شامل کر لینا ان کے لیے بہ گمان غالب ممکن نہیں تھا۔

معراج نامہ کے شروع میں رسول اکرم ﷺ کی مدح ان شعروں پر ختم ہوئی ہے۔

جس سے ختم الانبیا ناراض ہے　　خالق ارض وسما ناراض ہے
ہے یہی مضمون قرآن وحدیث　　جس کو اس میں شبہ ہو وہ ہے خبیث
ماہتاب اس کے اشارے سے گرا　　آفتاب اس کے اشارے سے پھرا

اس کے بعد "در مدح صحابۂ کرام گوید" کے عنوان سے شعر کہے ہیں۔ ان میں ایک ایک شعر چاروں خلفا کی تعریف میں ہے، پھر یہ شعر کہا ہے۔

غور سے دیکھو تو چاروں ایک ہیں　　غور سے دیکھو تو چاروں نیک ہیں

پھر حضرت حسن اور حضرت حسین کی مدح میں بھی شاعر نے ایک ایک شعر کہا ہے، اس طرح۔

ہے امام مشرق ومغرب حسن　　نایب ابن ابی طالب حسن
نایب اس کا حسین تشنہ کام　　صابر وشاکر امام ابن امام
آسماں جب تک ہے بالائے زمیں　　رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

پھر معراج کا بیان کیا ہے اور اس سلسلے میں جو عنوانات قائم کیے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

تمہید در بیانِ معراج شریف　　در ذکر معراج شریف گوید
در وصف براق گوید　　در بیان خیرگی براق گوید
در بیان رسیدن مسجد اقصا　　در بیانِ رفتنِ احمدِ مرسل بر آسمانِ اوّل
رسیدنِ احمدِ مرسل تا بہ سدرہ　　در ذکر بیت معمور

اس معراج نامہ میں حضرت رسول اکرم ﷺ کے جسمانی معراج کا بیان کیا گیا ہے۔

پہنچے جب اوجِ دنیٰ کو مصطفاً مرتبہ حاصل تدلّٰی کا ہوا
قابَ قوسین اور اَو اَدنیٰ ہوا بہر محبوب ومحبّ خلوت سرا

پوری نظم میں کہیں بھی بیان اور مضامین میں ایسا سقم نہیں معلوم ہوتا جس سے شاعر کی نومشقی کا گمان ہو۔ ربط وتسلسل میں کمی کا بھی احساس نہیں ہوتا ہے۔ اپنے معیار اور مزاج کے اعتبار سے اسے ناسخ کی دوسری مثنویوں سے کمتر خیال کرنے کی کوئی وجہ بظاہر نہیں ہے۔

شہادت نامۂ آلِ نبی

شہادت نامہ آل نبیؐ کے نام سے ایک مثنوی مطبع نولکشور سے چند بار چھپی تھی، راقم نے جو نسخہ دیکھا ہے اس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:

''خاتمۃ الطبع بعد حمد ایزد جل وعلا..... نسخۂ متبرکہ مقبول قلبی شہادت نامۂ آل نبیؐ مشتمل حالات شہادت حضرت خامس آل عبا علیہ التحیۃ والثنا، تالیف لطیف زباں دان اردو دعبان لکھنؤ استاد راسخ شیخ امام بخش ناسخ، مطبع فیض منبع جناب منشی نولکشور واقع شہر کانپور میں تیسری مرتبہ بماہ اپریل 1888 مطبع ہوا''۔

وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مثنوی پہلی بار کب چھپی تھی البتہ قاموس الکتب میں اس طور پر اس کا اندراج ہے:

''ناسخ امام بخش لکھنوی: شہادت نامۂ آل نبی 1880 نولکشور لکھنؤ
حوالہ: فہرست پنجاب پبلک لائبریری، لاہور ص99''

دستور کے مطابق یہ مثنوی بھی حمد ونعت وغیرہ سے شروع ہوئی ہے۔ پھر شاعر نے اپنے لیے دعائیہ اشعار کہے ہیں ۔

الٰہی دے مجھے ان کی محبت بحقِ شافعؐ روز قیامت
رہے ان کی محبت تا بہ محشر بحقِ حضرت صدّیق اکبرؓ
کروں میں زندگی بھر ان کا ماتم بحقِ حضرت فاروق اعظمؓ
رہوں اس غم میں میں نالاں وگریاں بحقِ جامع آیات قرآن
رہوں ان کی محبت میں میں صادق بحق و حرمت قرآن ناطق

چاروں خلفا کا اس طور پر ذکر کرنے کے بعد شاعر نے اپنی اس مثنوی کا تعارف کرایا ہے۔

پس از حمد خدا و نعت مختار　　صریر خامہ ہے آہ شرر بار
شہادت نامہ ہے آلِ نبیؐ کا　　مصیبت نامہ ہے آلِ نبیؐ کا

اس میں حضرت ابوسفیان کے حالات کے بیان سے حضرت امام حسین کی شہادت تک کے واقعات سنائے گئے ہیں، آخری چند شعر یہ ہیں۔

ہوئے زخموں سے آخر چور شبیرؓ　　غذا سے ہو گئے مجبور شبیرؓ
لگے اُنیس سو زخم ان کے تن پر　　نہ تھی جا اک وجب ثابت بدن پر
گرا روئے زمیں پر پشت زیں سے　　گرا خورشید چرخ چار میں سے
نہیں آگے بیاں کی مجھ میں طاقت　　زباں میں جوشِ گریہ سے ہے لکنت
نظر میں ہوگئی تاریک دنیا　　رقم یہ قصۂ جانکاہ ہو گیا

اس مثنوی کے سلسلے میں قابلِ توجہ نکتہ یہ بھی ہے کہ اس میں اس قسم کے اشعار بھی موجود ہیں۔

علی بیشک امامِ اوّلیں ہے　　صراطِ مستقیم اور اہلِ دیں ہے

اور ــ

محمد مہدی جو اس کا پسر ہے　　امام آخر اثنا عشر ہے

ان سے مثنوی میں کوئی بڑی قباحت واقع نہیں ہوتی ہے۔ سُنّی حضرات آج بھی جناب حَسن، حُسین وغیرہ کے ناموں کے ساتھ معمولاً لفظ امام لاتے ہیں اور حضرت مہدی کے پیدا ہونے کے منتظر ہیں، شیخ ذوق دہلوی نے بھی کہا ہے۔

ہووے امام برحق پیدا ذوق اگر تو دیکھ ابھی　　ہو تا گرد اسلامیوں کا جوں سچۂ گو ہر لشکر ہے

اس امکان سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ اس مثنوی میں بعض اشعار بعد کے زمانے میں خود شاعر نے یا کسی اور نے داخل کر دیے ہوں۔

2- فصیح

شیخ امام بخش ناسخ کے شروع زمانے کے۔ لیکن مشہور اور باکمال شاگردوں میں سے تھے۔ اپنے استاد کی طرح انھوں نے بھی مذہبی مثنویاں لکھی تھیں۔

(الف) برق لامع

مرزا جعفر علی فصیح کی پہلی مثنوی جو مثنوی فصیح کے نام سے معروف ہوئی تھی 1230ھ (1815) کی تصنیف ہے، مصنف نے اس کا نام ''برق لامع'' مقرر کیا تھا۔ سبب تالیف اس کا اس طرح ہے کہ علمائے بریلی میں سے ایک عبدالکریم تھے جن کا وطن اصلی قنوج تھا۔ کئی کتابوں مصنف تھے اور حُسن کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔ انھوں نے ''سیفِ قاطع'' کے نام سے ایک مثنوی شیعہ عقائد کے رد میں لکھی تھی، اس میں کہتے ہیں۔

نواقض رفض کے سب لکھ چکا تو　　پر اب تاریخی نام ان کا سنا تو
سنا ہاتف نے جب مضمون سارا　　رکھا تب سیف قاطع نام اس کا
بدل تاریخ بھی یوں ہووے قابض　　کہ ہے یہ مثنوی سہم الروافض

1223ھ

اس کے خاتمے پر لکھا ہے:

''تمام ہوئی مثنوی ردِ روافض بنائی ہوئی مولوی حُسن صاحب کی ہے۔ تمت تمام''

اس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔

مرزا جعفر علی فصیح نے اسی مثنوی سیفِ قاطع کے جواب میں مثنوی برقِ لامع لکھی تھی۔ اس کا آغاز ان شعروں سے کیا ہے۔

پس از حمد خدائے حی قیوم　　پس از نعت رسول پاکؐ معصوم
زبان خامہ ہوتی ہے گہر بار　　رقم کرتا ہوں مدح آل اطہار
نبیؐ کا جانشیں شیر خدا ہے　　ثنا میں جس کی نازل ھل اتی ہے

اس میں مولوی حُسن کے ہر اعتراض کو ''قول'' کہا گیا ہے اور پہلے ہر قول کو نظم کر کے اس کا جواب بھی نظم کر دیا ہے۔ یہ مثنوی ان شعروں پر ختم ہوئی ہے۔

ہوا اس نظم سے ہاتف جو آگاہ　　صدا آنے لگی گردوں سے ناگاہ
کہ ہے تاریخ تو خورشید طالع　　مگر ہے نام اس کا برق لامع

1230ھ

اس کے بعد مزید چھ شعروں میں حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، معاویہؓ، شمرؒ اور ابوسفیانؓ پر لعنت کی گئی ہے۔ مثنوی کا ترقیمہ یہ ہے:

"این مثنوی تصنیف مرزا جعفر علی المتخلص بہ فصیح مرثیہ گو، ذاکر جناب سید الشہدا
علیہ السلام ساکن بلدہ لکھنؤ، الحال در کربلا معلّٰی برائے زیارت رفتہ است،
مالک کتاب ضامن صاحب، کاتب الحروف میر ابو القاسم کربلائی المتخلص بہ
تحسین ساکن چینا پٹن، تمت الکتاب بتاریخ ماہ ذیقعدہ 1246ھ روز چہار
شنبہ اختتام شد"۔

(ب) نان ونمک

فصیح کی دوسری مثنوی نان و نمک کے نام سے ہے اس کی ابتدا ان شعروں سے ہوتی ہے۔

مصرع بر جستہ بسم اللہ ہے   ہے یہ لاثانی خدا آگاہ ہے
اس میں ہے نام خدا نام خدا   جو محیط کل ہے اور سب سے جدا
جس نے بسم اللہ سے کی ابتدا   ہے یقینی اس کو حاصل انتہا

اس مثنوی میں شاعر نے مولانائے روم کی مثنوی سے استفادہ کیا ہے اور تصوف کے چند مسائل بھی نظم کیے ہیں، اس کے آخر کے کچھ شعر یہ ہیں۔

جبۂ ودستار پر ہرگز نہ پھول   رہنما کی شکل بن جاتے ہیں غول
مولوی کا قول ہے یہاں معتبر   چاہیے خُذ ما صَفا ودَع ما کدر
اے بسا ابلیس آدم طلعت است   پس بہر دستے نباید داد دست

اس مثنوی کے نسخۂ آصفیہ کے ترقیمے میں اس کا نام آیا ہے، اس طرح:

"نسخہ نان ونمک تصنیف مرزا جعفر فصیح بتاریخ چہار دہم ماہ رمضان 1242ھ
باتمام شد"۔

اس کے نسخۂ علی گڑھ پر مثنوی، اس کے مصنف اور کاتب وغیرہ کے بارے میں جو اطلاعات درج ہیں، یہ ہیں:

11 "مثنوی فصیح   حاجی مرزا جعفر علی فصیح دہلوی کاتب یعقوب علی

سنہ تصنیف و کتابت 1236 تا 1247ھ، اوراق 33 فی ورق بارہ سطریں"۔

جناب نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے کہ اس کی تاریخ تصنیف قریب 1240ھ (1824-25) ہے۔

(ج) چشمۂ زمزم

فصیح کی ایک اور مثنوی "چشمۂ زمزم" ہے، اس کا آغاز ان شعروں سے ہوتا ہے۔

پڑھ کے بسم اللہ کر حمد خدا بعد نعت و منقبت مطلب برآ
دل سے سُن لے میری، پہلے کان رکھ ایک کو مت بھول، دو کا دھیان رکھ
تین سے بیزار ہو اے ہوشیار گر نظر آویں تو سَتّر بار مار

ان شعروں سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مثنوی شیعی عقائد کے بیان میں ہے۔ چنانچہ اس کے مباحث یہ ہیں:

اصول دیں، شرح توحید، علم خالق، حیات حق، صفت انسان اور صفت روح، حوض کوثر، معرفت الٰہی، سوال قبر، وغیرہ۔

تیسرے شعر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں نہ صرف سُنّی عقیدہ کی تردید کی گئی ہے بلکہ موقع بہ موقع بعض بزرگوں پر تبرآ بھی کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کے خاتمہ میں شاعر نے اس کی تصنیف کا سال اور نام وغیرہ بھی نظم کیا ہے، اس طرح۔

وقت ختم نظم تھے اے مرد نیک سال ہجری ساڑھے بارہ سو اور ایک
1251ھ

چشمۂ زمزم ہے اس نسخے کا نام خلق میں جاری رہے گا فیض عام
ہو لقب کا گر مصنف کے خیال آٹھ اٹھارہ دہائی سے نکال

پہلے شعر سے سال تصنیف 1251ھ اور آخر مصرع میں شاعر کے تخلص کے عدد اس طرح نظم کیے ہیں:

فصیح = ح، ف + ص + ی

188=180+8

اس مثنوی کے نسخۂ آصفیہ کے ترقیمہ کی عبارت یہ ہے:

''نقل از محررہ مولانا مفتی محمد عباس صاحب قبلہ مورخہ 10 رمضان 1272''۔ 12

خود مفتی محمد عباس موسوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا اس مثنوی کا قلمی نسخہ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے، اس کی ضخامت پچپن ورق کی ہے اور ہر صفحہ پر دس سطریں ہیں۔

3-ضمیر

میر ضمیر مرزا فصیح کے ہم سن تھے۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے ان کو اپنا شاگرد بتایا ہے اور لکھا ہے:

''میر مظفر حسین ضمیر خلف قادر حسین خاں سرآمد صلحائے عالی مقدار، جوان سخنی وذوفنون است، عمرش سی سالہ خواہد بود، ہمراہ شیخ محمد بخش کہ واجد تخلص دارد شیرنی تقسیم کردہ بود، وبہ حلقۂ شاگردی فقیر درآمدہ بود، ارادۂ آں داشت کہ ہرگاہ نظم کردن شعر را بیاموزم مرثیہ وسلام جناب سید الشہدا علیہ السلام گفتہ باشم، آخر چوں بہ غایت رسید نامے در مرثیہ گوئی برآورد''۔ 14

مصحفی نے ان کی چند غزلوں کے اشعار درج کر کے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ان کے تلمذ کے زمانے میں میر ضمیر بھی غزلیں کہتے تھے، مصحفی کے مذکورہ بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے سعادت خاں ناصر نے ایک دلچسپ لیکن لائق توجہ نکتہ کی نشاندہی کی ہے:

''شیریں سخن، خوش تقریر، جلیس بے نظیر، میر مظفر حسین تخلص ضمیر خلف میر قادر حسین، شاگرد میاں مصحفی، میاں صاحب تذکرہ دوم میں لکھتے ہیں کہ معرفت واجد بہ خدمتم آمدہ، شیرنی تقسیم کردہ روبرو ہمہ باشاگرد من شدہ، اس اعلان کے ساتھ لکھنا خالی اس سے نہیں کہ پہلے کسی کی شاگردی سے انکار کیا ہو''۔ 15

لیکن افسوس ہے کہ ضمیر کے پہلے استاد کا سراغ ناصر کو بھی نہ مل سکا۔

شیخ مصحفی مرزا حاجی قمر کے والد مرزا جعفر کے مداح تھے، معلوم ہوتا ہے کہ استاد کے واسطے سے میر ضمیر بھی ان کی خدمت میں پہنچ گئے اور ہر طرح مرزا حاجی کی موافقت میں سرگرم رہے۔ جس زمانے میں نواب غازی الدین حیدر نے معتمد الدولہ کی جگہ مرزا حاجی کو نیابت پر مامور کیا۔

میر ضمیر زمانے کے نشیب و فراز سے غافل رہ کر مرزا حاجی کی خوشنودی کے لیے زیادہ سرگرم ہو گیے، سعادت خاں ناصر نے ایک معرکے کا حال اس طرح نقل کیا ہے:

> ''مرزا حاجی قمر اور میر مظفر حسین ضمیر کو یہ منظور ہوا کہ موجی رام کو مرزا قتیل کی زبان سے ذلت دلوایئے، مرزا (قتیل) صاحب نے سر مشاعرہ یہ اعتراض اس پر کیے..... شیخ امام بخش ناسخ کو دلیری مرزا صاحب کی نہایت ناگوار گذری، موجی رام میاں مصحفی کے پاس التجا لے گیا، میاں صاحب نے کہا: شاگرد کے واسطے آشنا سے بگڑنا نہیں چاہیے، ایسے بہت بن سکتے ہیں، جب ناسخ نے سنا کہ مصحفی حمایت موجی کی نہیں کرتے اسے اپنے پاس بلا بھیجا اور یہ سوال و جواب ایک بند کاغذ پر لکھ کر اسے دیے......دوسری صحبت میں سر مشاعرہ اس نے پڑھے''۔ 16

اس قسم کے معرکوں نے میر ضمیر کا مرزا حاجی قمر کا موافق ہونا ثابت کر دیا، اس نے اس کے لیے بڑی مشکلیں پیدا کر دیں۔ مرزا حاجی کی بساط کے الٹ جانے اور معتمد الدولہ کے دوبارہ خلعت کے حصول کے بعد میر ضمیر کی ترقی کے مواقع مسدود ہو گئے۔ میر ضمیر کی شہرت ماند پڑ گئی اور حالات کو ناموافق دیکھ کر ان کے بعض شاگردوں نے بھی مخالفت پر کمر باندھ لی۔

نصیر الدین حیدر کے عہد میں جب معتمد الدولہ معزول ہو گئے تو میر ضمیر نے پھر اپنی سیادت اور بزرگی کا اثر قائم کرنے کی کوشش کی، ناصر نے لکھا ہے:

> ''عہد نصیر الدین حیدر شاہ سے تا حضرت اقدس واعلا معزز و ممتاز ایک سال میں دو تین خواب کہ تعبیر ان کی دولت بیدار ہے، مشاہدہ فرماتے ہیں، بیان ان کا بشارت کی طرح زبان پر لاتے ہیں''۔ 17

اس زمانے میں جب وہ مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوے بعض وہ شاگرد جو غزلیں کہتے تھے، انھیں چھوڑ کر خواجہ آتش کے پاس چلے گئے۔ اس صورت حال نے میر ضمیر کو زیادہ پریشان کر دیا۔ غرض زندگی میں طرح طرح کی پریشانیاں اٹھا کر وہ ملک بقا کی طرف راہی ہوے، حاتم علی بیگ مہر نے اس شعر میں ان کی وفات کی ہجری اور عیسوی تاریخ نظم کی ہے ؎

ہجری وعیسوی تاریخ لکھی جا کے حیدر سے مل ضمیر اب تو

1855

اور: حیدر + ضمیر

222 + 1050 = 1272ھ

کہتے ہیں کہ طویل اور مربوط نظمیں اُسی زمانے میں لکھی جاتی ہیں۔ جب دل کو سکون اور اطمینان میسر ہو۔ بادشاہ دوم نصیرالدین حیدر کے عہد میں جب حالات موافق اور سازگار ہوئے۔ تو میر ضمیر نے مثنویاں لکھنے کا خیال کیا۔ اس باب میں بلاشبہ بادشاہ کی دلچسپی اور پذیرائی کو بھی دخل رہا ہے۔ مشہور ہے کہ تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں۔ ضمیر کے سلسلے میں پروفیسر گیان چند کی ضخیم کتاب کی ورق گردانی کی تو اس حقیقت کا اعتراف ضروری معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنی اس بھاری بھرکم تصنیف کو ''صحیفۂ اغلاط'' کہہ کر ہرگز کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ اسے ان کی انکساری پر محمول کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ میر ضمیر کی مثنویوں کے بارے میں اس صحیفۂ اغلاط میں جو کچھ لکھا ہے الّا ماشاء اللہ سب غلط ہے۔

(الف) ریحان معراج

جیسا کہ نام سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ مثنوی حضرت رسول اکرم ﷺ کے واقعہ معراج سے متعلق ہے اسی لیے اسے اکثر ''معراج نامۂ ضمیر'' بھی کہا گیا ہے۔ رضا لائبریری رامپور میں اس معراج نامہ کے ایک سے زائد قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ اس کے سبب تالیف کے تحت شاعر نے کہا ہے کہ ایک دن نماز صبح کے بعد وہ وظیفہ میں مشغول تھا کہ مہدی علی خاں وزیر نے طلب کیا اور بادشاہ کا حکم سنایا کہ معراج نامہ لکھ کر حاضر کرو۔ انھوں نے گھر آ کر اسے لکھنا شروع کر دیا۔ اس مثنوی میں جتنے عنوانات ہیں سب فارسی عبارت میں ہیں، مثلاً:

نزول حضرت جبرئیل بخدمتِ جناب سید المرسلینؐ

پردہ آراستہ شدن جنت النعیم جہت تقدیم رسول کریمؐ

ذکر سامان روانگی جناب محمدؐ جہت معراج بہ سوے عالم بالا

ذکر شکل وشمایل براق جناب رسولؐ و پرواز از زمیں

آمدن خازن بیت المقدس وسوال وجواب از جناب رسالت مآب وغیرہ

یہ مثنوی حمد سے شروع ہوئی ہے ۔

کروں حمد پروردگار قدیر کریم ورحیم وسیع و بصیر
وہی خالق ظلمت و نور ہے دلوں سے قریں چشم سے دور ہے

حمد ونعت کے بعد حضرات حسنینؓ وغیرہ کی منقبت ہے۔

دل و دیدہ اس کے حسن اور حسین وہ دو راحت جاں، وہ دو نور عین

پھر اپنے بادشاہ کی مدح میں شاعر نے کئی شعر کہے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

''مدح شاہ نصیرالدین حیدر''

کروں میں بھی مدح شہ خوش خصال خداوند جاہ و خداوند مال
زہے بادشاہ رعیت نواز زہے عادل و باذل و کارساز
سخی اس طرح کا کہیں بھی سنا کہ شاعر کو پیش از سخن دے صلا
رفاہ رعیت کا خواہاں ہے وہ کہ اس عہد میں فخر شاہاں ہے وہ
غم آل احمدؐ میں ہے دل حزیں سیہ پوش رہتا ہے تا اربعیں
شب و روز ہے اس دعا میں ضمیر سلامت رہیں یہ شاہ و وزیر

اس سے پہلے سبب تالیف کتاب کے سلسلے میں ''تعریف وزیر'' کے عنوان سے کئی شعر کہے ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

وزیر خرد مند با عدل و داد وہ مہدی علی خان والا نژاد
دیا انتظام امورات شاہ کہ ملک اور رعیت کا ہے خیر خواہ
حیا آنکھ میں اور مروت کمال ولیکن ہر اک سے علی قدر حال
وہ خورشید تاباں ، یہ ماہ منیر عجب شاہ ہے اور عجایب وزیر

اپنی نظم کے بارے میں شاعر کا بیان یہ ہے ۔

میں ہوں مرثیہ گوے سبط رسولؐ ادھر بھی اٹھا یک نگاہ قبول
یہ معراج نامہ جو لایا ہوں میں نبیؐ کے وسیلے سے آیا ہوں میں

یہ میرا وسیلہ نہ رد کیجیو　　میں سید ہوں میری مدد کیجیو

اصل نظم شروع کرنے سے پہلے خود اپنے تعارف میں شاعر نے کئی شعر لکھے ہیں، چند ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

''عاجزی صاحب تصنیف کی''

بس اب مدح سلطان ہوا مجھ کو فرض　　کروں خدمت اہل معنی میں عرض
بہ تعجیل لکھے یہ اوراق چند　　سخن ہو گر اس میں کوئی ناپسند
تو کیجیو نہ باب تعرض کو وا　　تلے اپنے دامن کے لیجو چھپا

معراج نامہ میں شاعر نے کتاب حیات القلوب وغیرہ سے روایتیں اخذ کی ہیں اور جگہ جگہ منظر نگاری کے بھی اچھے نمونے پیش کیے ہیں مثلاً:

در باغ جنت کھلے ہیں تمام　　ہیں غلمان و حور اس میں کرتے خرام
درختان فردوس ہیں جھومتے　　زمیں کو ہیں اس شکر میں چومتے
کوئی اک طرف حوض کوثر عبور　　ادراک سمت نہر شراب طہور
کنارے پہ نہروں کے سبزے کا جوش　　ہوا آب میں عکس سے سبز پوش
صبا ڈالیوں کو ہلاتی ہوئی　　چلی جھومتی لڑکھڑاتی ہوئی

مثنوی کے خاتمے میں پھر بادشاہ اور وزیر کے لیے کئی شعر کہے ہیں، ان میں یہ بھی ہیں۔

کہوں اب اٹھا کر وو دستِ نیاز　　عطا کر مرے شہ کو عمرِ دراز
ہمیشہ مطیع پیمبر ہے وہ　　سدا ناصر دین حیدر ہے وہ
وزیر اس کا دایم رہے کامراں　　الٰہی یہ نوآب ہو اور جہاں
بیاں کس سے ہوں اس کی تعریف کے　　یہ باعث ہوے ایسی تصنیف کے

اس مثنوی میں انیس سو شعر ہیں اور یہ صرف بیس دن میں مکمل ہوئی ہے۔

بہ اعجاز آل رسالت مآب　　کہی بیس دن میں یہ دس جز کتاب

اس کی تاریخ شاعر نے اس طرح کہی ہے۔

یہ فرمائشِ صاحب تاج ہے مسمّٰی بہ ''ریحانِ معراج'' ہے
ہوا ختم معراج نامہ جوں ہی ہوئی فکر تاریخ کی دلنشیں
ندا آئی ہاتف کی بے اشتباہ کہو اس کی تاریخ فیضانِ شاہ
1247ھ

شاعر کے بیان سے ظاہر ہے کہ اس نے اس مثنوی کا نام ''ریحانِ معراج'' مقرر کیا تھا اور اسے 1247ھ (32-1831) میں بہ عہد نصیر الدین حیدر مکمل کیا تھا۔ اس مثنوی کے بعد غلام نجف کا کہا ہوا فارسی قطعہ تاریخ بھی درج ہے۔

یہ معراج نامہ اردو کی کامیاب مذہبی مثنویوں میں سے ہے۔ اس میں بیانیہ شاعری کی تقریباً سبھی خوبیاں بہ شمول منظر نگاری وغیرہ موجود ہیں۔ زبان بھی اس کی صاف ستھری اور بول چال کے مطابق ہے۔ بیان میں بھی ابہام اور گنجلک نہیں ہے۔ یہ مثنوی چھپ چکی ہے لیکن اب کمیاب ہے

(2) مظہر العجائب

اسی بادشاہ یعنی نصیر الدین حیدر کے عہد میں کوئی دو برس کی مدت میں میر ضمیر نے ایک اور مثنوی ''مظہر العجائب'' کے نام سے مکمل کر لی، اس میں مختلف معجزوں سے متعلق واقعات اور حالات قلمبند کیے تھے، اس مثنوی کے نسخۂ کراچی میں شروع میں عربی کی سات آیتیں لکھی ہیں ان کے بعد یہ اشعار تحریر کیے ہیں۔

لیک شکر اس کا ہوسکے کس سے انتظام دو کون ہے جس سے
وصف کا اس کے جب خیال کیا حیرتوں نے زباں کو لال کیا
سب یہ نقش کشیدہ ہے اس کا جو ہے سو آفریدہ ہے اس کا

منظر نگاری کے بھی اس مثنوی میں اچھے نمونے ملتے ہیں۔ چند شعر نمونے کے طور پر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

ہوئی جب قطع وادی پُر خار پہنچے اک سبزہ زار میں اک بار
دشت تھا صفحۂ زمرد گوں صاف مثلِ بطون صاف دروں

تھی اس سبزہ زار سے اظہار　　سبزہ خطِ گلر خاں کی بہار

ہوگیا عکس سے اسی کے تمام　　شیشۂ آسماں زمرد فام

مختلف قسم کی صنعتوں کا صرف، مناسب مقام تشبیہات کا لانا اور ان سب کے لیے برمحل الفاظ کا انتخاب زبان پر شاعر کی قدرت اور اس کی تیزیٔ فکر کا مظہر ہے۔ بے شک کہیں کہیں ایسے الفاظ بھی آئے ہیں جو بول چال میں مروج نہیں ہیں، لیکن اس ضخیم مثنوی میں بعض نامانوس اور غریب لفظوں کا در آنا ایسا عیب نہیں ہے جس سے مثنوی کی خوبیوں پر پردہ پڑ جاتا ہو۔

میر ضمیر نے یہ مثنوی 1249ھ (34-1833) میں مکمل کی تھی۔ اس کے آخر میں ایک قطعہ تاریخ لکھا ہے، جس میں اس کے مطالب کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

جس دم کہی ضمیر نے یہ مثنوی تمام　　عالم نے دل میں فکر کی تاریخ لکھنے کا (کذا)

آئی صدائے غیب اسی وقت کان میں　　یہ معجزات خوب کیے، کیا ہی واہ واہ

1249ھ

بدخط اور بدنویس کاتب نے اس قطعہ کو بھی خراب کیا ہے لیکن چوتھے مصرعے کے اعداد صحیح لکھے ہیں۔ اس لیے ان پر شبہ کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ یوں بھی تمام قرائن اسی حق میں ہیں کہ یہ مثنوی معراج نامہ کے بعد لکھی گئی تھی۔ کاتب نے ترقیمہ میں اس مثنوی کو ''نسخہ عجایب وغرایب مظہر العجائب'' اور شاعر کو ''شاعر نازک خیال'' اور ''مداح ابی عبداللہ الحسین'' کہا ہے۔ اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مثنوی میر ضمیر کی پختگی کے زمانے کی تصنیف ہے، جناب افسر صدیقی امروہوی نے یہ اطلاع بھی قلمبند کی ہے کہ:

''یہ مثنوی 1311ھ (1894) میں مظہر العجائب پریس لکھنؤ سے طبع ہو چکی ہے۔ مطبوعہ نسخہ بھی کتب خانۂ خاص میں موجود ہے۔''

گمان غالب ہے کہ وہ مطبوعہ نسخہ بھی افسر صاحب نے یہ سطور لکھتے وقت دیکھا ہوگا۔ اس مثنوی کا ایک مخطوطہ رضا لائبریری رامپور میں بھی ہے، جس کی کتابت سید صفدر حسین نے 1273ھ میں ایک سو ترانوے اوراق پر کی تھی۔

(ج) اعجازِ عشق

میر ضمیر کی دستیاب مثنویوں میں یہی ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ بظاہر اس کا زمانہ تصنیف مذکورہ مثنویوں کے آس پاس ہی ہوگا۔ یہ مثنوی مختصر ہے اور صرف پچیس صفحوں میں سما گئی ہے۔ ہر صفحہ پر سترہ سطریں ہیں۔ نسخہ کراچی کے فہرست نگار کے بقول اس میں چار سو سات ابیات ہیں۔

یہ مثنوی بھی معمول کے مطابق حمد، نعت اور منقبت سے شروع ہوئی ہے۔ موضوع کی مناسبت سے جو اس کے نام سے ظاہر ہے اس میں کئی شعر عشق کی صفت کے بیان میں کہے گئے ہیں مثلاً

اے عشق میں کیا کہوں تو کیا ہے   آشوب ہے، فتنہ ہے، بلا ہے
سودا ترا رکھتا ہو نہ جو سر   وہ کوزۂ خاک ہے سراسر
جو دل کہ نہ ہووے تیرا مسکن   کہیے اسے سنگ، بلکہ آہن

شاعر کو عشق کے جذبہ کا بیان مقصود تھا۔ اس کے لیے اس نے ایک روایتی قصہ کو وسیلہ بنایا ہے جذبات نگاری کے بعض قابل توجہ نمونے پیش کیے ہیں مثال کے طور پر عاشق کی قبر پر اس کی محبوب اس طرح گریہ کناں ہے۔

بیزار ہوں اپنی زندگی سے   میں کیا کروں تجھ بغیر جی کے
نے صبر ہے، نے قرار مجھ کو   پاس اپنے بلالے یار مجھ کو
سچ عاشق زار ہے اگر تو   اب بہر خدا نہ دیر کر تو

اس کی یہ گریہ وزاری رنگ لاتی ہے اور وہ اپنے عاشق کی قبر میں سما جاتی ہے۔

جس زمانے میں یہ مثنوی لکھی گئی ہے زبان تشکیلی مدارج میں تھی۔ اس وقت ایسے بہت لفظ زبانوں پر جاری تھے جو بعد میں متروک ہوئے، بعض مقامی روزمرّے بھی ایسے تھے جن کو اب گنوار کہہ دیتے ہیں، اس مثنوی میں کہیں کہیں یہ بھی دخل پا گئے ہیں چنانچہ ذیل کے شعروں میں ہیں۔

سب رشتۂ مہر و دوستی توڑ   جاتے رہے اپنا اپنا منہ موڑ

اور ـ

بیجائی پر اپنی گاہ روتا　　تنہائی پر اپنی گاہ روتا

ان کے باوجود یہ مثنوی شاعر کی خوبی فکر کی مظہر ہے اور اختصار کے باوجود ایک کامیاب اور قابل ذکر مثنوی ہے۔

4-صفا

لالا سری رام نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''صفا، سید ذوالفقار علی خاں، شرفائے لکھنؤ میں تھے، فن سخن میں حضرت میر تقی میر سے شرف تلمذ حاصل تھا، زمانہ کی گردش نے لکھنؤ سے بنگالہ پہونچایا.....
بنگالہ سے چینا پٹن میں آئے، میر ابو القاسم میر عالم مدار المہام کے زمانے میں حیدرآباد پہنچے.....''۔

انھوں نے خاصی لمبی عمر پائی تھی۔ 1260ھ کے قریب اپنا دیوان مرتب کیا اور اسی سال میں وزارت پائی، ان کے دیوان کا قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ جناب نصیر الدین ہاشمی کا کہنا ہے کہ صفا نے حیدرآباد میں وفات پائی تھی اور دائرۂ میر مومن میں دفن ہوئے تھے۔

صفا نے کئی مثنویاں لکھی تھیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:

(الف) زاد الآخرت

یہ ایک طویل مذہبی مثنوی ہے۔ کتب خانۂ آصفیہ میں اس کے ایک سے زائد قلمی نسخے موجود ہیں۔ ایک نسخہ دوسو بیاسی صفحوں کا ہے۔ جس میں ہر صفحہ پر پندرہ سطریں ہیں۔ اس کے شروع کے کچھ اشعار یہ ہیں۔

وہی عالم ہے میری شرح غم کا　　جو طرح انگیز ہے لوح و قلم کا
ظہور اس کا مشیت آب و گل ہے　　مکاں اس لامکاں کا کنج دل ہے

اس مثنوی میں حضرت امام حسین کی شہادت کے واقعات دس مجلسوں میں لکھے گئے ہیں، چنانچہ اس کو شہادت نامہ اور دہ مجلس بھی کہا جا سکتا ہے۔ مجلسوں کے مضامین اس طرح ہیں:

1-رحلت آنحضرت ﷺ

2-تولد و رحلت بی بی فاطمہ زہرہؓ
3-ولادت وشہادت حضرت علی مرتضیٰؓ
4-ولادت وشہادت حضرت امام حسنؓ
5-ولادت امام حسینؓ
6-شہادت فرزندانِ عقیل
7-امام حسین کا کوفہ کو روانہ ہونا
8-شہادت رفقائے امام حسین علیہ السلام
9-شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام
10-واقعات بعد شہادت امام

ہر باب کو چند ذیلی فصلوں میں بھی تقسیم کیا گیا ہے۔ مثنوی کے آخر میں شاعر نے اپنے حالات بھی مختصراً نظم کیے ہیں۔

فقیر از دودۂ پیغمبری ہے حسینی ، ہاشمی و جعفری ہے
غمِ آلِ نبیؑ ہے کام میرا علی ذوالفقار ہے نام میرا
تخلص مشتہر میرا صفا ہے مرا دل حُبِّ حیدر سے بھرا ہے
دکھن میں جورِ گردوں سے قضا را ہے سال چند سے میرا گذارا
مسافر وضع در چینا پٹن ہوں غریب شہر آوارہ وطن ہوں

مثنوی کے اتمام کی تاریخ اس نے اس طرح سے بیان کی ہے۔

ہیں غم روز ورست وخیز مجھ کو کفایت دست آویز مجھ کو
ہوا مرقوم جب یہ غم کا احوال تھے بارہ سو کے اوپر سترہ سال

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اپنی اس مثنوی کو شاعر وقت کے لیے سرمایہ خیال کرتا تھا، چنانچہ مسافرت وغیرہ میں بھی......................اس نے محنت کی تھی۔

جناب نصیر الدین ہاشمی نے اس مثنوی کے بارے میں یہ نہایت مفید اطلاع فراہم کی ہے کہ:

''یہ دکھنی منظوم کتاب حالات وواقعات شہدائے کربلا کے بیان میں ہے، نواب

ثابت جنگ غفار خاں فرزند والا جاہ والی کرناٹک کی ایما پر تصنیف کی گئی''۔24ے

اس مثنوی کو''دکھنی'' صرف اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس علاقے میں لکھی گئی تھی، ورنہ زبان و بیان اور فکر و خیال وغیرہ ہر اعتبار سے یہ لکھنوی ہی ہے۔ یہی نہیں سید ذوالفقار علی خاں صفا کی سبھی مثنویاں بلکہ ان کا سارا کلام لکھنوی طرز و انداز کو کرناٹک کے علاقے تک پہنچا دینے کے ایک موثر وسیلہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ مفید نتائج کا حامل ہوگا۔

سید صفا کی اس مثنوی کے جو نسخے حیدر آباد میں محفوظ ہیں ان میں سے ایک 1263ھ (1847) کا لکھا ہوا بھی ہے۔

(ب) چھومنتر

یہ سید صفا کی دوسری دستیاب مثنوی ہے۔ لالا سری رام کی رائے اس کے بارے میں یہ ہے کہ یہ ''خاص طور سے دید کے قابل ہے''، ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد میں اس کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس کے تعارف میں جو لکھا ہے اس کا اختصار یہ ہے:

''مثنوی چھومنتر میں میر عالم کی مدح لکھی ہے، جو 1223ھ میں فوت ہوئے، یہ مثنوی کسی فارسی قصے پر مبنی نہیں ہے بلکہ مصنف کی طبع زاد ہے، یہ بنارس کے ایک طالب علم کا قصہ ہے، جو تاجر زادے پر عاشق ہو کر پڑھنا لکھنا چھوڑ دیتا ہے، جب وہ لڑکا فوت ہو گیا تو یہ بھی اس کی چتا کے پاس مر گیا۔ قصہ طویل نہیں ہے، زبان و اسلوب بہت دلکش ہے۔ حمد و نعت کے لوازمات مثنوی کو ترک کر کے میر کی طرح عشق کے بیان سے اس کی ابتدا کی گئی ہے''۔

اس مثنوی کے ابتدائی شعر یہ ہیں۔

محو ہے ساری خدائی عشق کی　　بل بے کافر ماجرائی عشق کی
یا تھا اپنے دم قدم کا پیکھنا　　پاؤں پھسلا یا صنم کا پیکھنا
کفر سے صفا کو یا وہ عار ہے　　یا رگ جاں بد تر از زنار ہے
سرگذشت اس راہ میں رکھتی ہے پاؤں　　یھاں کے بھولوں کو ٹھکانا ہے نہ ٹھاؤں

میر عالم جو دکن کے دیوان تھے ان کی مدح میں جو اشعار کہے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

کون وہ ہے صاحب جود ونوال قدر دانِ زمرۂ اہلِ کمال
میر عالم صاحب فیض عمیم درشہ دارِ آیۂ خلق کریم
فضل سب یک سو امارت یک طرف دولت اک جانب وزارت یک طرف
سرورے از قبول سیدے از زمرۂ آلِ رسولؐ
اے صفا اب یہ نہیں اطراف اس جگہ بیجا ہے مداحی کا لاف

مثنوی کے آخر میں شاعر نے اپنے استاد محمد تقی میر اور اپنے وطن لکھنؤ کو اس طرح یاد کیا ہے۔

ہاں اگر کچھ حسرت استاد ہے تو بجا ہے یہ محل یاد ہے
مثنوی یہ عشق کی تصویر ہے قابل نذر جناب میر ہے
سو تو زیر باقی فقط افسوس ہے لکھنؤ اب ہم سے لاکھوں کوس ہے

مثنوی کا اختتام ان شعروں پر ہوا ہے۔

ہے ادب کہتا کہ مت بڑ مار تو کہتی ہے جرات، نہ ہمت ہار تو
گو یہ فدوی مو بہ مو مرہون ہے قبلہ گاہِ بر صلہ مسنون ہے

اس آخری شعر سے ظاہر ہے کہ سید صفا نے یہ عشقیہ مثنوی ''صلہ'' کے لیے لکھی تھی۔ گمان غالب ہے کہ ان کا مقصود حاصل ہو گیا ہوگا۔ اس مثنوی میں قدیم الفاظ اور روز مرّے اکثر نظم ہو گئے ہیں۔ باوجود اس کے یہ زبان و بیان پر شاعر کی قدرت کی مظہر ہے۔

(ج) حملۂ حیدری

یہ صفا کی تیسری موجود مثنوی ہے۔ جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے اس کا موضوع مذہب ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جو رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے دو سو اٹھارہ اوراق پر محیط ہے، اس کا سالِ تصنیف 1229ھ (1814) ہے اور یہ بھی دکن کے علاقے میں لکھی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ فی الوقت اس کے بارے میں تفصیلات ہمیں دستیاب نہیں ہو سکیں۔

لکھنؤ میں مذہبی مثنویاں اس زمانے میں شیعہ اور سُنّی دونوں عقیدوں سے متعلق اور بھی لکھی گئی تھیں مثلاً:

''مثنوی طلسمات عشق، از نادر علی نادر رضوی لکھنوی، سال تصنیف 1226ھ (1811)''۔

اس کا جونسخہ رامپور میں ہے بخط مصنف بتایا گیا ہے۔ اس کی ضخامت 127 ورق کی ہے۔

مقصود ان مثنویوں سے اپنے معتقدات کو نظم کے وسیلہ سے خاص و عام تک پہنچانا اور ان کو عام کرنا ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ شروع میں یہ مثنویاں مذہبیات کی باضابطہ تدریس اور مطالعے کے بعد لکھی جاتی تھیں اور شاعر بروقت معتبر ماخذ سے رجوع بھی کرتا تھا۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ اپنے عقیدے کے مطابق صحیح بیانات اور روایات ہی کو نظم کیا جائے۔ یہ کام بہت آسان نہیں تھا۔ لیکن مذہب کا جوش و خروش اسے پورا کرا لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ مطالعہ اور تحقیق پر حصول ثواب کا شوق غالب آتا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے لوگ بھی مذہبی مثنویاں لکھنے لگے جنھیں کتب مذہب کی باقاعدہ تحصیل کے مواقع میسر نہیں ہو سکے تھے۔ مقرروں اور ذاکروں سے جو کچھ سنا تھا اور ذہن میں جتنا کچھ اور جیسا کچھ محفوظ رہ گیا تھا۔ اسی کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق نظم کا جامہ پہنا کر خوش ہو جاتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ مذہبی مثنویوں سے کمال فن کا اظہار مطلوب نہیں ہوتا تھا لیکن شروع شروع میں جن شاعروں نے اس میدان میں قدم رکھا تھا وہ عموماً باکمال اور صاحب علم بھی تھے۔ بعد میں کمتر درجے کے لوگوں نے اس کام کو اختیار کیا۔ یہ زبان و بیان کے اصول و ضوابط کی طرف بھی کماحقہ، توجہ نہیں کر سکے اور ان کی مثنویوں میں ہر قسم کے عیوب و نقائص در آنے لگے۔ چنانچہ زبان و بیان کے رموز و نکات کے جاننے والوں کے علاوہ علمائے مذہب کی نظروں میں بھی یہ مثنویاں قدر و منزلت حاصل نہ کر سکیں۔

گذشتہ اوراق میں جن چند مذہبی مثنویوں کا حال تحریر کیا گیا ہے ان کے بارے میں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا معیار متعلق شاعر کے دوسرے کلام کے مقابلے میں کسی درجہ میں بھی کمتر نہیں ہے اور ان میں متروک یا قابل ترک الفاظ وغیرہ نہیں آئے ہیں اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان مثنویوں کی کماحقہ پذیرائی کی گئی تھی۔

لکھنؤ میں اس زمانے میں عشقیہ مثنویاں کم لکھی گئیں اور جو لکھی گئیں بیشتر ''صلے'' کے لیے لکھی گئی تھیں۔ اس مقام پر ایک قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ فیض آباد میں مقصود نامی شاعر نے

ایک بارہ ماسہ لکھا تھا۔ لکھنؤ میں بھی اس صنف کو نظر انداز نہیں کیا گیا:

5- وحشت

محسن نے اپنے تذکرے میں ان کے بارے میں بس اتنا لکھا ہے:

''میر بہادر علی مرحوم وحشت لکھنوی شاگرد جرأت''۔

انھوں نے ایک بارہ ماسہ لکھا تھا جس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ اس کی کتابت تفصیر احمد خاں نامی کسی شخص نے کی تھی۔ افسوس ہے کہ اس صنف کی طرف تا حال کما حقہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔

(2)

اردو زبان وادب کا مزاج اوّل روز سے عالمگیر اور آفاقی رہا ہے۔ عقیدہ اور نسل وغیرہ کی بنیادوں پر کسی بھی قسم کی تقسیم کو اس نے کبھی گوارا نہیں کیا ہے۔ اسی لیے عشق کے ہمہ گیر اور ہمہ جہت جذبے کو یہاں شروع سے بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ تو ہوا ہے کہ قدیم عشقیہ مثنویوں میں کرداروں کے نام ایسے مقرر کیے گئے تھے کہ وہ کسی مخصوص فرقے کے جیسے ہوتے تھے مثلاً

چاندا، لورک مینا باؤن

پدماوت، مرگاوت، چندر بدن، مہیار،

انجمن آرا، جان عالم، دل افروز، دلبر وغیرہ

لیکن ان کے اعمال، اطوار اور معاملات کی پیش کش ہمیشہ ایسی ہوتی تھی کہ ان کو کسی مذہبی طبقے یا نسلی جماعت سے متعلق نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مذہبی تصانیف اور تراجم کی بات البتہ الگ ہے کہ ان میں قلم پابند ہوتا ہے۔

اودھ کی سلطنت انگریزی سیاست کا ایک کرشمہ تھی۔ اس بادشاہت کے قیام کے بعد سوچنے اور عمل کرنے کے انداز میں بدیہی طور پر فرق پیدا ہونے لگا تھا۔ اہل فرنگ کی چشم و ابرو کے اشارے یہاں کے ارباب دانش کے خیال و عمل میں انقلاب پیدا کر دیتے تھے۔ ان کے معاملات یہاں نمونہ اور سند کا حکم رکھتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی تحریریں لکھنؤ میں نہ صرف پڑھی گئیں

بلکہ یہاں پر وہ راہنما ثابت ہوئیں۔ میر امن کی باغ و بہار نے فسانۂ عجائب لکھوالیا لیکن جس لکھنؤ میں کوئی ربع صدی تک پہلے کلکتہ کے لیے کہتے تھے کہ ''وہاں شاعری کی جاحمالی ہے'' اب کلکتہ کی اس تالیف کے بارے میں کوئی حرف زبان یا قلم سے نہیں نکل سکا۔ البتہ کچھ کہا تو ''دتی کے روڑے'' کو کہا کہ وہ آقایانِ فرنگ کی منشا کے بھی مطابق تھا۔ اب پسر بجسٹن وغیرہ کے قصے بھی ''فسانوں'' میں شامل کیے جانے لگے تھے۔

اردو کے معاشرے میں پردے کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ یہاں خواتین کا برملا ذکر بھی معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ لکھنؤ میں بھی یہ صورت حال بحال تھی۔ لیکن بتدریج بتانِ فرنگ کی بے حجابی کا اثر بھی اس معاشرے پر مرتب ہونے لگا۔ عشق کے معاملات بھی بدلنے لگے۔ حسنِ مطلق کے چرچے کم ہونے لگے۔ حسین اور پھر اسبابِ حُسن اور اعضائے حسین وغیرہ کا تذکرہ عام ہونے لگا، عورتوں کی زبان میں عورتوں کی باتیں اور مَردوں کی طرف سے

ع: تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

وغیرہ قسم کے کلام زبانوں پر جاری ہو گئے، عشق کے ارضی اور فطری معاملات کا بے حجابانہ بیان کیا جانے لگا۔ یہ نہیں ہے کہ اردو کے قدیمی سرمایے میں یہ باتیں نایاب تھیں، بے شک یہ سب کچھ پہلے بھی تھا لیکن کمتر تھا۔ لکھنؤ کی شاہی کے زمانے میں رفتہ رفتہ ان کا رواج زیادہ ہوتا گیا۔

اہل لکھنؤ کے انداز فکر و عمل اور لکھنؤ میں بسنے والے مختلف طبقوں اور فرقوں کے معاملات کا بھی عشقیہ مثنویوں میں تذکرہ کیا جانے لگا تھا۔ اس طرح وہاں کی معاشرتی اور عشقیہ مثنویوں کا مطالعہ وہاں کی تمدنی زندگی اور تہذیبی فکر کو سمجھنے کے لیے بہت مفید ہے۔

1 - خان

جن لوگوں نے اردو کے قدیم افسانوی ادب کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جسے آج مختصر افسانہ کہتے ہیں اس کی قدیم زمانے میں کئی صورتیں چلی آتی تھیں، مثلاً:

چٹکلہ، چرتر، حکایت، روایت، لطیفہ، نقل وغیرہ

لطف یہ ہے کہ ان سبھی اصناف کے نمونے نظم اور نثر دونوں میں ملتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ غازی الدین حیدر نے اپنے زمانۂ نیابت میں ان اصناف سے دلچسپی کا اظہار کیا تھا چنانچہ محمد بخش

مہجور نے اردو نثر میں اپنی کتاب ''نورتن'' لکھ کر ان کے نام معنون کی تھی۔ ان کے بعد ان کے جانشین نصیرالدین حیدر کے عہد میں اس روایت نے ترقی کا قدم آگے بڑھایا اور اشرف خان خان تخلص نے مثنوی چار باغ تصنیف کی۔ خان کے حالات میں شیخ مصحفی نے لکھا ہے:

''اشرف علی خاں، خان تخلص ولد محمد علی خان وزیر دہلی ابن محمد روشن خاں مخاطب بہ نواب روشن الدولہ قوم افغان خٹک، بزرگانش سکنہ شاہ جہاں آباد، خودش بہ لکھنؤ تولد و نشو نما یافتہ، فقیر با والدش از زمانہ ملازمت صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ بہادر راز مناسبت کہ مرد شجاع و خوش تقریر، ہمیشہ مقرب سلاطین بودہ است، الحال در سرکار جناب عالی در سواران بنارس عز و امتیاز تمامی دارد، در فن سپاہگری بہ سواری و در نیزہ بازی یکۂ روزگار، چوں گفتن شعر دلش بہ سوے خود کشیدہ بہ اشارۂ پدر خود در حلقۂ تلامذۂ فقیر در آمدہ در مشق چہار پنج سال از ہمسران خود گوے سبقت بردہ حق تعالیٰ زندہ دارد، یقین کہ بیشل خواہد بود، عمرش بست و پنج سالہ است''۔27

استاد کی دعائیں رنگ لائیں۔ خان نے تیزی سے ترقی کی اور ان کا شمار استادوں میں ہونے لگا۔ محسن نے ان کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ:

''خان اشرف خاں مرحوم، ولد محمد علی خاں، باشندہ لکھنؤ صاحب دیوان، شاگرد غلام ہمدانی مصحفی، اور حشل پسر محمد پناہ آشناز بہت شاگردان کے اس شہر میں ہیں''۔28

سعادت خاں ناصر نے فیض آباد اور لکھنؤ میں ان کے دس شاگردوں کا حال قلم بند کیا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں خان کا دیوان محفوظ ہے جس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ:

''اس دیوان میں غزلیات، فردات، قطعات، مخمس اور مسدس شامل ہیں،

- واسوخت بھی ہے اور تاریخی قطعات بھی ہیں''۔

اس قلمی نسخہ کا ترقیمہ یہ ہے:

''تمام شد دیوان اوّل تصنیف حضرت جناب خاں صاحب قبلہ اشرف خاں سلمہ اللہ تعالیٰ

ولد محمد علی خاں ابن محمد روشن خاں بخطاب روشن الدولہ ساکن شاہجہاں آباد، تاریخ یازدہم شعبان 1258ھ (1842) بروز شنبہ وقت دوپہر تمام شد''۔29

(الف) چار باغ

خان نے اپنی یہ مثنوی نصیر الدین حیدر کے جلوس کے فوراً بعد لکھی تھی، جناب افسر صدیقی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''مثنوی چار باغ شاہ نصیر الدین والی لکھنؤ کے عہد میں لکھی گئی ہے، اس میں حمد و نعت کے بعد شاہ مذکور اور اس کے وزیر ''سید نیک ذات'' کی تعریف کی گئی ہے۔ سید نیک ذات کا اشارہ (معتمد الدولہ) آغا میر کی طرف ہے۔ خان نے حمد کے بعد چند ابیات اپنے حالات میں لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے ان کی گذر فراغت سے ساتھ نہیں ہوتی تھی اور اولاد سے محروم تھے، مناجات میں مایوسانہ نقشہ کشی کی ہے۔''30

نہ اولاد ہے نام جس سے رہے　　نہ زر ہے کہ آرام دنیا ملے
نہیں مجھ سا بدبخت کوئی یہاں　　اکیلا پڑا ہوں میان جہاں
رہوں کس طرح نہ میں اندوگیں　　بجز بے کسی پاس کوئی نہیں
بہت مجھ سے برگشتہ ہے روزگار　　کہ گردش میں شکل لیل ونہار
موے پر بھی میت رہے گی خراب　　کہ تنہا و مفلس ہوں میں، دل کباب
ملے گی نہ مدفن کو ہرگز زمیں　　کہ محتاج ہوں پاس کوئی نہیں
کسی کو نہ ترس آئے گا بجز ترے　　تو ہی مہر بھی گر کرے تو کرے
عمل میرے وہ ہیں کہ ہوں رو سیاہ　　نہیں جھوٹ اس میں تو ہی ہے گواہ

اسی سلسلے میں دعا کرتے ہیں۔

رہوں میں نہ محتاج دنیا کے بیچ　　جہنم سے بچ جاؤں عقبیٰ کے بیچ
مری مفلسی اب جو ہے دور ہو　　مرا جام مقصود مخمور ہو
خدایا مجھے دیجو گور و کفن　　نہ کھادیں مری لاش زاغ وزغن

ہر شعر گویا شاعر کے دل کی آواز ہے، بظاہر اس مثنوی سے شاعر کا مقصود یہ رہا ہوگا کہ معتمد الدولہ کی سرکار سے وہ بھی فیضیاب ہو جائے اور اس کی مفلسی دور ہو جائے۔ لیکن اس کی یہ خواہش بہ گمان غالب پوری نہیں ہو سکی ہوگی کیونکہ جلد ہی معتمد الدولہ گرفتار ہو کر اپنے منصب سے معزول ہو گئے تھے۔

اشرف خان نے اپنی اس مثنوی کا نام ذیل کے شعر میں نظم کیا ہے۔

نہیں چار باتیں یہ ہیں باغ چار　　جو دیکھے بہار ان کی، ہو بیقرار

اس شعر میں مثنوی کے ہر باب کو باغ کہا گیا ہے اور پھر اس کے چاروں ابواب کی تفصیل الگ الگ شعروں میں بیان کی ہے اس طرح ۔

لکھا باب اول میں چاہت کا حال　　نہیں خواب وخور کا ہے جس میں خیال
لکھا باب دویم میں طرفہ بیاں　　چرتر کیے رنڈیوں کے عیاں
سوم باغ میں ہے فقیروں کا حال　　پہنتے ہیں جبہ جو باقیل وقال
چہارم میں ہیں مولوی اور طبیب　　بیاں اُن کا طرفہ ہے ان کا عجیب

اپنے تخلص کو شاعر نے اس شعر میں نظم کیا ہے۔

سو یہ عرض رکھتا ہے خاں تجھ سے اب　　بر آویں مطالب مرے دل کے سب

مثنوی کا آغاز جیسا کہ مذکور ہوا حمد و نعت سے ہوا ہے چنانچہ شروع کے کچھ شعر یہ ہیں ۔

خدایا تو ہے مالک دو جہاں　　تری ذات ہے لا بیاں لا بیاں
دکھایا تجلی کا اپنی سماں　　بچایا پھر آتش سے موسیٰ کو ہاں
ترا آئینہ بس کہ انسان ہے　　نہیں حُسنِ یوسف تری شان ہے
دل مرد ماں دہر میں یہ نہیں　　مکاں تیرے سب ہیں تو سب کا مکیں

شاعر نے اس میں چاروں یار اور حضرات شیخین کی بھی مدلل مدح کی ہے کہتا ہے۔

درود اس کے اصحابوں پر لکھ قلم　　بیاں اس کے یاروں کا کر اب رقم
کہ تھے ہمنشیں اس کے وہ پارسا　　اور اب بھی ہیں پاس اس کے بعد فنا
محبّ رسولؐ وعلیؓ تھے ضرور　　کہوں گر بُرا میں تو ہے یہ قصور

اور آگے خدا جانے نیک و زبوں غرض کیا کم و بیش گر میں لکھوں

مثنوی کو چار ابواب میں تقسیم کرنے کے ساتھ ساتھ ان بزرگوں کے بارے میں شاعر کا بیان توجہ کے لائق ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ معتمد الدولہ کے سنّی رفقا اور متوسّل اپنے عقیدے کا حسب ضرورت اظہار کر سکتے تھے۔

اشرف خان کی مثنوی چار باغ کا نسخہ کراچی ناقص الآخر ہے اس لیے اس میں نہ تو خاتمہ کے اشعار ہیں اور نہ ترقیمہ کی عبارت ہی ہے، موجودہ صورت میں اس میں چوتھے باب کا بھی کچھ ہی حصہ موجود ہے اور اس کے آخری شعر یہ ہیں:۔

لیا گھیر یوں اس کو ہو بیقرار کہ گھوڑے کو جس طرح چابک سوار
وہ بیچارہ آخر ہوا بیحواس چھپا بھاگ کے مولوی جی کے پاس

(ب) مثنوی گلدستۂ انجمن

ایک مدت ہوئی پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم نے راقم کو اس مثنوی کا قلمی نسخہ دکھایا تھا۔ اس زمانے میں خیال بھی نہ تھا کہ اس کی ضرورت پڑے گی، راقم نے یادداشت کے طور پر اس کے آخری دو شعر لکھ لیے تھے۔

یہ حال اظہا ہے دنیا میں خان بھلا کوئی بیمار جاوے کہاں
دکھائی بہت سی بہار سخن کرو ختم گلدستہ انجمن

ان شعروں میں مثنوی اور اس کے مصنف کا نام آ گیا ہے۔ ظاہراً اس میں بھی اشرف خان نے اپنے زمانے کے معاشرے کے مختلف طبقوں اور پیشہ وروں سے متعلق اپنے تلخ تجربات کو نظم کیا ہے۔ اس مثنوی کا ترقیمہ اس طرح ہے:

''تمام شد نسخہ گلدستہ انجمن تصنیف اشرف خاں شاعر متخلص بہ خان ابن محمد علی خاں بن محمد روشن خاں مخاطب روشن الدولہ ابن اچھے خاں بن صوفی میر خاں ساکن شاہجہاں آباد بتاریخ ششم شہر ذی الحجہ 1246ھ (31-1830) بروز پنجشنبہ بوقت دو پہر از دست بندہ رام دین صورت اختتام یافت''۔

اور اس کے سرورق کا اندراج یہ ہے:

''مثنوی گلدستہ انجمن مصنفہ: اشرف خاں شاہجہاں آبادی متخلص بہ خان''۔

خیال ہے کہ اس کا زمانہ تصنیف بھی تقریباً وہی ہوگا جو مثنوی چار باغ کا تھا۔

اشرف خاں کی یہ دونوں مثنویاں لکھنؤ کے اُس زمانے کے حالات کے بیان پر مشتمل ہیں۔ دونوں میں شاعر نے اپنے تجربوں کے مطابق حقائق اور واقعات کو پیش کیا ہے، دونوں کی زبان صاف، شستہ اور رواں ہے۔ دونوں مثنویاں بطور مجموعی عام فہم اور موثر حقیقت بیانی کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے۔

7-تراب

اس خطے کے مثنوی نگاروں میں شاہ تراب علی کاکوروی کو بھی قابل ذکر حیثیت حاصل ہے، ان کے بارے میں محسن نے لکھا ہے:

''حضرت تراب علی خلف اور سجادہ نشیں حضرت شاہ کاظم علیہ الرحمہ کے، باشندہ کاکوری نواح لکھنؤ صاحب دیوان''۔31 -

انھوں نے اردو میں ایک سے زائد مثنویاں لکھی تھیں، ان کا مختصر اتعارف کرایا جاتا ہے۔

(الف) مثنوی عاشق وصنم

شاہ تراب علی نے اپنی مثنوی عاشق وصنم میں اپنا احوال نظم کیا ہے۔ اس کا خلاصہ اس طرح لکھا ہے:

''تراب نے اپنی داستان کا آغاز لکھنؤ کی ایک پردہ نشین کے عشق سے کیا ہے، لکھتے ہیں کہ اسی دوران والدہ کا انتقال ہوگیا اور یہ گوالیار چلے گیے جہاں ان کے پیر تھے، پھر اجمیر آگئے، یہاں سے حج بیت اللہ کا خیال آیا اور سورت سے جہاز پر سوار ہوئے، سعدیہ میں احرام باندھا، حرم نبوی کی زیارت کے بعد سورت واپس آئے تو وہاں ایک مغنیہ سے عشق ہوگیا، یہاں سے آگرہ پہنچے اور دربار ابو العلائی میں حاضری دی، اس کے بعد دہلی اور پنجاب ہوتے ہوے بہار پہنچ کر ایک چشتی بزرگ کی خدمت میں آئے، بہار سے پھر اجمیر اجمیر سے دہلی، دہلی سے حضرت ابو العلا صاحب کے عرس کے موقع پر دوبارہ آگرہ پہنچے، یہاں بھی

ایک مغنیہ سے عشق ومحبت کے پینگ بڑھائے وغیرہ"۔32

پوری مثنوی میں اسی قسم کے واقعات نظم کیے ہیں، مخطوطہ ناقص الآخر ہے اس لیے اس میں نہ خاتمے کے سب اشعار ہیں اور نہ ترقیمہ ہی ہے۔ مثنوی کی ابتدا ان شعروں سے کی ہے۔

ہے حمد خدا جو کچھ کہیں ہم — ہر شکل میں عین ذات ہیں ہم
موجود بہر وجود ہم ہیں — نابود میں عین بود ہم ہیں
ہر جسم میں جان ہے ہماری — ہر شان میں شان ہے ہماری

بہ صورت موجودہ خاتمہ کے یہ شعر مخطوطہ میں ہیں۔

ہے خاتمہ مثنوی کا اس جا — کب تک کروں اپنا آپ چرچا
تقلید کی تھی یہ سب حکایت — تحقیق خدا کرے عنایت
یہ اس کے کرم سے کچھ نہیں دور — چاہے تو وہ خاک سے کرے نور

مثنوی 69 صفحوں پر محیط ہے۔ ہر صفحہ پر گیارہ سطریں ہیں، سال تصنیف 1250ھ (1834) کے قریب خیال کیا گیا ہے۔

(ب) خیال آباد تراب

یہ ایک ضخیم مثنوی ہے جو 122 صفحوں پر لکھی گئی ہے۔ ہر صفحہ پر گیارہ سطریں ہیں اور اس کا سال تصنیف 1252ھ (37-1836) ہے۔ یہ سال اس کے نام سے جو تاریخی ہے بر آمد ہوتا ہے، اس کے مخطوطہ کا بھی آخر کا ایک ورق ضائع ہو گیا ہے اس لیے سال کتابت معلوم نہیں ہو سکا ہے:

اس مثنوی خیال آباد تراب میں کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کے نکات بیان کیے گیے ہیں۔ ابتدا حمد سے کی ہے۔

ایسے ظاہر کو تم کہو کہیں کیا — ہے ملا سب سے اور جدا کا جدا
جس کو کچھ کہیے وہ خدا ہی نہیں — ہے وہ بیگانہ آشنا ہی نہیں
جب یہاں حکم گفتگو نہ رہا — ما عرفناک تب نبیؐ نے کہا
جو ہے بے شبہ صاحب لولاک — وہ خدا کا نہ کرسکا ادراک

ہم کہاں، تم کہاں، یہ کیسا ذکر   چپ رہو، چپ رہو، سُن ایسا ذکر

اسی میں ہے کہ "نعت کا رتبہ حمد سے کچھ کم نہیں ہے اور کون سی آنکھ ہے کہ اس کی لاعلمی سے تم نہیں، عاشق کا ذکر مجھ سے کیا ہوا جو معشوق کے بیان میں زبان کھولوں، بھلا محب اور حبیب سے کیا فرق ہے کہ ع:

کوئی کچھ کہہ سکے یا میں بولوں"

مثنوی کے آخر میں یہ عبارت ہے:

"مقدور اس کو باقی رہتا ہے، شریعت میں اس عالم خیال کا نام عالم برزخ ہے، یعنی عالم ارواح مجردہ لطیفی اور عالم اجسام مرکبہ اور یہ ...."۔

(ج) چہاردہ گل مسمّٰی بہ گلزارِ وحدت

شاہ تراب حسینی کی اس مثنوی کا قلمی نسخہ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہے۔ اس میں کل سترہ ورق ہیں اور ہر ورق پر چودہ سطریں ہیں۔ ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

بنام آنکہ صاحب خانۂ دل   ز شمع دل کیا روشن اور محفل

آخری شعر کا پہلا مصرع یہ ہے۔

تراب نقش نعلین جس نے

اور اس کا دوسرا مصرعہ پوری طرح واضح نہیں ہے۔

شاہ تراب کی ان مثنویوں کا بھی کم و بیش وہی معاملہ ہے یعنی اپنے مطالب اور مدّعا کو وہ شعر کے وسیلہ سے خاص و عام کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے لفاظی اور صنائع کے بجائے عام فہم سلیس اور بول چال کی زبان کا استعمال کرتے تھے۔

کہا جا چکا ہے کہ لکھنؤ میں تہذیبی، معاشرتی اور عاشقانہ موضوعات سے متعلق مثنویاں زیادہ نہیں لکھی گئی تھیں، جو لکھی گئی تھیں ان میں سے چند کا نمونہ کے طور پر مختصراً تعارف کرایا گیا، قصیدے اور غزل کا آہنگ الگ ہوتا ہے اور مثنوی کا انداز ان سے مختلف ہوتا ہے۔ غزل کے طرز سے مثنوی کا مطابق اور ہم آہنگ ہونا ہرگز ضروری نہیں ہے، کسی مرکز پر غزل کا جو انداز ہے ضروری نہیں وہاں کی مثنویوں کا بھی وہی مزاج ہو چنانچہ لکھنؤ کی عشقیہ مثنوی کا انداز بطور مجموعی

وہی سمجھنا چاہیے جو خان اور تراب کی مثنویوں کا تھا بے شک شاعر کے مزاج کی انفرادیت بھی موثر ہوتی ہے۔

8-عیشی

گذشتہ اوراق میں ان کا مذکور آچکا ہے۔ان کی تصانیف کا شمار کراتے ہوئے محسن نے تحریر کیا ہے کہ:

"نظم ونثر میں نامی، طالب علی خان مرحوم عیشی ولد علی بخش خاں، باشندۂ لکھنو، دیوان فارسی مع قصائد وغیرہ، ایک دیوان ہندی اور نثر کا مجموعہ اور ایک سرو چراغاں ان سے یادگار ہے،شاگرد رشید مرزا قتیل"۔35

سرو چراغاں کے سبب تصنیف میں مصنف نے لکھا ہے کہ:

"برآتش نفسان محفل زباں دانی کہ بازار سخن از شعلۂ آواز شاں گرم است، روشن باد کہ روزے در محفل چرب گویان روشن قیاس کہ روشنان فلک از تجلائے طبع شان روی سازند بہ ذکر چراغ افروزان مشکات نظم فارسی وزبان اردو ہنگامۂ بیان گرمی پذیرفت، سخن از چرب زبانی مرزا صائب کہ ہر کرا انوار فراست شمع چراغ دارہ دماغ است میداند کہ پیش آں آفتاب اوج سخن دیگراں را فروغ چراغلہ بیش نیست، بمیاں آمد وایں مطلع گرمش سامعہ افروز شد۔

ہر سرائے را کہ باشد از دل روشن چراغ
می جہد شبہاے تار از دیدۂ روزن چراغ

سامعاں..... گفتند کہ اگر از لمعان ایں ردیف وقوافی اردو زبان ہم اقتباس از انوار فیوض نمایند جا دارد، وبہ راقم آثم طالبعلی عیشی تخلص کہ در فروغستان روشن طبعان بہ دود چراغے نمی ارزد، ایماے احباب رفت تا شمع آسا عرق ریختہ غزل فارسی ترتیب دہد و ہر قدر کہ از کلام سابقین ولاحقین بہم رسد، دریں مسودہ دود جگر جمع نماید چوں شمع انگشت قبول برچشم گذاشتم واحباب ایں مختصر را بہ سرو چراغاں نا میدند ومن چراغ بے دود کہ مادۂ تاریخ سال ایں تالیف است وایں شمع طور

فصاحت و بلاغت را دو لمعہ است:

لمعۂ اول در غزلہائے فارسی و

لمعۂ دوم در غزلہائے زبان اردو"۔36

مولانا محمد حسین آزاد نے سرو چراغاں کو مثنوی کہا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اقتباسِ بالا سے ظاہر ہے کہ یہ مختلف شاعروں کی ایک خاص ردیف اور قوافی میں کہی ہوئی منتخب غزلوں کا مجموعہ ہے۔

سرو چراغاں کی تالیف سے مقصود غزلیں جمع کرنا تھا اور بس چنانچہ عیشی نے اس میں شاعروں کا نام اور احوال بالکل نہیں لکھا ہے۔ بعض غزلوں کے مقطعے بھی نقل نہیں کیے ہیں۔ ان کے بارے میں تو یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہے کہ وہ کس شاعر کی تخلیق ہیں البتہ جن غزلوں کے مقطعے تحریر کر دیے ہیں ان کے مصنف کا تخلص معلوم ہو جاتا ہے۔ اس مجموعے کا تاریخی نام "چراغِ بے دود" ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کام عیشی نے 1230ھ میں جیسا کہ اقتباس بالا میں مذکور ہے یعنی غازی الدین حیدر کے زمانۂ نیابت میں کیا تھا، افسوس ہے کہ یہ تا حال چھپ نہیں سکا ہے۔

(ب) سوز و ساز

عیشی نے ایک عشقیہ مثنوی بھی لکھی تھی۔ اس کے تعارف میں پروفیسر گیان چند نے جو لکھا تھا اس کا اختصار یہ ہے:

> "حسرت موہانی نے یہ مثنوی اردوئے معلی کے دسمبر 1906 کے شمارے میں شائع کی تھی۔ اس میں تین سو سے اوپر اشعار ہیں، پہلا شعر یہ ہے۔
>
> زیب سرنامہ نام باری   دی جس نے دلوں کو بیقراری
>
> مثنوی کی زبان اچھی ہے۔ محبوبہ کا سراپا یوں بیان کرتے ہیں۔
>
> تھی شعلۂ حسن پائے تا فرق   رشک مہ و مہر غیرت برق
>
> سر تا پا وہ تھی سر بسر ناز   کامل خوبی تمام انداز

9-اختر

قاضی محمد صادق خاں نام، اختر تخلص، بڑے صاحب استعداد شخص تھے۔ سعادت خاں ناصر

نے لکھا ہے:

''آسمان فضل و ہنر، قاضی محمد خاں، تخلص اختر، سلسلہ ان کے نسب کا خواجہ عبداللہ احرار تک پہنچتا ہے، اپنی اصل و نسل پر فخر و ناز رہتا ہے، مولد اجداد اول عربستان، بعدۂ ترکستان، ترکستان سے دہلی، دہلی سے بنگالہ، عہدۂ قضا و خدمت صدر الصدور اس کے خاندان میں مفوض اور مقرر، علوم دوازدہ گانہ میں مشہور اور نامور، تصنیفات اور تالیفات اس کی چہار دانگ ہندوستان میں مشہور چنانچہ:

تذکرۂ آفتاب عالمتاب و بہار اقبال و مفید المستفید و

محامد حیدری و گلدستۂ محبت و بہار بے خزاں و لوامع النور

قصہ کوتاہ وہ صاحب تحصیل نثر و نظم میں شاگرد محمد حسن قتیل، تاریخ ولادت عدد لفظ ''اختر'' پیش ازیں وہ نامور خدمت منشی گری، صاحب کلاں لکھنؤ سے ممتاز تھا،
1201

بعد اس کے شاہ زمن غازی الدین حیدر نے گھر سے اس کو طلب کیا اور عہدۂ تالیف و تصنیف پر ہزار روپیہ کا نوکر رہا، بعد بر ہمی عہد دولت حضرت خلد مکاں ضلع کانپور میں نوزدہ سال عہدۂ تحصیلداری پر مامور رہا، حالیا عرصہ دو سال سے وارد لکھنؤ ہے''۔

قاضی محمد صادق اختر کی مثنوی سراپا سوز کو عجیب مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ اس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں، علی گڑھ کے کئی نسخوں میں سے ایک کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے:

''مثنوی دل افروز سراپا سوز از قاضی محمد صادق خاں اختر کاتب شیخ مکرم حسین اوراق اُنیس فی صفحہ اُنیس سطر سال کتابت 1272ھ (56-1855)

ابتدا ۔

خلق عالم سے مدعا ہے عشق مظہر ذات کبریا ہے عشق

خاتمہ ۔

سال تاریخ خواست چو ناسخ گفت دل مثنوی معنی راست

لیکن مثنوی معنی راست سے 1437 کے عدد برآمد ہوتے ہیں اگر یہ مثنوی معنوی است ہو تو البتہ اس سے 1243 نکلیں گے، نہ کہ 1244 جو مطلوب ہیں۔ اس مثنوی کے بارے میں اسپرنگر نے جو لکھا ہے یہ ہے:

''مثنوی سراپا سوز مصنفہ 1231ھ، تقریباً 650 شعر، مطبوعہ مطبع مسیحی لکھنؤ، اٹھارہ صفحات، ہر صفحہ میں اڑتیس شعر''۔40

لیکن صحیح وہ ہے جو قاضی عبدالودود مرحوم نے تحریر کیا ہے یعنی:

''مثنوی سوز وساز (کتبخانہ شرقیہ پٹنہ)، اکیس ورق، ہر صفحے میں سولہ شعر، تقریضات مزید برآں، زمانہ تصنیف نور بشا گرد اختر کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے۔

اس کی چاہے اگر کوئی تاریخ ہے بیان شہادت عاشق''41

1244ھ

مثنوی کا نام سوز وساز غالباً کاتب نے سہواً لکھ دیا ہے۔ اس کے شروع میں عشق کی خوبیوں اور کارفرمائیوں کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چند شعر یہ ہیں۔

عشق سے دل کو ارجمندی ہے عشق معراج سربلندی ہے
کہیں یہ کوچۂ سلامت ہے کہیں سنگ سر ملامت ہے
کہیں گیسوے یار بنتا ہے کہیں ڈسنے کو مار بنتا ہے
کہیں یہ پھول ہو کے ہار ہوا کہیں پھل ہو جگر کے پار ہوا
کہیں یہ لطف نشہ ے ہے کہیں ایسا بھی ہے کہ لاشے ہے

بطور مجموعی یہ اردو کی اچھی مثنویوں میں سے ہے، باوجودیکہ مصنف کا تعلق بنگالہ سے تھا، اس مثنوی کی زبان لائق ستائش ہے۔

مرثیہ

لکھنؤ کی ریاست کی شناخت کے طور پر نواب آصف الدولہ نے امام باڑہ تعمیر کروادیا تھا، وہیں مجلسوں وغیرہ کا اہتمام ہوتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مذہب پسندی کی لہر تیز ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس سلسلے کی جدتوں میں خود نوابین کی شرکت اور حمایت بھی ضروری نہیں رہ گئی تھی۔ چہلم کے تعزیے کے بارے میں سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

> ''میاں احسان مرثیہ بھی زمان سابق میں خوب کہتے تھے، جب انھوں نے امام باڑہ بنایا اور تعزیہ داری شروع کی وہ عہد جناب عالی نواب سعادت علی خاں کا اوایل عہد تھا، اوّل تعزیہ روز چہلم بستم ماہ صفر کو لکھنؤ میں میاں احسان نے اٹھایا بلکہ یہ امر جدید جناب عالی کو ناگوار ہوا لیکن بہ پاس مذہب کچھ حکم نہ دے سکے، اور یوں کہا کہ اب لوگ بہت زیادہ امر جدید کرنے لگے ہیں''۔1

نواب کی ناگواری پہلے سال ''امر جدید'' کو روکنے میں ناکام ہوگئی تو سلسلہ چل پڑا اور بقول ناصر:

دوسرے سال سے ایک سیدانی نے بھی تعزیہ نوزدہم ماہ صفر چہلم کو اٹھانا شروع کیا، پھر رفتہ رفتہ یہ امر کل رواج ہوگیا''۔

نواب معتمد الدولہ جو پہلے وزیراعظم ہوئے خود بھی مرثیے کہتے تھے اور ایسے معاملات کو جو مذہب سے متعلق ہوتے ہوں عموماً ان کی سرپرستی حاصل رہتی تھی۔

معتمد الدولہ کے زوال کے بعد جس زمانے میں منتظم الدولہ کو اقتدار حاصل ہوا باوجودیکہ بادشاہ نصیرالدین حیدر مذہبی رسوم کو ہر طرح نباہتے تھے، تعزیۂ چہلم سے متعلق ناصر نے لکھا ہے:

"نقل یہ ہے کہ بعد انتقال میاں احسان کے ان کی زوجہ بھی حسب دستور اپنے شوہر کے تعزیہ چہلم اٹھایا کرتی تھیں۔ اوائل عہد نصیرالدین حیدر بادشاہ سے مبلغ دو سو روپے واسطے اٹھانے تعزیہ کے سرکار شاہی سے ہر سال چہلم میں زوجہ میاں احسان کو ملا کرتے تھے۔ جب عہدۂ نیابت منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کا ہوا، نواب مذکور نے بہ سبب خیر خواہی کے چاہا کہ یہ بھی سالانہ مثل اور امروں کے موقوف کریں، یہاں تک کہ تعزیہ اٹھنے میں تامل ہوا۔ بہ سبب نہ وصول ہونے سالانہ کے جب نوبت استغاثہ کی حضور بادشاہ تک پہنچی، بادشاہ بہت ناراض ہوئے اور نواب مذکور کے پاس چوبدار بھیجا اور چوبدار کو حکم دیا کہ روپیہ مختار زوجہ میاں احسان مرحوم کو اپنے سامنے دلوا کے آنا اور اس کی رسید میرے حضور میں جلد حاضر کرنا۔ چوبدار فوراً نواب صاحب کے پاس آیا اور حکم بادشاہ سنایا۔ نواب صاحب سے بار بار چوبدار نے تقید کی۔ تب نواب صاحب نے لاچار ہو کے فرمایا کہ وہ مختار زوجۂ میاں احسان کا کہاں ہے؟ جب مختار حاضر ہوا تب نواب مذکور نے فرمایا کہ میاں احسان وہی تھا کہ جو تعزیہ کا اجاڑ ڈالتا تھا۔ اب ان کی زوجہ بھی مثل اپنے شوہر کے اجاڑ ڈالتی ہے چالیس دن تک۔ تب مختار نے جل کر عرض کیا کہ حضور بجا ہے لیکن وہ اجاڑ آپ کے عہد نیابت میں پڑا۔ تب نواب مذکور نے بہ اکراہ مختار کو روپے عنایت فرمائے اور چوبدار کو حکم دیا کہ رسید اس سے لے کر بادشاہ کے حضور میں گذار دو، بعد لینے رسید کے مختار کی گردن میں ہاتھ دے کے کچہری وزارت سے نکال دیا، سبحان اللہ کیا ایمانداری و شکری ہے"۔

شہرت جو بھی ہو واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ کے حالات بہت حوصلہ افزا نہیں تھے۔ البتہ نواب

معتمد الدولہ ہر حال میں اپنے عقیدے کی ترویج واشاعت کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ شیخ ناسخ نے اپنے ایک قصیدے میں پوری صراحت کے ساتھ ان کے بارے میں کہا ہے۔

رواج شرع بہ ہندوستاں ز ہمت اوست　　امام صاحب عصر است راضی از اطوار

مرزا رجب علی بیگ سرور نے مرثیہ گوئی کے لیے تقریباً سبھی ممتاز ومعروف ناموں کو ذیل کے اقتباس میں جمع کر دیا ہے:

''مرثیہ گوئے بے نظیر میاں دلگیر، صاف باطن نیک ضمیر، خلیق، فصیح، مرد مسکین، مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا، اللہ کے کرم سے ناظم خوب دبیر مرغوب، سکندر طالع بہ صورت گدا، احسان اہل دول کا نہ اٹھایا''۔

ان مرثیہ گویوں میں زمانی تقسیم اس طرح معلوم ہوتی ہے:

پہلا دور:　مسکین، سکندر، گدا

دوسرا دور:　احسان، افسردہ

تیسرا دور:　فصیح، خلیق، دلگیر، ضمیر

جدید دور:　دبیر

دوسرے دور کے مرثیہ گویوں نے نواب معتمد الدولہ کی نوازشات سے اپنے آخر زمانے میں بہ گمان غالب براہ راست یا بالواسطہ فیض پایا تھا چنانچہ بیان کردہ واقعات سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے، تیسرے دور کے مرثیہ گویوں کی معتمد الدولہ نے براہ راست سرپرستی کی تھی چنانچہ اپنے مرثیوں میں اُنھوں نے خود اعتراف کیا ہے۔

آخر دور کے مرثیہ گو ان کی مجلسوں میں پہنچنے لگے تھے اور اس پر وہ فخر بھی کرتے تھے، وقت کے ساتھ زبان وبیان وغیرہ کے انداز بھی بدلتے رہے تھے چنانچہ میاں سکندر کے ایک مرثیہ کا بند یہ ہے۔

عباس کی بیوہ کوک اٹھی اُس پانی لاون ہارے کا
مونڈھوں سے وا کے ہاتھ کٹے اور سیس کٹا بیچارے کا
بندھوا کر گٹھری دھر لونگی تابوت اٹھا دکھیارے کا

تب اُور نجف کی پَیر دھروں کر دھیان علی پیارے کا
کاندھے پر سوکھی مشک دھرے آنسو سے ندی بہاؤں گی
تابوت اٹھائے، علم لیے، میں جگ دکھلاتی جاؤں گی

میاں احسان جنھوں نے پہلی بار چہلم کا تعزیہ اٹھایا تھا ایک مرثیے میں زینب کی زبان سے یہ بند کہتے ہیں۔

ایک دن وہ تھا دلھن تم نے بنایا تھا مجھے — لے کے اک اچھی سی محمل میں بٹھایا تھا مجھے
پھر بہو کہہ کے علی نے بھی بٹھایا تھا مجھے — پہلو میں فاطمہ بی بی نے لٹایا تھا مجھے
آج نے شان وہ ہنگی، نہ وہ شوکت ہنگی — میں تباہی میں ہوں اور شاہ کی رخصت ہنگی

اس بند پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مسیح الزماں نے لکھا ہے:

''اس دور کے مرثیہ گو تاریخ کی طرف دھیان نہیں دیتے اور واقعات کے خاکے میں تخیل سے رنگ بھرتے ہیں''۔

مقصود چونکہ رونا رلانا اور ثواب کمانا تھا اس لیے واقعات کو مقصود کے مطابق ڈھال کر نظم کر لیا جانا کافی سمجھا جاتا تھا۔

مرثیہ کے ایوان کے اراکین اربعہ یہ ہیں: فصیح، خلیق، دلگیر، ضمیر، انھیں چاروں نے اس صنف کو لائق توجہ اور قابل قدر حیثیت عطا کی چنانچہ ان کا ذکر تفصیل سے کیا جائے گا۔

نواب سعادت علی خاں کو اپنے ملک کی فکر تھی اور وہ اسی فکر میں مرے۔ ملک میں وہ اندرونی خلفشار نہیں چاہتے تھے۔ اہل مذہب کی کوئی بات ناگوار ہوتی تو وہ خاموشی سے برداشت کر لیتے تھے۔ ان کے بعد جب غازی الدین حیدر مسند نشیں ہوئے تو معتمد الدولہ کو ان کی نیابت سے سرفرازی حاصل ہوئی۔ اپنے آقا کے مزاج میں معتمد الدولہ پوری طرح دخیل تھے اور عملاً وہی اودھ کے اصل حکمراں تھے۔ ان کے زمانے میں مذہب اور شاعری وغیرہ کے معاملوں پر سے تمام موانعات یک لخت دور ہو گئے۔ گویا ایک بند تھا کہ جو ٹوٹ گیا۔ مجتہد العصر کا رسوخ اور عمل زیادہ ہو گیا۔ بلکہ روز بروز بڑھنے لگا۔ لوگوں نے مذہب اثنا عشری کو اختیار کرنا شروع کر دیا۔ شیخ مصحفی نے ایک شاعر کے بارے میں تحریر کیا ہے:

> ''مرزا امام بخش رسم تخلص، گویند کہ پیش ازیں کاستھ بود، از چندے بہ حلقۂ اسلام درآمد و بہ مقتضائے موزونی طبع در ابتدا چیزے کہ موزوں میکرد بہ نظر میرزا قاسم رقت مرحوم گزرانیدہ......... حالا بطور خود راہ می رود، عمرش تخمیناً از سی متجاوز خواہد بود''۔

بعض لوگ جو اپنے دین آبائی پر قائم رہے ان کا حال وہ تھا جو ذیل کے اقتباس میں ظاہر ہے:

> ''لالا فتح چند تخلص شائق، قوم کاستھ، باوجود مذہب ہنود کے ایمۂ اطہار سے عقیدت صادق رکھتا ہے، کلام صداقت نظام اس کا دلیل خوش اعتقادی کی ہے''۔

1 - دلگیر

میاں دلگیر جن کا اصل نام چھنو لال تھا غالباً اپنا اسلام ظاہر کرنے سے پہلے ہی نواب معتمد الدولہ کی خدمت میں باریاب ہو گئے تھے، پھر انھوں نے کتب مذہب کا مطالعہ کیا اور مرثیہ گوئی شروع کی۔

وہ زمانہ تھا جب مرثیہ گوئی کے ضوابط اور معیار وغیرہ مقرر نہیں ہوئے تھے۔ شاعر موقع اور ضرورت کے مطابق اپنے بیان میں مضامین شامل کر لیتا تھا۔ میاں دلگیر نے چونکہ معتمد الدولہ کی خوشنودی کے لیے مرثیہ کہنا شروع کیا تھا۔ عموماً آخری بند میں ان کے لیے دعا بھی کرتے تھے۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے ذخیرے میں راقم نے ان کا پینتالیس بند کا ایک مرثیہ دیکھا تھا۔ اس کے آخر میں ہے۔

اب یہ دلگیر دعا کر تو بہ درگاہِ الٰہ   معتمد الدولہ بہادر رہے باعزت و جاہ
نبیؐ اور آل نبیؑ اس کے رہیں پشت پناہ   اس پہ نواب کی ہردم ہو عنایت کی نگاہ
خلق کے سر پہ رہے سایۂ دامن اس کا   خوار و رسوا رہے کونین میں دشمن اس کا

چوتھے مصرع میں ''نواب'' سے غازی الدین حیدر بلکہ سعادت علی خاں بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اپنے ابتدائی زمانے میں معتمد الدولہ نواب سعادت علی خاں کے ملازم بھی رہے تھے اور اس

زمانے میں بھی اپنی حیثیت اور حوصلے کے مطابق مذہب کی بہت کچھ سرپرستی کرتے رہتے تھے۔

میاں دلگیر شروع میں طرب تخلص کرتے تھے۔ جب مرثیہ گوئی اختیار کی تو اس صنف کی مناسبت سے دوسرا تخلص اختیار کیا، معتمد الدولہ نے اس تخلص کی رعایت سے ان کو "میاں دلگیر" کہہ دیا ہوگا، بس یہی ان کا نام پڑ گیا اور جو اصل نام تھا وہ فراموش ہوگیا۔ پہلے نام سے تو وہ معروف تھے۔ پھر مسلمان ہو جانے کے بعد ماضی کی حقیقت کو یاد کرنے کے لیے بھی اکثر تذکرہ نویسوں نے ان کا قدیمی نام چھنولال لکھ دیا ہے۔ نیا اسلامی نام غلام حسین ابھی زبانوں پر جاری بھی نہ ہوا تھا کہ نواب کی زبان سے "میاں دلگیر" نکلا، غلام حسین پوری طرح فراموش ہوگیا۔ اور چھنولال طرب "میاں دلگیر" ہو کر رہ گئے۔

معتمد الدولہ جب تک لکھنؤ میں با اختیار رہے میاں دلگیر ان کی دعا گوی اپنے مرثیوں میں کرتے رہے، ایک اور مرثیہ میں کہتے ہیں۔

اب آگے مرنے کا اکبر کے کیا کہوں میں حال — خدائے پاک سے دلگیر ہے یہ میرا سوال
رہے ہمیشہ جہاں میں بہ حشمت و اقبال — جناب معتمد الدولہ سپہر جلال
مدام اختر اقبال اس کا تاباں ہو — عدو جو اس کا ہو وہ خوار اور پشیماں ہو

یہ مرثیہ اس زمانے میں لکھا گیا جب معتمد الدولہ کا اختر اقبال تاباں تھا اور ان کو سپہر جلال کہا جاتا تھا۔ بظاہر یہ وہ وقت تھا جب وہ منصب وزارت پر فائز تھے۔

معتمد الدولہ کے زوال کے بعد میاں دلگیر کی اس طور پر پذیرائی نہیں ہو سکی افتخار الدولہ مہاراج میوارام جو مسلمان ہو جانے کے بعد ہدایت علی خاں بہادر کے نام سے معروف ہوئے میاں دلگیر کے اعزا میں سے تھے اور جن کا حال یہ تھا کہ: ع

گنج ہائے شایگاں صرف عزاداری نمود

اور لکھنؤ میں ان کی مجلسیں مشہور تھیں۔ میاں دلگیر ان کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اپنے مرثیوں میں اُن کے اور اُن کی بیگم کے لیے دعا گوئی کرتے رہے چنانچہ ایک مرثیہ میں کہتے ہیں۔

آگے اے دلگیر کر درگاہ حق میں یہ دعا — افتخار الدولہ پر سایہ رہے اللہ کا
حشمت و اقبال سے قائم رہے وہ دائما — اور بیگم صاحبہ پر بھی رہے فضل خدا

ماتم سرور سے یہ غافل نہ ہوں صبح و مسا   اور ان کی تعزیہ داری ہو مقبول خدا

میاں دلگیر نے ان کی تعزیہ داری کے مقبول خدا ہونے کے لیے دعا کی ہے جس سے ظاہر ہے کہ افتخار الدولہ اور ان کی بیگم کے لیے سب سے محبوب عمل یہی تھا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مع بیگم (اور شاید بعض اور اعزا کے بھی ساتھ) مسلمان ہوئے تھے۔اپنی حیثیت اور حوصلے کے مطابق مرثیہ گویوں کو وہ نوازتے رہتے تھے۔میاں دلگیر بھی ان کی نوازشات سے فیضیاب ہورہے تھے۔ ایک اور مرثیہ میں کہتے ہیں ۔

دعا یہ مانگ لے دلگیر حق سے تو رو کر   علیؑ کا سایہ رہے افتخار دولہ پر

رہے یہ حشمت و اقبال یہ خجستہ سیر   کرے مدام عزائے امام جن و بشر

خدا کے فضل سے برآئے مدعا دل کا   نہ اس جناب پہ ہو وقت کوئی مشکل کا

دلگیر نے بعض اور بھی صاحب ثروت شخصوں کی مجلسوں میں شرکت کر کے ان کی دعا گوئی کی تھی لیکن ان کا افلاس دور نہیں ہوسکا۔ایک سلام میں کہتے ہیں ۔

افلاس دور کیجیے دلگیر کا شتاب   آقا حسین تم سے یہی التماس ہے

بڑھاپا آتا جاتا تھا، مرنے کی فکر لاحق ہورہی تھی۔کربلا کے لیے ہجرت کر جانے کی خواہش زور پکڑتی جاتی تھی، یہ شعر توجہ طلب ہیں ۔

قدرت حق سے یہ کچھ دور نہیں ہے واللہ   دفن دلگیر ہو قبر شہدا کے نزدیک

اور ۔

عرض دلگیر ہے سرداب میں جادو یا شاہ   قابل ہند کسی طور مری خاک نہیں

ان شعروں کی موجودگی میں دلگیر کے مسلمان ہونے پر شبہ کرنا بڑی ہی زیادتی کی بات ہے۔ کوئی ہندو نہ دفن کیے جانے کی تمنا کرسکتا ہے اور نہ اپنی خاک کو ہند کے لیے نا قابل قرار دے سکتا ہے۔دلگیر کو کربلا میں مرنے کی تمنا تھی۔کہتے تھے ۔

دلگیر کربلا کی طرف جلد کوچ کر   ناداں قریب اب تری رحلت کا وقت ہے

لیکن ان کی یہ آخری خواہش پوری نہیں ہوسکی۔مفلسی نے راہیں مسدود کردیں اور "بے استطاعت" رہ کر وہ جنت کو سدھار گئے۔

میاں دلگیر نے رسمایا زمانہ سازی کے لیے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ انھوں نے کتب مذہب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا اور اپنے اس علم سے مرثیہ گوئی میں بھی فائدہ اٹھایا تھا۔ کہا جا چکا ہے کہ ان سے پہلے اکثر مرثیہ گو صحتِ واقعات کا اہتمام نہیں کرتے تھے، میاں دلگیر نے اپنے مرثیوں میں عموماً اس بات کا التزام کیا تھا کہ روایتیں ان کے عقیدے کے مطابق ہوں اور صحیح ہوں۔ ایک مرثیے میں کہتے ہیں۔

یہ بین کرکے لگی پیٹنے وہ خستہ جگر   اب اس کے رونے کو دلگیر تو بیان نہ کر
کتاب میں یہ روایت مجھے پڑی تھی نظر   لکھا جو میں نے یہ احوال مسلم ہے پر
سند سے بچ ہے کہ خالی مرا کلام نہیں   خدا نہ خواستہ راوی پہ اتہام نہیں

شاعری نہ محض مذہب ہے اور نہ فقط تاریخ ہے۔ شعر کے لیے اثر شرط ہے اور اثر پیدا کرنے کے لیے بعض باتوں کا شامل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ باتیں ایسی ہونی چاہئیں جو مخصوص حالات میں سننے والوں کے مزاج اور ان کے مزاج کے تقاضوں سے بھی مناسبت رکھتی ہوں۔ میاں دلگیر نے اسی قسم کے مطالب کو ''دخلِ طبیعت'' کا نام دیا تھا، وہ اس نکتے سے بخوبی واقف تھے کہ مرثیے کی کامیابی کے لیے اس دخلِ طبیعت کی بہت اہمیت تھی۔ کیونکہ اس کے بغیر مرثیہ کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ مرثیہ کے لیے رقت انگیز اور دردآمیز ہونا ضروری ہے۔ یہ وصف نہ ہو تو مرثیہ مرثیہ نہیں رہ جائے گا اور یہ بات بغیر دخلِ طبیعت کے پیدا نہیں ہو سکتی ہے، میاں دلگیر نے اس صورت حال کی طرف ایک مرثیہ کے اس بند میں اشارہ کیا ہے۔

دلگیر نے حدیث سے ہے مرثیہ کہا   ہاں بین میں تو دخلِ طبیعت ہے جابجا
راوی کا نام آیا نہ اس میں کتاب کا   خالی سند سے پر نہیں یہ نظم مطلقاً
آگاہ راہرو ہے ہر اک اس طریق کا   اس جا پہ اتفاق ہوا ہر فریق کا

کتاب اور حدیث کی سند کے ساتھ مرثیہ کامیابی کے ساتھ کہہ لینا آسان بات نہیں تھی اسی لیے اپنے اس طرز میں میاں دلگیر منفرد رہ گئے تھے۔

اپنے عقیدے سے متعلق خلاف قیاس روایتوں کو میاں دلگیر نے قبول نہیں کیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے مرثیے عموماً زیادہ موثر، قابل قبول اور پسندیدہ ہیں۔ انھوں نے بیان واقعات میں

انسان کی فطرت اور اس کے مزاج پر بھی نظر رکھی ہے اور بات اس طرح کہی ہے کہ وہ مقتضائے حال کے مطابق ہو جائے۔ دلگیر کے مرثیوں کے بارے میں یہ دعوا تو نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں ہندوستانیت کا عنصر نہیں ہوتا تھا۔ ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ دلگیر اصلاً ہندو تھے اور دوسروں کے مقابلے میں ہندوستانی مزاج اور آداب و رسوم سے زیادہ بہتر طور پر واقف تھے، اصل نکتہ جس کی طرف توجہ کی جانی چاہیے یہ ہے کہ ان معاملات کا بیان شاعر نے صحیح پس منظر اور مناسب ماحول میں کیا ہے۔ ایک مرثیہ کا آخری بند یہ ہے۔

حیا سے بین تو کچھ کر سکی نہ وہ پُر غم   کمالِ ضبطِ فغاں سے غش آ گیا اُس دم
وہ لاش لے گیے عبّاس اور امامِ اُمم -   عجب یہ مرثیہ دلگیر نے کیا رقم
بیان جنگ ہے، شادی کا ماجرا بھی ہے   زبان حال ہے، پہلو حدیث کا بھی ہے

مسلمان خاتون، حیا کا پیکر، نامحرم کو اپنی آواز بھی نہیں سنا سکتی، شدت غم سے بین بھی نہیں کر سکتی، ضبطِ غم کے نتیجے میں وہ بیہوش ہو گئی، بیان واقعات میں ترتیب، تسلسل اور ربط لائق ستائش ہے۔ میاں دلگیر شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ شروع میں آغا نوازش سے بھی کسب فیض کیا تھا، وہ زبان و بیان کے مسائل اور نکات سے بخوبی واقف تھے اور اس اعتبار سے بھی ان کے مرثیے قابل قدر تھے، ساری لیاقتوں اور خوبیوں کے ساتھ ایک قدرتی کمی بھی تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

''میاں دلگیر کی زبان میں لکنت تھی، اس لیے مرثیہ خوانی نہیں کرتے تھے، تصنیف میں انھوں نے مرثیت کے دائرے سے قدم نہیں بڑھایا''۔

آزاد کا یہ آخری بیان حقیقت کے دائرے سے خارج معلوم ہوتا ہے۔ میاں دلگیر اپنے زمانے میں غزل گو کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ تقریباً سبھی معاصر تذکروں میں ان کی غزلوں کے اشعار کم و بیش نقل کیے گئے ہیں۔ انھوں نے مثنویاں بھی لکھی تھیں۔ رام پور کے کتب خانے میں ان کی ایک مثنوی کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ جس کی ضخامت دس ورق ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری نے راجا صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں بھی ان کی مثنویوں وغیرہ کے ایک مجموعہ کی نشاندہی کی تھی۔ پھر انھوں نے اس کو ''منظومات میاں دلگیر'' کے نام سے شائع بھی کر دیا تھا۔

میاں دلگیر غزل کے علاوہ مرثیے وغیرہ کے بھی مسلّم الثبوت استادوں میں شمار ہوتے تھے۔
ان کے سب سے زیادہ مشہور شاگرد امانت ہوئے۔ ان کے ذکر میں سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

''اوائل میں میاں امانت نے برائے چندے میاں دلگیر صاحب سے اصلاح لی
تھی، پھر خود استاد بن بیٹھے''۔

مرثیے میں استادی شاگردی کی روایت کو باقاعدگی کی صورت بھی انھیں نے دی تھی۔
مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ:

''میر علی حسن اشک تخلص........ان کے والد خلیق تخلص فقط مرثیہ کہتے تھے اور
میاں دلگیر کے شاگرد تھے''۔

میر خلیق کے علاوہ اور مرثیہ گو بھی دلگیر کے شاگرد تھے۔

2-فصیح

مرزا جعفر علی فصیح ایک مذہب پسند خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ میاں مصحفی نے بتایا ہے کہ
انھوں نے حدیث اور کتب حدیث اور کتب دینیہ کا درس مولانا دلدار علی سے لیا تھا اور:

''یکبار برائے زیارت ایمۂ معصومین رفتہ بود وحالا باہمیں قصد بہ طرف
کلکتہ رفتہ است''۔

پہلی بار انھوں نے یہ سفر اپنے والدین کے ساتھ کیا ہوگا اور دوسری مرتبہ اہل وعیال کے
ساتھ 1233ھ میں اسی نیت سے وہ کلکتہ پہنچے تھے، وہیں ان کا بیٹا کاظم مرا، شیخ ناسخ نے تاریخ
کہی۔

''تاریخ فوت پسر مرزا جعفر فصیح''

ز کلکتہ بہ جنت رفت کاظم — قرار و صبر باہم بُردا ے وا ے
چنیں سالِ وفاتش کلکِ ناسخ — رقم بنمود کاظم مُردا ے وا ے

1233ھ

وہ زمانہ تھا جب قافلے چلا کرتے تھے۔ چنانچہ فصیح جس قافلے کے ساتھ جارہے تھے اسی
میں بہ گمان غالب ''اخبار ماتم'' مولفۂ 1285ھ کا موتف حسین بھی تھا۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ

رامپور کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس میں حُسین نے اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''محمد حُسین حُسین تخلص ابن محمد علی ابن حاجی محمد بیگ ابن آقا علی تقی کھاچی''۔

اس کا بیان ہے کہ میرے والدین ''تباہی شاہجہاں آباد'' (وفات شاہ عالم ثانی) کے بعد گھر سے نکلے، لکھنؤ پہنچے، وہیں پر ''بست ونہم رمضان 1222 ھ میں ولادت راقم ہوئی''، پھر یہ لوگ ...122 ھ کو سفر عتبات کے لیے روانہ ہوئے۔ حُسین کی خط وکتابت انیس، دبیر، اُنس وغیرہ سے ...ہے، اخبار ماتم میں مرزا جعفر فصیح کا ذکر بھی آیا ہے۔ فصیح کے دوسرے سفر کی روانگی کا بھی وہی زمانہ ہے، اور ان کی کتاب کا نام ''نخل ماتم'' بھی حسین کی تالیف کے نام سے مطابقت رکھتا ہے۔

فصیح کی مذہب پسندی نے انھیں مرثیہ گوئی کی راہ پر لگا دیا اور اسی طور پر انھیں شہرت ملی، غزل کے میدان میں انھوں نے شیخ ناسخ کی شاگردی اختیار کی تھی۔ میاں دلگیر بھی انھیں کے شاگرد تھے، دونوں کے مابین دوستانہ روابط قائم ہوگئے ہوں گے، فصیح نے مرثیوں میں میاں دلگیر ...مشورہ کیا ہوگا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اسی کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''مرزا فصیح میاں دلگیر سے اور دلگیر شیخ ناسخ سے اصلاح لیتے تھے''۔

ظاہراً فصیح اور دلگیر کے درمیان باقاعدہ استادی شاگردی کا رابطہ نہیں تھا، مشورہ دوستانہ ہوگا۔

فصیح بھی معتمد الدولہ کے متوسل اور مقرب تھے اور اپنے مرثیوں میں انھوں نے ان کی دعا گوئی کی ہے، فصیح کے ایسے مرثیے جن میں معتمد الدولہ کا نام آیا ہے سب غازی الدین حیدر کے زمانے کے معلوم ہوتے ہیں اور اس اعتبار سے میاں دلگیر کو ان پر تقدم حاصل ہے۔

بیت اللہ شریف میں پہنچنے کے بعد فصیح نے جو مرثیے لکھے تھے ان میں سے ایک کو انھوں نے اس بند پر ختم کیا ہے۔

فصیح بعد دعا کر بکا کہ بار اِلٰہ | بحق زمزم ورکن ومقام وبیت اللہ
ہمیشہ رکھ اسے باعزوشان وشوکت وجاہ | جو حاج کا ہے مددگار، زایروں کا پناہ
دعا ئے معتمد الدولہ مجھ پہ واجب ہے | کہ میرا محسن وراحت رسان وصاحب ہے

فصیح نے معتمد الدولہ کو حاجیوں کا مددگار اور زائروں کا پناہ قرار دیا ہے۔ ان کی انھیں خوبیوں

کا نتیجہ تھا کہ لکھنؤ میں ان کی سرپرستی میں مرثیہ گوئی نے خوب فروغ پایا۔

بیت اللہ شریف میں پہنچنے کے بعد فصیح نے جو مرثیے لکھے تھے ان میں سے ایک کا آخری بند یہ ہے ؎

بس فصیح آگے نہیں طاقت تحریر و بیاں   کر دعا حق سے در کعبہ پہ ہو گریاں
ہند میں معتمد الدولہ ہے فیاض جہاں   مجھ پہ کرتا ہے وہ غربت میں ہمیشہ احساں
اس پہ احسان وکرم کو متواتر یارب   ابر رحمت کا ہمیشہ ہو تقاطر یارب

تیسرے مصرع سے یہ حقیقت بخوبی ظاہر ہے کہ اس وقت شاعر "ہند" میں نہیں ہے۔ معتمد الدولہ کسی وسیلہ سے فصیح کی مدد کے لیے وہاں مناسب رقم بھیجتے رہے ہوں گے، اسی کو فصیح نے "احسان" سے تعبیر کیا ہے اور اسی کے صلے میں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ نواب پر متواتر احسان وکرم ہوتا رہے۔

غازی الدین حیدر کے اعلان بادشاہت کی خبر اور معتمد الدولہ کے عہدۂ وزارت پر فائز ہونے کی اطلاع پاکر فصیح نے ایک مرثیہ لکھا۔ اس کے آخری بند میں انھوں نے اس طرح دعا کی ہے ؎

بس اے فصیح یہاں کر تو مرثیے کو تمام   دعا کا وقت ہے اور التماس کا ہنگام
ہے پیش روترے بیت الحرام ورکن ومقام   یہ عرض کر کہ بہ طفیل رسولؐ وآلِ کرام
جہاں میں معتمد الدولہ دیرگاہ رہے   سدا تقرب درگاہ بادشاہ رہے

آخری شعر توجہ طلب ہے۔ شاعر نے معتمد الدولہ کے لیے دعا کی ہے۔ بادشاہ کو اس دعا میں براہ راست شامل نہیں کیا ہے، یہ اہم بات ہے، اس سے ظاہر ہے کہ دعا گوئی نہ رسمی ہے نہ روایتی ہے بلکہ حقیقت حال کے عین مطابق ہے۔

فصیح کی علمی قابلیت اور علوم مذہب سے متعلق ان کی لیاقت میں شبہ کی کوئی وجہ نہیں لیکن ہمیں ان کے ایسے مرثیے دستیاب نہیں ہو سکے جن میں میاں دلگیر کی طرح کسی خصوصیت کے بارے میں کوئی دعویٰ کیا گیا ہو، سعادت خاں ناصر نے البتہ لکھا ہے کہ:

"مرثیے میں صف آرائی اس کا ایجاد اور حسینی مضامین میں استاذ"۔

ایک مرثیے کے کچھ بند نمونے کے طور پر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

بارک اللہ کہا شہ نے ہوکر خوشحال — اور صف آرا ہوے میداں میں شہ نیک خصال
میمنہ سونپا بن قین کو شہ نے فی الحال — میسرہ ابن مظاہر کو بہ اشفاق کمال
پھر عَلَم دست مبارک میں لیا مولا نے — جلوہ گر پرچم زرّیں کو کیا مولا نے
سب رفیقوں کی طرف شاہ نے کی جھک کے نگاہ — متوجہ ہوے پھر سوے عزیزاں ناگاہ
بس کہ تھی منصب اعلا کی ہر اک شخص کو چاہ — سب طلب گارِ عَلَم دیکھتے تھے جانب شاہ
اس طرف مسلم وزینب کے پسر تھے مشتاق — اکبر وقاسم و عبّاس اُدھر تھے مشتاق
تھے جو مسلم کے پسر سبط علی اعلا — ان کے نانا تھے علم دار، تمنا تھی بجا
بیٹے زینب کے جو تھے ان کے تھے حیدر نانا — دادا جعفر تھے علمدار شہِ ہر دوسَرا
دادا اکبر کے علمدار تھے اور قاسم کے — باپ تھے شیرِ خدا ماہِ بنی ہاشم کے
شہ نے عبّاس کو ناگاہ پکارا اُس آن — اور کہا تم ہو بہر طور عَلَم کے شایاں
آکے عبّاس ہوے شاہ کے پہلے قرباں — پھر عَلَم لے کے کہا، ہے مری عزّت کا نشاں
کبھی فرزندِ محمدؐ کے قدم چومتے تھے — کبھی آنکھوں سے لگا کر وہ عَلَم چومتے تھے

جنگ کے لیے صف آرائی کی اہمیت ظاہر ہے اور اس طرف فصیح کا توجہ کرنا اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ انھوں نے واقعات کے اجزا اور ان کے درمیان تسلسل پر بھی نظر رکھی تھی اور یہ خوبی غالباً اُن کی مثنوی نگاری کا فیض ہے، کہا جا چکا ہے کہ فصیح نے چند مثنویاں بھی لکھی تھیں اور ان سب کے موضوع بھی مذہبی ہی تھے، انھیں کا فائدہ فصیح کو مرثیوں میں حاصل ہوا تھا۔

3۔خلیق

میر محمد مستحسن خلیق بقول نواب سید محمد خاں رند 7 رجب 1240ھ کو فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے۔ وہ غازی الدین حیدر بادشاہ اوّل کا آخری زمانہ تھا۔ لکھنؤ میں نواب معتمد الدّولہ آغا میر کی سرپرستی میں دلگیر اور فصیح وغیرہ کے مرثیوں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ خلیق نے بھی اسی کو اختیار کیا، بقول سعادت خاں ناصر:

''ریختہ کو بالائے طاق رکھ کر مصروف مرثیہ گوئی ہوا، اور خوب نام پیدا کیا، خدا ہمیں بھی وہی توفیق عطا کرے، اگرچہ مرثیہ گوئی سہل اور غزل گوئی دشوار لیکن

حاصل دنیا و دین اس میں ہے''۔

میر خلیق کی زبان پر فیض آباد کی بول چال تھی اور وہ لکھنؤ کی ادبی اور کتابی زبان سے خاصی مختلف تھی۔ مرثیہ میں قواعد اور لغت کی پابندی بھی ضروری نہیں تھی، چنانچہ ان کا مصرع ہے

ع: لیلاف پڑھی اور اسے دودھ پلایا

مرثیہ گو قرآن پاک کے کلمات میں بھی بے تکلف تصرف کر سکتا تھا اور عام طور سے سننے والے کو گرفت کرنے کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس صورت حال کے نتیجے میں مرثیوں میں بے احتیاطی زیادہ سے زیادہ ہوتی گئی۔ ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے لکھا ہے:

''جاننا چاہیے کہ جب زمانہ سابق کے شعرا دے بے احتیاطیوں میں یہ حال تھا کہ قصہ بہ منزلہ یکے از ہزار واندکے از بسیار بہ اختصار اور لکھا گیا تو اس زمانے کے مرثیہ گو بھی بہت سی افراط و تفریط کو کام فرماتے تھے..... جب اس طرح کے مراثی اور سلام مشہور ہندوستان ہوئے تو اہل بنگالہ کو بھی حوصلہ مرثیہ گوئی کا پیدا ہوا، اور بہت کچھ کہا، ایک مطلع ان میں سے یہ ہے، بیت

ہمرے امام صاحب چھوا بھگائی ساں　　وہ بچو کافر سبہ کا بگائی ساں

قربان اُن خوش اعتقاد رونے والوں کے جو ایسا کلام سن کر روتے تھے۔''

میر خلیق مطالعہ اور تحقیق کے عادی نہیں تھے۔ وہ شاعری کو ساحری تو مانتے تھے کہ وہ سننے والوں کو رُلا دیتی تھی۔ لیکن اس کا تعلق کتب اور لغات وغیرہ سے جوڑنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے، وہ جیسا سنتے تھے ویسا ہی بولتے تھے، اور نظم بھی اُسی طور پر کرتے تھے۔ انھوں نے جس وقت مرثیہ گوئی شروع کی تھی، ان کی عمر ساٹھ کو پہنچ رہی تھی۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ اس عمر کے آدمی سے یہ توقع کہ وہ مذہبی کتابوں کا بغور مطالعہ کرکے ایک ایک واقعہ کی جزئیات کی تحقیق کرے گا مناسب نہیں ہے۔

میر خلیق بہت اعلیٰ نسبتیں رکھتے تھے۔ شاعری انھیں باپ دادا سے ورثہ میں ملی تھی۔ سید زادے تھے، بہ کثرت روایتیں ان تک سینہ بہ سینہ پہنچی تھیں اور حصول ثواب کے لیے وہ بہت تھیں۔ مرثیہ گوئی سے جو کچھ مطلوب و مقصود تھا وہ ان سے بخوبی حاصل ہو سکتا تھا۔ مولانا محمد حسین

آزاد نے صحیح لکھا ہے کہ:

''میر خلیق مرثیت کے کوچے سے اتفاقاً ہی قدم آگے بڑھاتے تھے، وہ مضمون آفرینی کی ہوس کم کرتے تھے، اور ہمیشہ محاورہ اور لطف زبان کو خیالات درد انگیز کے ساتھ ترکیب دے کر مطلوب حاصل کرتے تھے، اور یہ جوہر اس آئینہ کا کانی اور خاندانی وصف تھا، ان کا کلام بہ نسبت سبحان اللہ، واہ، واہ، کے نالہ و آہ کا زیادہ طلبگار تھا''۔

مرثیہ گو کی حیثیت سے میر خلیق کی شہرت کے اسباب متعدد تھے۔ ایک یہ بھی تھا کہ شاعری کے میدان میں وہ پہلے سے معروف تھے، لوگ عام طور سے ان کے کلام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، انھوں نے جب اپنا پہلا مرثیہ پڑھا ہوگا تو لوگوں نے اسے بھی استعجاب اور استحسان کی نظر سے دیکھا اور سنا ہوگا۔

حضرت حسینؑ کے رفقا اور یزیدی لشکر کے مابین جنگ کے واقعات پر ہی مرثیہ کی بنیاد ہے، میر خلیق کا امتیاز یہ تھا کہ وہ خود سپاہی تھے اور نواب کے لشکر میں رہتے تھے۔ شیخ مصحفی نے زینت کے حال میں تحریر کیا ہے:

''از میر مستحسن خلیق معلوم شدہ، مشارٌ الیہ می گوید کہ ہرگاہ من ہمراہ لشکر رفتم بہ سبب الفتے کہ (زینت) بامن داشت ایں غزل نوشتہ فرستادہ بود''۔

اس سپاہی پیشگی کا فائدہ یہ ہوا کہ اپنے زمانے کے آلاتِ حرب کے استعمال کے علاوہ جنگ کے معاملات، طور طریقوں سے وہ بذاتِ خود واقف تھے اور اپنے مرثیوں میں ان معلومات سے انھوں نے بخوبی فائدہ اٹھایا تھا۔ اس صورت حال کے فوائد ان کے اخلاف کو بھی کم وبیش حاصل رہے ہیں۔ چنانچہ جنگ کی تفصیلات رجز وغیرہ کا جوش وخروش اور زور وشور جو اس خاندان کے مرثیوں میں ہے دوسروں کے یہاں کمتر معلوم ہوتا ہے۔

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے کتب خانہ میں میر خلیق سے منسوب ایک مرثیہ تھا جس کا پہلا مصرع یہ ہے ع: جب کھائی سناں سرور ریاضِ حسنی نے

اس کی تاریخ کتابت 4 رجب 1206ھ لکھی ہے اور اس کی بنیاد پر دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ

چوبیس پچیس برس کی عمر میں مرثیہ کہنے لگے تھے۔اس موقع پر یہ حقیقت ذہن میں رہنی چاہیے کہ جعلی مخطوطات کا تیار کر لیا جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔پُرانے سادہ کاغذ پر ہر سائز کے بہ آسانی دستیاب ہیں۔ان پر کوئی چیز لکھ کر پُرانی تاریخیں درج کر کے ''بہت اہم مخطوط'' بغیر دشواری کے تیار کیا جاسکتا ہے۔منتشر اوراق پر لکھی ہوئی نظم ونثر کو بہت احتیاط سے پرکھنا ضروری ہے،مخطوطے کی عبارت معتبر ہو تو بھی تاریخ کتابت غلط ہوسکتی ہے۔اس لیے جہاں محض سال لکھا ہو مہینہ اور تاریخ نہ ہو یا مہینہ اور تاریخ درج ہو لیکن دن تحریر نہ ہو وہاں تمام امکانات پر ضرور نظر کر لینی چاہیے۔میر خلیق کی مرثیہ گوئی کے بارے میں جو معلومات موجود ہیں ان کی تغلیط یا تردید کسی کاغذ پر لکھی ہوئی تاریخ سے نہیں ہوسکتی،معتبر معاصر شہادت کی جستجو ضروری ہے اور ان کی غیر موجودگی میں کسی کاغذ پر لکھی ہوئی تاریخ پر اعتماد کر لینا معمولاً گمراہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔

میاں دلگیر اور مرزا فصیح کی طرح مرثیہ گوئی میں میر خلیق کی بھی سرپرستی نواب معتمد الدولہ آغا میر نے کی تھی،ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے ایک قابل توجہ بات یہ کہی ہے کہ:

> ''شاہنامہ اب بھی اہل کمال اس زمانے کے کہہ سکتے ہیں مگر محمود سا قدر داں کوئی نہیں''۔

کسی شخص کی صلاحیت کی شناخت کرنا اس کو صحیح راہ پر لگا کر اس سے صحیح کام لے لینا ہی قدر شناس سرپرست کا اصل کارنامہ ہوتا ہے۔جن لوگوں میں دوسروں کی صلاحیتوں کی تشخیص کی لیاقت نہیں ہوتی ان کی سرپرستی میں قابل لحاظ کارنامے انجام نہیں پاتے۔اگر صحیح معنوں میں قدر کرنے والا میسر نہ آئے تو صاحبان فن کی لیاقتیں مُردہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔معتمد الدولہ کی نکتہ رس،نکتہ شناس طبیعت نے اپنے متوسلین کی صلاحیتوں کی تشخیص کر لی تھی اور جو استعداد رکھتے تھے ان سے انھوں نے مرثیہ گوئی کا کام لے لیا۔معتمد الدولہ کا یہ کارنامہ قابل ذکر ہے کہ ان کے زیر اثر آنے کے بعد کئی غزل گویوں نے غزل کو چھوڑ کر مرثیہ کی صنف کو اختیار کر لیا تھا،ان مرثیہ گویوں نے اپنے مرثیوں میں ان کے لیے عمو ماً دعا گوئی بھی کی ہے۔جن لوگوں نے غزل کو چھوڑ کر مرثیہ کو اختیار کیا تھا انھیں میں میر محمد مستحسن خلیق بھی تھے۔

مرثیہ کی ہیئت سے بحث کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد نے اس طرح اظہار خیال

کیا ہے کہ:

"مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے میدان میں جو ہوا بدلی وہ میر خلیق کے زمانے سے بدلی پہلے اکثر مرثیے چومصرعے ہوتے تھے۔ ہر چار مصرعے کے بعد قافیہ، وہ انداز موقوف ہوا...... مرثیہ کے لیے مسدس کا طریقہ آئین ہو گیا"۔

لیکن جیسا کہ مذکور ہوا حقیقت برعکس معلوم ہوتی ہے۔ خلیق نے جس وقت اس میدان میں قدم رکھا تھا دلگیر اور فصیح مسدس کی صورت میں متعدد مرثیے لکھ چکے تھے۔ میر خلیق نے اسی روش کو اختیار کیا، دلگیر اور فصیح کے تقدم کا اعتراف خود آزاد نے بھی اس طرح کیا ہے:

"دلگیر کی زبان میں لکنت تھی، اس لیے مرثیہ خوانی نہیں کرتے تھے، مرزا فصیح حج و زیارت کو گئے اور وہیں سکونت پذیر ہوئے، میر ضمیر اور میر خلیق کے لیے میدان خالی رہا کہ جولانیاں دکھائیں"۔

مسدس کی صورت میں مرثیے بہت پہلے سے لکھے جا رہے تھے چنانچہ مسکین اور محب وغیرہ کے بھی مرثیے بہ شکل مسدس موجود ہیں۔ دلگیر اور فصیح وغیرہ نے اس ہیئت کو خاص کر دیا، دوسری صورتوں میں انھوں نے عموماً مرثیے نہیں لکھے، بعد کی نسلیں ان کی اتباع کرتی رہیں۔

میر خلیق جس وقت لکھنؤ پہنچے وہ معتمد الدولہ کا آخری زمانہ تھا، پھر بھی انھوں نے بہت مرثیے لکھے اور خوب شہرت حاصل کی۔ مرثیہ سے انھیں حصول ثواب کے سوا کچھ اور مطلب غالباً نہیں تھا، ایک مرثیے کے خاتمہ میں وہ خود لکھتے ہیں۔

اے خلیق آگے تو اب کھول نہ دفتر غم کا	رونے والوں کو خدا اجر دے اس ماتم کا

چنانچہ ان کے مرثیوں میں وہ بات نہیں آسکی جو دلگیر اور فصیح کے مرثیوں میں تھی۔ ایک مرثیے میں انھوں نے معتمد الدولہ کے لیے اس طرح دعا کی ہے۔

شور رونے کا جو خیمہ سے اٹھا یکباری	شہ [illegible] کرتے ہو کیوں سب زاری
غم نے اکبر کے جو تھی برچھی جگر پہ ماری	[illegible] آنکھوں سے اندھیاری
کہہ کے یہ سنے گئے میدان میں لاش اکبر کی	[illegible] کہہ اصغر کی
جلد تو یاں سے عناں توسن خامہ کی پھرا	[illegible] بدرگاہ خدا ہاتھ اٹھا

یعنی اے خالقِ جن و ملک وارض و سما — شاد رکھ معتمد الدولہ کو دنیا میں سدا
حشمت و اوج فزوں ہر گھڑی ہر دم ہووے — غم شبیر سوا کچھ نہ اسے غم ہووے

دعا کے لیے یہ مضمون میر خلیق کا اپنا ہے، زبان کا انداز بھی توجہ طلب ہے، اندھیاری اور پاس کے علاوہ کھول آنکھ (کھول کر آنکھ) آنکھوں تلے (آنکھوں کے تلے) غم شبیر سوا (غم شبیر کے سوا) وغیرہ کا تصرف قدما کے کلام میں تو عام تھا، لیکن خلیق کے زمانے میں بھی بولنے والے بولتے تھے۔ دوسرے بند میں خدا کو چاروں یعنی جن و ملک، ارض و سما کا خالق قرار دے کر اس سے دعا کرنا بھی قابل لحاظ ہے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ میں 63 بند کا ایک اور مرثیہ راقم نے دیکھا تھا جس کے آخر میں "تمام شد" کے نیچے لکھا ہے:

"مالک نواب وزیر صاحب"

ظاہر ہے کہ اس سے مراد معتمد الدولہ ہی ہیں، خلیق نے ان کی ایما سے یہ مرثیہ لکھا ہوگا۔ اس کے آخری بند میں "شاہ زمن" (غازی الدین حیدر) کے لیے دعا کی ہے، اس طرح۔

خاموش خلیق اب نہیں یارا ئے سخن کا — صد شکر کہ مداح ہے تو شاہ زمن کا
کہہ حق سے کہ صدقہ شہ ہفتاد و دو تن کا — پابند نہ کر مجھ کو کبھی رنج و محن کا
دنیا میں کسی چیز کا مجھ کو نہ الم ہو — پر دل میں مرے پنج تن پاک کا غم ہو

نصیر الدین حیدر بادشاہ دوم کے زمانے میں معتمد الدولہ کے نظر بند ہو جانے کے بعد بھی میر خلیق نے مرثیے لکھے تھے چنانچہ ایک مرثیے کا ترقیمہ اس طرح ہے:

"تمام شد، کتبہ محمد جعفر، بست و کیم شہر ذی الحجہ 1244ھ تمام شد"۔

یہ مرثیہ نسبتاً مختصر ہے، وجہ ظاہر ہے، وہ سرپرست موجود نہیں تھا، طبیعت بجھ گئی ہوگی۔ البتہ حصول ثواب کے لیے مرثیہ لکھ لیا اور آخری بند میں کہا۔

ماتم سے شہ کے خیمہ میں اک حشر تھا بپا — سر کوئی پیٹتا، کوئی روتا تھا غل مچا
آگے خلیق تو نہ بیاں کر یہ ماجرا — رو رو کے اب تو خالق اکبر سے دعا
میں نے یہ مرثیہ جو کہا ہے قبول ہو — اس کے صلہ میں شہ کی زیارت حصول ہو

دلگیر اور فصیح مرثیہ کو علمی وزن و وقار عطا کر چکے تھے۔ میر خلیق نے بھی معتمد الدولہ کی سر پرستی میں مرثیے پر محنت کی۔ اگر چہ بڑھاپا تھا، اپنے تجربے کی روشنی میں انھوں نے بھی اس صنف میں بعض جدتیں کیں۔ مرثیے کے آخری بند میں کہتے ہیں ؎

بین یہ بانو کرتی تھی رو رو　　شاہ وہ لاشہ لے گیے رن کو
اہل حرم میں حشر بپا ہو　　طول سخن کو خلیق اب مت دو
مرثیہ ایسا نے سُنا ہے　　بین نئی، مضمون نیا ہے

بین میں میر خلیق نے خواتین کی بول چال کو نہایت سلیقے سے برتا ہے، ایک اور مرثیے کے دو بند یہ ہیں ؎

بانو سے کہا مادر قاسم نے یہ رو رو　　سر دولھا کا تک زانو پہ دلھن کے تو رکھ دو
جب زانو پہ دلھن کے رکھا دولھا کے سر کو　　سب بیبیاں رونے لگیں منہ ڈھانپ کے پھر تو
تھے نوحہ کناں گرد تو سب ابن حسن کے　　اک غم کی سی تصویر بنی بیٹھی تھی بَن کے
چلّا کے تو رو سکتی نہ تھی شرم کی ماری　　دریا کی طرح چشم سے پر اشک تھے جاری
ماں نے جو کہا شرم نہ اب کیجیو واری　　لیں ہاتھوں سے لاشے کی بلائیں کئی باری
آہوں نے کیے سینے میں ٹکڑے یہ جگر کے　　غش ہوگئی سر پاؤں پہ نوشاہ کے دھر کے

معتمد الدولہ کے معزول ہو جانے کے بعد بعض امرا اور بیگمات وغیرہ نے مرثیہ کی سر پرستی کی لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ رفتہ رفتہ ممدوح کے لیے دعا گوئی کا چلن بھی کم سے کم ہو گیا اور پھر صنف مرثیہ کی وہ گرم بازاری بھی نہ رہی اور بقول مولانا محمد حسین آزاد:

"میر خلیق نے اپنے بڑھاپے کے سبب سے اخیر عمر میں مرثیہ پڑھنا چھوڑ دیا تھا"۔

انھوں نے کوئی اٹھتر برس کی عمر پا کر بہ عہد امجد علی شاہ وفات پائی، تاریخ ہوئی:

<u>میر خلیق مر گئے</u>

1260ھ

4-ضمیر

میر مظفر حسین ضمیر تخلص، میاں دلگیر اور مرزا فصیح کے ہم سن تھے۔ جس زمانے میں انھوں نے شعر گوئی شروع کی تھی مرزا حاجی قمر کا دور دورہ تھا۔ ان کے یہاں شاعروں کی نشستیں رہتی تھیں۔ میر ضمیر ان کے مقربین میں تھے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں جب معتمد الدولہ کو دوسری مرتبہ عروج حاصل ہوا مرزا حاجی کا لکھنؤ سے اخراج عمل میں آیا اور اس کے مخلصین بھی معتوب ہوئے چنانچہ میر ضمیر بھی گوشۂ گمنامی میں جا پڑے۔

مرزا سلامت علی دبیر کی ابتدا تھی انھوں نے میاں دلگیر کے علاوہ میر ضمیر سے بھی کسب فیض کیا تھا۔ لطافت خلف امانت نے ان کے بارے میں کہا ہے۔

ہر طرح اللہ نے ان کو کیا تھا اہل دل　　　تھے رجوع قلب سے شاگرد دلگیر و ضمیر

لوگوں کو موقع مل گیا اور بقول محمد حسین آزاد:

> "یار لوگوں نے شاگرد کو نقطۂ مقابل کر کے بجائے خود استاد بنا دیا اور وہی صورت ہوگئی کہ ایک مجلس میں دونوں کا اجتماع موقوف ہو گیا"۔

مرزا دبیر کو بادشاہ کے دربار میں پہنچا دیا گیا۔ اس غیر معمولی اعزاز کا ذکر خود دبیر نے ایک مرثیہ میں اس طرح کیا ہے۔

واجب ہے حمد و شکر جناب الہٰ میں　　　فضل خدا سے آیا ہوں کس بارگاہ میں
مجھ سا گدا اور انجمن بادشاہ میں　　　چرچا یہ لوگ کرتے ہیں اس وقت راہ میں
ذرے پہ چشم مہر ہے، مہر منیر کو　　　حضرت نے آج یاد کیا ہے دبیر کو

غازی الدین حیدر کے دربار میں طلب کیا جانا معتمد الدولہ کے اشارے سے ہی ہوا ہوگا۔ اس زمانے میں دبیر کے ہاتھوں میر ضمیر کو جو خفت اٹھانی پڑتی تھی اس کا اندازہ سعادت خاں ناصر کے نقل کردہ اس ایک واقعہ سے کیا جانا چاہیے:

> "ایک بزرگ کی زبانی اسے بیان کرتا ہوں، میاں دبیر اوائل میں ایک مرثیہ اصلاح کے واسطے میر ضمیر کی خدمت میں لائے، کہیں کہیں اصلاح دی اور بہت پسند کیا، بلکہ فرمایا کہ یہ مرثیہ ہمیں دو کہ راجا میوارام کے یہاں ہم پڑھیں، اس

نے کہا: بہتر میں بھیج دوں گا، دبیر نے اس مرثیے کی دو نقلیں کیں، ایک بھیج دی اور ایک اپنے پاس رکھی، .....اس ناحق شناس نے سامعین کو ہمہ تن اشک دیکھ کر وہی مرثیہ پڑھا، رقت اور تعریف ایسی ہوئی کہ میر ضمیر کے پڑھنے کی گنجائش ہی نہ رہی"۔

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو میر ضمیر کے سادہ لوح شخص ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

معتمد الدولہ کے زوال کے بعد میر ضمیر کے حالات بدلے اور انھوں نے بہت دھوم دھام کے مرثیے لکھے، اس میدان میں ان کی ایجادات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد نے تحریر کیا ہے:

"اس وقت تک مرثیہ تیس سے پینتالیس، حد پچاس بند تک ہوتا تھا، میر ضمیر نے ایک مرثیہ لکھا ع

کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے

اس میں شاہزادہ علی اکبر کی شہادت کا بیان ہے، پہلے ایک تمہید سے مرثیہ کا چہرہ باندھا، پھر سراپا لکھا، پھر میدان جنگ کا نقشہ دکھایا اور بیان شہادت پر خاتمہ کر دیا، چونکہ پہلا ایجاد تھا، تعریف کی آوازیں دور دور تک پہنچیں، تمام شہر میں شہرا ہو گیا اور اطراف سے طلب میں فرمائشیں آئیں، یہ ایجاد مرثیہ گوئی کے عالم میں ایک انقلاب تھا کہ پہلی روش متروک ہو گئی، باوجودیکہ انھوں نے مقطع میں کہہ دیا تھا۔

دَس میں کہوں، سَو میں کہوں، یہ درد ہے میرا   اس طرز میں جو کہوے، سو شاگرد ہے میرا

پھر بھی سب اس کی پیروی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ پہلے امانت نے، پھر اور شاعروں نے واسوخت میں سراپا کو داخل کیا۔

آزاد کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ میر ضمیر کے اس مرثیے سے بہت پہلے دلگیر اور فصیح مرثیے کی عمارت کو بہت بلندی تک پہنچا چکے تھے۔ قصیدے کے خطوط پر مرثیے کے اجزائے ترکیبی بھی متعین ہو چلے تھے چنانچہ بعض یہ تھے: تمہید، صف آرائی، جنگ، شہادت اور خاتمہ۔ میر خلیق نے بین کے نظم کرنے میں امتیاز حاصل کیا، چہرہ، سراپا وغیرہ کی اصطلاحات کسی

قدر بعد کے زمانے میں رائج ہوئیں۔ میاں دلگیر اور فصیح نے خاصے طویل مرثیے بھی لکھے تھے۔ ان کے بعض مرثیوں میں ساٹھ بلکہ زائد بند بھی ہیں:

میر ضمیر کے جس مرثیے کا آزاد نے ذکر کیا ہے وہ نصیر الدین حیدر کے عہد کا ہے۔ بادشاہ کی انھیں سرپرستی حاصل تھی۔ اس لیے وہ تعلّی کے مضامین نظم کر سکتے تھے، ایک بند یہ ہے۔

جس سال لکھے وصف یہ ہم شکل نبیؐ کے　　سنہ بارہ سو اُنچاس تھے ہجری نبوی کے
آگے تو یہ انداز سُنے تھے نہ کسی کے　　اب جب یہ مقلّد ہوئے اس طرز نوی کے
دس میں کہوں، سو میں کہوں، یہ درد ہے میرا　　جو جو کہے اس طرز میں، شاگرد ہے میرا

یہ مرثیہ انھوں نے 1249ھ (34-1833) میں لکھا تھا۔ اس بند کے آخری مصرعے میں بظاہر مرزا دبیر پر چوٹ کی ہے جو اُن کے شاگرد تھے اور اب ان کی استادانہ حیثیت مسلّم ہو چکی تھی، غالباً اس زمانے میں حالات مرزا دبیر کے لیے بہت ساز گار نہیں رہ گئے تھے۔

اس مرثیے کے انداز کو میر ضمیر کا ''طرز نوی'' کہنا بھی بظاہر تعلّی ہے۔ ہاں زبان کی پختگی، بیان کی خوبی اور مطالب میں ربط و تسلسل اور ندرت وغیرہ ضرور داد طلب ہیں۔

یہ مرثیہ جس زمانے میں لکھا گیا میر ضمیر کے سرپرست منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کا اخراج عمل میں آ چکا تھا اور نواب روشن الدولہ محمد حسین خاں وزارت سے مخلع ہو چکے تھے اور ابھی میر ضمیر کو ان کی خدمت میں غالباً رسائی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ اس مرثیے کے آخری بند میں انھوں نے اپنے خدا سے رجوع کر کے اسی کے سامنے اپنی غرض پیش کی ہے۔

ہاں کلک بس اب آگے نہیں طاقت تحریر　　ہو اور زیادہ تری تحریر میں تاثیر
کہتا ہے ضمیر اب کہ برائے شہ دلگیر　　محبوب علی جانِ نبی حضرت شبیر
اس مرثیہ کا بس یہ خدا مجھ کو صلا دے　　اکبر کا تصدّق، مری اولاد جلا دے

معلوم ہوتا ہے کہ ضمیر کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی۔ ضمیر کا بڑھاپا آ چلا تھا اس لیے یہ غم زیادہ تھا۔ دل کی گہرائیوں سے انھوں نے خدا سے دعا کی، بات دل سے نکلی تھی اس لیے اس میں سوز و گداز بھی تھا اور درد و اثر بھی غالباً یہی وجہ ہوئی کہ ان کے اس مرثیہ کو بہت شہرت ملی۔

دنیاوی معاملات پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ ضمیر کی عمر کا بیشتر حصہ مایوسیوں اور پریشانیوں

میں گزرا تھا۔ امجد علی شاہ کے آخری زمانے میں جب 1262ھ (1846) میں علی نقی خاں کو وزارت کا خلعت ملا تو میر ضمیر نے ایک مرثیہ کہا۔

خاموش ہو گو خاتمۂ مرثیہ ہے دور بیماری نے رکھا ہے ضمیر اب مجھے مجبور
ہاں دست دعا جلد اُٹھا با دل رنجور اے صاحب اسرار خدا سید پُر نور
نوآب ہے محسن مرا آباد رہے یہ ہمنام علی اور نقی شاد رہے یہ

بڑھاپے اور بیماریوں نے ان کی فکر میں۔ مایوسی اور لب ولہجہ میں درد کی جو صورت پیدا کر دی تھی اس نے ان کے مرثیوں کو زیادہ پُر اثر اور رقت انگیز بنا دیا تھا۔ اس زمانے میں انھیں شاہی دربار میں رسائی حاصل ہوگئی تھی۔ ایک مرثیہ کے آخری بند میں بادشاہ سے تعزیہ داری کے لیے مکان کی طلب کی ہے کہتے ہیں۔

اے اہل عزا کیا کہوں مضمون شہادت سُننے کی ہے طاقت نہ بیاں کرنے کی طاقت
کہتا ہے ضمیر اب یہ بصد زاری ومنّت ہے قبضۂ شبیر میں کونین کی دولت
مجھ پر یہ عنایات شہنشاہِ زماں ہو تعمیر جو اک تعزیہ داری کا مکاں ہو

آخر عمر میں میر ضمیر نے اپنے داماد مرزا عشق کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس باب میں بھی انھیں غالباً کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ سعادت خاں ناصر کا بیان ہے:

> ''سید حسین مرزا تخلص عشق خلف محمد مرزا انس، شاگرد اپنے والد ماجد کے، اور شادی ان کی دختر بلند اختر میر مظفر حسین ضمیر سے ہوئی ہے، دونوں طرف سے شاعر .... منبر پر جا کر مرثیہ حال جناب علی اکبر علیہ السّلام کا از اول تا آخر رزم وبزم وبین خوب پڑھا اور آخر مرثیہ مذکور میں تخلص اپنا عشق باندھا تھا، پڑھا ......ایک صاحب کہ شاگردان میر انیس صاحب سے ہیں از راہِ نفسانیت بولے.... چند مرثیے تو میر ضمیر نے ان کے جہیز میں بھی ساتھ کیے ہیں، کیا عجب کہ یہ مرثیہ جہیز و ہوا اور انھوں نے اپنا تخلص عشق ملا کے یہ مرثیہ جہیز و پڑھا ہو''۔

اس میں شک نہیں کہ ضمیر پُر گو شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی مثنوی مظہر العجائب میں کہا کہ۔

کروں ابیات کا گر آج شمار ہوں گے البتہ سی وچار ہزار

یہ فقط مرثیوں کے ابیات ہیں　　ورنہ کرتا جو جمع کلیات
آج سب ہو اگر کہیں موجود　　بیت ہوں صد ہزار سے افزود

اس تعداد میں کچھ مبالغہ بھی ہوسکتا ہے۔ اپنی مرثیہ گوئی کے بارے میں اسی مثنوی میں انھوں نے جو کہا ہے وہ یہ ہے۔

ہے ولے صد، ہزار شکر خدا　　کہ مری طرز ہے سبھوں سے جدا
طرز یہ مرثیہ کی ٹھہرائی　　کہ سراپا ہو اور صف آرائی
پایا میرے کلام نے یہ رواج　　کہ نہیں ہے بیان کا محتاج

یہ آخری بات بھی غور طلب ہے، واقعات سے اس کی مشکل ہی سے تائید ہوتی ہے۔

واسوخت

مولانا محمد حسین آزاد نے میر ضمیر کے ایک مرثیے کا تعارف کراتے ہوئے ضمناً ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ واسوخت میں سراپا نگاری کا عنصر مرثیے سے آیا ہے۔ بات اتنی ہی نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنے مطالب و مزاج کے اعتبار سے واسوخت اپنی دوسری تمام اصناف کے مقابلے میں مرثیے سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے، اس میں عاشق اپنے محبوب کی بعض صفات کا بیان کرنے کے ساتھ اپنے تعلّق خاطر کو دکھاتا ہے اور پھر اسی بنیاد پر اس سے دوری یا وقتی اور عارضی جدائی پر رنج و غم کے تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مرثیہ اور واسوخت دونوں میں محبوب انسانی ذاتیں ہوتی ہیں جن سے ظہور میں آنے والے اعمال وافعال ایک خاص انداز کے ہوتے ہیں۔

واسوخت میں بھی مطالب کے درمیان ربط و تسلسل کو ضروری خیال کیا جاتا ہے اور ان کے مابین کم و بیش وہی ترتیب قائم کی جاتی ہے جو مرثیے میں ہوتی ہے، غالباً ان مختلف النوع مماثلتوں کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ واسوخت کے لیے بھی عموماً مسدّس کی صورت ہی کو اختیار کیا گیا ہے۔

شاہزادہ جہاندار شاہ کی آمد کے بعد سے لکھنؤ میں ایک سے زائد دربار آراستہ ہونے لگے تھے۔ وقت کے ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ نواب سعادت علی خاں اتنے با اختیار تھے کہ

انھوں نے انشا کو کسی دوسرے رئیس کے یہاں جانے سے روک دیا تھا۔ ان کے بعد والی ملک کے اختیار و اقتدار میں اور کمی آ گئی تھی۔ شاعر بھی حسب موقع کبھی ایک رئیس سے اور کبھی دوسرے سے وابستہ ہو جاتے تھے اور بقول آتش ؎

روز و شب وہ جو رہا کرتی تھی صحبت نہ رہی ہم نشینی کی جو خدمت تھی وہ خدمت نہ رہی

اور اس طرح بتدریج لکھنؤ کی فضا صنف واسوخت کے لیے زیادہ سے زیادہ سازگار ہوتی چلی گئی، بے شک قدما نے بھی واسوخت لکھے تھے۔ لیکن لکھنؤ کی شاہی کے آخری زمانے میں اس صنف کو جو فروغ حاصل ہوا تھا پہلے کبھی نہیں ہوا۔

پوپلے منہ سے چنے نہیں چبائے جاتے ہیں۔ واسوخت میں معمولاً جو مضامین نظم کیے جاتے ہیں وہ جوانی میں یا زیادہ سے زیادہ ادھیڑ عمر میں بھلے لگتے ہیں۔ بڑھاپے میں زیب نہیں دیتے۔ اس لیے واسوخت کی تصنیف کا زمانہ عموماً شباب بلکہ شیب کا ہوتا ہے اور اس کا مطالعہ اسی نظر سے کیا جانا چاہیے۔

1- آتش

خواجہ حیدر علی آتش نے چھبیس بند کا ایک واسوخت لکھا تھا جو مسدس ترکیب بند کی صورت میں ہے۔ شروع میں محبوب سے اپنے مخلصانہ روابط کا بہت مدلل انداز سے بیان کیا ہے کہتے ہیں ؎

آگے اک یار نہ تھا یار، ترے یار تھے ہم ہمدم و ہم سخن و مونس و غمخوار تھے ہم
لطف و اشفاق و عنایت کے سزاوار تھے ہم مدعی اب جو ہیں مجبور تھے، مختار تھے ہم
چیں جبیں پر نہ تھی رنجش کی نہ یہ باتیں تھیں مہربانی تھی شب و روز ملاقاتیں تھیں

محبتوں اور پرخلوص ملاقاتوں کا بیان کئی بند میں کیا ہے۔ ان میں جگہ جگہ ایسے نشان موجود ہیں جن سے اس واسوخت کے لکھنؤ میں لکھے جانے کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً سیر و تفریح کے ذکر میں ہے ؎

عیش باغ آپ کبھی سیر کو جو جاتے ہیں خار ہوتا تھا جو بندے کو نہ واں پاتے تھے
غنچہ ساں میری جدائی سے بہ تنگ آتے تھے بھیج کر پیک صبا ڈھونڈ کے بلواتے تھے
ہر روش پر مجھے تم ساتھ لیے پھرتے تھے ہاتھ میں اپنے مرا ہاتھ لیے پھرتے تھے

پھر حالات بدلے، زمانے کی روش اور محبوب کے معاملات میں بھی تغیر آ گیا، اب صورت

حال یہ ہو گئی کہ ۔

اٹھ گیا مہر و محبت کا زمانے سے رواج
بیٹھے بیٹھے اس الجھ پڑنے کا کیا کیجیے علاج
یوں تو معشوقوں کا ہوتا ہے تلون کا مزاج
پر نہ اتنا بھی کہ کل تھی سو طبیعت نہیں آج
یا ہمیں ساتھ رہا کرتے تھے اندر باہر
یا ہمیں ہیں کہ ہمیں حکم ہے 'باہر باہر'

محبوب کی اس بدلی ہوئی روش پر عاشق کا رد عمل یہ ہے کہ اس نے بھی بظاہر اپنا منہ پھیر لیا اور اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے صاف صاف کہہ دیا:

یہ غلط فہمی ہے ہم سا کوئی محبوب نہیں
کیا کوئی اور زمانے میں خوش اسلوب نہیں
راست بازوں سے یہ ابرو کی کجی خوب نہیں
نہ سہی، دوستی صاحب کو جو مطلوب نہیں
تم کو غیروں کی مدارات مبارک ہووے
ہم کو ہے جس سے ملاقات مبارک ہووے

لیکن عاشق کا اس طرح منہ پھیر لینا محض اس لیے تھا کہ محبوب پھر راہ پر آجائے۔ اس عمل سے مطلوب فی الواقع بگاڑ کر لینا نہیں تھا۔ واسوخت کے آخر کے بند اسی حقیقت کے بیان پر مشتمل ہیں۔ مقطع میں بہت صراحت سے کہا ہے ۔

غیر معشوق کا نکلا ہے زباں سے جو نام
چھیڑنے کے لیے صاحب کے فقط تھا یہ کلام
حرف حق کہہ کے یہ واسوخت کو کرتا ہے تمام
مت بُرا مانیو اس بات کا، آتش ہے غلام
دوستی غیر سے واللہ جو منظور بھی ہو
آنکھ اٹھا کر نہ کبھی دیکھیں اگر حور بھی ہو

اختصار کے باوجود اپنے مطالب وغیرہ کے اعتبار سے آتش کا یہ واسوخت کامیاب ہے البتہ زبان و بیان میں بعض قباحتیں ہیں اور وہ اس لیے ہیں کہ اس کا زمانۂ تصنیف خاصا قدیم ہے۔

2- رند

خواجہ حیدر علی آتش کے شاگردوں میں سے بھی بعض نے واسوخت لکھے تھے۔ نواب سید محمد خاں رند تخلص نے جو واسوخت لکھا تھا اس میں چوالیس بند ہیں۔ پہلا بند یہ ہے ۔

پیش ازیں یار ترا عاشق شیدا تھا میں
ہمہ تن آئینہ ساں محوِ تماشا تھا میں
بستۂ سلسلۂ زلف چلیپا تھا میں
کو بہ کو شہر میں تیرے لیے رسوا تھا میں
اک زمانہ ترا عاشق مجھے بتلاتا تھا
انگلیاں اٹھتی تھیں جس راہ سے میں جاتا تھا

شب ہجر کی کیفیت کا بیان ذیل کے بند میں کیا ہے۔

جو ہوا اور قلق اس دل مضطر کے سوا ایڑیاں رگڑیں زمیں پر کبھی سر دے پٹکا
دیکھا جب یوں بھی تسلی نہیں ہوتی اصلا دونوں ہاتھوں سے جگر تھام لیا اٹھ بیٹھا
کیا کہوں رات غضب لاتی ہے کیا کیا جانی کبھی لیٹا، کبھی بیٹھا، کبھی ٹہلا جانی

محبوب بے وفا کو وصال کے دنوں کے مزوں کی یاد دلائی ہے اور کہتے ہیں۔

رات دن یوں ہی رہا کرتی تھی باہم صحبت عشق تھا تم سے مجھے، مجھ سے تمھیں تھی الفت
نام اغیار سے صاحب کو ہوئی تھی نفرت گھر تلک اپنے نہ جاتے تھے مرے بے رخصت
کبھی جاتے تھے تو دم بھر کے لیے جاتے تھے جی نہ واں لگتا تھا گھبرا کے چلے آتے تھے

رند کے وقت تک حالات میں اور تبدیلی آ گئی تھی۔ آتش نے محبوب سے جو منہ پھیرا تھا تو اس سے مقصود اسے راہ پر لانا تھا لیکن رند نے اگر رخ بدلا تھا تو بدل ہی لیا تھا۔ وہ نواب تھے اور بات کے دھنی تھے۔ واسوخت کے خاتمے میں صاف کہتے ہیں۔

دوستی بندے کو صاحب سے نہیں اب منظور رکھیے تکلیف ملاقات سے مجھ کو معذور
گرچہ بد وضع ہے یہ رند جہاں میں مشہور پر زمانے پہ ہے ظاہر جو ہے میرا دستور
عمر بھر پھر نہ زباں سے کبھی اقرار کیا جب کسی بات کا ناچیز نے انکار کیا

آتش کے بعض دوسرے شاگردوں کے یہاں بھی یہی معاملہ ہے لیکن یہ روش عام نہیں ہو سکی تھی۔ دوسری صورت بھی مل جاتی ہے۔

3-عرش

میر حسن عسکری نام تھا۔ لیکن میر کلو کر کے مشہور تھے۔ محمد تقی میر کے بیٹے اور بقول محسن شیخ ناسخ کے شاگرد تھے لیکن خود ان کو اُن کے تلمذ سے انکار تھا۔ ان کے دیوان میں ایک مختصر واسوخت ہے جس میں صرف بیس بند ہیں۔ اس میں جو قصہ نظم ہوا ہے وہ آتش اور رند کے واسوخت سے مختلف ہے۔ پہلا بند یہ ہے۔

یار صورت بھی نہیں اب مجھے دکھلاتا ہے دل مرا آتش ہجراں سے جلا جاتا ہے
طایر جاں قفس تن میں جو گھبراتا ہے میر گلزار عدم ہی کا خیال آتا ہے

اور دم بھر نہ وہ صیاد اگر آئے گا   بلبل روح قفس میں نہ نظر آئے گا

عاشق نے فراق محبوب میں اپنے حال زار کا مدلل اور مفصل بیان کیا ہے ایک بند یہ ہے۔

وحشت دل نے یہ حالت مری پہنچائی ہے   کہ ہر اک شخص سمجھتا مجھے سودائی ہے
پاؤں میں آبلے ہیں بادیہ پیمائی ہے   دل وحشی ہے و یا آہو صحرائی ہے
اب جو اے غیرت لیلا نہ تجھے پاؤں گا   بید مجنوں کے تلے جی سے گذر جاؤں گا

محبوب کی محبتوں کی یاد آتی ہے۔ پھر اس کے علاحدگی اختیار کرنے کا خیال آتا ہے اور دل تڑپ تڑپ جاتا ہے۔ ایسے میں ذہن میں طرح طرح کے خیال پیدا ہوتے ہیں۔ شاعر نے بڑے سلیقے سے ان کو نظم کیا ہے، ایک بند یہ ہے۔

تیرے کوچے کا خیال آئے گا جس دم دل کو   باغ فردوس کا دکھلائے گا عالم دل کو
حرکتوں کا تری ہووے گا اگر غم دل کو   صحبت حور کریگی وہیں خرم دل کو
دل سے اے سرو قد آزاد کریں گے تجھ کو   بھول کر بھی نہ کبھی یاد کریں گے تجھ کو

لیکن یہ سب محض خیالی باتیں تھیں۔ صحیح صورت حال وہ ہے جس کے بیان پر شاعر نے واسوخت کو ختم کیا ہے۔

قصہ کوتاہ اگر اب بھی ہے منظور وصال   نہ کوئی رنج ہے صاحب کو نہ بندے کو ملال
خواب میں اب نہ کسی حور کا آئے گا خیال   رشک جنت ہے مکاں حور بھی ہے اک تمثال
تیرے آئینۂ رخسار کا حیراں ہے عرش   تو سلیماں ہے ترا تابع فرماں ہے عرش

نثر

(۱)

رُقعہ

لکھنؤ میں نثر نویسی کی مجلسیں بھی نواب سعادت علی خاں کے آخر زمانے میں منعقد ہونے لگی تھیں۔ شیخ مصحفی نے ان کو "مجلسِ مناثرہ" کہا ہے۔ شیخ مغل فانی ان مجلسوں کا بانی تھا۔ اس کے حال میں مصحفی نے لکھا ہے:

> "شیخ مغل فانی بانیِ مجلس مناثرہ دریں شہر او شدہ، اوّل جماعتے ز ہنودان وغیرہ بہ تقریب نثر نویسی چہ در زبانِ اردوے ریختہ و چہ در زبانِ فارسی در مجلس حاضر می شدند، چوں حسب اتفاق روزے گذر فقیر دراں مقام افتاد، برائے شریک شدنِ منشیانِ انشا پردازان روز ہا نثر یکہ در وصفِ دکانِ تنبولی بہ تتبع ظہوری بر مشتری گفتہ بودم، بہ معرضِ بیان آوردم ... القصہ رفتہ رفتہ مجلس مناثرہ اش بمشاعرہ تبدیل یافت و ورقِ مرقّع تصویرِ نثر نویساں را بر طاق گذاشتہ ...... ہر گاہ دریں نزدیکی .... رقعہ شوریدہ مضمون زبان اردو خواندہ شد ...... عجز و نیاز شیخ

مغل باہر کدام ضرب المثل روزگار است تخمیناً عمرش از سی در گذشتہ باشد"۔

سعادت خاں ناصر نے مغل فانی کے ایک رقعے کا اقتباس اس طرح نقل کیا ہے:

"موجدِ رقعہ خوانی، شیخ مغل، تخلص فانی، میاں مصحفی نے در پردہ اسے اپنا شاگرد لکھا ہے"۔

ایک رقعہ لکھتے ہیں:

"کیوں سکھ بچن میں نے تجھ سے کہا تھا کہ تو کڑھی پکانا، تو اب تک باتیں بھگارتی ہے، ایسا نہ ہو پھلوری سے تیری ناک کاٹ ڈالوں"۔

یہ اقتباس ضلع جگت کی بہت اچھی مثال ہے۔

شیخ مصحفی نے خود اپنی جس نثری تحریر کا ذکر کیا ہے وہ ہمیں فی الوقت دستیاب نہیں ہو سکی۔ مصحفی نے یہاں ضمناً ایک قابلِ توجہ واقعہ کا بیان کیا ہے کہ شیخ مغل فانی کی مجلسِ مناثرہ میں شروع شروع میں ہندو شریک ہوتے تھے۔ تلاش کے باوجود اُن میں سے ایک کا بھی حال معلوم نہیں ہو سکا۔

(2)

تنقید

انشا اور مصحفی کے معرکوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ کے مشاعروں میں سننے والے کلام کے حُسن و قبح پر بہ خوبی غور کرنے لگے تھے اور کوئی خامی یا عیب معلوم ہوتا تو سرِ محفل اس کو ظاہر بھی کر دیتے تھے۔ اس صورتِ حال نے شاعروں کو محتاط کر دیا تھا اور وہ زبان و بیان کے مختلف پہلوؤں پر اچھی طرح نظر کر لینے کے بعد ہی مشاعروں میں کلام کو پیش کرنے کی جرأت کرتے تھے۔

مشاعروں کے سوال و جواب نے رفتہ رفتہ علمی اور فنی بحثوں کی صورت اختیار کر لی اور کبھی کبھی یہ بحثیں تحریر میں بھی آ جاتی تھیں۔ سعادت خاں ناصر نے لالا موجی رام موجی تخلص کے تین شعر لکھے ہیں ؎

گیا نہانے جو وہ بے نقاب در تہِ آب ۔۔۔ تو رنگِ رخ سے کھلا اک گلاب در تہِ آب
میں رو دیا یاس کی حالت میں تشنگی سے جب ۔۔۔ تو آ گئی وہیں موجِ سراب در تہِ آب
بہے ہیں دیدۂ گریاں سے اس طرح آنسو ۔۔۔ رواں ہو چشمے سے جس طرح آب در تہِ آب

پھر ان سے متعلق مشاعرے کی روداد اس طرح سنائی ہے:

''یہ طرح مرزا جعفر صاحب کے مشاعرے کی تھی، مرزا حاجی قمر اور میر مظفر حسین ضمیر کو یہ منظور ہوا کہ موجی رام کو مرزا قتیل کی زبان سے ذلت دلوایئے، مرزا (قتیل) صاحب نے سر مشاعرہ یہ اعتراض اس پر کیے کہ:

گُل کو گلاب کہنا غیر مستعمل اور

چشمہ بیرون آب ہے اور

سراب محض ریگستان ہے، ریگ سے اور موج سے کیا نسبت؟

جب مرزا صاحب نے سرِ مشاعرہ اس پر یہ اعتراض کیے شیخ امام بخش ناسخ کو دلیری مرزا صاحب کی نہایت ناگوار گذری۔ موجی رام میاں مصحفی کے پاس التجا لے گیا۔ میاں صاحب نے کہا شاگرد کے واسطے آشنا سے بگڑنا نہ چاہیے۔ ایسے بہت بن سکتے ہیں۔

جب ناسخ نے سُنا کہ مصحفی حمایت موجی کی نہیں کرتے، اُسے اپنے پاس بلا بھیجا اور یہ سوال و جواب ایک بند کاغذ میں لکھ کر اُسے دیے، دوسری صحبت میں سر مشاعرہ اس نے پڑھے۔

افصح الافصحاء مرزا قتیل صاحب آپ نے جو مجھ ہیچ مداں کی غزل پر یہ اعتراض کیے ہیں کہ گُلاب بہ معنی گل گلاب غیر مستعمل اور اردو میں نہیں آیا ہے۔ ایسا کلام لایعنی آپ سا شاعر فخرِ زمانہ کہے بسا عجب ہے۔ نہیں جانتے ہو کہ محاورۂ اہل ہند میں گلابی جاڑا اسے کہتے ہیں کہ موسم گلاب میں ہو اور گلابی رنگ کہ منسوب بہ گلاب ہو۔ قطع نظر میر محمد تقی کہ زبان ریختہ میں سہیم و عدیل نہیں رکھتے تھے فرماتے ہیں۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

مرزا مظہر جان جاناں مظہر فرماتے ہیں۔

عالم ہے یہ پسینے کا اس مست خواب پر　　پڑتی ہے اوس جیسے سحر کو گلاب پر

میاں مصحفی۔

سرخ ہے مے سے وہ چشم نیم خواب نرگسی　　یا یہ باغ حسن میں پھولا گلاب نرگسی

دیگر۔

دِلّی بھی طرفہ جا ہے کہ ہر اک گلی کے بیچ　　بکتے ہیں کوڑی کوڑی کٹورے گلاب کے

اور آپ نے جو فرمایا کہ چشمہ بیرون آب ہے فی الحقیقت سعدی نے گلستاں میں غلطی فرمائی ۔

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل چو پُر شد نہ شاید گذشتن بہ پیل

اور آپ نے جو کہا کہ سراب محض ریگستان ہے اور موج سے کیا نسبت؟ ناصر علی کہتا ہے۔

نمی دانم کدا می شہسوار آمد دریں وادی کہ از صد جا گریباں چاک شد موج سرابش را

جواب آپ کے ہر اعتراض کا یہ ہے اور

غزل ثانی تصنیف ضمیر کو جو آپ بے عیب کہتے ہیں ایک شعر میں دو اعتراض ہے ۔

وطن میں بھی نہیں سرگشتگوں کو چین ذرا کہ کم نہ ماہی کا ہوا اضطراب در تہ آب

صاحب میرے! اضطراب ماہی تہ آب۔ کوئی شاعر نہیں بولا۔ کس واسطے کہ مچھلی کو سوائے پانی کے آرام نہیں اور اگر اضطراب بہ معنی رفتار ہے۔ اضطراب اور رفتار میں بڑا فرق ہے۔ سرگشتہ مفرد جمع اس کی جس وقت کیجیے گا بجائے ہائے ہوز کے کاف فارسی اور الف نون جمع کا آئے گا اور سرگشتگاں ہوگا۔ سرگشتگوں کی ایجاد کہاں سے ہے؟ زبانِ اردو کے جاننے والے فی زمانہ میاں مصحفی اور انشاء اللہ خاں ہیں۔ آپ عبث دخل در معقولات دیتے ہیں۔ فارسی آپ کی البتہ مشہور اس کو اصفہانی جانیں۔ زیادہ والسلام والاکرام"۔

غازی الدین حیدر کے عہد تک کلام کی تنقید و تحسین کا انداز یہی تھا۔ کئی برس بعد تک بھی تنقیدی بحثوں کا یہی طور رہا تھا۔ اس قسم کی بحثوں کے لیے اساتذۂ فارسی و اردو کے کلام پر بہت اچھی نظر ہونی ضروری تھی۔ ساتھ ہی ہر لفظ کے مفہوم اس کی اصل اور محلِ استعمال سے بھی واقفیت لازم تھی۔

(3)

مذہبی نثر

شاہی کے ابتدائی زمانے میں لکھنؤ میں اردو نثر میں جو کتابیں لکھی گئی تھیں زیادہ تر وہ مذہبی مسائل و معاملات سے متعلق ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ جو کتابیں ہمیں دستیاب ہوئی ہیں وہ اثنا عشری عقیدے سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفین نہ صرف اپنے علاقے میں اپنے معتقدات کی ترویج و اشاعت کے خواہاں تھے بلکہ ان کی نگاہیں پورے ملک خصوصاً دارالخلافہ دہلی پر بھی تھیں۔

ان کتابوں کے مصنفین نے محنت کی ہے اور زبان کو مرصع اور بیان کو عالمانہ بنانے کی شعوری کوشش کی ہے۔ مطالب کو دلچسپ اور دلنشیں بنانے کے لیے نثر کے ساتھ نظم کی آمیزش بھی کی ہے۔ یہ کتابیں خاصی متداول رہی ہیں۔ چنانچہ ان کے قلمی نسخے رام پور، اور حیدرآباد کے کتب خانوں میں بھی محفوظ ہیں، یہاں نمونے کے طور پر صرف چند کا حال لکھا جاتا ہے۔

1- غافل مرزا مغل محمد آبادی

ان کی ایک نثری کتاب ''نخلِ ماتم'' کے نام سے رامپور کے کتب خانے میں ہے اور جیسا کہ

نام سے ظاہر ہے یہ کتاب مصائب سید الشہدا کے بیان میں ہے۔ مصنف نے دیباچے میں خاصی مفید معلومات فراہم کی ہیں:

''سابق اس سے اس بندۂ عاصی سراپا معاصی محمد ہادی بن محمد حسن نے بہ عون ونصر الٰہ دو جلد نثر بہ اشک وآہ مصایب فرزند رسول اللہؐ میں تحریر کی ہیں کہ ایک کا نام وسیلۃ النجاۃ اور دوسری مسمّی بہ زاد الآخرت ہے، از بسکہ احادیث وروایات دونوں کتابوں میں کتب معتبرہ معتمدہ سے مانند بحار الانوار اور جلاء العیون کے یا بعضے نسخ معتبرہ وتوارخ سے بھی کچھ کچھ حکایات مصایب سات تحریر ہوی ہیں، اور نظم بھی جس قدر کہ مناسب جان کر ملحق بہ نثر کی ہے وہ بھی نرا نیا مضمون ہیں بلکہ اکثر مضامینِ احادیث اس میں مندرج ہیں۔ اسی جہت سے بہ فضلِ الٰہی دونوں کتابیں مروج اور مقبول ہو چکی ہیں، لیکن جب اکثر اشخاص کے پاس یہ کلام مصیبت اساس جمع ہوا تو اس احقر کے پڑھنے کے واسطے کوئی چیز نہ رہی کہ اسے محافلِ عزائے شہدائے کربلا میں پڑھے، پس خاطرِ قاصرِ خاکسار میں گذرا کہ تیسری کتاب نثر ونظم کی مصایب سید الشہدا علیہ السّلام میں تحریر کرے کہ وہ خاص اپنے واسطے رہے، اور طرز بھی اس کی ان دونوں کتابوں سے جُدی ہو یعنی بیشتر اس میں عباراتِ عربیہ کتب احادیث کی ہوں کہ تا ماہر زبان اس سے محظوظ اور عبارت کتاب صدمۂ تصرفات امتزاجِ کلامِ غیر فصیح سے محفوظ ہو، پس شروع کی تیسری کتاب بہ تائید ملک الوہاب بہ ارادۂ چہل محافلِ احوال نور دیدۂ احمد مختار بہ شرط مشیتِ پروردگار وبقائے حیاتِ مستعار وعدم تفکرات لیل ونہار اور مرتب کیا اس چہل محفل غم مسمّٰی بہ بحر ماتم کو چالیس محفلوں پر، پس عبارت محفل سے یہ ہے کہ اس میں بقدر طاقت سامعِ سامعین محفل عزا ہمگی نظم ونثر بطور ترجمۂ احادیث احوال سید الشہدا تحریر ہو لیکن بہ رعایتِ مناسبت مقام بعض محفل مصیبت انجام کم ہوی اور بعض زیاد، قطعہ تاریخ کتاب لمولفہ ۔

محفلیں کیں جو رقم مجلسِ ماتم کے لیے نثر ماتم اسی باعث سے رکھا نام کتاب
فکر تاریخ کی تھی دل میں کہ ہاتف نے کہا نثر ماتم ہی تو تاریخ ہے کر لیجئے حساب

1231ھ

اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں بھی ہے۔ اس میں متن کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"نحمدک یامن اعظم ذریتنا علی أبی الائمۃ وسراج الامۃ سبط المصطفیٰ وابن المرتضیٰ

ترجمہ: ستائش کرتے ہیں ہم تیری اے خدا کہ بزرگ کیا ہے تو نے ہماری مصیبت کو شہادت پر ائمہ ہُدا......الخ۔

اور مصنف کا نام اس طرح لکھا ہوا ہے: "مرزا مغل محمد ہادی بن محمد حسن"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص محمد حسن کا بیٹا تھا اور مرزا مغل کے نام سے معروف تھا۔ خود شاعر تھا اور غافل تخلص کرتا تھا۔ ڈپٹی عبدالغفور خاں نساخ کے تذکرے میں اس کے دو شعر لکھے ہیں اور نام اس کا اس طرح درج ہے:

"غافل تخلص، مرزا مغل لکھنوی"

اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ اس شخص نے اپنی کتاب "نثر ماتم" میں جا بجا اپنے اشعار نقل کیے ہیں۔ اس کتاب کی ضخامت ڈھائی سو سے زائد صفحات کی ہے۔ کتاب خلاصۃ المصائب کے ایک اندراج سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا مغل محمد ہادی اپنی کتاب "نثر ماتم" کی تکمیل کے بعد سال دو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہا تھا۔

افسوس ہے کہ اس کی دوسری نثری کتابوں کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔

2- سید اکبر علی

سید اکبر علی بھی اسی زمانے کے شیعہ عالموں میں سے تھے۔ ان کی کتاب "ضیاء الابصار" بھی متعلق حلقوں میں مقبول رہی ہے۔ اس کا جو نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کو مصنف نے اس طرح شروع کیا ہے:

''بعد حمد وصلوٰت کے ایسا کہتا ہے کہ بندۂ خاطی غریق محیط معاصی اکبر علی بن سید فضل علی رضوی عفی اللہ کہ سن تمیز سے طبیعت آثم کی راغب طرف حضوری مجالس عزا کے اور خوگر بہ سوے استماع مصایب حضرت سید الشہدا کے تھی، لیکن ان ایام میں بہ سبب قصور فہم اور ہیچ مدانی کے اجتماع احادیث مناقب اور مصایب آلِ عبا کا ممکن الوقوع نہ تھا، بعد تحصیل علم ضروریہ صرف ونحو وغیرہ کے جب قدرت ترجمہ گوئی پر بہم پہنچی چندے احادیث۔ عزا جمع کر کے بامید مثوبات بے غایات ایزدی محض ایام عاشورا میں احقر کو دو چار مجالس میں اتفاق ان احادیث کے پڑھنے کا ہوتا تھا، اتفاقات سے ایک روز یہ نحیف بہ عادت معہود خدمت فایض البرکت جناب سید دلدار علی تغمدہ اللہ بغفرانہ میں حاضر تھا کہ مرزا اکبر علی صاحب سلمہٗ اللہ نے جناب ممدوح سے عرض کی کہ میر اکبر علی بھی احادیث عزا پڑھتے ہیں، بمجرد استماع اس کلام کے جناب ممدوح خلد مکانی نے حقیر سے مخاطب ہوکر ارشاد کیا کہ امسال ہماری مجلس میں بھی پڑھنا ہوگا اور یہ تذکرہ اکیسویں ماہ ذی الحجۃ الحرام سنہ 1232ھ (1817) کا ہے، اگرچہ احقر نے بہ سبب فقدان کتب حدیث اور کتب لغت وغیرہ کے اس بات میں اعتذار کیا ارشاد ہوا کہ جون سی کتاب کی احتیاج ہو ہمارے کتب خانہ میں سے لے جا کر دیکھو، لہٰذا بموداے اَلامر فوق الادب وبموجب المامور معذور اسی سال سے آثم نے پڑھنا شروع کیا، اگرچہ احقر بہ سبب تصادم افکار زمانہ اور کثرت اشغال دنیوی کے معدوم الفرصت تھا اور اسی سبب مطالعۂ کتب احادیث عزا وغیرہ کما ینبغی میسّر نہ تھا لیکن فضل الٰہی سے عرصہ چہار سال میں احادیث کثیر کتب فریقین سے مجتمع ہوئیں، بعد اجتماع ان احادیث کے بعض اخلاے روحانی اور برادر ایمانی آثم سے محرک اس سلسلے کے ہوے کہ ان احادیث عربی کو بہ زبان اردو عام فہم ہندی کیا چاہیے کہ عوام الناس مستفید ثواب ہوں۔ ناچار بنابر پاس خاطر احباب بہ استعجال ہمگی ان احادیث کو بہ زبان ہندی تحریر کیا اور اس عجالہ کو بہ

ضیاء الابصار موسوم کر کے مرتب چودہ تذکرہ پر کیا ہے''۔

مولف کے اس بیان سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ اس کتاب کی تالیف 1236ھ یا اس کے ایک آدھ سال بعد مکمل ہوئی ہوگی، اس کتاب کے چھ نسخے رام پور اور ایک ایک حیدر آباد کے کتب خانہ آصفیہ اور سالار جنگ میں موجود ہے۔ اس کتاب کے چودہ ابواب یہ ہیں:

1۔ولادت حضرت امام حسین علیہ السلام
2۔فضائل اور مناقب حضرت امام حسین
3۔مکارم اخلاق حضرت حسین
4۔معجزات امام حسین
5۔ثواب گریہ وبکا
6۔آیات قرآنی اور فضائل امام حسین
7۔ثواب زیارت اور احادیث فضیلت آل محمدؐ
8۔حضرت امام حسین کا مکہ معظمہ آنا
9۔مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کرنا
10۔شہادت حضرت حُر اور دیگر اصحاب امام حسین کی شہادت
11۔شہادت اہل بیت اور شہادت امام حسین علیہ السلام
12۔واقعات بعد شہادت امام حسین
13۔واقعات شہادت فرزندان مسلم اور خواب اُم سلمہ اور ابن عباس
14۔بعض قاتلان امام حسین جو دنیا میں عذاب میں مبتلا ہوئے۔

امتیاز علی خاں عرشی نے مصنف کے حالات اس طرح تحریر کیے ہیں:

''نام سید اکبر علی بن سید فضل علی بوضوی ہے، یہ حدیث خواں کے لقب سے مشہور تھے، مغموم تخلص سے شعر بھی کہتے تھے، خود اس کتاب ضیاء الابصار میں بھی مولفہ کے عنوان کے تحت حمد و شعر ملتے ہیں''۔

معلوم ہوتا ہے کہ اکبر علی مغموم کو شاعر کی حیثیت سے شہرت نہیں مل سکی تھی چنانچہ معاصر

تذکرہ نویسوں نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ علی گڑھ کی آزاد لائبریری میں البتہ بعض مجموعوں میں مغموم کے مرثیے اور سلام وغیرہ ملتے ہیں۔ لیکن فی الوقت یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کا مصنف یہی مغموم ہے یا اور کوئی۔

اس مولف کی دوسری نثری کتاب ''درۃ البیضائی مناقب الزہرا'' ہے۔ اس کے دیباچے میں لکھا ہے:

> ''اکبر علی بن سید فضل علی الرضوی نے سیدۃ النسا کے روز ولادت سے تا روز وفات احادیث کتاب بحار الانوار کا ترجمہ زبان ہندی اردو میں کیا اور موسوم اس عجالہ کو بہ درۃ البیضاء فی مناقب الزہرا کر کے پیش کش اور ہدیہ بارگاہ .... نواب محسن الدولہ بہادر کیا''۔

اس کتاب میں کل تین سو ساٹھ ورق ہیں۔

امکان ہے کہ اس مترجم کی اور بھی کوئی کتاب اردو نثر میں ہو۔

نخل ماتم

شیخ امام بخش ناسخ کے معروف شاگرد مرزا جعفر علی فصیح کی یہ نثری تصنیف ہے۔ اُس وقت کے رواج کے مطابق اس میں مولف نے جگہ جگہ اپنے اشعار بھی شامل کیے ہیں، اس کتاب کا آغاز اس طرح سے ہوا ہے:

اے قلم کھینچ مد بسم اللہ | ہے سر حمد حد بسم اللہ

> روز دہم آغاز حکایت، اے دوستان احمد مختار، اے محبان حیدر کرار، و تعزیہ داران عترۃ اطہار، غمگساران فرمانبردار السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ، خوشا حال اُن کا جن کا سینہ محبت اہل بیت سے لبریز ہے اور آنکھیں بزم عزا میں گہر ریز ہیں''۔

اس کتاب کا کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کا نسخہ اکیس سطری مسطر پر دو سو بیالیس صفحوں پر محیط ہے۔ ظاہر ہے کہ امام حُسین کی شہادت کا اس میں مفصل بیان ہوا ہے۔ کتاب حضرت سکینہ کے نقال کے ذکر پر ختم ہوئی ہے۔ خاتمہ ان شعروں پر ہوا ہے۔

وہ ہیں ذاکر شہید کربلا کے　　وہ ہیں مشفق فصیح بے نوا کے
دعا کا خاتمہ ہے فاتحہ پر　　کرو شکر خدا الحمد پڑھ کر

یہ کتاب غازی الدین حیدر کے زمانہ نیابت میں لکھی گئی تھی۔

4-مرزا محمد ہادی

نام تو ان کا بھی محمد ہادی تھا، لیکن یہ محمد ہادی عرف مرزا مغل غافل سے مختلف شخص تھے۔ ان کے والد کا نام مرزا علی تھا اور یہ خود اپنے وقت کے نام برآوردہ شیعہ عالموں میں سے تھے، انھوں نے اپنے پیشرووں کی اردو میں مشہور مذہبی کتابوں کا بخوبی مطالعہ کیا تھا اور پھر تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان کی تصانیف میں سے کتاب ''خلاصۃ المصائب'' خاصی مقبول رہی ہے۔ اس کے سبب تالیف میں مصنف نے تحریر کیا ہے کہ:

''الغرض چاہا جب اس فقیر نے کہ اس کتاب کو جمع کرے اور کتب احادیث اور .... ایسی جمع کیں کہ ان کی کتابوں سے رواج پا گیا حدیث کا پڑھنا مجلس میں، مثل میر اکبر علی صاحب و مرزا امان بیگ صاحب و مرزا مغل مرحوم کی کتابوں میں نظم بہت ہے بہ طریق روایت خوانوں کے، اور اکثر حدیث خواں نظم ہندی کو عبارت عربی کے ساتھ پڑھنا گوارا نہیں کرتے کہ بیشتر روایت خوانوں نے اکثر روایات کو بہ سبب ملنے نظم غیر مشروع کے خراب کر دیا اور ثواب کو اپنے ضایع کیا اور مرزا امان بیگ صاحب نے کتاب خوب جمع فرمائی، مگر وہ کتاب تمام و کمال نہ نکلنے پائی لیکن میر اکبر علی صاحب نے ضیاء الابصار کو اپنے سامنے تقسیم کر دیا اور ثواب اپنا بڑھایا...... پس اس عاصی کے خیال میں آیا کہ ضیاء الابصار بہ طریق کتب حدیث مثل جلاء العیون وغیرہ کے ہے اور ذاکر کو ہر بار ترتیب نو کرنی پڑتی ہے اور جب فضایل و مصایب جدا جدا ہوں تو ہر بار کر خوب نہیں لگتی، پس اس لیے چاہا میں نے کہ اس کتاب کو موافق اپنی عقل ناقص کے ان کتابوں اور غیر ان کے سے انتخاب کر کے ترتیب دوں کہ ہر روایت میں پہلے فضایل ہوں اور پھر مصایب ہوں کہ یہ طریقہ حدیث خوانوں میں سے کسی نے نہیں لیا، اور اگر خدا تعالی نے چاہا تو ذاکروں کو بھی یہ طریقہ پسند آئے اور آسان پڑے، اور ثواب جناب سید مغفور کا اور جن بزرگواروں کی تصنیف سے میں نے انتخاب کیا ہے زیادہ ہووے، اور پس جاننا چاہیے کہ اکثر روایات تو اس میں ضیاء الابصار کی ہیں، اور بعض روایات تصنیف مرزا مغل صاحب غافل اور مرزا جعفر علی صاحب

فصیح اور مرزا امان بیگ صاحب اور سید اظہر علی صاحب کربلائی کہ کتاب ان کی زاد العاقبت ہے انتخاب کی ہے اور بعض روایات کتاب خرائج اور بیاض فخری وغیرہ کتابوں سے نکالی ہیں تا میں بھی شریک ثواب ہوں۔ انشاء اللہ تعالی اور نام رکھا میں نے اس کتاب کا خلاصۃ المصایب اور بعد اس کے ایک کتاب اور جمع کر رہا ہوں کہ اس میں سب معصوموں کا احوال تولد اور وفات مع زیادہ ان حضرات کے جمع کیا ہے، اگر فرصت پاتا ہوں تو اسے بھی انشاءاللہ طیار کر کے خدمت مومنین میں حاضر کرتا ہوں، پس امید وار ہوں کہ اس عاصی کو بھی بہ دعائے خیر یاد فرماویں''۔

یہ کتاب مولف نے 74 فصلوں پر مرتب کی ہے اور اس کی ضخامت ساڑھے چار سو صفحات کے قریب ہے۔

کتاب خلاصۃ المصائب نہایت مقبول ہوئی اور کئی بار مختلف مطبعوں سے چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ اس کی طباعت کے بارے میں مولف نے لکھا ہے کہ:

''باعث طبع اس کتاب سراسر حسنات کا ذات عالی صفات وہ والا جناب ہوے ہیں کہ تمام اہل شاہجہاں آباد کو فیض عام ان کے سے دین آئین مذہب حقہ امامیہ حاصل ہوئے بلکہ سنت نبوی و طریقۂ مرتضوی کو اس مقام میں بلکہ اس اطراف میں رواج دیا یعنی نواب مستطاب معلّی القاب.....اعتماد الدولہ سید حامد علی خان بہادر جنگ، پس آنجا کہ نیت حق طبیعت ان جناب کی ہمیشہ امور خیرات و مبرات رہتی ہیں، باوجودیکہ عین ریعان جوانی اور عنفوان شباب ہے مگر اس عرصے میں ہزاروں امور خیر دست حق پرست ان کے سے جاری ہوے ہیں، مانند بنائے مساجد اور مدارس اور امام باڑوں کا اور مقرر کرنا پیش نماز مذہب حقہ امامیہ کا شہر شاہجہاں آباد میں اور بہ اعلان کرنا تعزیہ داری جناب خامس آل عبا کا کہ اس شہر میں بہ سبب کثرت اہل سنت و جماعت کے عہد سلطان تیمور سے اب تک یہ امور بہ اعلان کسی نے نہیں کیے تھے، ان جناب نے جاری کیے تھے، پس ہر گاہ مجالس و محافل بیت السلطنت لکھنؤ دیکھے اور طریقہ حدیث خوانی کا سماعت ان جناب نے فرمایا، نہایت پسند کیا اور چونکہ بہ سبب

محبت جناب اَبا عبداللہ الحسین کہ جد اعلاان کے ہیں آب وگل میں خمیر پائی ہے
لہٰذا اس کمترین سے ارشاد کیا کہ کتاب ترجمۂ احادیث صحیحہ متضمن مصایب اور
فضایل جناب خامس آل عبا اور باقی شہیدان معرکہ کربلاے معلا تکمیل و تیار کر
کے بہ نام حضرت شاہ عالم واجد علی شاہ معرض طبع میں لا کر ہرگاہ یہ حقیر خانہ زاد
موروثی اس دودمان عالی شان کا ہوں، منظور ہے کہ تمام ہندوستان یعنی دار
السلطنت شاہجہاں آباد مع مضافات و متعلقات اس کے شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ
اور دیہہ بہ دیہہ بلکہ ہر گھر میں یہ کتاب مجالس عزا میں پڑھی جائے، پس بحمد اللہ
کہ بزار حکم اشرف سے معرض طبع میں آے اور اللہ تعالی واسطے رسول مقبول اور
تمامی ایمۂ اطہار........ تا بقاے ایام دنیا و ظہور خاتم خلفا صاحب العصر والزماں
کے اس دولت عظمی اور سلطنت کبریٰ کو ذات والا جناب خسروانی سے رونق بخش
رکھے اور جناب ایزد سبحان نواب معظم کو بہ مزید عمر و دولت تا صد وسی سال قایم
رکھ کر نسل سے ان کی سیادت تا قیام قیامت جاری رہے''۔

اس اقتباس سے یہ حقیقت بخوبی ظاہر ہے کہ بہادر شاہ بادشاہ کے زمانے میں جب نواب حامد علی خاں کو قلمدانِ وزارت ملا۔ دہلی میں شیعیت کا زور بہت بڑھ گیا تھا اور اس مذہب کی کتابیں ان کی ایما سے لکھنؤ میں چھپ کر دہلی اور مضافات میں گھر گھر میں پہنچ رہی تھیں، بادشاہ کی تبدیلی مذہب کا واقعہ بھی اسی صورت حال کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

کتاب خلاصۃ المصائب کا سال تالیف نواب باقر علی تشفی نے صحیفۂ غم سے نکالا ہے۔ اس
1233ھ
کتاب کی زبان پر فارسی کا اثر غالب معلوم ہوتا ہے چنانچہ بعض مقاموں پر پاتا ہوں، وغیرہ کا استعمال مستقبل کے صیغے کے طور پر بھی کیا گیا ہے اور اس قسم کی ترکیبیں تو عام ہیں۔

فیض ان کے سے اور پیش نماز مذہب حقہ امامیہ کا

اقتباس بالا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں اور بھی چند کتابیں اسی قسم کی موضوعات سے متعلق لکھی گئی تھیں۔ ان کتابوں کی نثر وغیرہ کا انداز بھی ایسا ہی ہے۔

(4)

انگریزی سے ترجمے

نواب آصف الدولہ کے بعد ہی اودھ کے علاقے پر عملاً انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ نواب وزیر علی کی گرفتاری اور پھر سعادت علی خاں کی مسند نشینی اس دعوے پر دال ہے۔ نواب غازی الدین حیدر منڈیاؤں کی انگریزی پلٹن کی حفاظت اور اہتمام میں مسند وزارت پر متمکن ہوئے تھے۔ واضح رہے کہ یہ وہ مقام ہے جس کے بارے میں میر علی اوسط رشک کا کہنا ہے کہ

ع جو منڈیاؤں جاتے ہیں تو لندن دیکھ لیتے ہیں

غازی الدین حیدر

مسند نشینی کے صرف چند سال بعد انگریزی حکومت کی نوازش سے انھوں نے تاج شاہی زیب سر کیا۔ چنانچہ ان کی نیابت اور پھر شاہی کے زمانے میں ان کی سرپرستی میں لکھنؤ میں انگریزی معاشرت کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان اور علوم وغیرہ کو بتدریج رواج حاصل ہوتا چلا گیا۔

بادشاہ اوّل کی بیگمات میں سے دو یعنی نواب مبارک محل اور سلطان مریم بیگم ولایتی تھیں اور ان کے واسطے سے بادشاہ کے محل میں بھی انگریزوں کو دخل حاصل ہو گیا تھا۔ بادشاہ نے اپنے

علاقے میں تعلیم کے معاملات میں اصلاح کی جو کوششیں کی تھیں، ان سے متعلق یہ واقعہ خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ انھوں نے ایک نصابی کمیٹی بنائی تھی، لکھا ہے کہ:

''غازی الدین حیدر نے اپنے علاقے میں سائنٹفک سوچ کو عام کرنے کی خاطر اسکول بک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد لکھنؤ کے مدارس کے لیے ایسا نصاب تیار کرنا تھا جو یورپی دانشگاہوں کے ہم پلہ ہو، اس مقصد کے حصول کے لیے نصابی کمیٹی انگریزی اور فرانسیسی نصابی کتب کا انتخاب کرتی تھی اور اردو میں ترجمہ شدہ کتب کی طباعت کے لیے مطبع سلطانی (اودھ) قائم کیا گیا تھا''۔

ان کے زمانے میں جن کتابوں کے ترجمے ہوئے، ان سے متعلق تفصیلات کا علم نہیں ہے۔ البتہ بتایا گیا ہے کہ:

''بہت سی انگریزی کتابوں کے فارسی تراجم کیے گئے، بعض یہ ہیں: تاریخ میکسیکو، تاریخ چین، انگریزی قرابادین، سمندری اشاروں پر ایک کتاب وغیرہ''۔

اردو میں جو کتابیں تیار کی گئی تھیں ان کا حال آگے آئے گا۔

نصیرالدین حیدر

بادشاہ دوم کے حال میں امیر علی خاں نے لکھا ہے کہ:

''طبع والائے ایں بادشاہ جمجاہ علم دوست افتادہ بود......وازیں جاست کہ بعض علما را برائے تکمیل فنون ریاضی وتحصیل آلات رصدی مسیل انگلستان ساختہ بود، ونیز طرح بنائے رصد خانہ در شہر نزہت بہر لکھنؤ بہ کمال حسن وخوبی ولطافت وخوش اسلوبی انداختہ''۔

نصیرالدین حیدر کو انگریزی اشیا، مصنوعات وغیرہ سے نہایت دلچسپی تھی۔ وہ انگریزی لباس زیب تن کرتے تھے۔ ان کی بیگم مخدرۂ علیا ولایتی تھیں اور ان کے اثر سے محل میں انگریزوں کو رسائی حاصل تھی، خود بادشاہ کے ملازمین میں سے بعض انگریز تھے۔ بتایا گیا ہے کہ مسٹر رائٹ نامی ایک شخص بادشاہ کو انگریزی کی تعلیم دیتا تھا۔ شاہی کتب خانہ کا مہتمم بھی ایک انگریز مسٹر کردپلی تھا۔ ان لوگوں کے اثر سے انگریزی زبان ہی نہیں علوم وفنون کو بھی لکھنؤ میں خوب فروغ حاصل ہوا تھا۔

اس مقام پر انگریزوں کے معاملات کی نوعیت کی طرف بھی توجہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں سب سے زیادہ موثر شخصیت نواب معتمد الدولہ آغا میر کی تھی، ریزیڈنٹ نے ان کے وقار کو اس حد تک بڑھایا کہ وہ بادشاہ گر سمجھے جانے لگے تھے بلکہ خود ان کے ذہن میں بھی یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ''ہم جسے چاہیں بادشاہ بنا دیں''، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی کوششوں سے اس نو ساختہ بادشاہت میں انگریزوں کے اثرات بہت تیزی سے مستحکم ہو گئے۔

ان روابط کے باوجود ان کی گرفتاری کی صورت اس طرح ہوئی تھی کہ:

> ''ریزیڈنٹ نے (بادشاہ سے) فرمایا کہ تم معتمد الدولہ کو ہماری کوٹھی میں بھیج دو، ہم گرفتار کر دیں گے، نصیر الدین حیدر نے معتمد الدولہ کو خوشی خوشی کوٹھی ریزیڈنٹی میں بھیجا، صاحب کلاں نے کوٹھی خاص میں جگہ دی، خود باہر آئے، معتمد الدولہ وہاں بیٹھا تھا کہ دوسرے دروازے سے دو انگریز کرچیں حسب ضابطہ برہنہ لیے مانند عزرائیل کے اس کے سر پر آپہنچے اور یہ حکم سنایا کہ آپ بموجب حکم بادشاہ سلیمان جاہ کے قید ہوئے، ایک ساعت کے بعد صاحب کلاں پھر تشریف لائے، بہت تشفی اور دلداری کی، کہا کہ نواب صاحب یہ مقام شکر جانیے کہ بادشاہ کے پنجۂ قید و قہر سے چھڑا کر اپنے پاس رکھا ورنہ بادشاہ تمہارا دشمن تھا، بہت بُری طرح پیش آتا...... بعد عرصے کے آغا میر عزت و آبرو سمیت بہ تصدق صاحب کلاں کے مع زن و بچہ و مال و اسباب لکھنؤ سے کانپور کو گیا''۔

ریزیڈنٹ نے اس طرح ایک تیر سے دو شکار کیے یعنی بادشاہ بھی ممنون ہوا اور آغا میر اور ان کا گھرانا بھی ان کا احسان مند رہا۔ اسی قسم کی ہوشیاریوں سے کام لے کر رفتہ رفتہ انگریز پورے ملک پر حاکم و قابض ہو گئے۔

نصیر الدین حیدر کے عہد میں جب معتمد الدولہ کو جلا وطن کیا گیا تو لکھنؤ سے بہت شاعر اور نثر نویس بھی ان کی خدمت میں کانپور چلے گئے۔ اس سے لکھنؤ کا علمی ماحول وقتی طور پر متاثر ہوا تھا۔ لیکن یہ فائدہ بھی ہوا کہ علمی و ادبی نقطۂ نظر سے کانپور ایک ایسے نئے مرکز کی حیثیت سے اُبھرنے لگا جس پر انگریزی کی چھاپ نمایاں تھی۔

غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں جن مترجموں کا تقرر ہوا تھا، ان سب کے نام وثوق کے ساتھ معلوم نہیں ہو سکے ہیں البتہ جن بعض مترجموں کا حال دریافت ہو سکا ہے ان کا یہاں مختصر اتعارف کرایا جاتا ہے۔

1 - کمال الدین حیدر

اس زمانے کے شاید سب سے زیادہ معروف اور باکمال مترجم یہی تھے۔ انھیں شاہی دربار میں رسوخ حاصل تھا، طب میں دخل رکھتے تھے اور انگریزی زبان سے واقفیت حاصل تھی، اس زمانے کے طریقہ کے مطابق شعر بھی کہہ لیتے تھے اور زائر تخلص کرتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''سوانحات سلاطینِ اودھ'' ہے جو بُرہان الملک سے برجیس قدر تک کے حالات پر دو جلدوں میں ہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے ان کے ترجموں کی تعداد اُنیس بتائی ہے لیکن صرف دس کے نام لکھے ہیں، اس طرح:

نمبر شمار	نام کتاب/رسالہ	نام مصنف
1	رسالہ علوم طبیعیہ	؟؟؟
2	رسالہ ہیئت	ڈاکٹر برنگلی
3	رسالہ دیگر ہیئت	ڈاکٹر ولسن
4	رسالہ علم الکیمیا	ریورنڈ چارلس
5	رسالہ علم المناظر	ایضاً
6	رسالہ قوت مقناطیس	ایضاً
7	رسالہ علم الماء	ایضاً
8	رسالہ علم الہوا	ایضاً
9	رسالہ علم الحرارۃ	ایضاً
10	رسالہ مقاصد العلوم	لارڈ بروم

یہ سب کتابیں مطبع سلطانی اودھ لکھنؤ میں چھپی تھیں۔ آخر الذکر کا سالِ طباعت 1841

ہے اور اس کے ابتدائیہ میں مترجم نے لکھا ہے:

"حسب الحکم ابوالفتح معین الدین، سلطان الزماں، نوشیروانِ عادل، محمد علی شاہ بادشاہ غازی حسب فرمائش محکمۂ اجلاس جنرل کامیٹی، اسکول بک سوسائٹی کے عاصی سراپا معاصی سید کمال الدین حیدر عرف محمد امیر الحسن الحسینی نے زبان اردو میں ترجمہ کیا"۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ غازی الدین حیدر کی قائم کردہ اسکول بک سوسائٹی اور اس کی جنرل کمیٹی محمد علی شاہ کے زمانے تک بدستور کام کر رہی تھی اور کمال الدین حیدر اس سے مسلسل وابستہ رہے تھے، نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ سوسائٹی کب تک قائم رہی۔ رسالہ مقناطیس (قوت مقناطیس) کا سالِ طباعت 1850 بتایا گیا ہے لیکن اس کے بارے میں کوئی اور اطلاع حاصل نہیں ہو سکی ہے۔

مندرجہ بالا فہرست میں رسالۂ ہیئت از ولسن کے مترجم کے نام کی جگہ "مترجمین شاہان اودھ" لکھا ہے اور سال طباعت وغیرہ تحریر نہیں ہے، یہی معاملہ برنکلی کے رسالۂ ہیئت کا بھی ہے۔

اس فہرست کے علاوہ کمال الدین حیدر کے دو اور ترجموں کا پتہ چلتا ہے یعنی۔

(الف) خواص الاشیاء، جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

"الحمد للہ الذی الخ.......... جناب سید کمال الدین حیدر عرف محمد امیر حسن الحسنی، من افضل السادات واکمل الکمالات نے زبان انگریزی سے ترجمہ اردو میں کیا اور سمیول پارکس صاحب کی اصول کیمسٹری یعنی خواص اشیا موالید ثلاثہ کا درج کیا اور اسے صاحب عالی شان کرنل ولکاک صاحب جو مہتمم رصد خانہ سلطانی ہیں بخوبی صحیح کیا اور اس کتاب کو میر خاں صاحب کو واسطے تجربہ کے دیا اور جناب میر خاں صاحب قبلہ نے نام اس کا خواص الاشیا موسوم فرمایا"۔

اس کتاب میں چھ سو بہتر فقرات ہیں یعنی کتاب کو اس قدر عنوان پر تقسیم کیا گیا ہے۔ اکثر نام (اصطلاحات) انگریزی میں باقی رکھے گئے ہیں۔ مثلاً آکسیجن، گیس، سلفات، فاسفورس، پوٹاشیم، کاربن، نائٹروجن وغیرہ، کتاب کا خاتمہ ان کلمات پر ہوا ہے:

"فی الحقیقت ہمارے یقین کرنے کا ایک سبب یہ ہے کہ مرکب جدید اس جذب

کی جہت سے پیدا ہوتا ہے جس کا نام ہیولی پابند ہے، اور وہ جذب اجزائی باریک پر بھی اس صورت مثل جذب نظام شمسی کے عمل کرتا ہے"۔

اس کتاب کے مخطوطہ کا ترقیمہ اس طرح ہے:

"تمت تمام شد بتاریخ ہفتدہم شہر ذی الحجہ 1282ھ (1865-66) یوم پنجشنبہ"۔

فہرست نگار نے اس رسالہ کی تاریخ تصنیف قریب 1250ھ لکھی ہے، یعنی بہ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ دوم۔

دوسرا رسالہ (ب) "سائنس کے فوائد واعمال" ہے، جس کے بارے میں درج ذیل اطلاعات فراہم کی گئی ہیں:

"مصنف لارڈ براہم، مترجم کمال الدین حیدر سید المعروف میر محمد حسین لکھنوی، یہ کتاب پہلی بار لکھنؤ سے طبع ہوئی، پھر حیدرآباد دکن میں 1843 میں چھپی"۔

(ج) "رسالہ در ماہیت ہوا" یہ تیسرا رسالہ ہے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔

"رسالہ در ماہیت ہوا، صفحات باون، سطور تیرہ، مترجم: منشی کمال الدین

آغاز: بیان ماہیت اور تاثیر ایمسفرک ایر (HEMISPHERIC AIR) کا، ایمسفرک ایر یعنی جو ہوا کہ کرۂ زمین کو گھیرے ہوئے ہے وہ ہر ایک چیز میں سمائی ہے اور اگرچہ خیال میں سبک یعنی ہلکی معلوم ہوتی ہے.........

اختتام: مثلاً دس پندرہ ٹکڑے کہ ہر ٹکڑا ڈیڑھ ڈیڑھ چھٹانک کا ہو تیار کر سکتے ہیں"۔

صفحہ اوّل پر انگریزی میں حسب ذیل عبارت درج ہے:

"AIR

By : P. Breton 1829"

یہ انگریزی رسالہ مصنفہ پی برٹن کا اردو ترجمہ ہے جس میں ہوا کی ماہیت بیان کی گئی ہے، آخر میں دو ورق پر آلات سائنس کے نقشے دیے گئے ہیں"۔

قریب بہ یقین ہے کہ ان چند کے علاوہ سید کمال الدین حیدر کے کیے ہوئے اور بھی کچھ ترجمے ہوں گے۔

2-عبدالسلام

یہ بھی شاہان اودھ کے نامور مترجموں میں سے تھے۔ان کی ترجمہ کی ہوئی کتابیں لکھنؤ کے علاوہ حیدرآباد اور کلکتہ سے بھی چھپ کر شائع ہوئی تھیں،خیال ہے کہ یہ انگریزی کے علاوہ فرانسیسی زبان سے بھی واقف تھے۔

جیمس فرگوسن نامی کسی عالم کا ایک رسالہ علم ہیئت سے متعلق فرانسیسی زبان میں تھا، بادشاہ دوم نصیرالدین حیدر کے حکم سے عبدالسلام نے اس کے مطالب کو سوال و جواب کی صورت میں اردو زبان میں منتقل کیا۔تدریس کے نقطۂ نظر سے یہ طرز بیان نہایت مفید اور برمحل تھا۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے۔ بلکہ مترجم نے اصل مفہوم پر توجہ دی ہے۔اس رسالے کا نام مفتاح الافلاک ہے اور یہ بارہ فصلوں پر منقسم ہے اور ہر فصل کو مترجم نے ''گفتگو'' کہا ہے۔بارہ گفتگو اس طرح ہیں:

''1-زمین کی شکل اور حرکت اور مقدار کے بیان میں

2-نظام شمسی

3-میل، مرکز اور عادات نور

4-مکانوں کی عرض و طول

5-دن اور رات کے گھٹنے اور موسموں کے تغیر اور نور ماہ کا بیان

6-چاند کی حرکت اور چاند و سورج گہن

7-دریاؤں کا مد و جزر

8-شمس اور کوکبی زمانہ کا حساب

9-تعدیل زمانے کے بیان میں

10-اصلاح تقویم

11-انقلاب نقطی الاعتدال

12-ثوابت اور مساحت سیارات اور قرص آفتاب"۔

اس رسالے کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے:

"علم ہیئات وہ علم ہے جس سے کواکب کی شکلیں اور اوضاع اور ابعاد وغیرہ دریافت کیے جاتے ہیں۔ یہ علم شریف ہر عہد اور ہر ملک میں کم وبیش مروج ہوتا چلا آتا ہے، چنانچہ قدیم تواریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلف میں لوگ ہنر ودانش سے ناواقف محض تھے لیکن روز وشب اور جاڑے اور گرمی اور ساعات کی شناخت رکھتے تھے"۔

اور اس کا اختتام ان کلمات پر مترجم نے کیا ہے:

"استاد: بہت اچھا، اب تم رخصت ہو، خدا تمھاری عمر دراز کرے اور ہر طرح کے علوم تم کو نصیب کرے، اپنے قبلہ گاہی کو میرا اسلام ونیاز کہو"۔

اس رسالے کے نسخۂ آصفیہ کا ترقیمہ اس طرح ہے:

"تمت تمام شد، یہ رسالہ مسمّی مفتاح الافلاک بتاریخ یازدہم ماہ رمضان المبارک 1257ھ (1841) روز چہار شنبہ تمام شد"۔

اور اس کے پہلے صفحہ پر کسی نے یہ عبارت لکھ دی ہے:

"یہ رسالہ حسب الحکم محکم جناب سلطنت مآب ابوالنصر قطب الدین سلیمان جاہ سلطان عادل نوشیروان زماں نصیر الدین حیدر بادشاہ زادہ خلد اللہ ملکہ، وسلطانہ، کے حکیم فریوسن صاحب کے اصول علم ہیئات سے مترجم نے بہ وسیلہ عبدالسلام لکھنوی کے اردو زبان میں ترجمہ کیا"۔

اس میں نصیر الدین حیدر کے نام کے ساتھ "بادشاہ زادہ" لکھے ہونے پر تعجب ہے۔ یہاں غالباً "زادہ" کے بعد کوئی اور دعائیہ کلمہ رہا ہوگا۔ اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبدالسلام نے اصل متن فرانسیسی زبان میں پڑھ کر مترجم کو سنا کر لکھ دیا ہوگا اور اس نے اردو عبارت کو اپنے طور پر درست کیا ہوگا، یہ مترجم کون ہے؟ یہ بات معلوم نہیں ہو سکی۔

یہ کتاب پہلی بار باپ ٹسٹ مشن پریس، سرکلر روڈ، کلکتہ سے 1833 (1248ھ) میں ایک

سو چھتیس صفحوں پر چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ پھر حیدرآباد دکن میں 1844 میں دوسری بار چھپی تھی۔

3- میل صاحب

ان کے بارے میں کوئی مفید بات معلوم نہیں ہو سکی بجز اس کے کہ یہ نصیر الدین حیدر کے مقربوں میں سے تھے اور انھوں نے ان کے زمانے میں ترجمے کا کام کیا تھا۔

پنک صاحب نامی کسی یورپی عالم نے ایک رسالہ آسٹرنامی کے علم سے متعلق لکھا تھا۔ میل صاحب نے اس کا ترجمہ اردو زبان میں کیا تھا۔ رسالے میں کل سینتالیس ابواب ہیں اور یہ پہلی بار نصیر الدین حیدر بادشاہ کے حکم سے چھپا تھا۔ اس مطبوعہ نسخہ کے بارے میں تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔ قلمی نسخہ چھپن اوراق پر محیط ہے اور اس کی کتابت 26 صفر 1253ھ (1837) میں مکمل ہوئی تھی۔ آغاز ان فقروں سے ہوا ہے:

> ''یہ ایک رسالہ ہے مختصر فن اسٹرانمی میں جس کو علم ہیئت کہتے ہیں، اصل اس کی کتاب ہے بطور سوال و جواب واسطے........''۔

اور آخر کے الفاظ یہ ہیں:

> ''......بس عالم بے حد کے نوادرات کا کیا ذکر، اس راز میں بشر کی عقل کوتاہ اور پراگندہ ہوتی ہے''۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ رسالہ سوال و جواب کی صورت میں طالب علموں کے لیے لکھا گیا تھا۔ ترقیمہ اس طرح ہے:

> ''تمام ہوا یہ رسالہ علم ہیئت بہ تاریخ 26 صفر 1253ھ بخط شیخ عطاء اللہ ہندی تحریر یافت''۔

(5)

کتبِ قانون

ہندوؤں اور مسلمانوں کے مختلف مقدمات جو انگریزوں کی عدالتوں میں پیش ہوتے تھے ان سے متعلق جاری شدہ احکامات اور فیصلوں کو ایک انگریز عالم ولیم میکناٹن نے الگ الگ چند کتابوں کی صورت میں انگریزی میں مرتب کر دیا تھا۔ ان کتابوں کے مختلف لوگوں سے زبان اردو میں ترجمے کرائے گئے تھے اور پھر انھیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ان کے مذہبی قوانین کی مستند کتابوں کی حیثیت سے شائع کیا گیا اور عدالتوں میں انھیں سے نظیریں پیش کرنے کا کام لیا جانے لگا۔

وہ زمانہ تھا جب ملک میں مسلمان حاکم تھے اور صاحب علم باصلاحیت لوگوں کی ان میں کچھ کمی نہیں تھی۔ پھر بھی مسلمانوں کے شرعی معاملوں سے متعلق ترجمے کا کام ہندو عالموں سے لیا گیا، ان مترجموں کے بارے میں یہ بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ شریعت کے باریک اور نازک مسائل کو پوری صحت کے ساتھ سمجھ سکتے تھے۔ باوجود اس کے ان ترجموں کو عدالتوں میں رواج دینا انگریزی تسلط کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

1-مکند لال

اس شخص کے حالات تو معلوم نہیں۔ اس کے بارے میں فی الوقت بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ اوّلین شاہان اودھ کے زمانے میں ترجمے کا کام کرتا تھا اور اسے انگریزوں کا تقرب حاصل تھا، اس نے ولیم میکناٹن کی کم سے کم دو کتابوں کے انگریزی سے اردو زبان میں ترجمے کیے تھے اور وہ ترجمے ایک سے زائد بار چھپ کر شائع ہوئے تھے۔

(الف) اصول شرع محمدی: یہ رسالہ مسلمانوں کے مسائل وراثت سے متعلق ممالک مغربی میں عدالت ہائے دیوانی کے فیصلوں اور نظیروں پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ مطبع ثمر ہند لکھنؤ سے 38 صفحوں پر چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن حیدر آباد دکن میں محکمۂ صدر دیوانی عدالت سے بھی شائع ہوا تھا۔

(ب) اصول نظائر شرع محمدی: یہ دوسرا رسالہ بھی اسلامی قانون سے متعلق ہے۔ یہ بھی 38 صفحوں کا ہے، اور مطبع ثمر ہندی لکھنؤ ہی سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اس کا تیسرا ایڈیشن 1848 میں نکلا تھا۔

ان دونوں رسالوں کی پہلی اشاعت کا سال 1828 بتایا گیا ہے جو یقیناً غلط ہے کیونکہ اس سال میں مطبع ثمر ہند لکھنو کے قیام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

2-مکھن رام

میکناٹن کے ہندوؤں سے متعلق رسالوں کا ترجمہ مکھن رام نامی ایک شخص نے ''اصول دھرم شاستر'' کے نام سے دو جلدوں میں کیا تھا۔ ترجمے کا سال تو معلوم نہیں البتہ ان رسالوں کی طباعت بہت بعد میں دہلی میں عمل میں آئی تھی۔ لالہ مکھن رام کا حال بھی کچھ معلوم نہیں۔

تذکرے

نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں نصف ملک انگریزی عملداری میں شامل ہو گیا تھا۔ نواب کی ساری توجہ ملک کی بازیافت کے لیے کوششوں میں صرف ہو رہی تھی۔ اودھ کے علمی اور فنی مجالس بھی اس صورت حال سے متاثر ہوئے۔ میر خانہ نشین ہونے پر مجبور ہو گئے اور انشا اپنے گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ رہے۔

لکھنؤ میں غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر نے تاج شاہی زیب سر کر لیا تھا۔ لیکن ان سے اور ان کی بیدار مغز رعایا سے بھی حقیقت حال پوری طرح مخفی نہیں تھی۔ شیخ ناسخ کو بار بار اپنے شہر سے نکلنا پڑا تھا۔ نمود و نمائش کا زور تھا اور ٹھوس کاموں کی قدر اس دور میں کم سے کم کی جا سکتی تھی۔

شاہ عالم ثانی کے دور میں لکھنؤ میں کئی وقیع اور مفید تذکرے لکھے گئے تھے۔ لیکن اکبر شاہ ثانی کے عہد میں شاید ایک بھی باقاعدہ تذکرہ نہیں لکھا گیا تھا۔ شیخ مصحفی نے ضرور تذکرہ ریاض الفصحاء میں کچھ برائے نام سا اضافہ کیا تھا لیکن اسے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی، کسی نے اپنی تصنیف میں ضمناً اگر چند شاعروں کا احوال درج کر دیے تھے تو اسے تذکرہ نویسی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

دستور الفصاحت:

یہ کوئی باقاعدہ تذکرہ نہیں ہے بلکہ ایک ضخیم کتاب کا جس کا نام دستور الفصاحت ہے اتن کا

خاتمہ ہے جسے امتیاز علی خاں عرشی نے اپنے مبسوط مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے:

"مئی 1939 میں سید احمد علی یکتا لکھنوی کی دستور الفصاحت نام کی ایک کتاب کتابخانہ عالیہ رامپور کے لیے خریدی گئی...شروع میں مصنف نے اردو زبان کی پیدائش، ترقی وغیرہ، ...اس کے بعد صرف، نحو، معانی کے قواعد وضوابط بیان کیے ہیں، خاتمے میں پینتیس ایسے شاعروں کا ذکر کیا ہے جن کے شعر کتاب کے اندر سند میں پیش کیے گئے ہیں،...کتاب کا مقدمہ اردو زبان کی تاریخ پر نئی روشنی ڈالتا ہے، خاتمے کے مباحث شعرائے بارے میں دلچسپ اور اہم بیانوں اور نکتوں پر مشتمل تھے،... یہ دونوں حصے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ یکجا شائع کیے جا رہے ہیں"۔

اپنے دیباچے میں عرشی صاحب نے ان تمام تذکروں وغیرہ کے تعارف میں ان کے زمانۂ تصنیف کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔جن سے انھوں نے اپنی اس کتاب کے حواشی تحریر کیے ہیں، اصل کتاب کے مصنف کے حالات بھی انھوں نے بڑی دیدہ ریزی سے لکھے ہیں مگر اس سلسلے میں بعض مقامات پر تعجب ہوتا ہے مثلاً:

صفحہ 8 (دیباچہ مصحح) پر ہے:

"دیباچے کے مقفیٰ فقرے، امام صاحب الزماں کی تعریف کے اشعار، نیز خاتمۂ کتاب میں ہر طبقے کے اندر بارہ بارہ شاعروں کا تذکرہ، یہ قراین بتاتے ہیں کہ یکتا کا مذہب اثنا عشری ہے"۔

ہر طبقے میں بارہ شاعروں کا ذکر کتاب میں نہیں ہے۔یہ عرشی صاحب کی غلط بیانی ہے اور کسی غلط بیان کی بنیاد پر حکم لگا دینا بڑی بیجا بات ہے۔

پھر صفحہ 20 (دیباچہ مصحح) پر تحریر کیا ہے:

"یہ شاعر جن کی مجموعی تعداد پینتیس ہے تین طبقوں میں منقسم ہیں، پہلے طبقے میں گیارہ اور باقی دونوں میں بارہ بارہ شاعروں کا ذکر ہے، چونکہ مصنف اثنا عشری

مذہب کا تھا غالباً دوازدہ امام کے شمار کے مطابق ہر طبقے میں بارہ شاعروں کا ذکر ہوگا، ہمارے نسخے میں طبقۂ ادنیٰ کا ایک نام سہواً چھوٹ گیا ہے"۔

یہ دعویٰ کہ مصنف اثنا عشری تھا ایک غلط بیانی پر مبنی ہے جیسا کہ اوپر ظاہر کیا جا چکا، پھر یہ ہرگز ضروری نہیں کہ اثنا عشری مذہب کا ماننے والا بارہ شاعروں ہی کا حال لکھے گا اور گیارہ کا ذکر نہیں کر سکتا ہے چنانچہ یہ مفروضہ کہ لازماً ایک کا حال چھوٹ گیا ہے محض بے بنیاد ہے۔

مفروضے بناتے رہنے کی ایک اور مثال اسی کتاب سے نقل کی جاتی ہے، لکھتے ہیں:

"اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ گردیزی نے یرنگ کا حال آخر 1165ھ میں لکھا ہے اور چند سے صرف تین سال مراد ہیں تو اس کا سالِ انتقال 1162ھ قرار پائے گا"

(ص 44-45)

اور دوسرے موقع پر تحریر کرتے ہیں:

"اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ختمِ نکات تک (یرنگ) زندہ تھا تو پھر اس کا یہ مطلب ہوگا کہ گردیزی نے اس کا حال کم از کم 1158ھ میں لکھا ہے۔" (ص 48)

دونوں باتیں مفروضوں پر مبنی ہیں اور دونوں بے اصل ہیں۔ اس قسم کی تحریروں کو تحقیق کا نام دینا بڑی زیادتی کی بات ہے۔

عرشی صاحب نے اس کتاب میں داخلی شہادتوں کی جستجو پر بہت محنت کی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ انھوں نے کاتب کی تحریر کو مصنف کے بیان پر ترجیح دینے میں بھی تامل نہیں کیا ہے۔ مثال کے طور پر قائم نے اپنے تذکرے کا تاریخی نام مخزنِ نکات رکھا ہے جس سے اس کی تکمیل کا سال 1168ھ معلوم ہوتا ہے، عرشی صاحب کے پیشِ نظر اس کا جو مخطوطہ تھا اس میں اشتیاق کے بارے میں لکھا ہے:

"مدتِ ہفت سال شد کہ بہ دارالبقا انتقال نمود"۔

اشتیاق نے 1150ھ میں رحلت کی۔ عرشی صاحب نے حکم لگا دیا کہ اشتیاق کا حال قائم نے یقیناً 1157ھ میں لکھا ہے (ص 51) اور یہ خیال نہ کیا کہ یہ تحریر کاتب کی ہے اور کاتب کے بیان کو مصنف کے قول پر ترجیح حاصل نہیں ہو سکتی۔ چاہیے تھا کہ کاتب نے لفظ "ہفت" کے بعد سہواً

''وہ'' چھوڑ دیا، صحیح معتدہ ہے اور یہ خود قائم کے قول کے مطابق ہے۔

عرشی صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کے نتیجے میں تقریباً سبھی مصنفین نے بیان غلط (کذب) ثابت ہوتے ہیں اور کاتب نے جو بھی لکھ دیا ہے وہی عرشی صاحب کے لیے قابل قبول ہے۔ اس روش کا جو نتیجہ ہوگا اس کی ایک مثال تذکرہ ابنِ طوفان سے پیش کی جاتی ہے جس میں لکھا ہے کہ:

> ''میر علی اوسط رشک تخلص از شاگردان معتمد ..... نائخ واز پسران میر حسن'' (ص 9)۔

کاتب نے سہواً از پسران سے پہلے لفظ خلیق چھوڑ دیا اور مرتّب کو موقع دے دیا کہ وہ میر حسن کو رشک کا باپ بنا دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تحقیق نہیں ہے بلکہ اپنے نتیجہ کی رو سے افترا پردازی ہے۔

عرشی صاحب نے اپنے ایجاد کردہ طریقۂ تحقیق کا استعمال کر کے دستور الفصاحت کو انشا کی دریائے لطافت سے قدیم تر ثابت کر دیا ہے۔ متن میں جا بجا تصحیح کر کے اس میں حسب خواہش تصرف بھی کیا ہے۔ صحیح وہ ہے جو مصنف نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے:

> ''عرصہ بعید ومدت مدید میری گردیدہ کہ چہرۂ تسطیر این مقالہ .... برصفحۂ وجود نقش گرفتہ، بہ سبب تردد خاطر..... درین تعطیل کہ سالہا سال بسر آمدہ ہرگز طبیعت متوجہ نہ شد کہ بہ نظر ثانی پرداز د... شیخ رمضان علی صاحب.... کمر ہمت بستہ بہ تقلش پرداختند وبہ سعی تمام در ماہ ذی الحجہ این سال آں را اتمام ساختند ....

قطعۂ تاریخ

صد شکر کہ اتمام پذیر فت رسالہ — واضح شد ازاں جملہ قوانین بلاغت

تاریخ تمامیش طلب کرد چو یکتا — فی الفور خرد گفت کہ دستور الفصاحت''۔

1269ھ

بہ صورت موجودہ یہ قدیم 35 شعرا کا تذکرہ ہے جو 1249ھ (میں مکمل ہوا، اس میں شاعروں کے واقعات تفصیل سے لکھے ہیں اس لیے یہ زیادہ قابل قدر ہے۔

مطبعے

لکھنؤ میں غازی الدین حیدر بادشاہ اول نے جو اسکول بک سوسائٹی قائم کی تھی اس کا ذکر مؤرخین نے عموماً نہیں کیا ہے۔ حالانکہ شمالی ہند میں یورپی علوم وغیرہ کو روشناس کرانے میں اس نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسی سوسائٹی کی کتابوں کی طباعت کے لیے بادشاہ کے حکم سے ایک مطبع قائم کیا گیا جس کا نام مطبع سلطانی رکھا گیا، اور اس میں کتابیں ٹائپ میں چھپتی تھیں۔ اہل لکھنؤ کو جن کی حُسن پسندی کا شہرہ ہے یہ ٹائپ کے حروف پسند نہیں آئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس مطبع کو زیادہ فروغ حاصل نہیں ہو سکا۔ اس مطبع کے ذکر میں مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے:

> ''لکھنؤ میں بہ عہد غازی الدین حیدر 1243 محری تا 1256 محری مطابق 1814 تا 1827 (1229 ھ تا 1242) ارسل نامی ایک یورپین نے آکر لوگوں کو مطبع کا خیال دلایا، اور جب اہل علم مشتاق ہوئے تو اس نے پہلا مطبع لکھنؤ میں کھولا، اس نے پریس اور تمام سامان یہیں تیار کرا کے چھاپنا شروع کیا اور زادالمعاد ہفت قلزم، اور تاج اللغات جو بہت سی جلدوں میں تھی چھاپ کے پبلک کے سامنے پیش کیں''۔

اس مطبع کی کارگزاریوں کا حال رام بابو سکسینہ نے اس طرح قلمبند کیا ہے:

''غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں بھی بہت صرف سے اور تکلف کے
ساتھ ایک مطبع ٹائپ کا کھولا گیا تھا، جس میں سب سے پہلے ہفت قلزم چھپی تھی،
دوسری کتابیں جو اس مطبع سے نکلیں حسب ذیل ہیں:
مناقب الحیدریہ بہ زبان عربی (مولفہ شیخ احمد بن محمد) 1891 میں، محامد حیدری
فارسی میں 1822 میں، یہ دونوں کتابیں غازی الدین حیدر کی تعریف میں
ہیں۔
گلدستۂ محبت، جس میں نواب گورنر جنرل لارڈ ہسٹینگس اور غازی الدین حیدر کی
ملاقات کا حال فارسی میں ہے۔
پنج سورہ بخط طغرا
تاج اللغات جو ایک عربی کا لغت زبان فارسی میں ہے''۔

مناقب الحیدریہ کی تاریخ طباعت 27 ربیع الاول 1235ھ (1819) ہے اور ہفت قلزم کا سال طباعت 1237ھ ہے اور اس طرح ظاہر ہے کہ مطبع سلطانی کی پہلی مطبوعہ کتاب مناقب الحیدریہ ہے۔ نہ کہ ہفت اقلیم۔ یہ آداب کی بات بھی تھی کہ بادشاہ کے قائم کردہ مطبع سے شائع ہونے والی پہلی کتاب مناقب الحیدریہ ہی ہونی چاہیے تھی۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ دوم کو اس مطبع سلطانی کو بہتر بنانے کا خیال ہوا۔ بہتری کی صورت تو نہ ہو سکی البتہ ان کی سرپرستی میں لیتھو کا چھاپہ خانہ قائم ہو گیا۔ اس کے بارے میں رام بابو سکسینہ نے تحریر کیا ہے:

> ''1830 میں ایک انگریز مسٹر آرچر جنھوں نے لیتھو کا چھاپہ خانہ کانپور میں کھولا
> تھا، نصیر الدین حیدر کے حکم سے لکھنؤ آئے اور یہاں بھی ایک مطبع جاری کیا،
> ایک اور مشہور کتاب جو اس زمانے میں لکھنؤ میں چھپی وہ ایک انگریزی کتاب کا
> ترجمہ تھی جس کو لارڈ بروہم نے سائنس کے فوائد اور اعمال پر تصنیف کیا تھا، اس
> کا ترجمہ بھی سید کمال الدین حیدر معروف بہ میر محمد حسینی لکھنوی نے اسکول بک
> سوسائٹی کلکتہ کی فرمائش سے کیا اور مطبع سلطانی میں 1830 میں چھپا، یہ ترجمہ

صاف اور سلیس اردو میں ہے"۔

رسالہ "سائنس کے فوائد و اجمال" کا حال پہلے لکھا جاچکا ہے۔ یہ کتاب اسکول بک سوسائٹی لکھنؤ نہ کہ کلکتہ کی تجویز سے 1843 میں جب کہ امجد علی شاہ بادشاہ تھے چھپی تھی۔ غالباً ترجمے کے سقم نے عبارت کے مفہوم کو کسی قدر بدل دیا ہے ورنہ صحیح صورت حال کا ذکر سکسینہ نے اس طرح کیا ہے:

"سب سے پہلی کتاب جو لکھنؤ میں لیتھو میں چھپی شرح الفیہ تھی"۔

اس کتاب کے پہلے صفحہ کی عبارت کا ضروری اقتباس یہ ہے:

"ہذا شرح الفیہ الموسوم بالبہجۃ المرضیۃ للشیخ جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابی بکر السیوطی، کمل طبعہ للطالبین بعونہ من شہر ذی القعدۃ سنۃ سبع واربعین ومائتین والف من الہجرۃ النبویۃ علی صاحبہا افضل الصلاۃ والتحیۃ فی مطبع السلطان الاعظم ... السلطان ابو النصر قطب الدین سلیمان جاہ سلطان عادل نوشیروان زمان نصیر الدین حیدر بادشاہ غازی"۔

یعنی یہ کتاب ذیقعدہ 1247 ھ (اپریل 1831) میں چھپ گئی تھی اور یہ واقعہ اس حقیقت پر بھی دلالت کرتا ہے کہ نصیر الدین حیدر کا یہ مطبع سلطانی 1830 کے اواخر میں لکھنؤ میں قائم ہو چکا تھا اور 1831 کے اوائل میں اس نے کام کرنا شروع کر دیا تھا، شرح الفیہ کا مذکورہ نسخہ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔

لکھنؤ میں ان شاہی مطبعوں کے قیام کے بعد یکے بعد دیگرے کئی چھاپے خانے قائم کیے گئے جن سے علم و ادب کی اشاعت میں بہت آسانیاں ہو گئیں۔

حواشی

لکھنؤ کی آبادی

1	آب حیات	ص242
2	انتخاب مضامین شرر	ص101
3	تواریخ نادر العصر	ص68
4	آب حیات	ص197
5	ایضاً	ص198
6	ایضاً	ص229
7	ایضاً	ص210
8	ایضاً	ص281تا282
9	انتخاب مضامین شرر	ص101

غزل

1	خوش معرکۂ زیبا ج1	ص263
2	گلستان سخن ج2	ص414
3	مجموعۂ نغز جلد1	ص155تا156

3-الف خوش معرکۂ زیبا ج1 ص145

4 مخزن الغرائب بحوالہ دستور الفصاحت ص104-105

5 گلشن سخن ص64

6 طبقات شعرائے ہند ص204

7 دستور الفصاحت خاتمہ ص107

8 خوش معرکۂ زیبا ص313

9 آب حیات ص256-288

10 ریاض الفصحا ص286-288

11 خوش معرکۂ زیبا ج1 ص348-351

12 دیوان مصحفی ہشتم پیش گفتار ص1011

13 تذکرہ ہندی ص101

14 آب حیات ص282-285

15 خوش معرکۂ زیبا ج1 ص96

16 تواریخ نادر العصر ص67-68

17 تذکرہ ہندی ص5

18 خوش معرکۂ زیبا ج1 ص216

19 خوش معرکۂ زیبا ج2 ص628

20 ایضاً ص493

21 سراپا سخن ص241

22 ریاض الفصحا ص366-367

23 خوش معرکۂ زیبا ص453

24 ایضاً ص452-453

25 ابن طوفان ص17

26 اردو مخطوطات علی گڑھ ص215

27 تذکرہ ہندی ص117

28 ایضاً ص326

29 آب حیات ص326

30 ریاض الفصحا ص344

31 آب حیات کا تنقیدی مطالعہ ص

32 آب حیات ص346

33 ایضاً ص342-343

34 دیوان مصحفی ہشتم پیشگفتار ص10-11

35 خوش معرکۂ زیبا ج2 ص203-205

36 ریاض الفصحاء ص5 4

37 تذکرہ ہندی ص100

38 آب حیات ص374

39 ایضاً ص375

40 خوش معرکۂ زیبا ج2 ص57 56

41 معاصر جولائی 1962 ص70 68

42 آب حیات ص332

43 ریاض الفصحا ص241

44 گلشن بے خار ص137

45 خوش معرکۂ زیبا ج1 ص327 326

46 آب حیات حاشیہ ص355

47 خوش معرکۂ زیبا ج1 ص263

48 ایضاً ج2 ص627

49 ایضاً ج1 ص453

50 اردو مخطوطات علی گڑھ ص

51 آب حیات ص365

52 ایضاً ص370

53 سراپا سخن ص241

54 تواریخ نادر العصر ص72 69

55 ریاض الفصحاء ص32

56 آب حیات ص348

57 ایضاً ص357-379

58 تواریخ گورکھپور ص20 19

59 بہار بے خزاں ص42

60 خوش معرکۂ زیبا ج2 ص218

61 جلوہ خضر ص250

62 خوش معرکۂ زیبا ج2 ص218

63 سخن شعرا ص10

64 سراپا سخن ص362

65 سخن شعرا ص25

66 ریاض الفصحا ص254

67 ایضاً ص253

68 گلشن بے خار ص150

69 خوش معرکۂ زیبا ج2 ص225

70 سراپا سخن ص257

71 آب بقا ص147

72 ریاض الفصحا ص188

73 خوش معرکۂ زیبا ج2 ص229 228

74 تاریخ آصفی ص35

75 مخطوطات فارسی انجمن کراچی ص24

76 تاریخ اودھ ج4 ص216

77 گلشن بے خار ص128

78 سراپا سخن ص115

79 خمخانۂ جاوید ج5 ص440

80 گلستان بے خزاں ص149

81 خمخانۂ جاوید جلد۳ ص194

82 اردو مخطوطات علی گڑھ ص396

83 خوش معرکۂ زیبا ج1 ص263

84 تذکرہ شعرائے اردو ص72

85 آب بقا ص172 171

86 ایضا ص174

87 ریاض الفصحاء ص95

88 آب حیات حاشیہ ص367

89 ریاض الفصحاء ص357

90 سراپا سخن ص277

91 اردو مثنوی شمالی ہند میں ص479-481

92 تذکرہ سرور ص811

93 آب حیات ص352

94 طبقات شعرائے ہند ص428

95	گلستان سخن ج2	ص467
96	ابن طوفان	ص98
97	آب حیات	ص462
98	ایضاً	ص353
99	گلشن بے خار	ص237
100	خوش معرکۂ زیبا ج2	ص377
101	دفتر فصاحت	ص4 6
102	سراپا سخن	ص357
103	آب حیات	ص331
104	طبقات شعرائے ہند	ص428-429
105	خوش معرکۂ زیبا ج2	ص620-621
106	ابن طوفان	ص30
107	آب حیات	ص342
108	خوش معرکۂ زیبا ج1	ص102
109	آب حیات	ص358
110	خوش معرکۂ زیبا ج2	ص399
111	خوش معرکۂ زیبا ج2	ص309
112	پری جمال بیگمات	ص25
113	خوش معرکۂ زیبا ج2	ص310
114	ریاض الفصحاء	ص375-376
115	ایضاً	ص118
116	خوش معرکۂ زیبا ج2	ص405-406
117	ریاض الفصحاء	ص375-376

118 فسانۂ عجائب ص14 13

119 خوش معرکۂ زیبا ج2 ص224

120 دیوان نوازش مقدمہ ص4

121 ریاض الفصحاء ص233-234

122 ایضاً ص210-211

123 سراپا سخن ص333

124 خوش معرکۂ زیبا ج2 ص203-204

125 خمخانۂ جاوید ج3 ص519

126 ریاض الفصحاء ص323

127 خوش معرکۂ زیبا ج2 ص19

128 گلدستۂ عشق ص168

129 خمخانۂ جاوید ج3 ص518

130 آب حیات ص351

131 خوش معرکۂ زیبا ج2 ص13

132 سراپا سخن ص254

133 خمخانۂ جاوید ج3 ص519

134 سراپا سخن ص204

135 خوش معرکۂ زیبا ج2 ص79

136 سراپا سخن ص311-312

137 خمخانۂ جاوید ج4 ص293

138 ایضاً ج5 ص253-254

139 ایضاً ج5 ص253-254

140 آب حیات ص383

141 ایضاً ص374

142 ابن طوفان ص11

143 سراپا سخن ص342

144 خوش معرکۂ زیبا ج2 ص47

145 خمخانۂ جاوید ج3 43 44

قصیدہ

1 دستور الفصاحت ص36 25

2 معاصر حصہ 18 سوانح لکھنؤ ص69 68

3 ایضاً ص95

4 آب حیات ص349

5 ریاض الفصحاء ص230

6 اردو مخطوطات علی گڑھ ص382

7 ریاض الفصحاء ص212

8 اردو مخطوطات علی گڑھ ص382-383

9 خوش معرکۂ زیبا ج1 ص275

10 آب حیات ص339

11 ایضاً ص338

12 خوش معرکۂ زیبا ج1 ص138

13 آب حیات کا تنقیدی مطالعہ ص95

14 ایضاً ایضاً ص96

15 مخزن آلام ص671-673

16 خوش معرکۂ زیبا ج1 ص248

17 طبقات شعرائے ہند ص382

18	گلستان سخن ج2	ص319-320
19	ابن طوفان	ص79 78
20	کتاب ہائے فارسی گنج بخش ج1	ص65
21	اردو مخطوطات آصفیہ ج1	ص53
22	غالب کے لطیفے	ص31
23	کچھ غالب کے بارے میں حصہ 1	ص100
24	یادگار غالب	ص27
25	کلیات نثر غالب	ص157158
26	کچھ غالب کے بارے میں حصہ 1	ص100

نعت

	اردو مخطوطات علی گڑھ	ص218

مثنوی

1	آب حیات	ص348
2	سراپا سخن	ص323
3	مثنوی ناسخ	ص4
4	ایضاً	ص5 4
5	معاصر حصہ 2	ص97
6	اردو جولائی 1968	ص94
7	قاموس الکتب جلد 1	ص985
8	اردو مخطوطات آصفیہ ج2	ص159-160
9	ایضاً ج2	ص160-161
10	اردو مخطوطات آصفیہ ج2	ص272-273
11	اردو مخطوطات علی گڑھ	ص154-155

12	اردو مخطوطات آصفیہ ج2	ص163
13	اردو مخطوطات علی گڑھ	ص344
14	ریاض الفصحاء	ص180
15	خوش معرکۂ زیبا ج2	ص520
16	ایضاً ج2	ص514
17	ایضاً ج2	ص520
18	تذکرہ مخطوطات ج3	ص91 98
	مزید دیکھو مخطوطات اردو گنج بخش	ص133
	اردو مخطوطات انجمن کراچی ج1	ص39 وغیرہ
19	اردو مخطوطات انجمن کراچی ج5	ص286287
20	ایضاً ج5	ص317
21	مخانۂ جاوید ج5	ص298
22	اردو مخطوطات آصفیہ ج1	ص44
23	ایضاً ج1	ص163-164
24	ایضاً ج2	ص330-331
25	تذکرہ مخطوطات ج5	ص240-242
26	سراپا سخن	ص274
27	ریاض الفصحا	ص90
28	سراپا سخن	ص140
29	اردو مخطوطات آصفیہ ج1	ص42
30	اردو مخطوطات انجمن کراچی ج5	ص54 51
31	سراپا سخن	ص274
32	اردو مخطوطات انجمن کراچی ج6	ص24 23

33	ایضاً ج2	ص234-235
34	اردو مخطوطات علی گڑھ	ص349
35	سراپا سخن	ص374
36	جائزہ مخطوطات ج1	ص112113
37	اردو مثنوی شمالی ہند میں	ص426427
38	خوش معرکہ زیبا ج1	ص301302
39	اردو مخطوطات علی گڑھ	ص235
40	ابن طوفان	ص64
41	ایضاً	ص65

مرثیہ

1	خوش معرکہ زیبا ج1	ص136
2	اردو مخطوطات علی گڑھ	ص392
3	اردو مرثیے کا ارتقا	ص170
4	ریاض الفصحا	ص103104
5	خوش معرکہ زیبا ج1	ص256
6	آب حیات	ص367
7	خوش معرکہ زیبا ج1	ص230
8	آب حیات	ص367
9	ریاض الفصحاء	ص254
10	اردو مخطوطات رامپور ج1	ص365375
11	آب حیات حاشیہ	ص367
12	خوش معرکہ زیبا ج2	ص255
13	ایضاً ج1	ص397

14	تلخیص معلی	ص92 90
15	آب حیات	ص367
16	تذکرۂ ہندی	ص280
17	تلخیص معلی	ص
18	آب حیات	ص366
19	ایضاً	ص367
20	ایضاً	ص370
21	ایضاً	ص517
22	خوش معرکۂ زیبا ج1	ص524
23	آب حیات	ص367
24	خوش معرکۂ زیبا ج2	ص239

واسوخت

1	آب حیات	ص367
2	ایضاً	ص282

نثر

(1) رقعہ

1	ریاض الفصحاء	ص250251
2	خوش معرکۂ زیبا ج1	ص425

(2) تنقید

1	خوش معرکۂ زیبا ج1	ص514517

(3) مذہبی نثر

1	فہرست مخطوطات رامپور	ص350352
2	اردو مخطوطات علی گڑھ	ص62

3	سخن شعرا	ص341
4	فہرست مخطوطات رام پور	ص352358
5	ایضاً	ص353
6	اردو مخطوطات علی گڑھ	ص.420,411 418
7	فہرست مخطوطات رام پور	ص46 45
8	ایضاً	ص362
9	اردو مخطوطات آصفیہ ج1	ص168169
10	علما کا حصہ	ص528533

(4) انگریزی سے ترجمے

1	مغرب سے نثری تراجم	ص134
2	شاہان اودھ	ص78
3	وزیر نامہ	ص69 68
4	تواریخ نادر العصر	ص97 94
5	مغرب سے نثری تراجم	ص135
6	کتابیات تراجم ج1	ص221
7	ایضاً ج1	ص387
8	ایضاً ج1	ص380
9	اردو مخطوطات آصفیہ	ص281
10	کتابیات تراجم ج1	ص115
11	اردو مخطوطات آصفیہ ج2	ص347
12	کتابیات تراجم ج1	ص386
13	اردو مخطوطات آصفیہ ج1	ص286-285

14	دہلی کے مخطوطات	ص23-24

5) کتب قانون

1	کتابیات قانون	ص267
	کتابیات تراجم ج1	ص261
2	کتابیات قانون	ص269
	کتابیات تراجم ج1	ص262
3	کتابیات قانون	ص105

(6) مطبعے

1	گذشتہ لکھنؤ	ص142
2	تاریخ ادب اردو حصہ نثر	ص36
3	ہندوستانی پریس	ص307
4	تاریخ ادب اردو حصہ نثر	ص

ماخذ

(الف) کتابیں

[متن میں جن کتابوں/رسالوں سے بحث کی گئی ہے ان کے نام یہاں درج کیے گئے ہیں]

1- آب بقا — خواجہ عبدالرؤف عشرت — نامی پریس لکھنؤ — بار اول جنوری 1918/1336ھ

2- آب حیات — محمد حسین آزاد — اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ — پہلا آفسٹ ایڈیشن 1982

3- آب حیات کا تنقیدی مطالعہ — پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب — کتاب نگر لکھنؤ — بار اول 1953

4- اردو داستان — ڈاکٹر سہیل بخاری — مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد — طبع اول 1987

5- اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری — ڈاکٹر فرمان فتح پوری — مجلس ترقی ادب لاہور — طبع اول نومبر 1972

6- اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام — مولوی عبدالحق — انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی 1953

7- اردو مثنوی شمالی ہند میں (صحیفۂ اغلاط) — ڈاکٹر گیان چند جین — انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ 1969

8- اردو مرثیے کا ارتقا	ڈاکٹر مسیح الزماں	کتاب نگر لکھنؤ، پہلی اشاعت	1968
9- اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	مقتدرہ قومی زبان، کراچی	طبع اول 1981
10- اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ	ڈاکٹر محمد ایوب قادری	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور	طبع اول 1988
11- اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (آصفیہ) کے اردو مخطوطات	نصیر الدین ہاشمی، جلد اول	مطبع ابراہیمیہ حیدرآباد دکن	1381ھ 1961
12- ایضاً	جلد دوم	اعجاز مشین پریس حیدرآباد دکن	1381ھ 1961
13- افسانۂ لکھنؤ	آغا محمد شرف مرتبہ۔ سید محمود نقوی	نشاط پبلی کیشنز، دہلی	1985
14- انتخاب دواوین	امام بخش صہبائی مرتبہ۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی	شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی اشاعت اول	!1987
15- انتخاب اعظمی	مولوی عبید اللہ اعظمی مؤلف ڈاکٹر محمد انصار اللہ	تاج پرنٹنگ پریس علی گڑھ	1981
16- انتخاب یادگار	امیر احمد امیر مینائی	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ پہلا ایڈیشن	1982
17- بمبئی میں اردو	ڈاکٹر میمونہ دلوی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	بار اول 1970
		کتاب نگر لکھنؤ	1957
18- بہار بے خزاں	احمد حسین سحر مرتبہ نعیم احمد	علمی مجلس دہلی	1968
19- بہارستانِ ناز	حکیم فصیح الدین رنج مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی	مجلس ترقی ادب لاہور، مارچ	1960
20- بیگماتِ [illegible]	شیخ تصدق حسین	کتاب نگر لکھنؤ	

21- پری جمال بیگمات شاہان اودھ   خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی   حمیدیہ پریس دہلی   ستمبر
مرتبہ عبدالسلام رامپوری   1935

22- تاریخ ادب اردو   رام بابو سکسینہ   مطبع منشی تیج کمار لکھنؤ   1969
اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری

23- تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان   سید فیاض محمود   پنجاب یونیورسٹی لاہور   1971
وہند۔ اردو ادب حصہ سوم

24- تاریخ اودھ   حکیم محمد نجم الغنی خاں رامپوری   مطبع مطلع العلوم مرادآباد   اگست
1912

25- تذکرہ اردو مخطوطات   ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور   ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن
جلد اول تا جلد ششم   ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

26- تذکرۃ الذاکرین   سید آغا شہر لکھنوی   شمسی پریس جھانسی   1946

27- تذکرہ سرور (عمدۂ منتخبہ)   اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور   شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی   مارچ
مرتب خواجہ احمد فاروقی   1961

28- تذکرۂ شعرا   ابن امین اللہ طوفان   مطبع آزاد پریس، پٹنہ   1954
مرتب قاضی عبدالودود

29- تذکرہ شعرائے اردو   میر حسن دہلوی مع مقدمہ از   انجمن ترقی اردو ہند، دہلی   1940
محمد حبیب اللہ خاں شروانی   طبع جدید

30- ترانے حدائق البلاغت   شیخ امام بخش صہبائی   مطبع منشی نولکشور لکھنؤ

31- تذکرۂ نادر (دیوان غریب)   میرزا کلب حسین خاں نادر   کتاب نگر لکھنؤ   1957
مرتب سید مسعود حسین رضوی

32- تذکرہ نعت گویان، بریلی   ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب   روشن پبلی کیشنز بدایوں   1986

33- تذکرۂ ہندی   شیخ غلام ہمدانی مصحفی   انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن   طبع اول
مرتبہ مولوی عبدالحق   1933

34- تلاش وتعارف   ڈاکٹر حنیف نقوی   نصرت پبلشرز لکھنؤ   1987

35-تخلیص معلی	ڈپٹی کلب حسین خاں نادر	لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ	باراول
	مرتبہ ڈاکٹر محمد انصاراللہ		1976
36-تواریخ نادرالعصر	منشی نول کشور		نقش ثانی
	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ		1990
37-جائزہ مخطوطات اردو	جلد اول	مرکزی اردو بورڈ لاہور، طبع اول	فروری
	مولف مشفق خواجہ		1979
38-جنگ نامۂ آصف الدولہ	خلیفہ محمد معظم عباسی	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	1980
ونواب-رامپور	مرتبہ محمد ایوب قادری	اشاعت اول	
39-چمن انداز تذکرہ مراۃ خیالی کا دوسرا حصہ	درگاپرشاد کھتری دہلوی نادر تخلص	اکمل المطابع دہلی	1883
40-حکیم آغا جان عیش اور ہریانہ کے مشاہیر	بلجیت سنگھ مطیر	کاپا جبلی کیشنز، بہادر گڑھ	دسمبر
	پہلا ایڈیشن		1981
41-خم خانۂ جاوید (تذکرہ ہزارداستان)	لالا سری رام دہلوی	امپیریل بک ڈپو پریس دہلی	1911
جلد دوم			
42- جلد سوم		دلی پرنٹنگ ورکس دہلی	1917
43- جلد چہارم	ہمدرد پریس	دہلی	1926
44-جلد پنجم	مرتبہ پنڈت برج موہن	ناشر لالا امیر چند کھنہ دہلی	1940
	دتاتریہ کیفی		
45-جلد ششم	مرتبہ خورشید احمد خاں یوسفی	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	1990
46-خندۂ گل	مولانا عبدالباری آسی الدنی	نگار شین پریس لکھنؤ	1929
خوش معرکۂ زیبا	سعادت خاں ناصر	مجلس ترقی ادب لاہور	1970
	مرتبہ مشفق خواجہ	طبع اول	
47-جلد اول			1970
48-جلد دوم		مارچ	1972
49-دربار اکبری	محمد حسین آزاد	قومی کونسل برائے فروغ اردو	
	دیباچہ اشاریہ از محمد انصاراللہ	زبان نئی دہلی	

50-دستور الفصاحت (مقدمہ وخاتمہ حکیم سید احمد علی خاں یکتا ہندوستان پرنٹنگ ورکس 1943
بہ تصحیح امتیاز علی خاں عرشی
51-دفتر فصاحت (دیوان خواجہ وزیر) مطبع مصطفائی لکھنؤ 1943
52-دہلی کی آخری شمع مرزا فرحت اللہ بیگ اسٹار بک ڈپو کلکتہ 1308
1891

53-دہلی کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست ڈاکٹر صلاح الدین انجمن ترقی اردو ہند دہلی
ستمبر 1975
54-دیوان ذوق خاقانی ہند محمد ابراہیم ذوق سٹی پرنٹنگ ورکس دہلی 1933
مولف محمد حسین آزاد 1351
55-دیوان ذوق محمد ابراہیم ذوق علمی پرنٹنگ پریس لاہور
ناشر شیخ غلام علی برکت علی لاہور
56-دیوان شیفتہ نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1985
57-دیوان ظفر بہادر شاہ ثانی ظفر تخلص اعجاز پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی
پیش لفظ ابواللیث صدیقی بار اول جنوری 1997
58-دیوان عرش میر حسن عسکری عرف میر کلو عرش انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی
مرتبہ ایم حبیب خاں دسمبر 1987
59-دیوان غالب-کامل-تاریخی ترتیب سے مرزا غالب ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی،
مرتبہ کالی داس گپتا رضا بار اول جنوری 1988
60-دیوان غالب-جدید المعروف بہ نسخہ مرزا غالب اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1982
حمیدیہ مرتبہ مفتی انوار الحق پہلا آفسٹ ایڈیشن
61-دیوان غالب-نسخہ حمیدیہ مرزا غالب مجلس ترقی ادب لاہور
مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں طبع دوم مئی 1983
62-دیوان غالب عکسی- پیش لفظ کالی داس گپتا رضا مطبوعہ ول چل کیشنز بمبئی اکتوبر 1984
63-دیوان غالب عکسی عکسی چوتھا ایڈیشن مطبع نظامی کانپور جون جولائی 1862

	پیش لفظ کالی داس گپتا رضا	ول پبلی کیشنز بمبئی	1987
64-دیوان فراق	شاہ اللہ خاں فراق	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	
	عکسی نسخہ قلمی مخزونہ کتب خانہ		
65-دیوان گویا	فقیر محمد خاں گویا ملیح آبادی	مطبع منشی نول کشور لکھنؤ	1288ھ/ 1871
66-دیوان مصحفی	شیخ مصحفی	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری	1990
	مرتبین بمیر لکھنوی و امیر مینائی پٹنہ		
67-دیوان مصحفی (دیوان ہشتم)	غلام ہمدانی مصحفی	خدا بخش لائبریری پٹنہ	1995
68-دیوان مومن	حکیم محمد مومن خاں دہلوی	مطبع جوہر ہند دہلی	1299ھ (1882)
69-دیوان نوازش	آغا نوازش حسین خاں	خدا بخش لائبریری پٹنہ	1993
	مرتبہ قاضی عبد الودود		
70-دیوان نیاز (فارسی و اردو)	شاہ نیاز احمد نیاز	مطبع منشی نول کشور کانپور اپریل	1875
71-رسالہ قواعد صرف و نحو اردو	امام بخش صہبائی	مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ	
72-ریاض الفصحا	شیخ مصحفی	جامعہ برقی پریس دہلی	1934
	مرتبہ مولوی عبد الحق		
73-ریاض دلربا	منشی گمانی لال	کنول پبلی کیشنز، دہلی مئی	1989
	مرتب ڈاکٹر ابن کنول		
74-سخن شعرا	عبد الغفور خاں نساخ	یوپی اردو اکادمی لکھنؤ	1982
		پہلا آفسٹ ایڈیشن	
75-سراپا سخن	سید محسن علی موسوی محسن	مطبع منشی نول کشور لکھنؤ	
	بار سوم	اپریل 1898/ 1315ھ	
76-سراج نظم	شیخ ناسخ	مطبع محمد حسین لکھنؤ	1265ھ/ 1849
	مرتبہ میر رشک		
77-سرگذشت غالب (مرزا اسد اللہ خاں غالب)	مولف میرزا احمد بشیر بھرتپوری	عزیزی پریس آگرہ	1942
78-سعادت یار خاں رنگین	ڈاکٹر جابر علی خاں	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	1956

79-شاہان اودھ کے کتب خانے — ڈاکٹر اے اشپرنگر، مترجم محمد اکرم چغتائی — انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

80-شمیم سخن — عبدالحئی صفا بدایونی — مطبع منشی نول کشور لکھنؤ بار دوم 1891

81-صہبائی-ایک مختصر تعارف — ڈاکٹر محمد انصار اللہ — لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ 1986

82-طبقات الشعرا — قدرت اللہ شوق، مرتب نثار احمد فاروقی — مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول جنوری 1968

83-طبقات شعرائے ہند — مولوی کریم الدین پانی پتی — یو پی اردو اکادمی لکھنؤ 1983

84-علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری کے اردو مخطوطات — ڈاکٹر عطا خورشید — خدا بخش لائبریری پٹنہ 1995

85-عود ہندی — مرزا غالب — مطبع منشی نول کشور لکھنؤ 1331ھ 1913

84-غالب کے لطیفے — مفتی انتظام اللہ شہابی، پہلی بار — حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی، سنہ ندارد

85-غزلیات ذوق۔ ردیف الف، مع مقدمہ وغیرہ شیخ ذوق — مرتبہ محمد انصار اللہ — غیر مطبوعہ (مقالہ برائے ایم اے) 1963

86-فسانۂ عجائب — رجب علی بیگ سرور، مرتب مخمور اکبرآبادی — رام نرائن لال، ارن کمار پبلشرز الہ آباد 1990

87-فہرست قلمی کتاب خانہ ذاتی نواب سید حیدر علی خان بہادر جعفری گوالیوری، کانپور — مرتبہ محمد انصار اللہ 1964

88-فہرست قلمی کتاب خانہ ذاتی نواب سید قیصر حسین خاں قیصر پنکاپوری کانپور — مرتبہ محمد انصار اللہ 1964

89-فہرست کتاب ہائے فارسی چاپ سنگی وکیاب کتب خانہ گنج بخش جلد یکم — مرتب سید عارف نوشاہی — مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان اسلام آباد (اور دوسری متعدد فہرستیں)

90-قاموس الکتب اردو — زیر نگرانی مولوی عبدالحق — انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

جلد اول-مذہبیات	اشاعت اول		جون 1961
جلد دوم-تاریخیات	اشاعت اول		1974-75
جلد سوم-عمرانیات	اشاعت اول		1978-80
91-قطعہ منتخب	عبدالغفور خاں نساخ	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	
	تلخیص و ترتیب محمد انصاراللہ	اشاعت اول	1974
92-کاملان رامپور	حافظ احمد علی خاں شوق	خدابخش لائبریری پٹنہ	1985
93-کتابیات تراجم	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	
	جلد اول۔علمی کتب	طبع اول	1986
94-کلیات آتش	خواجہ حیدر علی آتش	جلد اول، دوم	1975
	مرتب سید مرتضیٰ حسین فاضل مجلس ترقی ادب لاہور		
95-کلیات انشا	سید انشاءاللہ خاں انشا	مطبع منشی نول کشور کانپور بار اول	
			دسمبر 1894
96-کلیات ذوق (اردو)	شیخ محمد ابراہیم ذوق	ترقی اردو بیورو نئی دہلی	
	مرتب ڈاکٹر تنویر احمد علوی	دوسرا ایڈیشن	1989
97-کلیات صہبائی	امام بخش صہبائی	مطبع نظامی کانپور	1295ھ
	(مشتمل بر بیاض شوق پیام،		1878ء
	رسالہ نحو فارسی، دیوان صہبائی		
	جواہر منظور وغیرہ		
98-کلیات عیش	حکیم آغا جان عیش	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	
	مرتبہ ڈاکٹر حبیبہ بانو	پہلا ایڈیشن	1992
99-کلیات ناسخ	مرتبہ میر رشک	مطبع میر حسن رضوی، مطبع حسنی لکھنؤ	1258ھ
100-گذشتہ لکھنؤ	عبدالحلیم شرر لکھنوی	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	
	مرتب شمیم انہونوی		جولائی 1965
101-گلدستہ عشق (دیوان رند)	نواب سید محمد خاں رند	مطبع منشی نول کشور کانپور	
		بار ہفتم ذی قعدہ 1304ھ/ جولائی 1887	

102- گلستان بے خزاں   حکیم قطب الدین باطن   اتر پردیس اردو اکادمی لکھنؤ   1982
عرف نغمۂ عندلیب
103- گلستان سخن   مرزا قادر بخش صابر   جون 1966
مع مقدمہ خلیل الرحمٰن داؤدی   مجلس ترقی ادب لاہور
و ڈاکٹر وحید قریشی
104- گلشن بے خار   نواب مصطفیٰ خان شیفتہ   باہتمام مولوی محمد باقر سپرنٹنڈنٹ 1253ھ
مطبع لیتھوگرافک دہلی اخبار   1837
چند اوراق نقل کردہ محمد انصار اللہ
105- گلشن ہمیشہ بہار   نصر اللہ خاں خویشگی   انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی 1967
مرتبہ ڈاکٹر محمد اسلم فرخی
106- مثنوی حیات رجعت   میر رشک   مطبع سنگین لکھنؤ   1263ھ/ 1847
107- مجموعۂ نغز   حکیم قدرت اللہ خاں قاسم   مرتبہ حافظ محمود خاں شیرانی
ترقی اردو بورڈ دہلی   اکتوبر 1973
108- مذہب عشق (قصہ گل بکاؤلی)   نہال چند لاہوری   اگروال بک ڈپو دہلی   سال ندارد
109- مراثی خلیق   میر محمد مستحسن خلیق   قلمی مجلد
مملوکہ سید مسعود حسن رضوی ادیب   لکھنؤ
110- معتمد الدولہ آغا میر   ڈاکٹر محمد انصار اللہ   غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی اگست 1988
111- مضامین شرر   عبدالحلیم شرر   مرکنٹائل پریس لاہور بار اول
112- نادرات شاہی   شاہ عالم ثانی بادشاہ ہندوستان
مرتبہ امتیاز علی عرشی   ہندوستان پریس رامپور   1943
113- تاریخ - تجزیہ و تقدیر   ڈاکٹر شبیہ الحسن مارہروی   اردو پبلشرز لکھنؤ   فروری 1975
114- نظم مبارک و نظم گرامی   مطبع مولوی محمد حسین لکھنؤ   1261ھ/1845
(رشک کا پہلا اور دوسرا دیوان)
115- ایضاً   بعد تصحیح و اضافہ وغیرہ
116- نظم آخریں (رشک کا تیسرا دیوان) مرتب محمد انصار اللہ   غیر مطبوعہ   1966

117-نفس اللغہ حصہ اول میر رشک نیو پریس لکھنو مطبع اول
118-نمونۂ منثورات احسن مارہروی مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد 1986
119-نوطرز مرصع میر محمد حسین عطا خاں تحسین ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد 1958
مرتب سید نورالحسن ہاشمی
120-واقعات اظفری (اردو ترجمہ میرزا علی بخت محمد ظہیر الدین مترجمہ عبدالستار
اظفری گورگانی بہ تصحیح محمد حسین محوی صدیقی
مودی پور پرنٹنگ ورکس بنگلور سٹی مارچ 1937
121-وزیرنامہ وزیر السلطان سید محمد امیر علی مطبع نظامی کانپور 1293ھ
خان بہادر 1876
122-یادگار غالب خواجہ الطاف حسین حالی غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی 1996
دوسرا ایڈیشن
123-شعرائے اردو کے اولین تذکرے ڈاکٹر محمد انصار اللہ لیتھوکلر پرنٹرس علی گڑھ

(ب) رسالے

1-ششماہی اردو　　انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

(1) شمارہ جولائی، اگست، ستمبر 1968

خلیق کی مرثیہ گوئی　　ڈاکٹر مسیح الزماں

معراج نامۂ ناسخ　　رشید حسین خاں

(2) شمارہ خصوصی بہ یاد غالب　　جنوری، فروری، مارچ　　1969

2-سہ ماہی اردو ادب　　انجمن ترقی اردو ہند　　علی گڑھ

(1) شمارہ جون 1953　　لکھنؤ　　مومن نمبر

مثنوی سراپا سوز　　از محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی

فہرست مخطوطات　　از محمد ابرار حسین فاروقی

3-سہ ماہی تحریر　　علمی مجلس، دلی　　جلد 4، نمبر 4-1970

تذکرہ صدر الدین آزردہ　　مرتبہ مختار الدین احمد

4-معاصر　　دائرۂ ادب، پٹنہ

حصہ 2 میں　　سراج نظم مصنفۂ ناسخ از قاضی عبدالودود اور دوسرے متعلق مضامین

حصہ 12 میں　　دیوان غالب کے دو نسخے　از قاضی عبدالودود

5-ماہنامہ نگار-　　نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مومن نمبر　　دوسری اشاعت　　1951

6-رضا لائبریری جرنل　　شمارہ نمبر 2　　رامپور رضا لائبریری رامپور

رامپور کے دبستان شاعری کی ایک جھلک

از شبیر علی خاں شکیب

فہرست مخطوطات اردو، رضا لائبریری از ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہہ اور دوسرے مضامین

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

تاریخ ادب اُردو (جلد اوّل)

مصنّفین : گیان چند جین
سیّدہ جعفر
صفحات : 462
قیمت : -/454 روپے (سیٹ)

تاریخ ادب اُردو (جلد دوم)

مصنّفین : گیان چند جین
سیّدہ جعفر
صفحات : 527
قیمت : -/545 روپے (سیٹ)

تاریخ ادب اُردو (جلد سوم)

مصنّفین : گیان چند جین
سیّدہ جعفر
صفحات : 464
قیمت : -/545 روپے (سیٹ)

تاریخ ادب اُردو (جلد پنجم)

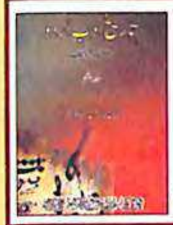

مصنّفین : گیان چند جین
سیّدہ جعفر
صفحات : 443
قیمت : -/545 روپے (سیٹ)

تاریخ نثر اردو (نمونہ منثورات)

مصنف : احسن مارہروی
صفحات : 496
قیمت : -/130 روپے

تامل ناڈو میں اردو

مصنف : علیم صبا نویدی
صفحات : 192
قیمت : -/135 روپے

₹ 132/-

ISBN : 978-81-7587-771-9

9 788175 877719

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language
Farogh-e-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025